خُطبات

حکیمُ الاُمّت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون 4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد- ٦

نظام شریعت

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت
حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

تصحیح وتزئین
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث
مولانا زاہد محمود قاسمی

ترتیب وعنوانات
مفتی عبدالرحمٰن خانؒ

ادارہ تالیفات اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

نظام شریعت

تاریخ اشاعت.............رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ
ناشر...............ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت...............سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں
کسی بھی طریقہ سے اس کی اشاعت غیر قانونی ہے

قانونی مشیر
قیصر احمد خان
(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ملتان)

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ...... چوک فوارہ...... ملتان
ادارہ اسلامیات...... انار کلی...... لاہور
مکتبہ سید احمد شہید...... اردو بازار...... لاہور
مکتبہ رحمانیہ...... اردو بازار...... لاہور

مکتبۃ الفاروق۔ مصریال روڈ چوہڑ ہڑپال۔ راولپنڈی
دار الاشاعت...... اردو بازار...... کراچی
مکتبۃ القرآن...... بنوری ٹاؤن...... کراچی
مکتبہ دار الاخلاص...... قصہ خوانی بازار...... پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

اجمالی فہرست

۱- الشریعۃ:- ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ الخ

۲- نفی الحرج:- هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ، الخ

۳- حق الطاعت:- وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

۴- اتباع المنیب:- وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ الخ

۵- شرط الایمان:- فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ الخ

۶- شعب الایمان:- اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ الخ

۷- الغالب للطالب:- **عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ** (متفق علیہ)

۸- الاعتصام بحبل اللہ:- وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا الخ

۹- الیسر مع العسر:- فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا

۱۰- تکمیل الاسلام:- يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ الخ

۱۱- تجارت آخرت:- اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ، الخ

۱۲- تقویم الزیغ:- وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ الخ

۱۳- العید والوعید:- يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ الخ

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۶ ”نظام شریعت“

جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ.... بمطابق اکتوبر 2008ء

فہرست عنوانات

الشریعت

نعمت شریعت ۱۱
دائمی اور سچی دوستی ۱۳
حقیقت نور ۱۸
ثمرات طاعت ۱۸
روح اعمال ۲۰
اہمیت راحت ۲۱
مناسبت قلب ۲۳
صورت راحت ۲۵
علامت راحت ۲۶
قبض وبسط ۲۸
صراط مستقیم ۳۱
فقر وغنا ۳۳
نعمت شریعت ۳۴
رعایت مصالح ۳۶
محبت وشریعت ۴۰
راحت اور شریعت ۴۲
اتباع شریعت ۴۵
فیض صحبت ۴۶
ضرورت تقلید ۴۹

نفی الحرج

عقلاء کے اشکالات ۵۳
جہلا کے اشکالات ۵۵
باطنی دولت ۵۶
طریق علاج مصائب ۵۹
دینداروں کا اشکال ۶۰
جواب اشکال ۶۱
خاصیت اعمال ۶۲
دین اور دشواری ۶۴
اسرار شریعت ۶۵
برکت صحبت ۶۷
دشواری کی حقیقت ۷۰
آئینہ شریعت ۷۳
درستی اعمال کی ضرورت ۷۴
معاش اور شریعت ۷۵
صورت اصلاح ۷۹
ہمت اور محبت ۸۱
مصاحبت کی صورت ۸۳

حق الاطاعت

شریعت وطریقت	۸۸
ظاہر وباطن	۹۰
گناہوں کی جڑ	۹۲
قرآن کا اثر	۹۵
علم اور جہل	۹۷
مقام علماء	۹۹
تبلیغ دین	۱۰۱
حب مال	۱۰۴
حب رسول	۱۰۵
حکماء وفلاسفہ	۱۰۶
حقیقت طاعت	۱۱۰
اطاعت یہ ہے کہ جنت	۱۱۰
اسباب محبت	۱۱۱
طریق اصلاح	۱۱۲
تقاضائے عظمت	۱۱۶
طریق تعلیم	۱۱۹

اتباع المنیب

ناصحین کو نصیحت	۱۲۳
علماء کو نصیحت	۱۲۵
مقام اتہام سے بچنا	۱۲۷
دنیاداروں کو نصیحت	۱۳۰
سفارش اور اس کی حقیقت	۱۳۲
علماء اور دنیا	۱۳۴
حقوق والدین	۱۳۷
اتباع کے معنی	۱۳۸
علماء پر اتہام	۱۳۹
قانون کے صحیح مفسر	۱۴۱
اتباع علماء کی ضرورت	۱۴۴
جدید مرض	۱۴۶
اتباع میں غلو	۱۴۹
بزرگی کے معیار	۱۵۰
علماء کی کوتاہی	۱۵۲
حق تعالیٰ کا اتباع	۱۵۴
لباس کی اہمیت	۱۵۷
دین کا اختصار	۱۵۹
معیار اتباع	۱۶۱
کشف وکرامات کی حقیقت	۱۶۳
منیب کا طریقہ	۱۶۷
متبوع کی شناخت	۱۶۸
سلف اور خلف کا فرق	۱۶۹
تقلید شخصی کی ضرورت	۱۷۲

شرط الایمان

وجوہ اطاعت	۱۷۶
مظہر صفات حق تعالیٰ	۱۷۶
سلامت فطرت کا مقتضیٰ	۱۷۸
بیعت کے معنی	۱۷۹
وسعت رحمت	۱۷۹

حسن تربیت ۱۸۰
حقانیت اسلام ۱۸۲
ظاہری و باطنی دولت ۱۸۴
شرط ایمان ۱۸۶
آج کل کی حالت ۱۸۸
صورت و حقیقت کا فرق ۱۹۰
فقدان عظمت شریعت ۱۹۱
ایمان کے درجات ۱۹۲

شعب الایمان

مسئلہ مساوات نساء ۱۹۵
عورت کی حکومت کے نتائج ۱۹۸
عورتوں کا عذر لنگ ۱۹۹
مغفرت کی ضرورت و صورت ۲۰۱
مذہب اور تمدن ۲۰۲
شرائط مغفرت ۲۰۴
انضباط اوقات ۲۰۶
مسئلہ استیذان ۲۰۷
ایک اہم کوتاہی ۲۰۸
اشاعت اسلام کا سبب ۲۱۰
اسلام سے نفرت کا سبب ۲۱۲
اصلاح نفس کی تدابیر ۲۱۴
ذکر اللہ کی اہمیت ۲۱۹

الغالب للطالب

اہمیت حدیث ۲۲۲
وسعت رحمت ۲۲۳
مقام ادب ۲۲۴
معرفت حق ۲۲۸
ہجوم خطرات ۲۳۰
مقام دوست ۲۳۲
اہتمام صحبت ۲۳۴
درجات اتباع ۲۳۷
اتباع سنت ۲۳۹
عمل اور مقصودیت ۲۴۱
ضرورت طلب ۲۴۳
شان محقق ۲۴۶
تقاضائے اتباع سنت ۲۵۰

الاعتصام بحبل الله

تعدد۔ تبدد و تردد کی صورت ۲۵۷
بقائے دین کی صورت ۲۶۰
دین کی مقصودیت ۲۶۳
اتفاق کی صورت و حقیقت ۲۶۵
مقام ازالہ و امالہ ۲۶۸
شرک باللہ ۲۷۰
کفار کا توکل ۲۷۴
قیام علی الحق ۲۷۶
اصلاح کی صورت ۲۷۸
اسلام اور تلوار ۲۷۹
روحی طاقت ۲۸۲

چراغ خداوندی ۲۸۳
حقیقی مقام ۲۸۶
ضرورت توکل ۲۸۸
حبل اللہ ۲۹۰

الیسر مع العسر

بشریت وملکیت ۲۹۷
شفقت نوح ۳۰۰
لطافت مزاج عارفین ۳۰۳
شان کیفیات انبیاء ۳۰۵
اقتضاءات بشریہ کا کمال ۳۰۹
حقوق العباد کی اہمیت ۳۱۲
عالم ارواح کی نسبت ۳۱۵
شفقت رسولؐ ۳۱۷
مع العسر یسرا کی تفسیر ۳۱۹
قبض وبسط ۳۲۳
نافع توجہ ۳۲۵
معراج یونس ۳۲۸
حقیقت معراج ۳۳۱
احکام کی عظمت ۳۳۴
قرب الی اللہ وقرب الی النار ۳۳۷
فضیلت شب براءت ۳۳۹

تکمیل الاسلام

سامعین کی اغراض ۳۴۴
وعظ کی غرض ۳۴۴
ہمارا دعویٰ اسلام ۳۴۵
مقصود اسلام ۳۴۸
اسلام کی حقیقت ۳۵۱
عوام کی غلطی ۳۵۳
اعمال کی تخصیص ۳۵۵
خواص کی کوتاہیاں ۳۵۶
اسلام اور امن ۳۵۸
اسلام میں معاملات ومعاشرت ۳۶۸
ہمارے امراض اوران کا علاج ۳۶۰

تجارت آخرت

ترقی کی حقیقت ۳۶۵
حدیث وتاریخ میں تفاوت ۳۶۷
ہمدروان قوم کی حالت ۳۶۸
ایثار اور فرعون ۳۷۱
سامان تدبیر ۳۷۴
قابل اصلاح رسوم ۳۷۷
فریب آمیز صورتیں ۳۸۰
مساجد کی حالت ۳۸۱
سرمایہ کاری ۳۸۳
چندہ اور ہدیہ کی بے احتیاطیاں ۳۸۴
ہدیہ کے آداب ۳۸۶
آداب چندہ ۳۹۰
دعوت الی الدین ۳۹۳
واسطہ قرب ۳۹۵

تقویم الزیغ

ضرورت تدبیر ۴۰۰
وعظ سننے کا مقصد ۴۰۳
ایک مشترک مرض ۴۰۳
احکام خداوندی کی عظمت کا فقدان ۴۰۵
تلاش حجت کے اسباب ۴۰۷
صراط مستقیم ۴۰۸
آسمان اور سائنس ۴۰۹
وحی اور حدیث ۴۱۱
اہمیت حدیث ۴۱۲
موضوع قرآن ۴۱۳
اساس احکام شرعیہ ۴۱۶
ابتلاء الحادو بدعات ۴۱۹
مقام علماء ۴۲۰
اسباب تنزل ۴۲۲
رفع اختلاف کی صورت ۴۲۵
ایصال ثواب کی صورت ۴۲۸
اکرام مسلم ۴۲۹
نجات کی صورت ۴۳۱
کامل کی پہچان ۴۳۵

العید والوعید

احکام کی حکمتیں ۴۳۷
غلبہ حال کا اثر ۴۴۰
قرآن بین التمرین ۴۴۲
فرعون اور ایمان ۴۴۴
طبعی اور عقلی محبت کا فرق ۴۴۶
طبعی و عقلی خوف کا فرق ۴۴۸
غلبہ حال ۴۵۰
انسان اور عشق ۴۵۱
علاج النفس ۴۵۴
ایک جدید فرقہ ۴۵۷
حکمتوں کی تفصیل ۴۶۲
لطف وقہر ۴۶۴
مشروعیت احکام صیام ۴۶۹
دین کی حقیقت ۴۷۲
انعام الٰہی ۴۷۴
تفسیر رحمۃ للعالمین ۴۷۸
اہمیت ذکر رسول ۴۸۱
خدمت والدین کی اہمیت ۴۸۸
اہتمام مغفرت کی ضرورت ۴۹۰
چند اشکالات کے جواب ۴۹۲

الشریعت

وجوب اتباع شریعت کے متعلق یہ وعظ ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ بروز یک شنبہ مطبع نظامی کانپور ٹپکا پور میں کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا جو ۳ گھنٹے ۳۵ منٹ میں ختم ہوا۔ حاضری قریباً ۵۰۰ تھی احمد عبدالعلیم لکھنوی نے اسے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد ان لا اله الا الله و حده لاشريک له و نشهد ان محمدا عبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ اٰله و اصحابه و بارک وسلم. امابعد فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمٰن الرحيم. ثم جعلناک علىٰ شريعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اهوآء الذين لا يعلمون انهم لن يغنوا عنک من الله شيئاً و ان الظلمين بعضهم اوليآء بعض والله ولى المتقين هذا بصآئر للناس و هدى ورحمة لقوم يؤمنون. (الجاثیہ، ۱۸ تا ۲۰)

ترجمہ: پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کردیا سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طریقے پر چلے جاتے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر مت چلئے یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کا دوست ہے یہ قرآن عام لوگوں کیلئے دانشمندیوں کا سبب ہے اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کیلئے بڑی رحمت ہے۔

نعمت شریعت

یہ چند آیتیں ہیں سورہ جاثیہ کی۔ ان میں حق تعالیٰ نے ایک نعمت کا ذکر فرمایا ہے جو عطا کی گئی ہے۔ اولاً بالذات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً وبالتبع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو اور چونکہ اس نعمت کو نعمت نہیں سمجھا جاتا بلکہ بجائے نعمت کے مصیبت و کلفت سمجھا جاتا ہے اس لئے اس وقت اس کو اختیار کرنا ضروری ہوا۔ اب یہاں تک مذاق بگڑا ہوا ہے کہ اتنی بڑی نعمت کی قدر نہیں بلکہ اس کو مصیبت اور کلفت سمجھ کر اس سے بچنے کی فکر ہے۔ جیسے کوئی مریض دوا کو مصیبت سمجھے اور اس سے بڑھ کر ناشکر وہ ہے جو غذائے لطیف کو مصیبت سمجھے۔ اس کو بہت اچھی اور لطیف غذا دی جاتی ہے اور وہ اس سے منہ بند کرتا ہے تو ایسے شخص کے اعتقاد کو درست کرنا اور خیال کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔

وہ نعمت کیا ہے جسے کلفت سمجھا جاتا ہے وہ شریعت ہے جو اسی عنوان سے اس آیت میں مذکور ہے اور باعتبار اختلاف احوال مکلفین کے اس کے دو درجے ہیں۔ دوا اور غذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں بلکہ وہ ایک ہی چیز ہے جو بعض کے اعتبار سے دوا ہے اور دوسرے بعض کے اعتبار سے غذا۔ اور غذا تو نعمت ہوتی ہے مگر دوا بھی واقع میں نعمت ہے۔ کیونکہ مریض کے حق میں دوا ہی ذریعہ ہے غذا کا۔ کیونکہ دوا کا مقصود مریض کے لئے یہی ہے کہ نعمتوں کا نعمت ہونا اس کو محسوس ہو۔ موٹی بات ہے کہ ایک کو دودھ ہضم نہ ہوتا ہو یا گوشت ہضم نہ ہوتا ہو ان میں لذت قوت اور فرحت سب ہے مگر ایک شخص کو فساد معدہ کی وجہ سے ہضم نہیں ہوتا تو اس کی کیا تدبیر کی جائے گی۔ اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ خوب کھائے اور دست آئیں۔ یہ مذاق ہے وہ جو یہ تدبیر کرے۔

ہمارے وطن میں ایک بوڑھے تھے کھاتے جاتے اور قے کرتے جاتے اور منہ صاف کر کے پھر کھاتے۔ حالانکہ اس کی یہ تدبیر نہ تھی بلکہ ان کو دوا سے اصلاح کرنی چاہئے تھی۔ تو ایسے شخص کے حق میں دوا بھی نعمت ہے۔ اسی طرح شریعت بعض کے اعتبار سے دوا ہے مگر چونکہ ذریعہ غذا کا ہے اس لئے اس کے حق میں بھی نعمت ہے اور جن کے حق میں غذا ہے اس کا نعمت ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

اب سمجھنا چاہئے کہ شریعت دوا کس کے حق میں ہے اور غذا کس کے حق میں۔ سو دوا تو اس کے حق میں ہے جو ابھی کلفت مجاہدہ میں ہے اور غذا اس کے حق میں ہے جو مجاہدہ کے بعض لذت مشاہدہ میں ہے اور لوگ اس مجاہدہ سے ہی گھبراتے ہیں اور جو اس کا قصد بھی رکھتے ہیں وہ منتظر بڑھاپے کے ہیں حالانکہ اس وقت آدمی قریب قریب معطل ہو جاتا ہے۔ پھر اخلاق ذمیمہ جو شباب میں راسخ ہو چکے ہیں وہ جدا مزاحمت کرتے ہیں کیونکہ جو خصلتیں جوانی میں جم چکتی ہیں وہ بڑھاپے میں بھی نہیں جاتیں۔ مگر پھر بھی لوگ کہا کرتے ہیں کہ جوانی میں کھانے پینے کے دن ہیں۔ جب بڑھاپا آئے گا تو اللہ اللہ کریں گے۔

یہ غلطی ہے دو وجہ سے۔ اول تو جس چیز کی عادت جوانی میں نہ ہو وہ بڑھاپے میں یوں بھی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے بڑھاپے میں قوت و ہمت نہیں رہتی۔ کسل بڑھ جاتا ہے۔ مشکل سے ٹھیل ٹھیل کے اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے نماز فرض کے لئے مشکل سے اٹھ جاتا ہے۔ ایک

بزرگ کہتے تھے کہ یہ قول کہ

دریغا کہ عمر جوانی گئی   جوانی گئی زندگانی گئی

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگانی کیوں کرگئی۔ کیونکہ بڑھاپا آنے سے اور آرام سے بیٹھے رہتے ہیں۔ لڑکے بالے یا نوکر چاکر پنکھا جھل رہے ہیں پاؤں دبا رہے ہیں مگر جب بڑھاپا آیا تو واقعی سمجھ میں آگیا کہ جوانی گئی زندگانی گئی کیونکہ نہ کھانے کی حلاوت نہ پینے کا مزہ نہ سونے کا چین نہ جاگنے کا لطف اگر دماغ میں یبوست غالب ہے تو سب لوگ سو رہے ہیں۔ یہ رات بھر اختر شماری میں مشغول ہیں نیند نہیں آتی۔ اور اگر رطوبت غالب ہے تو ہر وقت آنکھیں بند ہیں اونگھ رہے ہیں۔ اٹھنا چاہتے ہیں مگر اٹھا نہیں جاتا پھر اس کے علاوہ کہیں ناک میں درد ہے کہیں کان میں درد ہے کبھی ٹانگ میں درد ہے کبھی برسات کی ہوا لگ کر کمر میں درد ہے۔

جیسے مولانا رومی نے ایک بوڑھے کی حکایت لکھی ہے کہ وہ ایک طبیب کے پاس گیا اور اس نے کہا کہ میرے سر میں درد ہے۔ طبیب نے کہا کہ بڑھاپے سے اس نے کہا کہ زکام بھی ہے۔ اس نے کہا بڑھاپے سے اس نے کہا بلغم بھی سینہ پر جما ہوا ہے۔ اس نے کہا یہ بھی بڑھاپے سے ہے۔ اس نے کہا کھانا بھی اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ اس نے کہا یہ بھی بڑھاپے سے۔ غرض اس بوڑھے نے جو کہا اس کے جواب میں طبیب نے یہی کہا کہ یہ بھی بڑھاپے سے یہ سن کر وہ بوڑھا بہت غصے ہوا اور ایک دھول ماری طبیب کے۔ تیری طب میں یہی رہ گیا ہے کہ بڑھاپے سے۔ اس نے کہا میاں صاحب میں تمہاری دھول مارنے کا برا نہیں مانتا۔ تم معذور ہو یہ بھی بڑھاپے سے ہے۔

واقعی طبیب کامل تھا کہ سمجھ گیا کہ یہ ناحق کا غصہ بھی بڑھاپے سے ہے بہر حال یہ تو زندگانی کا لطف گیا اور وہ جو جوانی میں لوگوں کے دلوں میں وقعت باستثناء اہل اللہ کے وہ بھی چلی گئی کیونکہ ان کے دوستی سچ مچ کی دوستی ہے کیونکہ وہ محض دین کی وجہ سے ہوتی ہے دوسروں کی دوستی محض اغراض کی وجہ سے ہے جب بڑھاپا آیا تو بڑے میاں اپنی ہی اغراض پوری نہیں کر سکتے تو اور کی کیا پوری کریں گے۔ تو جب واسطہ نہیں رہ تو دوستی بھی ختم ہوگئی۔

دائمی اور سچی دوستی

اہل اللہ کو جو مستثنیٰ کیا ہے مراد اس سے وہ ہیں جو واقع میں اہل اللہ ہیں اور جو واقع

میں اہل اللہ نہیں اور اپنے کو صورت میں اہل اللہ کی پیش کرتے ہیں۔ ان کی دوستی تو دنیا داروں سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ یہ دعویٰ کرتے ہیں تقدس کا۔ پھر ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں۔ تو بعض خود اپنے کو غلطی سے اہل اللہ سمجھ رہے ہیں مگر واقع میں وہ اہل اللہ نہیں ہیں اور ان کی غلطی کی بناء یہ ہے کہ چار جاہل عوام معتقد ہو گئے اور انہوں نے حضور حضور، مولانا مولانا شاہ صاحب شاہ صاحب کہنا شروع کر دیا تو یہ سمجھے کہ میں بھی کچھ ہوں گا جب ہی تو یہ معتقد ہوئے ہیں۔ کیونکہ جو معتقد ہوئے ہیں وہ پاگل تو ہیں نہیں کچھ سمجھ ہی کے معتقد ہوئے ہیں۔ سبحان اللہ! اچھا استدلال ہے۔ اگر مخلوق کی عقیدت پر دارومدار ہے بزرگی کا تو کیوں صاحب سب ہی تو معتقد نہیں غیر معتقدین بھی تو ہیں ان کی بداعتقادی سے کیوں نہ استدلال کیا جائے۔ سچ یہ ہے کہ نہ خوش اعتقادی کوئی چیز ہے نہ بداعتقادی۔ ضابطہ یہ ہے کہ دیکھ لے کہ خدا کے ساتھ اپنا معاملہ کیسا ہے۔ اگر خدا کے ساتھ معاملہ اچھا نہیں ہے تو ساری دنیا کا غوث وقطب کہنا کوئی چیز نہیں غرض عوام کا اعتقاد کچھ نہیں۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

اپنا گوہر کسی صاحب نظر کو دکھلانا چاہئے۔ صرف چند گدھوں کی تصدیق سے عیسیٰ نہیں ہو سکتے۔

چند جاہلوں کے معتقد ہونے سے عیسیٰ نہیں ہو سکتے۔ اگر کچھ ہے تو کسی صاحب نظر کو دکھلاؤ۔ اگر وہ تصدیق کر دے تو ٹھیک ہے ورنہ محض جہلا کے اعتقاد سے کچھ نہیں ہوتا۔ جہلا کا اعتقاد کاہے پر ہے تو ان کا اعتقاد تو اس پر ہے کہ جو ہماری مرضی کے موافق ہو وہ ٹھیک ہے اور جو مرضی کے خلاف ہو تو فیہ کلام۔ جب ان کا یہ مدار اعتقاد ہے تو اس فکر میں پڑنا ہی لاحاصل ہے۔ مخلوق تو ہزاروں ہے اور ہر ایک کی خواہش دوسرے کے معارض تو پھر کس کس کو راضی کرے۔

ہمارے حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک شخص تھا اس کے پاس ایک ٹٹو تھا اور بیوی بچے اور کنبہ رکھتا تھا اس کو سفر پیش آیا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ یک جانور ہے اور کئی سوار ہیں باری باری سب مل کر اترتے چڑھتے جائیں گے۔ چنانچہ پہلے وہ خود سوار ہوا اور اپنے سینے لڑکے کو اور بیوی کو پیدل لے کر چلا۔ چلتے چلتے ایک گاؤں میں گزر ہوا۔ گاؤں والوں نے اسے سوار دیکھ کر کہا کہ تجھے سوار ہوتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ بچہ پیدل اور عورت جو قابل رحم ہے وہ بھی پیدل اور ہٹا کٹا ہو کے سوار ہے۔ اس نے کہا بات تو

ٹھیک ہے۔ بس خود اتر پڑا اور بیوی کو سوار کر دیا۔ دوسرے گاؤں میں پہنچا گاؤں والوں نے دیکھ کے کہنا شروع کیا کہ جورو کا غلام ہے کہ سائیس کی طرح گھوڑے کی رسی پکڑے چلا جا رہا ہے۔ ارے کم بخت تجھ پر کیا مار آئی۔ تو نے اپنا وقار کیوں کھویا۔ اس نے کہا یہ بھی سچ ہے آؤ اب کے سب مل کے سوار ہوں۔ چنانچہ وہ اس حالت میں ایک تیسرے گاؤں میں پہنچا۔ وہاں لوگوں نے کہا کہ ارے کیسا ظالم ہے کہ جانور پر سب کو ایک دم سوار کر دیا ہے۔ ارے ایک دفعہ گولی مار دے۔ ترسا ترسا کے مارنے سے کیا فائدہ۔ اس نے کہا یہ بھی معقول۔ فرداً فرداً بھی بیٹھ چکے۔ عورت کو بھی تنہا سوار کر چکے سب مل کے بھی بیٹھ چکے اب صرف یہی احتمال باقی ہے کہ کوئی بھی سوار نہ ہو۔ چنانچہ سب مل کے پیدل چلے۔ اب چوتھے گاؤں پر گزر ہوا۔ وہاں لوگوں نے اس حالت میں دیکھ کر کہا دیکھی ناشکری خدا نے سواری بھی دی تو اس کی قدر نہیں۔ ارے اگر ایک سواری تھی تو سب مل کے باری باری چڑھتے اترتے چلے جاتے۔ اس نے کہا کہ اب کسی طرح الزام سے بچ نہیں سکتے۔ اب وہی کرو جو اپنے جی میں آئے اور کسی کے کہنے کی پروا مت کرو۔ بس پھر وہ سب اترتے چڑھتے چلے گئے۔

تو خدا نے اسے اس تجربہ سے عقل دے دی کہ وہی کرو جس میں راحت ہو اور کسی کے طعن و تشنیع کی پرواہ مت کرو۔ جیسے بزرگوں پر کفر تک کے فتوے لگتے ہیں اور وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور کسی کے کہنے کی پرواہ نہیں کرتے امیر خسرو فرماتے ہیں۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند   آرے آرے می کند باخلق عالم کار نیست

مخلوق کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے... ہاں میں کرتا ہوں مجھے دنیا کی مخلوق سے کوئی تعلق نہیں۔

ہاں بھائی بت پرستی کرتا ہوں تمہارا اجارہ ہے؟ میں کہتا ہوں ہم تو کیا ہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہو سکتا ہے۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

سارے کمال آپ میں موجود اور کوئی صفت ایسی نہیں جو علی وجہ الکمال آپ میں موجود نہ ہو اور اس کو مخالفین نے بھی تسلیم کیا تھا۔ چنانچہ بہت جگہ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے۔

یعرفونه کما یعرفون ابنآء هم ام لم یعرفوا رسولهم فهم له منکرون

آپ کو اس طرح پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو۔ دوسری آیت میں بطور استفہام انکاری کے فرمایا ہے کہ کیا اپنے رسول کو نہیں پہچانا۔ جو اس کا انکار کرتے ہیں مطلب یہ کہ

باوجود پہچان لینے کے انکار کرتے ہیں غرض سب اچھی طرح جانتے تھے۔

اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے چنانچہ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا ایک جگہ اونٹ ذبح ہوا تھا اس کی اوجھڑی پڑی تھی تو آپس میں مشورہ کیا کہ کون شخص یہ اوجھڑی سجدے کی حالت میں آپ پر لا کر رکھ دے۔ روایت میں ہے فقام اشقی القوم یعنی جو سب سے زیادہ شقی اور بدبخت تھا وہ تیار ہو گیا۔ کفر میں بھی درجے ہوتے ہیں کوئی مڈل کوئی انٹرنس اور کوئی ایف اے اور کوئی بی اے تو ان میں جو سب سے بڑا کافر تھا یعنی بی اے تھا اس نے کہا میں جاؤں گا۔ چنانچہ وہ گیا اور اوجھڑی اٹھا لایا اور اسے کمر مبارک پر رکھ دیا۔ آپ سجدے ہی میں پڑے رہے کہ اتنے میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور اس اوجھڑی کو ہٹایا اور کفار کو خوب خوب کہا اور کوری کوری سنائیں اور آپ نے بھی نماز کے بعد دعا شروع کی یا تو وہ اس حرکت پر آپس میں ہنستے تھے اور مضحکہ کرتے اور مذاق اڑاتے تھے جیسے اوباشوں کی عادت ہوتی ہے۔ جب بددعا کے کلمات سنے تو سب کا رنگ فق ہو گیا۔ ساری ہنسی بھول گئے کیونکہ یہ یقین تھا کہ جیسے فرما رہے ہیں ویسا ہی ہوگا۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اصل میں اللہ کا فرمان ہے اگرچہ بندہ کے منہ سے نکل رہا ہے)

تو غرض اتنے معتقد مگر زبان سے آپ کو مجنوں کاہن شاعر ساحر وغیرہ اتنے ناشائستہ الفاظ سے یاد کرتے تھے تو دل میں وہ آپ کو سچا سمجھتے تھے مگر زبان سے تو یہ کہتے تھے۔ جب حضور کے ساتھ یہ معاملہ ہوا تو اور کوئی کیوں یہ توقع کرے کہ وہ طعن و تشنیع سے بچ جائے گا۔

غرض بعض مصنوعی اہل اللہ تو دھوکہ میں ہیں کہ انہیں شبہ ہے کہ ہم بھی بزرگ ہیں اور ہوتے ہیں وہ اہل دنیا اور بعض خود دھوکہ میں نہیں مگر دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ تو ان سب کی دوستی بھی محض دنیا ہی کے واسطے ہوتی ہے غرض بہت کم لوگ ہیں جو خدا کے واسطے محبت کرتے ہیں اور یہ محبت کبھی زائل نہیں ہوتی۔ اعتقاد تو چاہے جاتا رہے مگر محبت رہتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بدمعاش لڑکا ہے اور باپ ایک عرصہ تک نیک چلن سمجھتا رہا اور اس کی نیک چلنی پر اس کا اعتقاد تھا۔ مگر اب کسی وجہ سے اسے اس کی بدمعاشی کا علم ہوا۔ تو دیکھئے اعتقاد تو جاتا رہا مگر محبت باقی ہے بلکہ اس وقت تو کچھ فکر نہ تھی اب اور فکر بڑھ گئی کہ ہائے یہ بگڑ گیا۔ چاہتے ہیں کہ یہ دوست ہو جائے اس کے لئے کہیں بزرگوں سے

دعا کرا رہے ہیں کہیں تعویذ لکھوا رہے ہیں کہیں عزیزوں اور دوستوں سے مشورہ کر رہے ہیں کہ اس کی درستی کے لئے کیا تدبیر کی جائے یہی حالت ہے حب فی اللہ کی کہ محبوب بگڑ بھی جائے تب بھی محبت باقی رہتی ہے بلکہ اس حالت میں اور بڑھ جاتی ہے ورنہ کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس کے لئے دعا کرے یا اہتمام کرے۔

بس اس معیار پر دیکھ لیجئے کہ محبت خدا کے لئے ہے یا اپنی اغراض کے لئے ہوتی ہے۔ تو ایسے لوگ جوانی تک دوست رہتے ہیں اور جب بڑھاپا آیا تو اب جانتے ہیں کہ بڑے میاں سے اب کام نہیں نکل سکتا تو سب نے چھوڑ دیا بلکہ یہ خود غرضی یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے مال میں تصرف کرتا ہے تو ورثاء کو یہ بھی ناگوار ہوتا ہے اولاد اور بیوی بھی ناک بھوں چڑھاتی ہے کہ جتنا کم خرچ ہو اتنا ہی اچھا کہ ہمارے لئے بچ جائے گا۔ بلکہ بعض جگہ جہاں معذور ہو جاتے ہیں مثلاً اندھے ہو گئے تو اس وقت نوکر چاکر بھی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ پکارتے ہیں اور وہ سنتے ہیں مگر جواب نہیں دیتے کہ یہ ہمارا کیا کر لیں گے اور ہنستے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اب احتمال نہیں ہے جوانی آنے کا جو بدلہ لیں۔ اب وارثوں کی خوشامد کرتے ہیں کہ ان سے سابقہ پڑنے والا ہے تو غرض بعض اپنے مال سے بھی بڑھاپے میں منتفع نہیں ہو سکتے۔ تو کیا آپ اس بڑھاپے کے منتظر ہیں۔ میاں بڑھاپا آئے گا تم اس وقت کام ہی کے نہیں رہو گے۔

جوانی میں طاعات کرنے میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ جب جوانی میں طاعات کا خوگر ہو جائے گا تو بڑھاپے میں عادت کی وجہ سے آسانی ہو جائے گی۔ اسے ہر شخص عقل سے سمجھ سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب بڑھاپا اتنا آ جائے کہ کچھ نہ کر سکے تو اس کے لئے حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص صحت کی حالت میں نیک عمل کرتا ہو اور مرض میں نہ کر سکے یا حالت اقامت میں کرتا ہو سفر کی وجہ سے نہ کر سکے تو فرشتوں کو حکم کیا جاتا ہے کہ اس حالت میں بھی عمل پورا لکھنا۔ یہاں تو پنشن آدھی دی جاتی ہے اور وہاں پوری پنشن دی جاتی ہے بلکہ ایک ضمیمہ بھی اس پنشن کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ کیا ہے عمل نہ کرنے کی حسرت کا اجر۔ کہ پڑے سو رہے ہیں سبحان اللہ سبحان اللہ ثواب بھی لکھا جا رہا ہے۔ یہ جوانی کے عمل کی برکت ہے ورنہ یہ ثواب کیسے ملتا۔ یہ دلیل نقلی سے معلوم ہوا۔ غرض دلیل سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ جوانی کے عمل سے بڑھاپے کا تدارک ہو سکتا۔

حقیقت نور

تیسری بات ذوق عارفین کے سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اعمال میں ایک برکت خاصہ ہے جس سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے اور وہ نور وہی ہے جس کے لئے تہجد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی۔ **اللّٰھم اجعل فی قلبی نوراً** (سنن النسائی ۲:۲۱۸، سنن ابی داوٗد ۱۳۴۹) اے اللہ میرے قلب میں نور پیدا کردے۔ **وفی لحمی نورا** اور میرے کانوں میں نور پیدا کردے **وفی بصری نورا** اور میری آنکھوں میں نور پیدا کردے **وفی لحمی نورا** اور میرے گودے میں نور پیدا کردے۔ **وفی عظمی نورا** اور میری ہڈیوں میں نور پیدا کردے **وفی شعری نورا** اور میرے بالوں میں نور پیدا کردے **وفی عصبی نورا** اور میری رگوں میں اور پٹھوں میں نور پیدا کردے **وفی لحمی نورا** اور میرے گوشت میں نور پیدا کردے **وفی دمی نورا** اور میرے خون میں نور پیدا کردے اور یہاں تک کہا کہ **اعظم لی نورلہ** بڑھا اس نور کو میرے لئے **واجعلنی نورا** مجھے سراپا نور کردے **واجعل من فوقی نورا** اور میرے اوپر نور کردے **واجعل من تحتی نورا** اور میرے نیچے نور کردے **وعن یمینی نورا** میرے داہنے نور کردے **وعن شمالی نورا** اور میرے بائیں نور کردے اسی کا ترجمہ مولانا رومی نے کیا ہے۔

نور او در یمن و یسر و تحت و فوق   بر سر و بر گردنم مانند طوق

(اس کا نور دائیں بائیں اوپر نیچے چہرے پر اور گردن میں مثل طوق کے)

وہ نور لالٹین کی روشنی نہیں بلکہ ایک کیفیت خاصہ ہے کیونکہ حقیقت نور کی یہ ہے کہ ظاہر **لنفسه ومظهر لغیرہ** (یعنی خود بھی ظاہر اور دوسرے کو بھی ظاہر کردے) **اللہ نور السموات والارض** (اللہ تعالیٰ نور دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا' میں بھی نور کے یہی معنی ہیں نور کے معنی چمک دمک کے نہیں ہیں۔ تو یہ ہوئی نور کی حقیقت کہ خود بین ہوتا ہے اور دوسرے حقائق کو بین کردیتا ہے اور قلب کے اندر اس نور کے پیدا ہونے سے ظلمت دور ہو جاتی ہے کون سی ظلمت ظلمت کسل کی' ظلمت کینہ کی' ظلمت حسد کی' ظلمت کبر کی' ظلمت غصہ کی' ظلمت معصیت کی وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے اندر نشاط تازگی شگفتگی اور فرحت پیدا ہو جاتی ہے تو ایسا شخص بڑھاپے میں بھی نکما نہیں ہوتا۔

ثمرات طاعت

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص لازماً تلاوت قرآن کرتا ہے۔

بڑھاپے میں اس کے حواس خراب نہیں ہوتے۔ بڑھاپے میں عموماً حواس خراب ہو جاتے ہیں اس سے بچنے کی تدبیر تلاوت قرآن ہے۔ اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ باوجود بڑھاپا آ جانے کے بھی ان کے حواس قائم رہتے ہیں۔ جیسے مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کہ سو برس سے سن متجاوز تھا مگر حواس ویسے ہی تھے۔ یہ سب تلاوت قرآن کی برکت تھی۔ اسے عقلاً نہیں جانتے اہل اللہ جانتے ہیں کہ راز اس میں کیا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

خود قوی تر مے شود خمر کہن　　　خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

پرانی شراب تیز ہو جاتی ہے خاص کردہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو یعنی پرانی شراب تیز ہو جاتی ہے۔ تو یہ بوڑھے میاں پہلے سے بھی تیز ہو جاتے ہیں۔ اس میں یہ راز ہے کہ وہ اس وقت اہل مشاہدہ ہیں اور مشاہدہ کے معنی توجہ تام کے ہیں۔ یہ توجہ ہی وہ حظ ہے کہ بڑھاپے کا بھی ضعف نہیں معلوم ہوتا۔

جیسے ایک بوڑھا آدمی قریب مرگ ہو۔ اس نے اپنے بیٹے کو جو کہیں سفر میں ہے خط لکھا کہ تم فوراً چلے آؤ بیٹا آ گیا۔ تو بڑے میاں کا یہ حال تھا کہ کروٹ بھی کوئی اور بدلوائے بیٹے کی صورت دیکھتے ہیں فرط خوشی سے چارپائی سے خود بخود اٹھ بیٹھے۔ تو جب بیٹے کے مشاہدہ میں یہ اثر اور قوت ہے تو محبوب حقیقی کے مشاہدہ میں یہ اثر کیسے نہ ہوگا بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگا۔ اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم　　　ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جواں ہو جاتا ہوں۔

بس یہ حالت ہوتی ہے کہ کسل اور سستی نہیں رہتی۔ یہ اثر نو شباب میں طاعت کرنے کا عاجل ہے اور آجل میں یہ اثر ہے کہ حدیث میں ہے شباب نشاء فی طاعۃ اللہ یعنی جس کی جوانی کی نشوونما خدا کی طاعت میں ہوئی وہ قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوا۔ اس روز دھوپ اس شدت کی ہوگی کہ بھیجے پکنے لگیں گے۔ زمین تانبے کی ہو جائے گی۔ یعنی جس طرح تانبا فوراً گرمی کو قبول کر لیتا ہے اور مٹی دیر میں اور کم گرمی کو قبول کرتی ہے۔ تو زمین باوجود مٹی کے تانبے جیسی ہو جائے گی کہ تپنے لگے گی اور آفتاب سوا نیزہ پر آ جائے گا۔ یعنی بانس برابر اونچا

ہوگا۔ زمین کی قابلیت وانفعالیت بڑھ جائے گی۔ اور آفتاب کی فاعلیت بڑھ جائے گی تو اس وقت کیا حال ہوگا گرمی کا۔ دیکھو اس وقت کتنی دور ہے۔ حکماء تو کہتے ہیں کہ چوتھے آسمان پر ہے اور اس پر کچھ دلائل بھی پیش کرتے ہیں مگر ان کے مقدمات مخدوش ہیں۔ جن سے یہ حکم کرنا بناء الفاسد علی الفاسد ہے اور شریعت نے کوئی اس کا فیصلہ نہیں کیا مگر بظاہر نصوص سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر ہو تب بھی بہت دور ہوا کہ پانچ سو برس کی راہ ہے تو اتنے بعد پر بھی دیکھ لیجئے تھوڑی سی دھوپ میں کیا حال ہوتا ہے۔ تو اس روز جب کہ قرب کے سبب آفتاب کی فاعلیت اور زمین کی قابلیت بڑھ جائے گی گرمی کی شدت کا کیا حال پھر کوئی بچاؤ بھی نہ ہوگا۔

لا تریٰ فیھا عوجاً ولآ امتاً

کہ وہاں نہ ناہمواری ہوگی نہ ٹیلہ ہوگا۔ نہ کوئی چھت یا دیوار ہوگی کہ اسی کے سائے میں بیٹھ جائیں۔ ایسے وقت میں سایہ کی کتنی قدر ہوگی۔ تو ایسی بڑی نعمت کی (جس کی بدولت عرش کا سایہ تمہارے قبضہ میں ہے) قدر نہیں جانتے افسوس کہ تم اپنی قدر نہیں جانتے کہ تم کیا ہو۔ نفس وشیطان کے پنجہ میں پھنس کر اپنی قدر کھودی۔ تم وہ ہو کہ عرش بھی تمہارے قبضہ میں ہے بایں معنی کہ ایسی تدبیریں تمہارے ہاتھ میں ہیں کہ ان سے عرش کا سایہ تم کو مل سکتا ہے حدیث شریف میں چند اعمال کا ذکر ہے ان میں یہ بھی ہے کہ وہ جوان جس نے طاعۃ اللہ میں نشو ونما پائی قیامت کے روز اسے عرش کا سایہ ملے گا۔ تو اس جوانی کی فضیلت ہے کہ اس واسطے سے عرش کا سایہ نصیب ہوا۔ غرض ایسی نعمت ہے جوانی جسے تم اس میدان امید میں برباد کر رہے ہو کہ جب بڑھاپا آئے گا عمل کرلیں گے۔ خوب سمجھ لو کہ جب تم سے جوانی میں نہ ہوا تو بڑھاپا میں کیا ہوگا۔

روح اعمال

اگر فرض کیجئے ہمت کر کے کیا ہی تو یہاں دو چیزیں ہیں ایک عمل اور ایک اس کی روح۔ روح کیا ہے؟ وہ طمانیت ہے جس سے قلب کو حلاوت اور راحت ہوتی ہے یہ وہ چیز ہے کہ اعمال کی بھی روح ہے اور اموال کی بھی روح ہے اس وجہ سے کہ دکان کھولنے کارخانہ کھولنے اور جائیداد حاصل کرنے سے کیا مطلب ہے۔ یہی تا کہ راحت سے زندگی بسر ہو۔

تو اصل سب کی چین ہوا۔ لیکن افسوس ہے کہ جس طریق سے تم اعمال کرتے اور اموال حاصل کرتے ہو اس سے چین حاصل نہیں ہو سکتا۔

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست۔

جس راستہ پر جا رہے ہو مجھے امید نہیں اس سے کعبہ پہنچو کیونکہ راستہ کعبہ کا نہیں ترکستان کا ہے۔

اسی طرح وہ لوگ اموال و متاع کے ذریعہ سے چین حاصل ہونے کے خیال سے اس کے بڑھانے کی فکر میں منہمک رہتے ہیں حالانکہ مال کی خاصیت ہے کہ جوں جوں بڑھتا ہے پریشانی بڑھتی ہے۔ ہر وقت ادھیڑ بن رہتی ہے کہ اور بڑھے یا گھٹنے نہ پائے اہل عرفان کا قول ہے۔

ومن یحمد الدنیا لعیش یسرہ فسوف لعمری عن قلیل یلومها

جو شخص کسی مسرت بخش عیش دنیا کی مدح کر رہا ہے وہ عنقریب اس کی مذمت کرے گا۔ ابھی حس جاتی رہی ہے جب حس ہوگی تو معلوم ہوگا دو حالتیں ہیں دنیا کی ایک بڑھنا دوسرا گھٹنا دونوں حالتوں کے متعلق خوب کہا ہے۔

اذا ادبرت کانت علی المرء حسرة وان اقبلت صارت کثیرا همومها

دنیا جاتی ہے تو حسرت کو اپنی جگہ چھوڑ جاتی ہے اور آتی ہے تو پریشانی کو ساتھ لاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کو چھوڑ دو۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں روح پیدا کر لو یعنی وہ تدبیر کرو جس سے روح پیدا ہو وہ تدبیر روح پیدا ہونے کی میں بتا دوں گا۔

اہمیت راحت

یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ روح اعمال و احوال کی یہ ہے کہ قلب کو چین ہو جائے۔ اب یہ ثابت کرنا رہ گیا یہ کہاں سے ہوا کرتا ہے اسے دلیل سے قبل تجربہ سے بتلاتا ہوں کہ بڑھاپے میں جس چیز سے چین ہوتا ہے وہ جوانی کا عمل ہے شیخ عبدالحق محدث نے لکھا ہے کہ اگر تم کو یہ منظور ہو کہ بڑھاپے میں آسودہ رہو تو جوانی میں گناہوں کو چھوڑ دو خصوص دو چیزوں کو ایک حسن پرستی اور دوسری خوش آوازی میں مشغول ہونا۔ ان دونوں سے بالخصوص بچو ورنہ بڑھاپا آئے گا اور قلب میں بے چینی پیدا ہوگی اور یہ بات کیوں پیدا ہوگی اسے ہم

نہیں جانتے وہ تجربہ کا دعویٰ کرتے ہیں جسے شیخ سے عقیدت ہو وہ ان کی پکائی ہوئی کھائے ورنہ خود پکائے۔ اب تجربہ کے بعد دلیل سے کہتا ہوں کہ چین کی تدبیر کیا ہے۔

مسئلہ عقلیہ ہے کہ چین قلب کے متعلق ہوتا ہے۔ جوارح کا چین بھی دراصل قلب کا چین ہے کیونکہ ہاتھ پاؤں اور ڈیل میں درد ہو تو قلب بے چین ہوتا ہے نہ کھانے میں مزہ آتا ہے نہ دریا کی سیر میں لطف آتا ہے غرض کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔ تو چین کیا ہوا قلب کا سکون یعنی دل کا قرار پا جانا اور چین کا مقابل ہے بے چینی۔ جب چین سکون ہوا تو بے سکونی ہوئی اور بے سکونی حرکت ہوئی کیونکہ حرکت سکون کے مقابلہ میں ہے تو سکون اور چین انقطاع حرکت کا نام ہوا۔ اور انقطاع حرکت کب ہوتا ہے جب کوئی چیز اپنے مرکز پر پہنچ جائے کیونکہ حرکت مرکز پر پہنچنے کے لئے ہوتی ہے۔

مثلاً ڈھیلے کا مرکز زمین ہے۔ اگر اس کو اچھال دو تو وہ پھر بلندی سے پستی کی طرف رجوع کرے گا۔ کیونکہ پستی اور زمین اس کا مرکز ہے اور اس وقت تک حرکت کرتا رہے گا جب تک زمین تک جو اس کا مرکز ہے نہ پہنچ جاوے اور بیچ میں کوئی مکان' دیوار یا چھت اسے روکنے والی ہے تو رک جائے گا مگر تقاضا یہی رہے گا کہ کسی طرح نیچے اترے چنانچہ جب یہ حجاب زائل ہو جائے گا تو فوراً اتر آئے گا جو ڈھیلے زمین پر نہیں ہیں وہ بے چین ہوتے ہیں۔ دیکھو پتھر کو زمین سے اٹھاؤ تو وزنی معلوم ہوتا ہے یہ وزن کیا ہے۔ اصل میں تقاضا ہے کہ مرکز سے نہ اٹھاؤ کیونکہ جب ہاتھ سے چھوٹتا ہے وہیں پہنچ جاتا ہے اور مرکز کیا ہے جہاں قرار ہو۔ اب قلب کا مرکز دیکھئے کیا ہے مرکز کے دو مرتبے ہیں ایک حسی دوسرا معنوی۔ حسی تو مشاہدہ سے متعین ہو جاتا ہے اور معنوی خاصیت سے معلوم ہوگا۔ مرکز کی خاصیت ہے محبوبیت یعنی مرکز مطلوب کو کہتے ہیں۔ چنانچہ مطلوب ڈھیلے اور پتھر کا زمین ہے۔ اسی طرح جو قلب کا محبوب ہوگا وہ قلب کا مرکز ہے اور محبوب کون ہوتا ہے جس سے مناسبت ہو تو قلب کو جس سے مناسبت ہوگی وہی محبوب ہوگا اور وہی اس کا مرکز ہوگا۔

میں نے ایک باپ سے سنا ہے کہ مجھ کو جو فلاں بڑے بیٹے سے محبت زیادہ ہے وجہ یہ ہے کہ وہ میرے جیسا ہے یعنی مجھے اس سے مناسبت ہے۔

مناسبت قلب

اب یہ دیکھنا ہے کہ قلب کو کس چیز سے مناسبت تامہ ہے۔ سو برہان اور وجدان سے ثابت ہو چکا ہے کہ قلب کو پوری مناسبت صرف حضرت حق سبحانہ سے ہے اور اسی مناسبت کی نسبت شہادت دی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ **ان اللّٰہ خلق آدم علی صورتہ** (الصحیح المسلم کتاب البر والصلہ: ۱۱۵؛) یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا یہاں صورت کے معنی شکل نہیں بلکہ وہی مناسبت ہے جسے صوفیہ نے ایک خاص عنوان سے کہا ہے (جسے علماء خشک نہیں قبول کرتے) کہ انسان مظہر ہے حق تعالیٰ کا اس لفظ مظہریت سے چونکتے ہیں اور حقیقت میں یہ عنوان تفسیر ہے۔ اسی حدیث کی اور بدوں اس تفسیر کے سخت اشکال پڑتا ہے جس سے بچنے کے لئے بعضوں نے ضمیر کا مرجع بنایا ہے آدم کو آدم کی یعنی آدمی کی صورت پر پیدا کیا یعنی جیسی صورت آدم کے لئے مناسب تھی اس صورت پر پیدا کیا مگر بعض روایات میں بجائے صورۃ کے صورۃ الرحمن آیا ہے اسے کیا کریں گے اس کے جواب میں انہوں نے اسے روایات بالمعنی باجتہاد الراوی بنایا ہے۔ میں کہتا ہوں کیوں تکلف کرتے ہو جو تفسیر صوفیہ کرام نے بیان کی وہ نہایت بے تکلف اور آسان ہے۔

یہ دیکھئے کہ صورت کسے کہتے ہیں۔ اگر کہو چہرہ کی شکل کو کہتے ہیں اچھا مانا مگر یہ دیکھنا ہے کہ اس کو کیوں کہتے ہیں۔ صورت کی حقیقت کیا ہے۔ سو حقیقت صورت کی ظہور ہے۔ چنانچہ یہ وہ محاورہ ہے صورۃ المسئلہ کذا اور یوں بھی کہتے ہیں اس کام کے بننے کی کیا صورت ہے۔ تو یہاں صورت کے معنی ظہور کے ہیں اور چہرہ کو بھی صورت ظہور کے معنی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس سے ظہور ہوتا ہے حقیقت انسانیہ کا اور یہ حقیقت وہ ہے جس کو انا سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ روح ہے جسے حکماء نفس ناطقہ کہتے ہیں اور وہ ایک مخفی چیز ہے چونکہ روح ایک خفی چیز تھی جسے کالبد نے ظاہر کر دیا ہے اس لئے کالبد کو صورت کہہ دیا۔ تو اصل معنی صورت کے ظہور کے ہوئے اب سمجھئے کہ خلق آدم علی صورتہ کے معنی علی ظہورہ ہوئے یعنی خدا نے اپنے ظہور پر آدم کو پیدا کیا یعنی آدم کو پیدا کر کے اپنی صفات کو ظاہر کر دیا کہ خدا سمیع بھی ہے بصیر بھی ہے متکلم بھی ہے۔ ان صفات کا کچھ حصہ انسان کو دے کر اپنے صفات کمالیہ کو

ظاہر کر دیا اور مخلوق سے بھی صفات کا ظہور ہوتا ہے مگر انسان سے بوجہ اجمع الکمالات ہونے کے زیادہ ظہور ہوتا ہے۔ اسی واسطے اس کو مظہر اتم کہتے ہیں صوفیہ نے کیا کہا وہی انہوں نے بھی کہا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں صرف اصطلاح بدل دی۔ یہ ان کا لطیفہ ہے کہ اپنے اسرار کو عوام سے بچانے کے لئے اصطلاحیں مقرر کر لی ہیں۔ ورنہ وہ قرآن و حدیث سے جدا ہو کر کوئی نئی بات نہیں کہتے ہاں علماء خشک جو ان کی اصطلاح نہیں سمجھ سکتے ان پر اعتراض کر دیتے ہیں جو واقع میں ان پر نہیں ہوتا بلکہ اپنی فہم پر ہوتا ہے۔

اصطلاحاتے است مر ابدال را

اور محققین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ طالب کے سامنے تو ان نکات کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

لیکن معاند کے سامنے اعتراضات سن کر بھی خاموش رہتے ہیں بلکہ اپنے متوسلین کو بھی اظہار سے منع کر دیتے ہیں کما قال الشیرازی۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی

یعنی مدعی اور ظاہر پرست کے سامنے عشق اور مستی کے اسرار مت بیان کرو۔ ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو۔

وجہ یہ ہے کہ انہیں جوش نہیں آتا۔ جوش آتا ہے عازم اظہار کو۔ اسی لئے کیمیا گر کو کبھی جوش نہیں آئے گا۔ اگر کوئی اس کا انکار کرے تو وہ اور خوش ہوگا کہ چلو اچھا ہوا لوگوں کے ہجوم سے بچے اور پولیس کے خوف سے بچے اور جو کیمیا گر نہیں ہے محض دکان دار ہے اور لوگوں کو دھوکا دینا چاہتا ہے وہ طرح طرح کی کوششوں سے اپنا کیمیا گر ہونا ثابت کرے گا اسی طرح اہل اللہ جب دیکھتے ہیں کہ معتقدین کم ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں کہ چلو خلوت بالمحبوب کی دولت نصیب ہوئی۔

چہ خوش وقتی و خرم روزگارے   کہ یارے برخورد از وصل یارے

کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ عاشق محبوب کے وصل سے متمتع ہو۔

ایک اور عاشق نے کہا ہے۔

چہ خوش است با تو بزمی نہفتہ ساز کردن   در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

کیا اچھا ہے خفیہ مجلس تیرے ساتھ اختیار کرنا کہ دروازہ بند کر کے گفتگو میں مشغول ہونا۔

اس سے زیادہ خوشی کا کیا مقام ہوگا کہ محبوب کا وصل ایسے موقع سے حاصل ہو کہ کوئی پکارے

تک نہیں۔ کیا محبوب کے وصل کے وقت کوئی یہ چاہے گا کہ کوئی آ کر پکارے ارے فلانے۔ اس وقت تو یہ چاہے کہ ایک چار گھنٹے کے لئے ساری دنیا مجھ کو چھوڑ دے تو کام بن جائے اور بھئی جسے نقدہ حرمتہٗ کی ضرورت ہے اسے البتہ معتقدین کے کم ہونے سے فکر ہوگی کہ ایک اسامی کم ہوگئی۔ بہر حال مظہر اتم حق تعالیٰ کا انسان ہے کیونکہ انسان کو حق تعالیٰ سے مناسبت تامہ ہے اور یہی مناسبت سبب تھا محبوبیت کا اور محبوبیت صرف مرکز میں ہوتی ہے تو معلوم ہوا اور ثابت ہو گیا کہ قلب کا مرکز صرف ذات حق ہے اور اسی سے قلب کو قرار اور چین حاصل ہو سکتا ہے۔

صورت راحت

بس یہی ایک صورت ہے چین کی کہ خدا سے دل لگاؤ اسی کو فرماتے ہیں **الذین آمنوا وتطمئن قلوبهم بذکر الله** یعنی جو لوگ ایمان والے ہیں اور ان کے دلوں کو چین ہوتا ہے خدا کے ذکر سے۔ اور اس میں حصر اس لئے نہیں کہ خدا ہی کے ذکر سے چین ہوتا ہے کیونکہ مخاطب ابھی سمجھ رہا تھا کہ چین اور چیزوں سے ہوتا ہے تو اسے بالفعل صرف اتنا ہی بتا دیا کہ چین خدا کے ذکر سے بھی ہوتا ہے۔

سبحان اللہ! کیا تدریجی تعلیم ہے کہ مخاطب قبول ہی کرے۔ اگر ابتدا ہی سے حصر کے طور پر فرماتے تو ایک قسم کا معارضہ ہو جاتا۔ یہ نہیں کیا پہلے یہ بتایا کہ اور چیزوں سے چین ہونے کی ہم نفی نہیں کرتے مگر خدا کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے۔ جب مخاطب نے یہ سمجھ لیا کہ خدا کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے تو آگے فرمایا **الا بذکر الله تطمئن القلوب**۔ کہ آگاہ ہو جاؤ۔ اور خبردار ہو جاؤ کہ خدا کے ذکر سے دلوں کو چین ہوتا ہے اور کسی چیز سے چین نہیں ہوتا پہلے جملہ میں تو بذکر اللہ جو ظرف ہے تطمئن کا اپنی جگہ پر یعنی موخر ہے اور آگے بذکر اللہ کی تقدیم فرمائی تا کہ حصر کو مفید ہو کہ تقدیم ماحقہ التاخیر مفید حصر ہوتا ہے اور پھر اس کو الا حرف تنبیہ سے مؤکد بھی کر دیا کہ ہوشیار ہو جاؤ کہ خدا ہی کی یاد سے دلوں کو چین ہوتا ہے۔ اس کی دلیلیں میں ابھی سب بیان کر چکا ہوں۔ اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اسی کا ترجمہ مولانا رومی نے کیا ہے۔

گر گریزی بر امید راحتے
ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

اگر راحت کی امید پر تو بھاگنا چاہے تو وہاں بھی کوئی آفت پیش آجائے۔

جہاں جاکے پناہ لوگے کہیں چین نہیں ملے گا کوئی آفت آئے گی اور کہیں کوئی مصیبت کہیں دوستوں کی طرف سے پریشانیاں پیش آئیں گی اور کہیں دشمنوں کی طرف سے۔

ہیچ کنجے بے درد بے دام نیست
جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

یہ ترجمہ ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب کا غرض آرام کی چیز صرف یہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ جب خدا سے تعلق ہو جاتا ہے جو مرکز ہے قلب کا تو پھر حرکت نہیں ہوتی قلب کو اور یہی سکون ہے۔ اب اگر دنیا کی تدبیریں بھی کروگے مگر قلب کو مرکز پر رکھوگے تو پھر پریشانی نہیں ہوگی جیسے پرکار کا ایک پرہ مرکز پر ہوگا اور ایک دائرہ کے محیط پر حرکت کرے گا تو جو حصہ مرکز پر ہوگا وہ حرکت نہیں کرے گا۔ کیونکہ مرکز نقطہ حقیقی ہوتا ہے اور حرکت وضعیہ میں نقطہ مرکزیہ کو حرکت نہیں ہوتی۔ ایک پہیہ بہت بڑا ہے اور اس کے اندر ایک اور ہے اس سے چھوٹا۔ پھر اس سے چھوٹا پھر اس سے چھوٹا تو حرکت سب کو ہوگی۔ جو بڑا ہے اس کو زیادہ اور جو چھوٹا ہے اس کو کم۔ مگر ان سب محیطوں کا جو مرکز ہے اسے بالکل حرکت نہ ہوگی۔

اب سمجھئے کہ ایک باطن قلب ہے جو مرکز پر ہے اور ایک ظاہر قلب ہے جو محیط پر ہے زور کرتا ہے باطن قلب خدا کی یاد میں مشغول ہے اور ظاہر قلب کمانے میں مصروف ہے بلکہ اس محیط پر چلنے والے کو یہی حکم ہے کہ چلو ورنہ دائرہ قطع کیسے ہوگا۔ دائرہ کیا ہے بیوی بچوں کا نان ونفقہ قلب کے اسی ظاہر اور باطن کے متعلق متنبی کہتا ہے۔

عذل العواذل حول قلبی التائہ
وھوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

یعنی ملامت کرنے والیوں کی ملامت قلب کے ارد گرد ہے اور احباب کی محبت سوداء قلب میں ہے۔ پس سوداء قلب جو اندرون قلب ہے وہ غیر متحرک ہے جب اس میں خدا کا ذکر اور محبت جم جائے گی تو پھر حرکت نہیں ہوگی۔

علامت راحت

اس کی علامت یہ ہے کہ خوشی اور غم دونوں حالتیں یکساں ہوں گی۔ خوشی ہے تو الحمد للہ اور غم ہے تو الحمد للہ۔ کیونکہ وہاں نہ غم مطلوب ہے نہ خوشی مطلوب ہے۔ مطلوب تو ان کی رضا ہے۔

بس زبوں وسوسہ باشی دلا   گر طرب را باز دانی از بلا

یعنی اگر تم خوشی کو بلا سے ممتاز سمجھتے ہو تو ابھی وساوس میں مبتلا ہو۔

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

(دوست کی طرف جو پہنچے اسی میں خیر ہے)

خوشی بھی انہیں کی ہے اور غم بھی انہیں کا۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

تیری ناراضگی بھی مجھے پسند ہے میرے دل دکھانے والے یار پر دل فدا ہے۔

محبوب کی رضا مقصود ہے۔ جس طرح اس سے مصافحہ کرنے سے فرحت ہوتی ہے اسی طرح اس کی چپت میں بھی فرحت ہوتی ہے۔ چپت میں چوٹ تو ضرور لگے گی کیونکہ معشوق اچھا خاصا کھاتا پیتا ہٹا کٹا تھا۔ اس کا ہاتھ بھی زبردست ہوگا اور اس سے چوٹ بھی ضرور لگے گی۔ چوٹ سر پر لگے گی دل پر نہیں لگے گی۔ اسی سے یہ چپت میں بھی خوش ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اگر معشوق کہے کہ اگر تمہارے چوٹ لگتی ہو تو لاؤ میں تمہیں چھوڑ کر رقیب کو اس طرح چپت لگاؤں دباؤں تو وہ اس کا یہ جواب دے گا۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کے نصیب نہ ہوں کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا سر سلامت رہے تو خنجر آزمائے ہے۔

کہ جب ہم موجود ہیں تو رقیب کو کیوں مارتے ہو۔

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے   کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

تو جس کے قلب میں خدا کا تعلق جم جاتا ہے اس کو کسی حال میں غم نہیں ہوتا۔

عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

فراق اور وصل سے کیا مطلب دوست کی رضا مطلوب ہونی چاہئے اس کے سوا تمنا کرنا قابل افسوس ہے۔

یعنی وصل کو بھی مطلوب نہیں سمجھتے۔ اگر کوئی کہے کہ وصل تو مطلوب ہی ہے اس کے

مطلوب نہ سمجھنے کے کیا معنے جواب یہ ہے کہ وصل مزعوم عندالسالک کو مطلوب نہیں سمجھتے جسے سالک مطلوب سمجھتا ہے کیونکہ سالک غیر کامل کو ان حقائق کی خبر نہیں ہوتی جب تک شیخ کامل کی تقلید نہ ہو ایسا سالک محض اپنے علم سے کام لیتا ہے اور یہاں علم وفضل کا مٹانا ضروری ہے۔

اسی کو مولانا نے ایک حکایت میں بیان کیا ہے کہ ایک نحوی صاحب جنہیں اپنے نحوی ہونے پر ناز تھا سفر کے ارادہ سے کشتی پر سوار ہوئے۔ راستہ میں ملاح سے پوچھا کہ میاں تم نے کچھ نحو بھی پڑھی ہے اس نے کہا نہیں کہنے لگے افسوس تم نے آدھی عمر کھوئی اس کے بعد کشتی کسی گرداب میں آ گئی اور چکر کھانے لگی۔ ملاح نے پوچھا میاں کچھ تیرنا بھی جانتے ہو۔ انہوں نے کہا نہیں! اس نے کہا افسوس تم نے ساری ہی عمر کھوئی۔ مولانا فرماتے ہیں۔

محوی باید نہ نحو ایں جابداں
(جان لو کہ اس جگہ نحو کام نہیں آئے گی بلکہ محو کام آئے گی)

تو یہاں اس کی ضرورت ہے یہاں نرا ظاہری علم وفضل کافی نہیں اس سے محقق نہیں ہوتا اور علم وفضل کی وجہ سے محقق ہو بھی تو وہ دلائل کا محقق ہے وجدان کا محقق نہیں ہوتا دلائل کیا چیز ہیں اندھے کی لکڑی کہ اس کے سہارے سے ٹٹول کے چل رہا ہے جہاں وہ لکڑی ٹوٹ گئی بس کچھ بھی نہیں۔

تو اسی طرح اس نے اپنے علم سے وصال کی تعریف گھڑی کہ وصال کے کہتے ہیں کہ کچھ کیفیت ہونے لگے کچھ سنسناہٹ ہونے لگے جی لگنے لگے۔ اگر جی لگا تو سمجھے ہاں وصل ہو گیا اور جی نہیں لگتا اور وساوس کا ہجوم ہو گیا تو سمجھا کہ بس مردود ہو گیا تو اس کو غلطی یہ ہوئی کہ کیفیات کو وصل اور وساوس کو فراق سمجھا حالانکہ یہ قبض وبسط ہے فراق ووصل نہیں ہے۔

قبض وبسط

قبض وبسط دونوں وصل ہی کی قسمیں ہیں۔ چنانچہ جس طرح محبوب کا پاس بلا کر بٹھانا وصل ہے اسی طرح یہ حکم دینا کہ جاؤ آم لاؤ یہ بھی وصل ہے یہ نہیں کہ آموں کی جستجو میں جو وقت صرف ہو اور محبوب سے جدا رہنا پڑا یہ فراق ہو گیا۔ کسی شاعر نے کہا تھا۔

اسکے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں
تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

دوسرے نے جواب دیا۔

اسکے کوچہ سے کب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں   وہ ہوسناک ہیں جو روبقضا جاتے ہیں

مگر یہ اس اٹھنے میں ہے جو از خود ہو۔ وہ حقیقت میں خلاف ہے لیکن اس کے علاوہ ایک مرتبہ اور ہے وہ یہ کہ معشوق خود اٹھائے تو یہ اٹھنا عین وفاداری ہے مثلاً اگر معشوق کہے آم لاؤ تو فوراً چلا جائے اور اگرچہ لغۃً یہ زمانہ فراق کا ہوگا مگر اہل عقل کے نزدیک یہ زمانہ اس وصال سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ اس میں تو محبوب کے ناراض ہو جانے کا بھی جو کہ حقیقی فراق ہے اندیشہ ہے اور اس میں اس کے ناراض ہونے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ جتنی دیر آم لانے میں لگے گی اتنی دیر تک اس کے راضی رہنے کا یقین ہے۔ تو جو عاشق ہے وہ اس حالت میں بھی مزے میں ہے اور نہایت خوش ہے کہ محبوب کی رضا تو حاصل ہے۔ اس حالت میں وہ عاشق ضرور یہ کہے گا۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(فراق و وصل کی کیا حقیقت ہے دوست کی خوشنودی کو طلب کر دوست سے اس کی خوشنودی کے علاوہ اور کچھ مانگنا ملامت ہے)

اور یہ وہ فراق ہے کہ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی گوارا فرمایا کیا آپ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ فراق صوری یعنی توجہ الی الغیر مطلقاً بھی نہ ہو مگر آپ کو ارشاد ہوا۔

وانذر عشیرتک الاقربین قم فانذر فاصدع بما تؤمر واتل علیهم

کہ کفار کے پاس جایئے اور انہیں انذار و تبلیغ فرمایئے اور کلام الٰہی سنایئے اور اس پر آپ اٹھے اور خلوت میں بجائے محبوب حقیقی سے مناجات کرنے کے مشرکین و کفار سے خطاب فرماتے ہیں۔

یاایها الناس افعلوا کذا ولا تفعلوا کذا

اے لوگو اللہ کی عبادت کرو اور بت پرستی چھوڑ دو۔

گو آپ کی توجہ محبوب حقیقی کی جانب سے اس وقت بھی منقطع نہیں ہوئی تھی مگر ایک گونہ حجاب تو تھا کیونکہ ایک تو براہ راست محبوب کا دیکھنا اور ایک آئینہ کے اندر اس کا چہرہ نظر آنا۔ تو حق تعالیٰ کے دیکھنے کی مثال ایسی ہے کہ پہلے تو خود محبوب کو بلاواسطہ دیکھ رہے تھے اور اب بواسطہ مرآت کے دیکھ رہے ہیں گو توجہ اب بھی تام ہے مگر بلا حجاب نہیں کیونکہ مرآت حجاب ہے گو شفاف اور وہاں حجاب تو حجاب خود اپنی ذات کا حائل ہونا بھی گوارا نہیں حضرت بوعلی قلندر فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

ہمارے اور محبوب کے درمیان آنکھ اور کان کا بھی کیوں واسطہ ہو اس سے بھی غیرت آتی ہے۔ غرض یہ حجاب تھا جسے حق تعالیٰ کے ارشاد سے گوارا کیا گو وہ حجاب ان کی رضا سے تھا مگر وصال بلا حجاب کے مقابلہ میں تو فراق ہی تھا۔ تو دوسرے مومنین کیوں نہ اس فراق کو گوارا کریں۔

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

میرا میلان وصل کی طرف اور ان کا فراق کی طرف۔ اس کے مطلب کی خاطر میں نے اپنا مقصد ترک کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ عاشق قبض و بسط میں کچھ فرق نہیں کرتا یہ قبض میں گھبراتا ہے نہ بسط میں ناز کرتا ہے کیونکہ یہ سب وصال ہی کی حالتیں ہیں اور گو ظاہر قلب محیط دائرہ پر ہے جو دنیا کے کاموں میں مشغول ہے مگر باطن قلب جو مرکز پر ہے وہ مشغول ہے تسلیم و رضا میں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کسی حالت میں بھی تغیر نہیں ہوتا اور کسی مصیبت سے نہیں گھبراتا۔ یہاں تک کہ مرنے سے بھی نہیں گھبراتا اس واسطے کہ اس وقت بھی مطلوب تو پاس ہی ہے بلکہ موت کا وقت تو وہ ہے کہ پرکار کا باہر کا پرہ جو محیط پر تھا وہ بھی اندر کے پرہ کے قریب آ رہا تھا کیونکہ تمام افکار دنیا خود بخود منقطع ہو رہے ہیں تو اور خوشی کی بات ہے کہ یہ جسم ہیولانی جو ایک گونہ حجاب تھا اٹھا جاتا ہے۔ اس کو ایک بزرگ وقت نزع کے اس طرح فرما رہے تھے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم
جسم بگزارم سراسر جاں شوم

وہ وقت آیا کہ میں ظاہر ہو جاؤں۔ جسم چھوڑ کر سراسر جاں ہو جاؤں۔ اور اسی واسطے یوں بھی کہہ رہے تھے۔

چیست توحید آنکہ از غیر خدا
فرد آئی در خلا و در ملا

توحید یہ ہے کہ غیر خدا سے ہر خلوت و جلوت میں یکسو رہے۔

غرض اسی خوشی میں جان دے دی۔ ابن الفارض رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے صاحب کشف و صاحب حال تھے۔ جب ان کا زمانہ وفات قریب آیا تو۔

آٹھوں جنتیں ان پر منکشف ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر انہوں نے منہ پھیر لیا اور غلبہ حال میں یہ فرمایا کہ۔

ان کان منزلتی فی الحب عندکم　　ماقد رایت فقد ضیعت ایامی

(اگر آپ کی محبت کے صلہ میں مجھے یہ جنت دی جارہی ہیں تو میں نے اپنے ایام ضائع کردیئے کیونکہ میرا مطلوب صرف آپ کی ذات ہے)

کہ مل کر محبت کا صلہ یہی ملا تو ساری عمر ہی برباد ہوئی۔ پھر کہتے ہیں وہ جنتیں مستور ہوگئیں اور خاص تجلی کا ظہور ہوا اور روح پرواز کرگئی گویا وہ حالت تھی جسے ایک اور بزرگ کہتے ہیں۔

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد　　تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

اگر جان نکالنے کیلئے ملک الموت آئے جب تک تیرا دیدار نہ کرلوں جان نہ دینا چاہوں۔

غرض جس شخص کی یہ حالت ہو وہ کس قدر چین میں ہوگا۔

صراط مستقیم

میں راہب نہیں بناتا نہ میں کارخانے چھوڑاتا ہوں میں تو صرف یہ بتاتا ہوں کہ ظاہر قلب سے دنیا کے کام کرو اور باطن قلب خدا کی طرف متوجہ کرو۔ باقی یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی کو طلاق دے دو اور بچوں کو عاق کردو اور کوٹھری میں بیٹھ جاؤ۔ کیا سارا جہاں چھوڑ کر بس اللہ تعالیٰ کوٹھری میں ہیں۔ نعوذ باللہ ان کا تو کوئی مکان نہیں۔ **وھو معکم اینما کنتم** وہ تو ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں۔ ہاں تم ہی ان سے دور رہو اس لئے **و نحن اقرب الیہ من حبل الورید** یعنی ہم تم سے بہت نزدیک ہیں یہ نہیں فرمایا کہ انتم اقرب الینا۔ کہ تم ہم سے بہت نزدیک ہو۔ اس لئے کہ تم دور ہو اور وہ نزدیک ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ قرب وبعد تو نسب متکررہ میں سے ہے جب ایک دوسرے کے قریب ہوگا تو دوسرا بھی اس سے قریب ہوگا۔ ایک بعید ہوگا تو دوسرا بھی بعید ہوگا مگر یہ قرب حسی میں ٹھیک ہے۔ یہاں قرب کے معنی قرب علمی کے ہیں قرب جسمی کے نہیں ہیں۔ پس مراد محض یاد اور توجہ ہے تو اس اعتبار سے وہ قریب ہیں یعنی تمہاری طرف متوجہ ہیں اور تم بعید ہو یعنی تم ان کی طرف متوجہ نہیں۔ پس اگر تم ذرا ان کی طرف متوجہ ہو تو پھر ان کا قرب تمہیں معلوم ہو۔

میان عاشق ومعشوق ہیچ حائل نیست　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

عاشق اور معشوق میں کوئی پردہ نہیں۔ تو خود ہی حجاب ہے اے حافظ درمیان سے علیحدہ ہو۔

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ نے حضرت حق جل وعلا شانہ کو خواب میں دیکھا تو

پوچھا۔ **یارب دلنی علی اقرب الطرق الیک** یعنی مجھے اپنے تک پہنچنے کا سب سے مختصر راستہ بتایئے کہ بس اس سے سیدھا اور مختصر نہ ہو سبحان اللہ خواب میں بھی یہی دھیان ہے۔ جواب میں فرماتے ہیں **دع نفسک و تعال** اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ۔

کیسا سہل راستہ ہے یعنی اپنے نفس کے تقاضے پر عمل چھوڑ دو یعنی اپنی رائے کو اپنے ارادہ کو اور مصالح کو چھوڑ دو۔ بس ان مصالح نے ہی تو خراب کیا ہے ہر بات میں۔ غرض ہر بات میں پالیسی یہی وجہ ہے کہ انہیں چین نہیں اور اللہ والوں کو اس لئے تکلیف نہیں کہ ان کے سویدائے قلب میں پالیسی اور غرض نہیں ہے۔

حضرت بہلول نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہو اس کی خواہش کے موافق ہوتا ہو پھر اسے کاہے کی تکلیف۔ حضرت بہلول نے کہا کہ حضرت یہ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ہنسنے لگے اور کہا کہ اس پر تو تمہارا بھی ایمان ہے کہ بدوں خدا کے ارادہ کے کچھ نہیں ہوتا جب یہ سمجھ گئے تو اب یہ سمجھو کہ جس نے اپنی خواہش ہی نہ رکھی ہو اور اپنی مرضی کو بالکل خدا کی مرضی میں فنا کر دیا ہو تو جو کچھ ہوگا وہ خدا کی مرضی کے موافق ہی تو ہوگا۔ اور اس کی مرضی بھی وہی ہے جو خدا کی مرضی ہے۔ بس وہ اس کی خواہش کے موافق بھی ہوگا۔ اس کا کوئی خاص ارادہ ہی نہیں نہ یہ کہ ابھی مر جائیں نہ یہ کہ دس برس زندہ رہیں کہ ذرا بیمار ہوئے اور دھڑکا پیدا ہوا کہ ہائے ابھی تو ایک ہی برس گزرا ہے ابھی نو برس اور باقی ہیں۔ نہ یہ خواہش کہ غریب ہو کر رہیں نہ یہ خواہش کہ امیر ہو کر رہیں۔ جیسے زاہدوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کمل ہی ملے دوشالہ نہ ملے۔ اگر دوشالہ ملا تو ناک منہ چڑھ گیا اور دنیا دار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوشالہ ملے اگر کمل ملے گا تو اس کا ناک منہ چڑھ گیا۔ سو غور کرو تو تم کیا اور تمہاری مرضی ہی کیا۔ اگر کمل دیں کمل اوڑھو اگر دوشالہ دیں دوشالہ اوڑھو۔ اگر غریب بنائیں خوشی سے اسے گوارا کرو اور اگر بادشاہ بنائیں بادشاہ بن جاؤ ایک جوڑا روز بدلنے کو دیں ایک جوڑا روز پہنو اور اگر ایک جوڑا ایک برس میں دیں تو ایک برس میں پہنو۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ کو ان کے شیخ نے کرتہ دیا تھا۔ وہ اسے ساری عمر پہنے رہے۔ جب پھٹ جاتا کوڑے پر سے گدڑے چیتھڑے جوڑ بٹو کر دھوتے اور دھو کر پیوند لگا لیتے تھے۔ وہ کرتہ اب بھی موجود ہے اور زائرین نہایت عقیدت سے اسے آنکھوں سے

لگاتے ہیں اور بادشاہوں کے تخت وتاج کا پتہ بھی نہیں اور نہ کوئی انہیں پوچھتا ہے وجہ یہ کہ وہ عطیہ تھا سرکاری۔ اور گو یہ بھی عطیہ سرکاری ہے مگر بادشاہ اسے عطیہ سرکاری نہیں سمجھتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ہے ہم نے حاصل کیا ہے ہمیں اس کا استحقاق ہے اس خودی کی وجہ سے وہ مٹا دیا گیا اور اس میں یہ برکت عطا کی گئی کہ وہ اب تک باقی ہے۔

فقر وغنا

اگر کوئی کہے کہ وہ عمر بھر کیوں ایک کرتہ پہنے رہے اگر بدل ڈالتے تو کیا وہ عطیہ نہ ہوتا۔ تو بات یہ ہے کہ ان کو دوسرا میسر ہی نہ تھا باوجودیکہ ابراہیم لودھی بادشاہ ان کے مرید تھے مگر کبھی بادشاہ کی نذر قبول نہیں کی کہ یہ بیت المال کا ہے جو عامہ مسلمین کا ہے۔ بادشاہ کو اس میں تصرف جائز نہیں ہے۔ اگر چاہتے تو بہت کچھ لے لیتے اور بڑے بڑے عالیشان محل تیار کر لیتے ابراہیم بادشاہ کی بہن بھی حضرت سے مرید تھیں اور اس درجہ کی بی بی تھیں کہ آپ فرماتے تھے کہ اگر عورتوں کو خلیفہ بنانا مشائخ کا معمول ہوتا تو میں ابراہیم کی بہن کو خلافت دیتا ان سے بھی کبھی نذر قبول نہیں فرمائی کہ ان کے یہاں بھی وہی بادشاہ کا پیسہ ہے جو بیت المال کا ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے یہاں ایک بزرگ تشریف لائے۔ وہ ان کو ایک میلا اور پھٹا سا کرتہ پہنے دیکھ کر سمجھے کہ یہ بنتے ہیں۔ اور شبہ کی بات بھی تھی کہ جس شخص کا بادشاہ مرید ہو اس کو کہاں کی کمی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ بعض لوگ زاہدوں میں داخل ہونے کو پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتے ہیں۔ شیخ سمجھ گئے کہ مجھ پر تعریض ہے۔ ان سے علیحدگی میں عرض کیا کہ میں بنتا نہیں ہوں بلکہ میرے پاس اس کرتے کے سوا اور ہے نہیں۔ بڑی تنگی سے بسر ہوتی تھی اور فاقے ہوتے تھے۔

اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ آپ کے گھر میں سے آپ کے پیر کی بیٹی تھیں اگر کچھ ہوتا تو کیا آپ ان سے دریغ فرماتے۔ ان کی یہ حالت ہوتی تھی کہ فاقے ہوتے تھے اور جب کئی فاقے گزر جاتے تو بیوی کہتیں کہ حضرت اب تو تاب نہیں۔ فرماتے گھبراؤ نہیں جنت میں عمدہ عمدہ کھانا پک رہا ہے وہ بھی ایسی نیک تھیں کہ اس ادھار پر راضی ہو جاتیں۔ غرض شیخ کی تو عسرت کی یہ حالت تھی۔

اور ایک حضرت سیدنا غوث اعظم رحمہ اللہ کی حالت تھی کہ آپ ایسا کپڑا پہنتے تھے کہ اتنا قیمتی کپڑا خلیفہ وقت بھی نہیں پہن سکتا تھا چشم و خدم اور عمدہ و لطیف غذائیں اور مرغ پلاؤ وغیرہ سے سابقہ رہتا اور جہاں یہ تھا وہاں یہ بھی یقینی تھا کہ اگر دونوں کی حالتوں کو ایک دوسرے سے بدل دیا جاتا تو دونوں خوشی سے قبول کر لیتے۔ غرض عارف کی شان ہونی چاہئے کہ وہ جس حال میں رکھیں زندہ رکھیں تو زندہ رہے ماریں تو مر جائے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

یعنی زندگی عطا فرمائیں تو آپ کی مہربانی ہے اور اگر آپ قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں۔ دل آپ پر آ گیا ہے جو کچھ آپ تصرف کریں میں آپ سے راضی ہوں۔

نعمت شریعت

حاصل یہ ہے کہ اپنے ارادہ کو فنا کر دو اور یہاں ایک اشکال ہے کہ صاحب جب ارادہ کو فنا کر دیں تو نماز کا اور روزہ کا بھی ارادہ فنا کر دیں۔ سو سمجھ لو کہ ارادہ کو فنا کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ جو ارادہ حق کے خلاف ہو اسے فنا کر دو اور جو ارادہ حق کے موافق ہو وہ تو مطلوب ہے اور نماز و روزہ کا ارادہ مرضی حق کے موافق ہے اس کو فنا مت کرو۔

غرض یہ ہے چین کی جڑ اور روح جو اس کو جوانی میں حاصل کرے گا جو کہ اس وقت درجہ میں دوا میں ہو گی تو بڑھاپے میں آرام سے رہے گا اور چین سے بسر کرے گا اور بحکم غذا بھی ہو جائے گی اور یہ اوپر ثابت ہو چکا ہے دوا بھی نعمت ہے اور غذا بھی نعمت ہے کیونکہ دوا مجاہدہ ہے اور غذا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ مجاہدہ بھی نعمت ہے اس مقام پر جس نعمت کا ذکر ہے اس کے بھی دو درجے ہیں بعض کے لئے دوا بعض کے لئے غذا۔ یہ سب اسی کی تمہید تھی تمہید میں قدرے طول ہو گیا مگر خیر میں مقصود میں بھی کیا بیان کرتا۔ اس میں بھی یہی بیان کرتا بہر حال حق تعالیٰ نے ایک نعمت مرحمت فرمائی۔ اولاً جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً آپ کے غلاموں کو جسے لوگ تکلیف اور مصیبت سمجھتے ہیں۔

مجھے اپنے بچپن کی ایک حکایت یاد ہے کہ ایک بار میں مسہل پینے سے گھبرا رہا تھا تو والد صاحب نے فرمایا کہ تم مسہل پی لو تمہیں ایک روپیہ دیں گے چنانچہ اس روپیہ کے لالچ

میں وہ مسہل پی لیا لیکن جب عقل آئی اس وقت معلوم ہوا کہ مسہل پینے سے انکار کرنے میں کس قدر غلطی پر تھا کیونکہ وہ دراصل میرے ہی آرام کے لئے تھا۔

اسی طرح جب ہمیں عقل آئے گی تو اس نعمت کی قدر ہوگی کہ بڑی چیز ہے اگر دوا ہے تب بھی نعمت ہے کیونکہ صحت اسی سے ہے اور غذا کا لطف صحت ہی سے ہے۔ غذا مطلوب بالذات ہے تو دوا مطلوب بالعرض ہے۔ بہر حال دوا ہو یا غذا ہر حال میں نعمت ہے اور وہ نعمت کیا چیز ہے اب میں اس کا نام بتائے دیتا ہوں وہ نعمت وہ ہے جس کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں یعنی شریعت۔ اب تو شریعت کا نام سنا اور ڈرے کہ بس بھائی خدا خیر کرے اب حکم ہوگا کہ کھاؤ پیو نہیں ہنسو اور بولو مت ایک عنایت فرمانے مجھ سے فرمایا کہ شریعت کا خلاصہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ نہ ہنسنے کی جگہ ہنسو اور نہ رونے کی جگہ روؤ۔ گلا گھونٹا ہوا رکھو۔ میں نے کہا آپ جیسے سمجھدار جب یہ خلاصہ نکالیں گے تو واقعی پھر تو یہی خلاصہ ہوگا شریعت کا۔

ایسے بدمذاق لوگوں کی بالکل اس چمار کے لڑکے کی مثال ہے کہ ایک راجہ تھا گنوار سا۔ اس کی ایک لڑکی تھی اس کی شادی وہ کسی سے نہیں کرتا تھا کیونکہ اسے یہ خبط تھا کہ کوئی میرے برابر کا نہیں ہے۔ بڑے بڑے راجاؤں کے پیام پھیر دیتا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ شدت کی آندھی چلی اور زور کے بگولے میں ایک چمار کا لڑکا اڑ کر راجہ کی چھت پر گرا۔ لوگوں کو اور راجہ کو یہ تعجب ہوا کہ یہ لڑکا یہاں کہاں سے اور کیوں آیا۔ عقلاء کو بلایا گیا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ انہوں نے سوچ کے کہا کہ یہ غیبی آدمی ہے جو اس لڑکی کے ساتھ شادی کے واسطے بھیجا گیا ہے جب عالم شہادت میں کوئی آدمی شادی کے قابل نہ نکلا تو عالم الغیب سے اس کو بھیجا۔

حکم دیا اسے حمام میں لے جاؤ اور کپڑے بدلواؤ۔ جب اسے حمام میں لے چلے وہ بڑا چلایا راجہ نے حکماء سے پوچھا کیا ہے یہ چلاتا کیوں ہے انہوں نے کہا حضور! یہ عالم غیب سے تازہ آیا ہے ابھی ہم لوگوں سے مانوس نہیں ہے۔ اس سے گھبراتا ہے اسے زبردستی حمام میں لے جا کر گرم پانی سے نہلایا۔ جب کپڑے پہنانے کا قصد کیا گیا تو کپڑے دیکھ کر اور گھبرایا اور بہت چلایا۔ راجہ نے پھر حکماء سے پوچھا۔ انہوں نے کہا اس نے ابھی دنیا کی چیزیں نہیں دیکھی ہیں۔ اچھا اس کے سامنے بہت سے جواہرات لائے جائیں۔ یہ ان سے مانوس ہوگا۔ چنانچہ بہت سے جواہرات چمکتے چمکتے اس کے آگے لا کر رکھے گئے تو وہ پریشان ہوا اور لگا

چلانے۔ سب سے آخیر میں حکماء کی یہ رائے ہوئی کہ اچھا خود شہزادی کو اس کے سامنے بٹھا دیا جائے کہ شاید اسے ادھر رغبت ہو اور یہ قرار پکڑے۔ جب شہزادی سامنے لائی گئی تو اب اس کے چلانے اور پریشان ہونے کی کوئی انتہا کی حد نہیں رہی بہت ہی رویا چلایا۔ اب حکماء نے کہا کہ اچھا اسے آزاد کر دیا جائے جب یہ اس عالم سے مانوس ہوگا تب شادی کی جائے۔

چنانچہ وہ آزاد ہوتے ہی سب کپڑے اتار اور اپنی لنگوٹی باندھ مخلی بالطبع ہو کر اپنے گھر کی طرف بھاگا اور گھر پہنچ کر اپنی ماں کے ساتھ لپٹ گیا اور اس طرح اپنی سرگذشت سنانے لگا کہ مجھے ڈاکو پکڑ کر لے گئے تھے میری میا۔ مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کیا (یہ حمام کا خاکہ ہے) تب بھی میں نہ مرا میری میا۔ پھر تتا تتا پانی (یعنی گرم گرم) انہوں نے مجھ پر ڈالا تب بھی میں نہ مرا میری میا۔ پھر انہوں نے مجھے کفن پہنایا (جوڑے کی قدر کی ہے) تب بھی میں نہ مرا میری میا۔ پھر وہ جلتی ہوئی آگ لائے (یہ جواہرات کا نقشہ ہے) تب بھی میں نہ مرا میری میا پھر وہ ایک ڈائن کو بلائے (یہ شہزادی ہے) کہ مجھے کھا جائے۔ تب بھی میں نہ مرا میری میا۔

بس جو مذاق اس چمار کے لڑکے کا تھا وہ مذاق ہم لوگوں کا ہے کہ شریعت جیسی حسین شہزادی کو ڈائن سمجھ کر اس سے گھبراتے اور بھاگتے ہیں۔

رعایت مصالح

اجی شریعت تو ایسی حسین ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است

(سر سے پاؤں تک تیرا سراپا اس قابل ہے کہ اس پر جان نثار کی جائے)

افسوس ہم نے اسے چھوڑ کر دنیا کو محبوب بنایا ہے جس کی یہ حالت ہے۔

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد
چوں باز کنی مادر باشد

یعنی سمجھے کہ یہ بڑی حسین اور نوجوان ہوگی مگر جب چادر اٹھا کر دیکھا تو وہ نانی اماں سے بھی بڑی تھی۔ اب سمجھ لیجئے کہ آپ نے کس کو چھوڑا اور کس کو لیا۔

بقول دشمن پیمان دوست بشکستی
ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

دشمن کے کہنے سے دوست سے تعلق توڑا دیکھ کہ کس سے تو کٹا اور کس سے جڑا۔

وجہ یہ ہے کہ شریعت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور نہ اس کا حسین چہرہ دیکھنے کے لئے آنکھ بنوائی۔ اس لئے دنیا کی برائیاں نہیں دکھائی دیتیں۔ اجی اندھا اس سے زیادہ کیا دیکھتا ہے کہ ڈیل نرم نرم ہو۔ بس یہ حسن ہے اس کے نزدیک اور چاہے چہرہ پر آدھ سیر قیمہ بھرنے کی ضرورت ہی ہو اور چاہے ایسا ہو کہ جیسے اپلے میں کوا ٹھونگیں مار گیا ہو آنکھیں درست کرائیں تو اصل حسن کی پہچان ہو اور آنکھ میں یہ دھند اور جالا۔

غرض نفس کا ہے اور اتباع ہوا کا ہے۔ شریعت نے تو حقیقی مصالح کی ذمہ داری لی ہے خاص آپ کی موافقت نفس کا تو ٹھیکہ نہیں لیا۔ حکمت کے اقتضا سے جیسا مناسب ہوگا شریعت ویسا حکم کرے گی۔ حکم تو وہی ہے جو مرض کے مناسب نسخہ تجویز کرے۔

نہ کہ مریض کے نفس کے مناسب۔ اور مریض کی رعایت کرے گا وہ اصل میں طبیب نہیں ہے وہ فیس اینٹھنے والا ہے جو کہ آپ کی مرضی کے موافق نسخہ لکھ کر آپ کو خوش کر کے فیس لینا چاہتا ہے۔ بہت لوگ علماء میں بھی ایسے ملیں گے کہ فیس لے کر مستفتی کی مرضی کے موافق فتویٰ لکھ دیتے ہیں۔

میں نے ایک ہزار روپیہ کا فتویٰ دیکھا جس میں لگی خوش دامن کا نکاح داماد سے حلال لکھا تھا آپ کو تعجب ہوتا ہوگا کہ قرآن میں جس کی حرمت کی تصریح ہے اس کی حلت کا فتوی کیسے لکھ دیا اور لوگوں نے اسے کیسے مان لیا۔ اجی کمال تو جب ہی ہے کہ جب لوگ مان بھی لیں کیونکہ فتوی تو لوگوں کے اعتراض سے بچنے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ جب اعتراض سے بچاؤ نہ ہوا تو وہ فتویٰ ہی کیا ہوا۔ اور پھر ہزار روپیہ کون دیتا۔ ایسے فتوے لکھنے والے بڑے ذہین ہوتے ہیں۔

قصہ یہ تھا کہ ایک داماد ساس پر فریفتہ ہو گیا تو اس نے ایک مفتی سے کہا کہ کیا ترکیب کروں کہ اس سے نکاح کر سکوں۔ اس نے کہا ہزار روپیہ دو ترکیب میں بتا دوں گا چنانچہ اس نے ہزار روپے دیئے۔ ہزار روپیہ لے کر اس نے کیا ترکیب کی کہ یہ لکھا کہ ساس اس کو کہتے ہیں جو منکوحہ کی ماں ہو پہلا مقدمہ۔ منکوحہ اس کو کہتے ہیں جس کا نکاح شریعت کے موافق ہوا ہو۔ دوسرا مقدمہ عموماً عورتیں کلمات شرک وکفر اپنی زبان سے جاری کرتی ہیں جس سے مرتد ہو جاتی ہیں اور مرتدہ کا نکاح درست نہیں ہوتا اس لئے قبل نکاح تجدید ایمان ضروری ہے تیسرا مقدمہ یہ مشرکہ تھی کہ عادت کے موافق کلمات شرک وکفر زبان پر لاتی تھی چوتھا

مقدمہ۔ اور اسے تجدید ایمان نہیں کرائی گئی پانچواں مقدمہ۔ لہذا نکاح شرعاً نہیں ہوا کہ مشرکہ سے مومن کا نکاح نہیں ہوا۔ جب یہ منکوحہ نہ ہوئی اس کی ماں ساس بھی نہیں ہوئی۔ رہ گئی حرمت مصاہرت سو یہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی گھڑت ہے جو حدیث کے خلاف ہے اس لئے حدیث کے مقابلہ میں ہم ابوحنیفہ کا قول نہیں مانتے اسے اس لئے بس وہ حرمت مصاہرت سے بھی بری ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اسی طرح میں نے اور طرح طرح کے فتوے دیکھے ہیں تو کیا یہ لوگ طبیب ہیں۔ صاحب طبیب تو وہی ہے جو اپنی مرضی کا نسخہ لکھے اور مریض کو اس کے پینے پر مجبور کرے چاہے فیس ملے یا نہ ملے اسی طرح بہت سی باتیں شریعت کی بھی جو آپ کے خلاف ہوں گی آپ کو ناگوار ہوں گی۔

مثلاً کسی شخص کی عادت رشوت لینے کی ہے جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ رشوت لینا حرام ہے تو کس قدر ناگوار ہوگا کہ ہزار روپے کا نقصان ہوا۔ اگر اتفاق سے اسی لینے والے کو کہیں رشوت دینا پڑے تو اس وقت اس قانون کی خوبی سمجھ میں آجائے۔ اگر کوئی اس سے ہزار روپے رشوت کے لے کر فتویٰ سنے اور واپس کردے تب اس سے کوئی پوچھے کہ شریعت کا حکم کیسے ہے یہ کہے گا کہ سبحان اللہ! کیا کہنا ہے شریعت کا۔ بھلا ایسے خود غرض کا کیا فیصلہ اپنی اغراض سے قطع نظر کر کے فیصلہ کرو تو ہم مانیں گے۔ اس سے تو معلوم ہوا کہ محض غرض کے بندے ہو بلکہ اگر کوئی غرض سے بھی قطع نظر کرے اور وہ عقل سے اپنی مصالح کا فیصلہ کر لیا کرے تو یہ فیصلہ بھی قابل اعتبار نہیں کیونکہ وحی کے آگے عقل کیا چیز ہے۔

غرض شریعت سے ناگواری کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی خوبیاں دیکھنے کے لئے آنکھ نہیں ہے اگر آنکھ ہو تو معلوم ہو جائے کہ شریعت میں کہیں حق تعالیٰ نے اپنی غرض پوری نہیں کی ہے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

میں نے مخلوق کو اپنے نفع کے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ بندوں پر سخاوت کرنے کیلئے پیدا کیا۔

آپ کے مصالح کی ایسی رعایت ہے کہ شاید آپ خود بھی نہ کر سکتے مثلاً شریعت نے یہ بتایا کہ پھل آنے سے پہلے باغ کی فصل بیچنا حرام ہے گو یہ فیصلہ مالک باغ کو ناگوار ہے کہ پھل آنے سے پہلے باغ پانچ سو کو بکتا تھا اور اب پھل آئے اور کم آئے تو اڑھائی سو کو بیچنا پڑا لیکن خریدنے والے سے پوچھو کہ وہ شریعت سے کتنا خوش ہے کہ پانچ سو جس باغ

کے دیتا تھا اڑھائی سو میں مل گیا۔

اسی طرح ایک شخص نے ایک بیٹی اور ایک دور کا عصبہ چھوڑا۔ آدھی میراث بیٹی کو ملے گی اور آدھی عصبہ کو۔ اس میں بیٹی کو بڑا ناگوار ہوا کہ میں خاص بیٹی اور میرے باپ کا مال۔ یہ دور کا رشتہ دار سے خواہ مخواہ دے دیا مگر اس عصبہ سے پوچھو تو وہ کہے گا سبحان اللہ! شریعت میں حقوق کی کیا رعایت ہے کہ دور دور کی قرابت کو بھی اس قدر مانا ہے۔

تو اب ایک ہی حکم ہے مگر دو آدمیوں میں سے اپنی اپنی اغراض کی وجہ سے ایک کو ناگوار ہے اور ایک کو گوارا ہے۔ اب ہم کس کے فیصلہ کو ان دونوں میں سے مانیں۔

ترکت اللات والعزیٰ جمیعا کذلک یفصل الرجل البصیر

یعنی لات اور عزیٰ دونوں کو چھوڑ دیا۔ ہم ان دونوں میں سے کسی کا فیصلہ نہیں مانیں گے۔ کیونکہ یہ دونوں خود غرض ہیں ہم تو وحی کا فیصلہ مانیں گے کیونکہ وہاں غرض کا شائبہ نہیں ہے اسی لئے وہی قابل اعتبار ہے۔ وحی کا فیصلہ یہ ہے کہ شریعت قانون عام ہے جو مصالح عامہ کی رعایت کرتا ہے جیسے سرکاری قانون مثلاً سڑک پر پیشاب کرنا جرم ہے۔ اب ایک شخص کو زور کا پیشاب لگا وہ کہاں جائے۔ وہاں تو یہ حکم ہے پیشاب مت کرو اور یہاں پیشاب نکلا جا رہا ہے تو وہ شخص کیا کہے گا کہ بڑی سختی کا قانون ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پیشاب کی تو اجازت ہوتی مگر اس کی بدبو سے بچنے کے لئے کوئی ایسی دوا ڈال دی جاتی کہ دماغ بے حس ہو جاتے اس لئے کسی کو بدبو نہ معلوم ہوتی۔ بھلا کون اسے پسند کرے گا کہ اس گدھے کے پیشاب کے واسطے سب کو بے حس بنا دے۔

اسی طرح شریعت نے بھی مصالح عامہ کی رعایت سے قانون بنایا ہے تم اس میں مصالح خاصہ اور وہ بھی نفسانیہ ڈھونڈتے ہو اور شریعت کا اچھا معلوم ہونا مصالح عامہ کی رعایت سے یہ تو حکماء وعقلاء کی نظر میں ہے اور ایک نظر ہے عشق ومحبت والے کی اس کو اس سے اچھی معلوم ہوتی ہے کہ دوست کا قانون ہے۔ یہ حکماء کی نظر سے بڑھ کر ہے۔

جیسے کوئی طوائف اپنے کسی عاشق سے یہ کہہ دے کہ تم لنگوٹی باندھ کر رام نرائن کے بازار میں پھرو۔ یہ اس سے نہیں پوچھے گا کہ بی اس میں تمہارا کیا فائدہ بلکہ فوراً ادھر ادھر دوڑنے لگے گا۔ اگر کوئی کہے بھی گدھے یہ کیا ہے تو وہ کہے گا۔

قال الجدار للوتدلم تشقنی قال الوتدانظر الی من یدقنی

ایک شخص دیوار میں کیل ٹھونک رہا تھا تو دیوار نے کیل سے شکایت کی کہ میں نے کیا کیا جو میرے جگر کو شگافتہ کر رہی ہے۔ کیل نے جواب دیا کہ اس سے پوچھو جو مجھے ٹھونک رہا ہے تو حکماء و عقلاء احکام کے لم کے در پے ہوں گے اور جو عاشق ہوگا وہ یہ کہے گا کہ حکمت اس سے پوچھو جس نے قانون مقرر کیا ہے۔ مجھ کو کچھ بحث نہیں۔ بس مولوی صاحب کو یہی جواب اختیار کر لینا چاہئے۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

(آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہوا ہے جو استاد ازل کہتا ہے کہ کہہ دے میں وہی کہتی ہوں)

محبت و شریعت

غرض یہی علماء کو بھی مناسب ہے۔ میں ان کو نصیحت کرتا ہوں کہ اگر حکم و اسرار معلوم بھی ہوں تو پوچھنے پر تو ہرگز مت بتاؤ چاہے یہی گمان کریں کہ انہیں نہیں آتا اور پوچھنے والے بھی خوب سمجھ لیں کہ جاننے والے بھی بہت ہیں مگر تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تمہیں سب بتا دیا کریں۔

جیسے طبیب کہ جانتا سب ہے کہ تین ماشہ گل بنفشہ کیوں لکھا اور چھ ماشہ گل گاؤزبان کیوں لکھا مگر کوئی مریض پوچھنے لگے تو وہ نہیں بتائے گا اگر وہ کہے کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں طب نہیں آتی۔ ہاں صاحب نہیں آتی تمہیں پسند ہو پیو ورنہ مت پیو۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

مصلحت نیست کہ از پردۂ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

یعنی کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو مگر ہم تمہارے کہنے سے نہیں بتاتے اور حقیقت میں مصلحت اور حکمت پوچھنے کی ضرورت ہی کیا۔ محبوب کا حکم سمجھ کر کرنا چاہئے۔ محبوب سمجھ کر اس کے حکم کی علت دریافت کرنا عشق کے بالکل ہی خلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جاؤ ہم عاشق ہی نہیں پھر ہم پر وظائف عشق بھی واجب نہیں تو صاحب تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے عشق تو لوازم ایمان سے ہے جب تم نے آمنا کہا تو عشقنا کا التزام بھی کر لیا۔

جیسے کوئی شخص کہے مجھ پر نان ونفقہ بی بی کا کیسے واجب ہو گیا۔ میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا۔ صرف قبلت النکاح کہا تھا ہر شخص یہی کہے گا جب قبلت کہا جب ہی شوہری کے حقوق کے ملتزم ہو گئے پس سی طرح جب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا پس عاشق

ہو گئے کیونکہ اس کلمہ سے مومن ہو گئے اور مومن کے بارہ میں ارشاد ہے۔

والذین امنو آ اشد حباللہ

جو لوگ خدا پر ایمان لائے وہ خدا کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں تو تصدیق ایمانی کے ساتھ ہی سارے کے سارے عاشق ہو گئے اب آپ عشق سے انکار کریں تو کیا ہوتا ہے۔ جب عاشق ہونا ثابت ہو گیا تو عشق کے حقوق ادا کرو۔ بس کان مت ہلاؤ اور سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو۔ اگر کوئی اس انقیاد کا قصد کرے تو اول اول تو تکلف ہوتا ہے پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے۔ جس طرح دوا عادت پڑنے سے غذا ہو جاتی ہے اگر کوئی کہے کہ دوا کیوں کر غذا ہو جاتی ہے تو میرے پاس اس کی لاجواب مثال موجود ہے۔

دیکھئے حضرت تمباکو سلمہ اللہ تعالیٰ کہ کوئی اس سے مشکل سے بچا ہوگا۔ کہیں اکلا اور کہیں شربا اس کا استعمال ہوا کرتا ہے شروع کرتے وقت کیسی متلی ہوتی تھی کیسی ابکائیاں آتی تھیں چکر آتا تھا مگر جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر یہ جناب سب سے زیادہ مرغوب ہو جاتے ہیں۔ روزے میں سب کو پانی اور شربت کی فکر ہوتی ہے مگر انہیں نہ پھلکیوں کی پرواہ نہ شربت کی پرواہ نہ افطاری سے مطلب۔ ارے بھئی حقہ دے دو اور ایک پان دے دو۔ ایسی مکروہ چیز کیسی محبوب ہوئی اے اللہ تمباکو کی اتنی محبت اور شریعت کی اتنی بھی نہیں۔ ارے بھئی تمباکو ہی سمجھ لیا ہوتا۔ تمباکو ہی کیا ہوتا آخر کسی طرح بھدے لوگوں کو سمجھاؤں بھی۔ اگر خمیرہ گاؤزبان نہیں سمجھتے تو خمیرہ تمباکو ہی سمجھو۔ بہر حال اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ عادت ڈال لو تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے۔

بعض بزرگوں کو کسی تکلیف کے وقت نماز کو اٹھنے میں ناک منہ چڑھاتے دیکھ کر اگر شبہ ہو کہ عادت پڑ جانے کے بعد ان پر کیوں اثر ہے بات یہ ہے کہ ان کے دل پر اثر نہیں صرف جسم پر ضعف کی وجہ سے اثر ہے اور دل پر نہایت خوش ہیں۔

اس کی مثال بھی میرے پاس موجود ہے اور وہ نظیر حضرت تمباکو کی دوست مرچ ہیں کہ ناک بہہ رہی ہے۔ آنسو جاری ہیں سی سی کر رہے ہیں مگر کھائے چلے جاتے ہیں۔ کیوں صاحب اگر تکلیف ہے تو کیوں کھاتے ہو۔ بات یہ ہے کہ تکلیف منہ کو ہے مگر زبان اور حلق کو مزہ آتا ہے

۔ اس لئے منہ کی تکلیف گوارا ہے۔ تو اب سمجھ میں آ گیا کہ لذت والم دونوں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح امتثال امر محبوب میں گو بدن کو تکلیف ہو مگر دل اور روح شاداں ہے اور اس عادت کا یہ اثر ہے کہ اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے گو بدن کو آرام ملے کہ پڑے سوتے رہے مگر قلب کو جو تکلیف ہے اس کے آگے یہ آرام کچھ بھی نہیں۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں۔

بردل سالک ہزاراں غم بود
گرز باغ دل خلالے کم بود

یعنی اگر باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے اس وقت دیکھو ان کے غم کو۔ پھر اس میں بھی دو درجے ہیں۔ زاہد کو غم ہوتا ہے مطلقاً عمل فوت ہو جانے کا اور عارف کو غم ہوتا ہے بااختیار خود فوت ہو جانے کا اور بلا اختیار فوت ہونے کا کچھ غم نہیں ہوتا کیونکہ دوست نے اس میں یوں ہی تصرف کیا مگر یہ بات عام لوگوں کے سنانے کی نہیں کیونکہ یہ اگر قصداً بھی سو گئے اور نماز قضا کر دی تو حیلہ نکال لیں گے کہ محبوب کی یوں ہی مرضی تھی تو یہ مرضی مرض والوں کے لئے نہیں کیونکہ وہ خود مرضی (بفتح الراء) ہیں یعنی مرض والے۔

بہر حال تکلیف طبعی سے جسم کو پریشانی ہوتی ہے مگر روح کو نہیں ہوتی بلکہ ان اعمال سے ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ وہ غذائے روح بن جاتی ہیں کہ اگر وہ نہ ملیں تو پریشانی ہوتی ہے۔ صرف شروع میں کسی قدر تکلیف ہوتی ہے جیسے مشاہدہ سے پہلے مجاہدہ کی ضرورت ہے یا غذا سے پہلے دوا کی حاجت ہوتی ہے پھر تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے۔ تو حضرت ایسی چیز ہے شریعت جس سے ڈرتے ہیں لوگ حالانکہ اس میں ہمارے کل مصالح دینیہ و دنیویہ کی بے حد رعایت کی ہے۔

راحت اور شریعت

ساری مصلحتوں سے بڑھ کر تو چین ہے جو بدوں اتباع احکام شریعت نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص کہے کہ بدوں اتباع احکام کے بھی چین نصیب ہو سکتا ہے کیونکہ چین تو بقول تمہارے تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ہر وقت خدا کو یاد کریں اور اتباع شریعت نہ کریں تو تعلق مع اللہ تو حاصل ہو گیا پس چین سے رہیں گے تو خوب سمجھ لو کہ مطلق تعلق سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسے تعلق میں چین کا گمان بے حسی ہے۔ فی الواقع اس میں بے چینی مضمر ہے جو مرنے کے بعد کھل جائے گی۔

جیسے ایک سرحدی گنوار ہندوستان میں آیا۔ ایک حلوائی کی دکان پر جا کر حلوا لیا۔ اس نے

دام مانگنے یہ وہاں سے بھاگا۔ وہ حلوائی بھی پیچھے بھاگا۔ جب وہ اتنا بھاگا کہ قریب تھا کہ پکڑ لے آپ نے وہ حلوا جھٹ منہ میں رکھ لیا کہ جاؤ نہ ہمارا نہ تمہارا۔ وہ پکڑ کر تھانے میں لے گیا۔ تھانیدار رحم دل تھے۔ انہوں نے بجائے چالان کرنے کے یہ سزا دی کہ گدھے پر سوار کر کے اور اعلان کے لئے ڈھول کے ساتھ شہر سے باہر نکال دینے کی سزا دی۔ لونڈوں نے جو اسے گدھے پر سوار دیکھا تو وہ بھی تماشہ کے طور پر ساتھ ہو لئے۔ یہ ہندوستان کی سیر سے فارغ ہو کر اپنے ملک پہنچے۔ وہاں لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آغا ہندوستان رفتہ بودی چہ طور ملک ست؟ ہندوستان کیسا ملک ہے ہندوستان کے بارے میں کہا خوب ملک ست بڑا اچھا ملک ہے پوچھا گیا بچہ طور؟ تو آپ فرماتے ہیں۔ در ہندوستان حلوہ خوردن مفت ست۔ حلوہ مفت کھانے میں آتا ہے۔ سواری خر مفت ست گدھے کی سواری مفت ملتی ہے ڈم ڈم مفت است باجا مفت ہے فوج طفلاں مفت است۔ لڑکوں کی فوج مفت ملتی ہے ہندوستان خوب ملک ست۔

تو جیسے ان حضرات کو یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ حشم خدم عزت کا سامان تھا یا یہ نہایت ذلت کی سزا تھی۔ اسی طرح ان کو نہیں معلوم کہ یہ چین ہے یا بے چینی لیکن کہاں تک۔

فسوف تری اذا انکشف الغبار　　افرس تحت رجلک ام حمار

عنقریب دیکھ لے گا تو جب آنکھوں سے غبار اتر جائے گا کہ تمہارے بدن کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

جب حقیقت منکشف ہوگی اس وقت معلوم ہوگا کہ چین تھا یا بے چینی جیسے اس آغا کو جب ان سب باتوں کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی تو کس قدر شرمندہ ہوا ہوگا اسی طرح انہیں بھی مرتے وقت معلوم ہو جائے گا کہ وہ لذت تھی یا بے لذتی۔ غرض جو تعلق و نسبت مطلوب اور سرمایہ راحت ہے تو وہ ہے جو جانبین سے ہو رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ (راضی ہو گیا ان سے اور وہ راضی ہو گئے اس سے) وہ نسبت ہی نہیں جو صرف ایک ہی طرف سے ہو۔

جیسے کسی شہر میں ایک پردیسی طالب تھے۔ ان کے دیس کے کوئی آدمی ان سے ملنے گئے۔ انہوں نے پوچھا میاں طالب علم کس رنگ میں ہو۔ کہنے لگے کہ شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں۔ پوچھا کیا کام ہوا۔ کہنے لگے ہاں آدھا کام تو ہو گیا آدھا باقی ہے۔ پوچھا کس طرح کہنے لگے میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں۔ خوب آدھا ہو گیا تو یہ الوپن ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ بزعم خود صاحب نسبت ہیں جو ملکہ یادداشت بہم پہنچ کر اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں مگر اتباع شرع نہ ہونے کے سبب ان کے زعم کا حاصل یہ ہے کہ ہم تو راضی ہیں مگر اللہ تعالیٰ راضی نہیں خوب سمجھ لو کہ ان کے راضی ہونے کا معیار صرف احکام کا اتباع ہے۔ اگر اسی حال میں موت آ گئی تو سب کھل جائے گا کہ یہ تعلق ان کو پسند نہ ہونے کے سبب تمہاری نظر میں کس قدر خوار ہوگا۔

بقول سعدی

چو در چشم شاہد نیاید زرت   زرو خاک یکساں نماید برت

جب محبوب کی نظر میں تیرا سونا نہ آئے تو تیرے نزدیک سونا اور خاک برابر ہے۔

آپ نے ہزار روپے محبوب کو بھیجے کہ وہ خوش ہو مگر معلوم ہوا کہ وہ خوش نہیں ہوا اور اس نے نہیں لیا اور انہیں واپس کر دیا۔ کسی نے کہا کہ گھر میں بھیج دو تو یہی کہو گے پھینکو میں کیا کروں ایسے منحوس روپیہ کو اسی طرح جب معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ اس تعلق سے راضی نہیں ہوئے تو اس کو تعلق سمجھو گے۔ تعلق وہی ہے جو کہ دونوں جانب سے ہو اور یہ تعلق علاوہ اتباع شریعت کے ہو نہیں سکتا تو دیکھئے شریعت کتنی بڑی چیز ہوئی۔

حق تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں۔

ثم جعلنک علی شریعة من الامر فاتبعها ثم.

لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے ہیں۔

ولقد اتینا بنی اسرآئیل الکتب والحکم والنبوة و رزقنهم من الطیبت وفضلناهم علی العلمین وآتینهم من الامر فما اختلفوآ الامن بعد ماجآء هم العلم بغیابینهم ان ربک یقضی بینهم یوم القیٰمة فیما کانوا فیه یختلفون

فرماتے ہیں یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں اور ہم نے ان کو دنیا جہان والوں پر فوقیت دی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں۔ سو انہوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ آپس کی ضدا ضدی کے۔ آپ کا رب ان کا آپس میں قیامت کے روز

ان امور میں فیصلہ کردے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں **ثم جعلناک**......الخ یعنی آپ سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب وغیرہ عنایت کی تھی۔ اس کے بعد ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔

اتباع شریعت

من الامر میں من بیانیہ ہے کہ وہ شریعت اور طریقہ خاص کیا ہے۔ وہ امر دین ہے پس اس کا اتباع کیجئے کتنی لطیف ہے شریعت! یعنی جس عنوان سے علماء اتباع دین کا امر کرتے ہیں وہی عنوان آیت میں وارد ہو گیا جس سے صریحاً مدعا علماء کا ثابت ہو گیا۔ اب یہ سمجھنا چاہئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے۔

ولاتتبع اھوآء الذین لایعلمون

اور ان جاہلوں کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ طرز بیان ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ **ولا تتبع غیرھا** کہ غیر شریعت کی اتباع نہ کیجئے بلکہ یوں فرمایا کہ جہلا کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے۔ اس میں یہ بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہشیں نہیں وہ ہوائے نفسانی ہیں۔ اس لئے وہ عمل کے قابل نہیں۔ **الذین لایعلمون** سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترازی ہے یعنی **الذین یعلمون** کی اہوا کا اتباع جائز ہے بلکہ یہ قید واقعی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء ہی نہیں ہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ تو جہلا ہیں۔

جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانے میں نہ آنا تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ غیر مفسدین کے بہکانے میں آ جانا نہیں مطلب یہی ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں ان سے بچتے رہنا۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو۔

اور **الذین لایعلمون** کا مفعول جو ذکر نہیں فرمایا سبحان اللہ! اس میں عجیب رعایت ہے۔ اگر مفعول ذکر فرماتے تو وہ امر الدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہو جاتا کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام ہو رہا ہے۔ تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لئے مذموم ہے کہ وہ اہواء ہے اور اہواء اس لئے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا فعل ہے۔ اس لئے یہاں مطلق علم کی

نفی کردی کہ اھواء اس لئے مذموم ہے کہ وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل ہی جاہل ہیں۔

یہ دعویٰ کہ جو شخص شریعت کا متبع نہ ہو وہ بالکل جاہل ہے اتنا بڑا ہے کہ سارا عالم اس میں مقابل ہے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پورا یقین ہے کہ ساری دنیا کو جاہل بتانا اتنی پکی بات ہے کہ اس میں ذرا احتمال خلاف کا نہیں ورنہ آپ کو جھجک ضرور ہوتی کہ کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھے اور اس وقت گو ظاہر میں آپ تہیں تشریف رکھتے مگر آپ کا علم وفیض تو ہے جیسے آفتاب پر ابر آجائے تو آفتاب نظر سے پوشیدہ ہے مگر اس کی روشنی تو ہے بلکہ چوندھوں کے لئے تو یہ ابر بھی رحمت ہے کہ براہ راست وہ اس کا تحمل نہ کر سکتے۔ اسی طرح بعضے لوگ ایسے ہیں کہ اگر حضور کے زمانہ میں ہوتے تو یقیناً یہ حضور کی اتباع سے عار کرتے اور اس سے وہ کفر میں پڑ جاتے۔ تو اچھا ہوا کہ ابر آگیا ورنہ ان چوندھوں کو بڑی مشکل ہوتی۔ بہر حال اب وہ آفتاب کی روشنی ابر سے بھی چھن رہی ہے۔ اس موقع پر میں مولانا کا یہ شعر پڑھتے رک گیا وہ شعر یہ ہے۔

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ   چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنی آفتاب رخصت ہو گیا اور میں اسے اس لئے پسند نہیں کرتا کہ آفتاب رخصت نہیں ہوا وہ تو اب بھی درخشاں ہے صرف ابر کے نیچے چھپ گیا ہے بلکہ یہ شعر اس موقع پر مناسب ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست   خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

ابھی وہ ابر رحمت موتی بکھیر رہا ہے۔ خم و خمخانہ بارونق ہے۔

اور مولانا نے وہ شعر کسی دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔ غرض حضور کے غلام حضور سے فیض لینے والے اب بھی موجود ہیں جو اب بھی اس دعویٰ کو ثابت کرنے کو تیار ہیں کہ جو متبع شریعت نہ ہو وہ جاہل ہے۔

فیض صحبت

میں خود تو دعویٰ نہیں کرتا مگر دین کے محاسن پر نظر کر کے کہتا ہوں کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عاقل ہو مگر عالم نہ ہو اور کسی محقق کی صحبت میں نہ رہا ہو۔ اس کو کسی محقق کی صحبت میں چھ مہینے کے لئے بھیج دو۔ خدا کی قسم اس چھ مہینے میں وہ محقق یہ ثابت کر دے گا اور اس عاقل کی زبان سے اقرار کرا لے گا کہ میں احمق ہوں اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا۔ اگر اس سے زیادہ دلیل کو جی چاہے تجربہ کر لو کہ چھ مہینے کی رخصت لو پھر محقق کا پتہ ہم سے

پوچھو اس وقت دیکھ لوگے کہ یہ شخص آئے گا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا مگر جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے کہ میں احمق ہوں نہیں بلکہ پہلے احمق تھا کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آ جائے گی۔

تب معلوم ہوگا کہ **اھواء الذین لایعلمون** کا مدلول کیسا یقینی ہے کہ جو چیز شریعت کے مقابلہ میں ہے وہ جہل ہے۔

میں حالانکہ کچھ بھی نہیں مگر جونپور کے ایک شاعر صاحب میرے یہاں آئے جو عرفی تہذیب سے آراستہ تھے۔ میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ، ادنیٰ سے ادنیٰ ہوں۔ اسی طرح دس بیس دفعہ ادنیٰ کی اضافت ادنیٰ کی طرف کی جائے۔ بہر حال میں کچھ بھی نہیں ہوں مگر چند روز رہنے کے بعد جب وہ واپس گئے تو وہاں جا کر انہوں نے ایک رسالہ لکھا۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ عمر بھر جسے ہم تہذیب سمجھا کئے وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی نہیں تھی۔

خیر وہ مر گئے ایک اور دہلی کے طبیب بھی آئے چند روز یہاں رہنے سے وہ بھی یہ کہنے لگے کہ جن کو ہم اب تک کمالات سمجھتے تھے سارے نقائص نکلے اور جنہیں ہنر سمجھتے تھے وہ سب عیوب تھے۔ تو اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر شبہ ہو تجربہ کر لیجئے اس لئے فرمایا **اھواء الذین لایعلمون** جاہلوں کا اتباع نہ کیجئے۔

یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے جسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضر ہے کیونکہ اطمینان اور چین بدوں تقلید کے نہیں ہوتا مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے تو فلانے طبیب کا علاج کریں گے۔ تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے بیماری کا خوف نہیں ہوگا اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا علاج کریں اور اگر تقلید نہیں ہے تو پھر ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں۔ اگر آج ذرا سا تغیر پیش آیا ایک طبیب سے رجوع کیا۔ دوسرا تغیر پیش آیا دوسرے سے رجوع کر لیا۔ تیسرا پیش آیا تیسرے سے رجوع کر لیا۔ تو اس میں دل کو چین نہیں ہوگا اور ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کے تغیر میں کس سے رجوع کریں۔ غرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے چاہے وہ طبیب دانشمند بھی نہ ہو۔ مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائے گا اور اگر وہ تقلید حقائق کے موافق ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔

اگر شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونے کا بھی دعویٰ نہ ہوتا جیسا کہ مدلول ہے

ولا تتبع اهوآء الذین لایعلمون کا تب بھی شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب تو جب کہ شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونا ثابت کر دیا گیا تو اس اتباع کا ضروری مصلحت و موجب طمانیت ہونا اور بھی ثابت ہو گیا۔ آگے وعید ہے۔

انهم لن یغنوا عنک من الله شیئاً

یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے۔

یعنی گو یہ آج مددگار بننے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خدا کے یہاں ذرا کام نہیں آسکتے۔ اس پر اہل حق کو تردد ہو سکتا تھا کہ اتباع کے بعد ہم تو اکیلے رہ گئے اس لئے فرماتے ہیں۔

وان الظالمین بعضهم اولیاء بعض

اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا۔

اس سے تردد رفع ہو گیا کہ اہل اہواء اگر ہم سے الگ ہو گئے تو کچھ پرواہ نہیں کیونکہ خدا تو ہمارے ساتھ ہے۔ آگے مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں اور شریعت میں جو صفتیں ہیں انہیں بتاتے ہیں۔

هذا بصآئر للناس و هدیً و رحمة لقوم یوقنون

قرآن یا شریعت عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت ہے۔

هذا بصائر ۔ بصائر جمع بصیرت کی ہے۔ بصیرت کہتے ہیں باطنی روشنی کو جیسے بصر کہتے ہیں نگاہ یعنی ظاہری روشنی کو تو شریعت بصائر ہے یعنی باطن کو روشن کرنے والی ہے **وهدی** اور سراپا ہدایت ہے کہ اس سے راستہ نظر آتا ہے اور مقصود تک پہنچا دیتی ہے **ورحمة** اور رحمت ہے جو کہ مقصود ہے۔ گویا شریعت تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ ہے جو چند سال پہلے بھی ذہن میں آیا تھا مگر اسے بھول گیا تھا۔ اس وقت پھر یاد آ گیا وہ نکتہ یہ ہے کہ راہ رو کو انہیں تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ جب آدمی مقصود تک جانا چاہتا ہے تو اس کے لئے ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے مقصود تک پہنچ سکتے ہیں اور ایک بصر یعنی نگاہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے راستہ نظر آوے حق تعالیٰ کے قربان جایئے کہ شریعت کو بتلاتے ہیں کہ یہ ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کئے ہوئے ہے۔ **هذا بصائر** یہ

آنکھیں کھلی ہیں وھدی اور راستہ بھی اسی کے ذریعہ سے طے ہوا ہے ورحمۃ اور رحمت ہے یعنی مقصود بھی اسی سے حاصل ہے۔ سبحان اللہ! بصیرت طریق مقصود اسی ایک شریعت میں ہیں۔

اب رہا یہ کہ بصائر کو جمع کیوں لائے اور ہدی ورحمۃ کو مفرد کیوں لائے اس میں نکتہ یہ ہے کہ راستہ چلنے والے تو بہت ہوتے ہیں اور سب کی آنکھیں الگ الگ ہوتی ہیں اس لئے اس کو جمع لائے اور راستہ ایک ہی ہوتا ہے اور مقصود بھی سب کا ایک ہی ہوتا ہے اس لئے وہاں مفرد لائے پھر آگے فرماتے ہیں یہ کہ رحمت تو ہے مگر ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ لقوم یوقنون یقین کرنے والوں کے لئے۔

ضرورت تقلید

یقین کے دو درجے ہیں ایک تقلیدی اور ایک تحقیقی۔ تقلیدی تو یہ کہ احکام کو بلا دلیل مان لو پھر ان احکام کی برکت سے تحقیقی یقین ہو جائے گا جیسے شروع میں الف ب کو محض استاد کے تقلید سے مان لیتے ہو اس کے بعد اسی تقلید کی بدولت بڑے بڑے دیگر علوم کے محقق بن جاتے ہو اگر شروع ہی میں یہ پوچھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ الف ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ جاہل ہی رہو گے اس لئے پہلے کسی محقق کی تقلید کرو پہلے ہی سے محقق بننے کی کوشش مت کرو۔

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی تا راہ بیں نہ باشی کے راہ بر شوی

(اے بے خبر کوشش کرتا کہ باخبر ہو جائے جب تک راستہ نہیں دیکھو گے رہبر کیسے بنو گے)

اور طریقہ محقق بننے کا یہی ہے کہ پہلے تقلید کرو۔

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(ہم اپنے اندر خود حضرات انبیاء علیہم السلام کے علوم بغیر مکتب اور بغیر استاد دیکھو گے)

آج یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ہی سے ابا جان بن جائیں۔ ابھی ماں کا دودھ بھی نہیں چھوٹا مگر باوا بننے کا شوق ہے۔ اجی پہلے پاوا تو بن لو یعنی چارپائی کے پایہ کے برابر تو ہو لو پھر باوا بننا۔ ابھی تو پسر ہو خوب پسر پسر کے سویا کرو۔ جب بڑے ہو گئے تب باوا بھی بن جاؤ گے۔ ہیں تو جاہل کندہ ناتراش مگر یہ ضرور پوچھیں گے کہ کیوں صاحب اس حکم میں کیا راز ہے اور اس کی کیا حکمت ہے۔ میاں پہلے کام تو شروع کرو پھر خود معلوم ہو جائے گا۔

کوئی بادشاہ کے پاس جاتے ہی یہ کہنے لگے کہ میں آپ کے خزانہ کی پڑتال کروں گا ذرا کنجیاں دے دیجئے تو وہاں سے ظاہر ہے کہ نکال دیا جائے گا اگر خزانہ دیکھنا ہے پہلے بادشاہ کی

خدمت کرو۔ ممکن ہے کہ وہ خوش ہو کے خود کہیں جاؤ اسے ہمارے خزانے دکھلا لاؤ۔ اسی طرح یہ اسرار جو خزائن ربی ہیں یہ درخواست سے معلوم نہیں ہوتے بلکہ اطاعت سے حاصل ہوتے ہیں۔

بني اندر خود علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید و اوستا

(حقائق کے مکتب میں استاذ عشق کے روبرو اے بچے چند روز سعی کرو کہ ایک روز باپ ہوئے)

جب وہ خوش ہوں گے تو وہ علوم عطا کریں گے جو کتابوں سے حاصل ہو سکتے تھے نہ استادوں سے۔ بہرحال یقین کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ تقلید سے یقین حاصل کیا جائے اور ایک یہ کہ تحقیق سے اور جو یقین ابتداء میں تقلید سے حاصل ہوگا وہ انتہا میں تحقیق ہو جائے گا۔

خلاصہ تمام بیان کا یہ ہے کہ ہم میں اتباع شریعت کی بے حد کمی ہے اس کا تدارک کرو اور جو کام کرو پہلے شریعت سے تحقیق کر لو۔ مگر تحقیق ایسے سے کرو جو سچی بات بتائے اور جو خود اپنی خواہش نفسانی کو شریعت کے اندر ٹھونسے اور زبردستی غیر دین کو مصالح اور پالیسی کی وجہ سے دین بنائے وہ واقع میں عالم ہی نہیں وہ تو جاہل ہے۔ اس سے مت پوچھو ورنہ وہ اپنے ساتھ تمہیں بھی گمراہ کرے گا۔ اگر کہو کہاں ہے جو سچی بات بتلاوے تو ڈھونڈو ڈھونڈنے سے سب مل جاتا ہے۔ طبیب کیسے مل جاتا ہے اسی طرح سچا صاحب شریعت عالم بھی مل سکتا ہے۔ بہرحال جو کام کرو پہلے استفتاء کرو اور جو عالم ہیں انہیں چاہئے کہ قرآن و حدیث پر عمل کریں اور جو عامی ہیں وہ علماء سے دریافت کر کے عمل کریں اور خواہ اس میں دنیا کا نفع ہو یا نقصان۔ جب ایسا کرو گے تو پھر چند روز میں دیکھو گے کہ خود بخود برکات ظاہر ہوں گے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مصالح کو چھوڑو اور شریعت پر عمل کرو۔ اگر کوئی کہے کہ یہ خلاصہ تو پہلے ہی بیان ہو سکتا تھا پھر اس قدر تفصیل کی کیا ضرورت تھی۔ تو بات یہ ہے کہ تفصیل سے بہت سی زائد باتیں بھی معلوم ہو گئیں اور مضمون کی دل میں وقعت بھی بڑھ گئی ورنہ محض خلاصہ سے اتنا دل نشین نہ ہوتا۔ بہرحال خدا سے دعا کیجئے کہ ہم سب کو اتباع شریعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

نفی الحرج

آسانی دین کے متعلق یہ وعظ ۱۹ محرم الحرام ۱۳۳۱ھ بروز یک شنبہ مدرسہ احیاء العلوم الٰہ آباد میں ہوا۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدی اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان محمد اعبدہ و رسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ و علیٰ الہ و اصحابہ و بارک و سلم. اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن ھو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین من قبل و فی ھذا لیکون الرسول شھیداً علیکم و تکونوا شھداء علی الناس فاقیموا الصلوۃ واٰتوا الزکوۃ واعتصموا باللّٰہ ھو مولکم فنعم المولی و نعم النصیر. (الانبیاء ۷۸)

اس نے تم کو ممتاز فرمایا اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی۔ تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا پہلے بھی اور اس میں بھی تا کہ تمہارے لئے رسول گواہ ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ رہو سو تم لوگ نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہ تمہارا کارساز ہے سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار ہے۔

تمہید: یہ آیت جو میں نے پڑھی ہے اس میں سے صرف جزو اول کا بیان کرنا مقصود ہے اور اس کا تعلق جمعہ کے مضمون سے ہے چنانچہ عنقریب معلوم ہو جائے گا اور یہی وجہ ہوئی اس کے اختیار کرنے کی کیونکہ کوئی نیا مضمون اس وقت ذہن میں نہیں آیا دو وجہ سے ایک تو اس لئے کہ کوئی مقام نہیں بدلا۔ نیز زمانہ بھی دوسرے وعظ کا پہلے کے قریب ہے تو زمان اور مکان دونوں متحد ہیں اور ایسے موقع پر مجمع بھی اکثر ایک ہی ہوتا ہے تو سامعین بھی متحد ہیں اور اس خاص موقع کے اعتبار سے سامعین کے مناسب حال جو مضمون تھا۔ وہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اب کسی دوسرے مضمون کی ضرورت ذہن میں نہیں آئی۔ لہذا اسی گذشتہ مضمون کے متعلق ایک مضمون کو بیان کرتا ہوں اور میں نے بانی جلسہ سے عرض کیا تھا کہ ایک ہی جگہ دو بیان سے کیا فائدہ ہوگا مگر کوئی فائدہ بتلایا نہیں گیا۔ میں نے یہ بھی پوچھا کہ آخر کیا بیان کروں تو یہ کہا گیا کہ

اسی مضمون کے متعلق بیان کر دیا جائے جو جمعہ کو بیان کیا گیا تھا پھر اس کی بھی تعیین نہ بتلائی گئی مگر خود ہی اس کے مناسب مضمون میرے ذہن میں آ گیا اور ہر چند کہ ارتباط مضمون کے لحاظ سے مناسب یہ تھا کہ اسی آیت کی تلاوت اس وقت بھی بیان کی جاتی جو کہ جمعہ کو پڑھی گئی تھی اور اس میں سے یہ مضمون نکل بھی سکتا تھا جو آج بیان ہوگا۔ مگر اس میں سے استنباط کرنا پڑتا اور استنباط اس طور سے ہوتا کہ اس آیت کے آخر میں ہے ویعفوا عن کثیر اور عفو اثر ہے رحمت کا اور سہولت بھی رحمت ہی کا اثر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ سہولت کی رعایت کرتے ہیں اور کسی خاص جزو دین کے ساتھ خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں تو معلوم ہوا کہ دین کی ہر بات میں سہولت مرعی ہے تو استنباط اس طرح ہو سکتا مگر اس آیت میں استنباط کی ضرورت تھی اور یہاں صریح ہے پھر چونکہ قرآن سب ایک ہی ہے اس لئے اس آیت کو بھی یہی سمجھا جائے گا کہ وہی ہے اس لئے تلاوت کے لئے اس آیت کو ترجیح دی مضمون کا حاصل یہ ہے اور اسی سے دونوں مضمونوں میں تعلق بھی قائم ہو جائے گا۔

عقلاء کے اشکالات

جمعہ کے روز میں نے بیان کیا تھا کہ جو کچھ مصیبت آتی ہے ہمارے اعمال کی خرابی سے آتی ہے اور اس کا علاج اعمال کی درستی ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہمارے اوپر یہ مصائب دینی سستی کی وجہ سے ہیں۔ پس دین کو درست کیا جائے۔

اس پر ایک اشکال بعض لوگوں کے دل میں وارد ہوا کرتا ہے وہ یہ کہ مرض کا سبب اور اس کا علاج دونوں معلوم ہو گئے مگر اتنی بات رہ گئی کہ تدبیر کبھی آسان ہوتی ہے کبھی دشوار۔ جو تدبیر بتلائی گئی ہے اس میں قابل غور یہ بات ہے کہ وہ آسان ہے یا دشوار۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ سخت دشوار ہے۔ پس دوا تو بتلائی مگر ایسی جو امریکہ سے ملے گی اس تجویز کی تو وہ مثل ہوگئی کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود (جب تک تریاق عراق سے لایا جائے گا سانپ کا ڈسا ہوا مر چکا ہوگا)

دین کی اب بلاشبہ ایسی حالت ہوگئی کہ بالکل تباہ ہو رہا ہے مگر ساتھ ہی دیندار بننا بھی سخت دشوار ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اس کا مشاہدہ بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ دیندار کو سخت دقتیں پیش آتی ہیں۔ مال میں تو یہ کہ سود حرام ہے قمار (یعنی جوا) حرام ہے۔ رشوت حرام ہے۔ یہاں تک تو زیادہ وحشت نہیں ہوتی کیونکہ بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سود بھی نہیں لیتے۔

رشوت کا مال بھی نہیں کھاتے تو ان چیزوں سے اپنے دین کو بہت لوگ محفوظ سمجھتے ہیں۔ لیکن ان میں وسعت اتنی ہے کہ بہت دور تک ان کا اثر پہنچتا ہے۔ اکثر لوگ سود صرف اس کو سمجھتے ہیں کہ روپیہ دے کر سوا روپیہ لے لیں۔ رشوت اس کو سمجھتے ہیں کہ ظلم کر کے کام کے عوض میں لیں۔ قمار اس کو سمجھتے ہیں کہ چٹ پٹ ہو جائے مگر حقیقت میں یہ ابواب بہت وسیع ہیں۔ پس جو لوگ ناواقف ہیں ان سے یہ تو کہا ہی جائے گا کہ واقفیت پیدا کرلو۔ اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ ہر معاملہ فاسدہ ربوا ہے علی ہذا رشوت نام ہے ہر غیر متقوم چیز پر عوض لینے کا اور یہ بات جلدی سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ یہ تو ابواب فقہ کے متعلق ہے مگر میں ایک مختصر سا رسالہ بتاتا ہوں جس میں رشوت کے متعلق اچھی تقریر آپ کو معلوم ہوگی اور اس رسالہ کا نام **ازالۃ الغشوہ** ہے جو تحذیر الاخوان کا ایک جزو ہے یہ ایک رسالہ سود کے متعلق ہے علی ہذا قمار میں بھی بڑی وسعت ہے تو جان کا بیمہ وغیرہ یہ سب قمار میں داخل ہیں۔ تو آمدنی کی اکثر صورتیں آج کل سود یا رشوت یا قمار میں داخل ہیں۔ تو جو دیندار بننا چاہے اس کو ہر جگہ ہر وقت رکاوٹ پیش آتی ہے۔

مثلاً ایک شخص نے اپنے ورثہ کے لئے کچھ روپیہ جمع کرنا چاہا کہ دس دس روپیہ سالانہ یا ماہوار کسی کمپنی میں داخل کرتا ہے تاکہ ورثا کو دو ہزار روپے اس کے بعد مل جائیں۔ اتفاق سے ایک مولوی صاحب سے جو پوچھا تو انہوں نے ناجائز کہہ دیا۔ یا دوسری صورت نکالی کہ پرامیسری نوٹ خریدے تھے ایک دوسرے مولوی صاحب نے اس کو بھی ناجائز بتلا دیا گویا مولویوں نے عہد کرلیا ہے کہ ہر بات کو ناجائز کہو۔ اسی سے لوگ متوحش ہیں علی ہذا اور ابواب آمدنی کے بکثرت حرام ہیں۔

یہ تو مال کی دشواریاں تھیں اب جاہ کی کیفیت سنئے۔ کسی مولوی صاحب کی زبانی سن لیا تھا کہ **من تشبہ بقوم فھو منھم** (جس شخص نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی۔ وہ انہی میں سے ہوگا) اس پر کسی نے عمل بھی کرلیا اور کوٹ پتلون پہننا چھوڑ دیا مگر اب حالت یہ ہے کہ کوئی عزت نہیں کرتا نہ پلیٹ فارم پر نہ کہیں اور اب افسوس ہوتا ہے کہ اچھی دینداری اختیار کی کہ عزت و جاہ ہی جاتی رہی سقوں جولاہوں تک کو اس شخص کے مقابلہ کی جرات ہو گئی۔ یہ جاہ پر اثر پڑا۔ علی ہذا ہر امر میں دیندار کو دقت ہی پیش آتی ہے اور ایک یہ اثر ہوا کہ دینداری اختیار کرنے سے پہلے سارے جاڑے تندرست رہتے تھے۔ اب جو صبح کے وقت اٹھے اور وضو کرنا پڑا تو ساری سردی چھینکیں ہی آتی رہتی ہیں۔

ایک مولوی صاحب ہمارے دوست للت پور میں تھے۔ ایک رئیس کے ہاں لڑکوں کو پڑھاتے تھے اور نماز بھی پڑھایا کرتے۔ اتفاق سے ان لڑکوں کو زکام ہو گیا۔ ان لڑکوں کی ماں مولوی صاحب کو کوسا کرتی تھی کہ اچھی نماز پڑھوائی کہ بچے بیمار ہو گئے۔

اسی طرح روزہ ہے کہ بعض موسموں میں نہایت سخت ہوتا ہے کہ بجز پکے دیندار شخص کے ہر شخص رکھ نہیں سکتا۔ اگر ایسا روزہ دوسری قوموں میں ہوتا تو وہ اس کو دوسرے موسم میں تبدیل کر لیتے۔

چنانچہ ایک مسلمان رئیس کسی بڑے انگریز حاکم سے ملنے کے لئے گئے تو اس انگریز حاکم نے پوچھا کہ نواب صاحب ہم آپ کو دبلا پاتے ہیں اس کی کیا وجہ۔ مسلمان رئیس نے جواب دیا کہ گرمی کا موسم ہے اور آج کل ہمارے یہاں رمضان کا مہینہ ہے ہم روزہ رکھتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ آپ اپنے علماء سے کیوں نہیں درخواست کرتے کہ کمیٹی کر کے دوسرے موسم میں منتقل کر دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا دین کمیٹی پر نہیں۔

تو روزہ میں یہ دقت پیش آئی کہ گرمی کے دن پہاڑ ہوتے ہیں پیاس کے مارے ہونٹ خشک ہیں مگر کھانا پینا بند ہے یہ بھی کوئی مولوی صاحب فتویٰ نہیں دیتے کہ بجائے گرمی کے جاڑوں میں رکھ لینا۔

اب حج کی سنیئے حج کرنے کے لئے گئے تھے وہاں کہیں آب و ہوا کے اختلاف سے بیمار ہو گئے۔ کہیں کسی کو بدوؤں نے کوٹا پیٹا۔ اب جو واپس آئے تو سب سے کہتے ہیں کہ حج کرنے مت جاؤ۔ بڑی مصیبت کا سفر ہے۔ ان سب دشواریوں کو دیکھ کر اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ اشکال واقع ہوتا ہے کہ علاج تو ٹھیک ہے مگر تلخ اتنا ہے کہ مر جانا سہل ہے تو وہ مثل ہوئی کہ پنچوں کا کہنا سر پر مگر پرنالہ ادھر ہی کو اترے گا۔ ایسے مولویوں کا کہنا سر پر مگر۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

جب یہ اشکال ہے تو ہم دیندار کیسے بنیں۔ یہ تو عقلاء کو اشکالات پیش آتے ہیں۔

جہلا کے اشکالات

ایک جہلاء کو اشکال پیش آتا ہے کہ جب نماز وغیرہ دینداری کے کام شروع کئے مالی نقصان ہونا شروع ہو گیا آج بھینس مر گئی کل بیل مر گیا دو چار دن بعد بیٹا مر گیا۔

ایک بڈھا دیہاتی تھا کہ بیٹے اس کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک مولوی صاحب نے

اس سے کہا کہ کم بخت نماز تو پڑھ لیا کر۔ پہلے ہی دن نماز پڑھی تھی کہ بھینس مر گئی اس کے بیٹوں نے کہا کہ باوا نماز مت پڑھا کرو۔ اس نے کہا تو پھر میری خوب خدمت کرو۔ انہوں نے وعدہ کیا اب ذرا خدمت میں کوتاہی کرتے وہ دھمکاتا کہ میں پھر نماز شروع کر دوں گا۔ وہ ڈر جاتے اور خدمت شروع کر دیتے۔

مدرسہ جامع العلوم میں بعض خیر خواہوں نے یہ تجویز کی تھی کہ لوگوں کے گھروں میں مدرسہ کے نام سے گھڑے رکھ دیئے جائیں کہ اس میں روزانہ ایک چٹکی آٹے کی ڈال دیا کریں۔ چند روز میں بآسانی طلبہ کے لئے بہت سا آٹا جمع ہو جائے گا۔ ان ہی گھروں میں سے ایک گھر میں اتفاق سے ایک لڑکا مر گیا انہوں نے مدرسہ کا گھڑا پھینک دیا کہ اس کی نحوست سے لڑکا جاتا رہا۔

مجھے اس پر ایک حکایت حیدرآباد کی یاد آئی کہ ایک بزرگ سے پیر پر پیر رکھ کر لیٹنے کی نسبت ایک شخص نے پوچھا کہ سنا ہے کہ یہ طریقہ منحوس ہے حالانکہ حدیث میں اس طریقہ سے ممانعت بھی آئی ہے مگر ممانعت اس ہیئت کی ہے کہ جس میں بے پردگی ہو جائے ان بزرگ نے جواب دیا کہ ہاں بھائی منحوس تو ہے ہی اور ایک یہی کیا ساری سنتیں اور احکام شرعیہ منحوس ہیں۔ رشوت حرام کر دیا۔ یہ ایک کھلی نحوست ہے کہ مال نہ بڑھ سکا۔ زکوٰۃ واجب کر دی یہ بہت ہی بڑی نحوست ہے کہ جو جمع کیا تھا اسے فضول خرچ کرا دیا۔

نیز کبھی احکام شرعیہ کے ماننے والے کا امتحان بھی ہوتا ہے کہ یہ محبت سے احکام مانتا ہے یا محض دنیوی نفع کر لئے نیز کبھی حق تعالیٰ کو اس فرمانبردار پر یہ رحمت کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ دنیائے مضر سے اس کو بچاتے ہیں۔

باطنی دولت

اس کے متعلق مجھے ایک حدیث یاد آئی کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں حاضر ہوا اور کہا **انی احبک یا رسول اللہ** کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا **اعلم ما تقول** کہ جو کہہ رہے ہو سمجھ کر کہو (مطلب یہ کہ میری محبت آسان چیز نہیں اس میں بڑی آزمائش ہوتی ہے) اس نے عرض کیا کہ واقعی محبت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ **فاعد للفقر تجافاً** (المستدرک للحاکم ۴:۳۳۱) (یعنی فقر و فاقہ کے

لئے اپنے آپ کو تیار کر لے) اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے اس کی طرف فقر و فاقہ اس طرح آتا ہے جیسا کہ سیلاب نشیب کی طرف دوڑ کر آتا ہے جو میری حالت ہے وہی تمہاری ہوگی المرء مع من احب (آدمی قیامت کے دن اس کے ہمراہ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہوگا) اور اگر حضور جیسی حالت کسی کو بھی پیش نہ آئے تو حضور کے محب کو اس حالت سے محبت تو ضرور ہوگی۔ تو وہ اس کے آنے پر ہر وقت تیار تو رہے گا نیز جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں جب یہ شخص خدا کا محبوب ہوگا تو ہو اس کو مضرات سے ضرور بچائیں گے۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے خاص بندوں کو دنیا سے اس طرح بچاتے ہیں جیسے تم استسقاء کے مریض کو پانی سے بچاتے ہو۔ اس لئے دیندار کو ایک بددین کے برابر تمول تو ہرگز نہیں ہوگا مگر اس کو ایک دوسری دولت ایسی ملے گی کہ یہ تمول اس کے سامنے گرد ہے اور یہ وہی دولت ہے جس نے حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے تخت سلطنت چھڑا دیا مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ تخت چھوڑ دینا دولت باطنی کے ساتھ ہر ایک کو ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ اہل باطن دل سے تو ہمیشہ اس کو چھوڑ ہی دیتے ہیں یعنی اس کی طرف ان کو رغبت نہیں ہوتی۔ پھر جو منتہی ہوتے ہیں وہ ظاہر میں اس کو نہیں چھوڑتے کیونکہ وہ متحمل ہوتے ہیں چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کے متحمل تھے۔ مگر اب عموماً طبائع اس کے متحمل نہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی کی جیب کمزور ہو اور اس میں دس اشرفیاں اور دس روپے بھرے ہوئے ہوں تو روپے کو نکال کر جیب سے الگ کر دیں گے اور اگر کسی کی جیب مضبوط ہے اس کو نکالنے کی ضرورت نہیں اسی طرح مبتدی کو بھی اسباب ظاہرہ کا ترک زیب نہیں جس سے آثار ترک کا تحمل نہ ہو سکے۔ ایسے ہی موقع پر عالمگیر کا شعر ہے۔

شنیدم ترک منصب کرد عاقل خاں بنادانی — چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

(میں نے سنا کہ عاقل خان نے نادانی سے اپنا منصب ترک کر دیا عقلمند آدمی ایسا کام کیوں کرے کہ بعد میں پشیمانی ہو)

اسی وجہ سے ہمارے حضرت قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ نوکری خود نہ چھوڑو۔ جب توکل غالب آجائے گا تو سارے اسباب خود بخود چھوٹ جائیں گے مگر چھوڑنے میں جلدی نہ کرے کہ پھر ندامت ہوتی ہے۔

غرض باطنی دولت والے کو تمول سے بھی رغبت نہیں رہتی۔ لہذا وہ معنا تارک ہی ہوتا ہے مگر بعض اوقات ترک صوری میں بھی مصلحت ہوتی ہے اور چونکہ رغبت نہیں ہوتی اس لئے یہ شخص چھوڑ کر پچھتاتا بھی نہیں بلکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر پھر ملتی تو اور نفرت زیادہ ہوتی۔

جناب حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سلطنت چھوڑنے کے بعد ایک وزیر آیا کہ آپ کے سلطنت چھوڑ دینے سے لوگوں کو قلق ہے۔ فرمایا الحمدللہ مجھے قلق نہیں۔ فقیری میں بہت راحت ہے اس نے پوچھا فقیری میں کیا راحت ہے۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ سارا کام آپ کو خود ہی کرنا پڑتا ہے نہ کوئی نوکر اور نہ کوئی خادم۔ اس میں تکلیف ہے۔ جب اس نے بہت ہی اصرار کیا تو آپ نے اپنا ایک ظاہری تصرف دکھلایا کہ سمندر کے قریب جا کر ایک سوئی اس میں پھینک دی اور فرمایا کہ اے سمندر کی مچھلیو! میری سوئی گری ہے نکال کے دو صدہا مچھلیاں چاندی سونے کی سوئیاں منہ میں لئے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ آپ نے فرمایا وہی سوئی لوہے کی میری لا دو۔ ایک مچھلی آئی اور وہی سوئی لے کر رکھ گئی۔ اس وقت وزیر کو معلوم ہوا کہ اس فقیری سے حضرت ابراہیم کو اتنی عظیم الشان سلطنت حاصل ہو گئی ہے کہ ہر چیز ان کے کہنے میں ہے اور اس کے مذاق کے موافق آپ نے ایک مثال دکھلائی ورنہ اصل دولت کے سامنے یہ کیا چیز ہے۔

ایک دوسرا واقعہ اور ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے وضو کے لئے پانی لینے کو ڈول کنویں میں ڈالا ڈول چاندی سے بھرا ہوا آیا۔ دوسری مرتبہ سونے سے بھرا ہوا آیا۔ تیسری مرتبہ جواہرات سے۔ تو آپ نے آسمان کی طرف منہ کر کے عرض کیا کہ میری تو نماز کا وقت جا رہا ہے۔ اس وقت امتحان نہ لیجئے۔ مجھے پانی کی ضرورت ہے اس سونے چاندی کو لے کر میں کیا کروں گا۔

ان دونوں حکایتوں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ حضرات دنیا کو چھوڑ کر پچھتائے نہیں بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا جتنی زیادہ ہوتی ہے اسی قدر زیادہ کوفت ہوتی ہے۔ آخر کار چھوڑنی پڑتی ہے۔ تو اصل تارک تو اہل تمول ہی ہیں اور تارکین میں سے کوئی بھی تارک نہیں کیونکہ ان کی اول سے ہی یہی رائے ہوتی ہے کہ دنیا اس قدر جمع نہ کی جائے جس کو چھوڑنا پڑے۔ اور اہل تمول کی آخری رائے یہی ہوتی ہے کہ اس کو چھوڑ کر ہلکا ہونا چاہئے۔

گو بعض کے لئے خدا تعالیٰ کو منظور ہی یہ ہوتا ہے کہ دنیوی تعلقات میں بھی پھنسے رہیں تا کہ مخلوق کو نفع پہنچے اور ان کی ظاہری و باطنی حالت کو درست کیا جائے جیسے کہ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ مگر یہ حضرات باوجود ان تعلقات کے بھی دنیا کی طرف دل سے مشغول نہیں ہوئے۔

حضرات خلفاء کی یہ حالت تھی کہ پھٹے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور رعب تھا کسریٰ و قیصر پر تو اس قسم کا تعلق جو ان حضرات کو دنیا سے ہوتا ہے وہ تو عین عبادت ہے اس سے چنداں کلفت نہیں ہوتی۔ موجب کلفت و باعث خسارہ تعلق دنیاوی ہوتا ہے خیر یہ گفتگو تو استطرادی تھی۔

طریق علاج مصائب

اصل گفتگو یہ تھی کہ علاج تو مصائب کا دینداری ہے مگر اس علاج اور تدبیر پر یہ اشکال پیش آتا ہے کہ یہ تو سخت دشواری ہے کوئی آسان طریقہ بتلاؤ۔ اور اسی پر ایک دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ وہ آسان تدبیر بتلائے کون۔ کیونکہ ہم شارع نہیں ہیں۔ جو اس کو بدل دیں اور اگر بدلیں بھی تو ہمارے بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ اس دین کے خود محافظ ہیں۔ اگر ہم بدل بھی دیں گے تو مسلمان خود اس کو نہیں مانیں گے اور اگر کہو کہ خیر تم بھی مجبور ہو خدا تعالیٰ ہی کو آسان علاج بتلانا چاہیے تھا۔ تو اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ جس کو جرأت ہو خدا تعالیٰ سے جا کر عرض کرے ہمیں اس کے جواب کی ضرورت نہیں چونکہ ہم خدا تعالیٰ کے غلام ہیں اور غلام سے آقا پر اعتراض سنا نہیں جاتا اس لئے ہم بھی جواب بتلاتے ہیں مگر پہلے ایک سوال ہم آپ سے کرنا چاہتے ہیں پھر تمہارے اس سوال کا جواب خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

اگر کسی مریض کے لئے طبیب نے ایک نسخہ تجویز کیا ہو کہ اس کے مرض کے لئے وہی مناسب ہو اور مریض یہ کہے کہ حکیم صاحب یہ بہت دشوار اور سخت علاج ہے کہ آسان تدبیر بتلائیے۔ غور کر کے فرمائیے کہ حکیم صاحب اس کو کیا جواب دیں گے۔ ظاہر ہے کہ نسخہ چاک کر کے پھینک دیں گے اور کہیں گے معلوم ہوتا ہے تجھ کو مریض ہی رہنا پسند ہے جو ذرا سی دشواری سے گھبراتا ہے۔ حکیم صاحب کو معالج ہونے کے لحاظ سے مرض کے مناسب دوا تجویز کرنی چاہئے سہل ہو یا سخت۔ اور مریض کو اگر اپنا مرض زائل کرنا مقصود ہے تو اس مناسب تجویز پر عمل کرنا چاہئے اگر سہولت اور سختی پر اس کی نظر ہوگی تو حکیم بجز اس کے کہ اپنا نسخہ واپس لے لے گا اور کیا کرے گا۔

یہ تو حق تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ انہوں نے آپ کی اصلاح میں دریغ نہیں کیا ورنہ ان کو کیا غرض پڑی تھی جو کوئی دیندار بنے اپنے لئے بے دین بنے تو اپنے لئے۔ جو اعمال تجویز کئے ہیں وہ بالخاصہ ہمارے امراض کے لئے مفید ہیں۔ اب کسی کو شفاء ہی کی ضرورت نہ ہو تو اس کا کیا علاج اور طالب شفا کو اس پر نظر کرنی کب زیبا ہے کہ یہ سہل ہے یا دشوار۔ اس کو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ میرے مرض کے لئے بھی مفید ہے یا نہیں۔

تو اب عقلاء کو تو شک رہا نہ ہوگا کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ذاتی ہوتی ہے کہ اس کی جگہ دوسری چیز وہ نفع نہیں دے سکتی۔ تو ان اعمال کا بھی ایک خاصہ ہے جو بدوں ان کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور اگرچہ یہ بناء فاسد ہے کیونکہ متدین خوش عقیدہ خود خواص اشیاء ہی کا اس درجہ میں قائل نہیں کہ وہ اس کی خاصیت ذاتی ہو جس کا انفکاک نہ ہوسکے یا عموم نہ ہوسکے لیکن مدعیان عقل فلسفی طبع لوگوں پر تو یہ حجت ہے اس لئے الزام کے طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ جب یہ عذر علاج جسمانی میں کبھی نہیں کیا جاتا تو علاج روحانی میں سہولت دشواری پر کیوں نظر ہوتی ہے۔

دینداروں کا اشکال

البتہ متدین لوگوں کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ تو اعمال کی خاصیت بدلنے پر قادر ہیں۔ ایک دشوار سے دشوار عمل کی خاصیت ایک آسان عمل میں پیدا کر سکتے ہیں۔ طبیب ظاہری چونکہ تبدیل خاصیت سے مجبور ہے اس لئے وہ بجز اس کے کہ مریض طالب سہولت کو جواب دے دے اور کیا کر سکتا ہے مگر حق تعالیٰ تو قادر ہے۔ اس لئے وہ سوال باقی ہے۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ بے شک خاصیت کے بدلنے پر قادر ہیں مگر جن حکمتوں کی وجہ سے وہ خواص ایک عمل میں رکھے ہیں بدلنے کی صورت میں وہ خاص حکمتیں باقی نہ رہتیں۔ اس سے آگے سرحد ملی ہوئی ہے قدر کی۔ اس میں ہم زیادہ گفتگو نہیں کر سکتے۔ مگر ایک نظیر سے آپ اس کو کسی قدر سمجھ سکتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفۃ الارض بنانے کے لئے پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے عرض کیا تھا کہ **یسفک الدماء** تو حق تعالیٰ نے فرشتوں کو دو جواب دیئے۔ ایک تو حاکمانہ جواب دیا کہ **انی اعلم مالا تعلمون** (میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے) میرے معاملات کی تمہیں کیا خبر۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند
(سلطنت کے امور سے بادشاہ ہی خوب واقف ہوتے ہیں)

میں اپنے معاملات کا تم لوگوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ دوسرا جواب حکیمانہ دیا کہ **علم ادم الاسماء کلها الایۃ** (اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو سب چیزوں کا) تمام اوصاف اور اسماء اور خواص اشیاء کے جن سے کہ ان کو کام پڑنے والا تھا۔ تعلیم فرما

دیئے تا کہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوں۔ خواہ وہ تصرف کسی قسم کا ہو۔ کیونکہ تصرف ایک تو جمادات وغیرہ میں کرے گا اور ایک تصرف کرے گا خود انسان میں کہ اس کی اصلاح کرے گا اور یہ ظاہر ہے کہ اصلاح وہی کر سکتا ہے جو خوب اچھی طرح محل اصلاح کے اوصاف و خواص سے واقف ہو۔ غرض سب سکھلا دیا پھر فرشتوں پر پیش کیا اور پھر فرشتوں سے فرمایا کہ **انبئونی باسماء ہؤلآء ان کنتم صادقین** اگر تم سچے ہو ان کے نام بتلاؤ اور اسماء کی تخصیص محض ذکری ہے۔ مقصود مع اوصاف وخواص بتلانا ہے پھر فرشتوں نے حق تعالیٰ سے اپنے عجز کا اقرار کیا اور کہا **سبحنک لاعلم لنا الا ما علمتنا الایۃ** (آپ تو پاک ہیں ہم کو علم نہیں مگر وہی جو آپ نے ہم کو سکھلایا ہے) پھر حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم ان کے نام بتلاؤ **قال یاادم انبئھم باسمائھم** (حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم! تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے نام) پس آدم علیہ السلام نے سب بتلا دیا **فلما انباھم** جب آدم علیہ السلام نے نام بتلا دیئے تو **قال الم اقل لکم الایۃ** حق تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ خلافت کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ان کو تعلیم فرمائی۔

جواب اشکال

اب اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جو چیزیں آدم علیہ السلام کو بتلائیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے تھے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو امتحان میں اس طرح شریک کریں کہ ایک کو تو پندرھویں مقالہ کی شکل اول خلوت میں سکھلا دیں اور دوسرے سے اسی شکل میں بغیر سکھلائے ہوئے امتحان لیں۔

اس شبہ کا جواب سننے کے قابل ہے کہ یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تنہائی میں اسماء وغیرہ بتلائے تھے اور جب ثابت نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے سامنے ہی بتلایا ہو۔ اور یہی احتمال خدا تعالیٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے۔ تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہو سکتی بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہوگی کہ پندرھویں مقالہ کی شکل اول دونوں طلباء کے سامنے بیان کی گئی اور امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت بتلا سکا اور دوسرا نہیں بتلا سکا۔ اعتراض جو وارد ہوتا ہے۔ اول صورت میں ہوتا ہے اور اس پر منع کافی ہے اور اگر وہ

احتمال بالفرض راجح نہ سہی مگر احتمال تو ہے کہ فہرست سب کے سامنے پیش ہوئی اور پھر جب آدم علیہ السلام نے تو بتلا دیا اور فرشتے نہ بتلا سکے کیونکہ علم کے واسطے استعداد کی ضرورت ہے اول علوم کی استعداد بشر ہی میں تھی۔ مثلاً بھوک کی حقیقت کہ جبرئیل علیہ السلام نہیں سمجھ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی بوجہ عدم استعداد اس کی حقیقت نہ بتلا سکے تو حق تعالیٰ نے اس امتحان سے یہ بتلا دیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور وہی شرط تھی خلافت کی۔

اب ایک شبہ اور رہا کہ جب آدم علیہ السلام نے ان کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھ سکے ہوں گے تو ان میں بھی استعداد ثابت ہوگئی مگر یہ محض لغو اعتراض ہے کیونکہ بتلانے کے لئے مخاطب کا سمجھ لینا لازم نہیں اور اس لئے انباء فرمایا علم نہیں فرمایا۔ تعلیم کے معنی ہیں سمجھا دینے کے اور انباء کے معنی ہیں اخبار کے یعنی تقریر کر دی گو مخاطب نہ سمجھا ہو بہر حال استعداد کی ہر علم کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔

خاصیت اعمال

اس تقریر پر یہی اعتراض پڑتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ خاصیت ہی بدل دیتے اور وہ استعداد ملائکہ میں پیدا کر دیتے تو وہ بھی سمجھ لیتے جواب یہ ہے کہ خاصہ اس کو کہتے ہیں کہ اس ذات کے علاوہ کسی اور ذات میں نہ پایا جائے ورنہ خاصہ نہ رہے گا تو استعداد جو خاصہ بشر ہے ملائکہ میں کیسے پائی جاسکتی ہے اور اگر کہو کہ اول ہی فرشتوں کو بشر کر کے خلیفہ کر دیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے اس میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کو بشر کیوں نہیں کیا اس کی نسبت صرف یہی کہا جائے گا کہ۔

حدیث مطرب ومی گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

مطرب و مے کی بات کر زمانے کے راز تلاش نہ کر کہ کسی نے حکمت سے اس معمہ کو نہیں کھولا۔

اور یہیں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا شفقت ہے کہ مسئلہ قدر میں گفتگو کرنے سے منع فرمایا کیونکہ اس میں سوالات کا انقطاع نہیں ہوتا تو اس کو حضور نے اول ہی میں فرما دیا۔

اول ما آخر ہر منتہی است

غرض جو کام بڑے بڑے عقلاء ٹھوکریں کھا کر کرتے حضور نے اول میں ہی بتلا دیا۔
پس اسی طرح اس سوال کا جواب ہم نہیں دے سکتے کہ خاصیت اعمال کی بدل دیتے جیسے

وہاں فرشتوں کو بشر کر دینے کا اعتراض تھا تو غرض یہ ہے کہ ہر گناہ کی ایک خاص خاصیت حق تعالیٰ نے پیدا کر دی اور اس کا ایک علاج مقرر کر دیا۔ تو اب یہ اعتراض لغو ہے کہ جو خاصہ نماز کا ہے وہ بدوں نماز ہی کے کر دیتے تو یہ اشکال بھی مندفع ہو گیا۔ بس اب معلوم ہوا کہ اول امراض کا علاج انہیں اعمال میں ہے۔ اب وہ مثال توضیح کے لئے طبیب کی کافی ہو گئی کہ جیسے طبیب علاج کو خاص دوا میں منحصر کرتا ہے اور اس پر اعتراض کرنا لغو ہے اسی طرح خدا تعالیٰ پر یہ شبہ کرنا لغو ہے۔ تو یہ اعتراض کہ خدا تعالیٰ نے اصلاح کو ان ہی موجودہ احکام میں منحصر کیوں کیا نہ خدا پر ہو سکتا ہے نہ مولویوں پر۔ کیونکہ اول تو مولوی احکام کو مشروع ہی کیوں کرتے اور اگر کرتے تو ان کے کرنے سے ہوتا ہی کیوں۔ بلکہ ایسا ہوتا جیسا کہ ایک رند نے کسی واعظ سے یہ سن کر کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی کہا تھا کہ بارہا کردیم وشد۔ اعمال کی صورت تو ہو جاتی مگر واقع میں ان کی روح تو نہ ہوتی۔ البتہ اس کا خدا کو بے شک اختیار تھا مگر اب تو وحی بھی منقطع ہو گئی۔ اب تو احتمال ہی نہیں اور وحی کے وقت بھی کیوں ہوتا۔

ولو اتبع الحق اهوآء هم لفسدت السموات والارض

اگر دین حق ان کے خیالات کے تابع ہو جاتا تو تمام آسمان اور زمین میں فساد ہو جاتا۔

وہ قانون ایسا ہوتا جیسے بہت سے ڈاکو جمع ہو کر کہیں کہ ہم سے مشورہ کر کے قانون بنائیو کہ ڈکیتی کو جائز کہہ دو تو مجلس وضع قانون کی یہ کہے گی کہ اگر قانون تمہاری خواہش کے تابع ہو تو تمام عالم میں فساد ہو جائے گا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ فرماتے ہیں تو معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ میں تبدیل تو ہو سکتا نہیں۔ تو یہ ہوس تو گئی مگر صرف یہ اشکال رہا کہ دشوار تو ہے۔

یہ ہے اشکال جو بہت بڑا عقبہ ہے اور یہی مانع ہے مسلمانوں کو اتباع شریعت سے۔ مسلمان دلائل سے مان تو ضرور جاتے ہیں۔ خصوصاً انقلاب عالم کو دیکھ کر اکثر عقلاً اقرار بھی کرنے لگتے ہیں کہ شریعت کے چھوڑنے کی ساری خرابی ہے۔ مگر اقرار بھی اسی وقت تک ہے جب تک کہ الفاظ ہی الفاظ ہیں کچھ کرنا نہیں پڑا کیونکہ الفاظ تو شیریں ہی ہیں باقی کرنے کے نام صفر۔

مجھے الفاظ پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص مرا۔ اس کا ایک بیوقوف بیٹا تھا۔ جب باپ مرنے لگا تو اس نے سوچا کہ یہ ہے بیوقوف اور آئیں گے تعزیت کرنے والے۔ خدا جانے ان کے ساتھ کس بے تمیزی سے پیش آئے گا۔ اس لئے اس کو مناسب دستور العمل

[illegible] بنا مناسب ہے۔ [illegible] ان سے وصیت [illegible] جو شخص [illegible] سے اس کو اونچی جگہ بٹھلانا اور اس سے نرم اور شیریں کلام کرنا اور اس کو عمدہ کھانا کھلانا اور بھاری کپڑے پہن کر اس سے ملنا۔ اتفاقاً ایک شخص پہنچا آپ نے حکم دیا کہ ان کو اونچی مچان پر بٹھلاؤ اور خود جوڑا بدلنے لگے بھاری قالین اور دریاں لپیٹ کر تشریف لائے۔ اب مہمان جو بات کرتا ہے اس کے جواب میں گڑ اور روئی ارشاد ہوتا ہے پھر کھانے کے وقت گوشت آیا ذرا سخت تھا۔ مہمان نے شکایت کی تو آپ فرماتے ہیں میاں کے لئے پچاس روپیہ کا کتا کاٹ ڈالا آپ کو پسند ہی نہ آیا مہمان حیران کہ ہر فعل عجیب ہے وجہ پوچھنے پر سب کی توجیہ فرمائی۔ چنانچہ گڑ اور روئی کی وجہ نرم اور شیریں الفاظ کی وصیت بتلائی۔

تو جیسے اس نے معنی سے قطع نظر کر کے صرف نرمی اور شیرینی پر دلالت کرنے والے الفاظ یاد کر لئے تھے ایسے ہی ہمارے بھائیوں نے محض الفاظ یاد کر لئے کہ مذہب ضروری چیز ہے۔ اس میں پختگی کرنی چاہئے مگر میں ڈرتا ہوں کہ جب ان کو عمل کے لئے کہا جائے گا اس وقت خاصی مشکل ظاہر ہو گی اور پھر وہی سوال دشواری کا پیش کریں۔ اس لئے ضروری ہے کہ عمل کے وقت کی دشواری کے متعلق ان کو بتلایا جائے کہ آیا دین دشوار ہے یا نہیں۔

دین اور دشواری

سو ایک جواب تو معروض ہو چکا کہ اگر دشوار بھی ہو تو خواص مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل کے لئے قبول کرنا چاہئے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ واقع میں دین میں دشواری ہی نہیں۔ یہاں اسی جواب کو فرماتے ہیں کہ **ماجعل علیکم فی الدین من حرج** (نہیں کی تم پر دین میں کچھ تنگی) اور کیسی بے فکری سے کہتے ہیں۔ آخر خدا ہیں نا۔ اگر کوئی بندہ ہوتا تو ایسے موقع پر کہ ایک عالم دشواری کا مدعی ہو خدا جانے کتنی تمہیدوں کے بعد جواب دیتا۔ یہاں ایک دم سے نہایت پرزور لہجہ میں حرج کی نفی فرما دی۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بڑا انجینئر جرثقیل سے ایک بڑے بھاری بوجھ کو اٹھا رہا ہو اور ایک گنوار کہے کہ اس کو یہیں رہنے دو کہ مصلحت ہے تو وہ نہایت لاپرواہی سے کہے گا کہ نہیں یہ وہیں جائے گا اور خدا کی بڑی شان ہے ان کو وجوہ بتلانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب اہل تحقیق اپنی خاص شان میں ہوتے ہیں تو محض عوام کے نہ ماننے کی ضرورت سے

اسرار و نکات اور وجوہ نہیں لایا کرتے ہاں کبھی اس کے پر پرزے بھی بیان کر دیتے ہیں چنانچہ خدا تعالیٰ نے بھی کہیں کہیں بیان کیے ہیں۔ اس لئے محققین نے کہا ہے کہ۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

یعنی مدعی اور ظاہر پرست کے سامنے عشق اور مستی کے اسرار مت بیان کرو۔ ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو۔

بخلاف غیر محقق کے کہ اس پر جب اعتراض ہوتا ہے وہ بھڑک اٹھتا ہے اور زور شور کی تقریر شروع کر دیتا ہے اور محقق بھڑکتا نہیں بلکہ سارے جوابوں کو طے کر کے اوپر پہنچتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات جواب ہی نہیں دیتا۔ پس جواب نہ دینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یا تو جواب سے نیچے ہو کہ جواب تک نہ پہنچا ہو یا اوپر ہو کہ اس سے بھی عبور کر گیا ہو محقق کی یہی شان ہوتی ہے۔ پس خدا تعالیٰ کا کلام کہیں تو حکیمانہ ہے اور کہیں اور حاکمانہ طرز زیادہ شفقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ حکیمانہ جواب میں ذرا اجنبیت ہوتی ہے۔

جیسے ایک تو طبیب کہے کہ فلاں وجہ سے مضر ہے اس کو نہ کھاؤ اور ایک باپ کہے کہ خبردار اس کو مت کھاؤ اور اگر وہ وجہ پوچھے تو کہے گا کہ بکومت بس مت کھاؤ۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ بڑا سخت باپ ہے تو غلطی ہے بلکہ وہ بڑا شفیق باپ ہے تو حاکمانہ انداز بڑی شفقت کی دلیل ہے۔ تو حق تعالیٰ حاکمانہ فرماتے ہیں۔ **ماجعل علیکم فی الدین من حرج** (نہیں کی تم پر دین کی تنگی) تو اصل میں مجھے اس کا بیان کرنا ہے۔ مگر اس سے پہلے ایک ایسا جملہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر اس کو ذہن میں رکھ لیں تو پھر جواب میں تفصیل ہی کی ضرورت نہ رہے۔

اسرار شریعت

وہ جملہ یہ ہے **هو اجتباكم** کہ اس نے تم کو مخصوص بنا لیا ہے مقصود یہ کہ کیا ہمارے خاص ہو کر تم ہماری بات نہ مانو گے ایک تو مخصوص کہنے میں یہ اثر ہوتا ہے۔ دوسرے خود مخصوص ہونے میں ایک خاص مناسبت بھی ہو جاتی ہے جس سے خود بھی وہاں پہنچنے لگتا ہے جہاں پہنچانا مقصود ہے۔

جیسے ایک نوکر کہ وہ گھر کا کام کرتا تھا اور پوچھ پوچھ کر کرتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے اس کو خاص کر لیا کہ وہ آپ کے گھر کے مشورے بھی سنتا ہے تو اس کو احکام کے اسرار بھی

معلوم ہونے لگے ہیں تو خصوصیت میں یہ خاصہ ہے خاص کر جو کہ خدا کا مخصوص ہے اس کی نو علوم میں یہ حالت ہو جاتی ہے ویرزقه من حيث لا يحتسب (اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کو گمان بھی نہیں ہوتا) اور علوم باطنہ میں یہ حالت ہو جاتی ہے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

اپنے اندر انبیاء کے علوم دیکھے گا بغیر کتاب اور مددگار و استاد کے۔

اور یہ تفسیر نہیں ہے من حیث لایحتسب (جہاں سے اس کو گمان نہیں) کی محض مثال ہے۔ لیکن اگر کوئی اس لطیفہ کو آیت کے عموم کی تفسیر بھی کہے تو گنجائش ہے چنانچہ بعض مفسرین نے ومما رزقناهم ينفقون (اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں) میں نے اس عموم رزق سے فیض علمی مراد لیا ہے۔ اور ایک دوسری آیت میں بھی رزق کو دنیا کے رزق سے عام لیا ہے۔ یرزقون فرحين۔ تو اسی طرح اگر کوئی اس آیت میں بھی رزق سے علم مراد لے لے تو جائز ہے۔ نیز مشاہدہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ کے مخصوصین علوم میں خود وہاں تک پہنچتے ہیں جہاں اہل نظر نہیں پہنچتے۔

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کتابیں کچھ بہت نہیں پڑھی تھیں بلکہ پڑھنے کے زمانہ میں بھی بہت شوق و مشقت سے نہ پڑھا تھا مگر مولانا کا علم ان کے رسائل سے ملاحظہ فرمالیجئے۔

ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک مضمون نیا بیان کیا کسی نے حاضرین میں سے کہا کہ یہ مضمون تو ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی بیان فرمایا تھا ارشاد فرمایا کہ جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں ہی سے وہ فرماتے تھے مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کے برابر کھلتا تھا ہمارے لئے سوئی کے ناکہ کے برابر کھلتا ہے۔ تو جب یہ بات ہے تو اب ایسے شخص کو دلائل کی کیا ضرورت ہے مجھے علم مکسوب اور علم موہوب پر ایک مثال یاد آئی۔

ایک سیاح امیر عبدالرحمان کی فراست کی حالت بیان کرتے تھے کہ میں نے ایک رقعہ چند مشوروں پر مشتمل تنہائی میں لکھ کر پیش کرنے کے ارادہ سے جیب میں رکھ لیا۔ قبل اس کے کہ میں پیش کرتا انہوں نے خود ہی سب مضامین کا جواب دے دیا کہ بعض خیر خواہوں کی ایسی ایسی رائے ہے مگر اس کا یہ جواب ہے مجھ کو حیرت ہوئی جب دربار ..خاست ہوا تو میں نے کہا کہ امیر صاحب کیا آپ کو کشف ہوتا ہے انہوں نے فرمایا کہ نہیں

میں کیا صاحب باطن ہوں جو کشف ہوگا عقل سے ادراک ہو جاتا ہے۔ اور عقل کشف میں تھوڑا ہی فرق ہے کہ کشف مشابہ ٹیلی فون کے ہے کہ صاف صاف معلوم ہے اور عقل مشابہ ٹیلیگراف کے کہ ذرا غور سے معلوم ہوتا ہے واقعی عجیب مثال ہے کلام الملوک ملوک الکلام۔

تو حق تعالیٰ ان کو گویا ٹیلی فون سے بتلا دیتے ہیں۔ فرق ہے کہ ٹیلی فون میں تو خاص متکلم کی آواز ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ آواز سے پاک ہیں۔ تو علم بالکنہ کا جو نتیجہ ہوتا وہ اس کو حاصل ہو جاتا ہے۔ پس ھو اجتباکم کو اس طرف اشارہ کرنے کے لئے مقدم فرمایا۔ اور اس میں یہ بتلا دیا کہ اگر اسرار شریعت جاننا چاہتے ہو تو خدا کے برگزیدہ بنو۔ اور خدا کا برگزیدہ ہونا تو بڑی بات ہے بزرگوں کے پاس بیٹھنے بلکہ ان کا چہرہ دیکھنے سے بہت شبہات کا حل ہو جاتا ہے مولانا رومی نے سچ فرمایا ہے۔

اے لقاء تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اے محبوب! تیری زیارت ہر سوال کا جواب ہے باسانی ہر مشکل کا تو حل ہے۔

برکت صحبت

میرے ایک ہم وطن جو کہ اس وقت انگلستان میں ہیں۔ وہ مجھ سے نقل کرتے تھے کہ میں ایک وقت باندہ میں تھا۔ وہ انگریزی میں بڑے ذی استعداد ہیں۔ اور نوکری میں ایسے خوش اقبال کہ جب کوشش کی فوراً ہی چار پانچ سو کے ملازم ہو گئے مگر بے استقلالی کے سبب ان کو کبھی نوکری سے انتفاع نہ ہوا۔ غرض ذکی بہت ہیں مگر علم دین سے واقف نہیں۔ اس لئے یہ واقعہ ہوا کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام کی تاریخ دیکھ رہے تھے اور رمضان المبارک کا روزہ بھی تھا۔ اس میں تھا کہ ایک جگہ گئے اور کسی کافر بادشاہ کے پاس پیغام بھیجا کہ یا اسلام لاؤ یا جزیہ دو ورنہ قتال ہے۔ ان کو شبہ ہوا کہ بس اسلام کی یہ قیمت ہے کہ بجائے اسلام کے جزیہ پر راضی ہو گئے۔ حالانکہ اسلام کی تو وہ قیمت ہے کہ۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اپنی قیمت دو جہاں بتلائی ہے۔ نرخ بڑھایئے کیونکہ ابھی ارزاں ہے۔

یہ محض شریعت کی رحمت عامہ ہے کہ اسلام پر جبر نہ کر کے جزیہ قبول کر لیا اور ان

لوگوں کے حقوق برابر رکھے اور یہ شبہ ایسا بڑھا کہ اسلام کی حقانیت ہی کا انکار دل میں جم گیا۔ پھر خیال آیا کہ جب اسلام ہی کچھ نہیں ہے تو روزہ کیا چیز ہے۔ آخر پانی پی لیا۔ اس کے بعد رنج ہوا کیونکہ اسلام بہت مدت کا رفیق تھا۔ شام کو حسب معمول ایک دوست کے پاس پہنچے انہوں نے افطاری میں شرکت کے لئے بلایا تو انہوں نے کہا کہ میری ایسی حالت ہے کہ اگر تم کو معلوم ہو جاوے تو پاس بھی نہ بٹھلاؤ انہوں نے کہا کہ بیش بریں نیست (اس سے زیادہ نہیں) کہ تم کافر ہو گئے ہو گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے باقی اس کا اثر باہمی دوستی پر کیوں ہو یہ حکمت تالیف کے لئے کہا۔ جب کھا پی چکے انہوں نے حقیقت پوچھی معلوم ہونے پر کہا کہ ہماری خاطر سے تم مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے مل لو۔ یہ ہنسے کہ مولوی صاحب بجز قرآن وحدیث کے ان حقائق فلسفیہ کو کیا جانیں اور میرے شبہات کا کیا جواب دیں گے مگر جس چیز کے نہ جاننے کو یہ نقص سمجھ رہے ہیں وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔

ما بر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

ہم نے جو پڑھا سب بھلا دیا مگر دوست کی بات کا تکرار کرتے ہیں۔

یہ شعر میں نے خود مولانا کی زبان سے سنا ہے۔ حقیقت میں علم تو وہی ہے ایک صوفی فرماتے ہیں۔

علم نبود غیر علم عاشقی
ما بقی تلبیس ابلیس شقی

(علم سوائے علم معرفت خداوندی کے اور کچھ نہیں اس کے سوا اور جو کچھ ہے ابلیس لعین شقی تلبیس ہے)

اور وہی کہتے ہیں۔

ایها القوم الذی فی المدرسہ
کلما حصلتموہ وسوسہ

اے اہل مدرسہ! تمہاری تمام تحصیل کا حاصل وسوسہ ہے پس یہ تو اپنے اس علم پر فخر کرتے ہیں مگر عام لوگ اس کو ذلیل کہتے ہیں کہ یہ کیا جانیں سوائے قرآن وحدیث کے۔ حالانکہ تمام دنیا کے فلسفی قرآن وحدیث کے آگے گرد ہیں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بڑے بڑے فلسفی آئے مگر سب ساکت تھے۔

غرض انہوں نے غایت تحقیر سے کہا کہ مولانا کیا جانیں۔ انہوں نے کہا تم میری ہی خاطر سے جاؤ تو سہی۔ انہوں نے کہا کہ خیر تمہاری خاطر چلا جاؤں گا۔ آخر گئے اور ادب کے سبب زیادہ راستہ پیدل قطع کیا اور اسی حالت ہجوم اعتراضات میں پہنچے اور خوب

منصوبے سوچ رکھے تھے کہ یہ کہوں گا وہ کہوں گا۔ جا کر کہا السلام علیکم! مولانا نے سلام لے کر فرمایا۔ بولو کیا شبہ ہے بیان کرتے تھے کہ اب جو اعتراض سوچتا ہوں اس کا جواب ذہن میں موجود۔ اب مولانا تو تقاضا فرمارہے ہیں اور یہ گم سم حیران۔ خلاصہ یہ کہ کچھ بھی نہ رہا۔ قلب صاف ہو گیا۔ آخر میں انہوں نے عرض کیا کہ مجھ کو بیعت کر لیجئے کہتے ہیں کہ مجھ سے عمل میں تو بڑی بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں لیکن عقائد کے متعلق کبھی کوئی وسوسہ تک اس روز سے نہیں آیا۔ مجھ کو یہ حکایت اس پر یاد آ گئی کہ۔

اے لقا تو جواب ہر سوال　　　مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

اے محبوب! تیری زیارت ہر سوال کا جواب ہے۔ باسانی ہر مشکل کا تو حل ہے۔

یہ برکت ہے اہل اللہ سے تعلق رکھنے کی خود بھی اس کا اہتمام کیجئے اور اپنی اولاد کے لئے اس کا اہتمام کیجئے اور اگر عذر ہے کہ وہ انگریزی پڑھتے ہیں ان کو اتنی فرصت کہاں تو میں اس کی ایک سہل اور مختصر صورت بتلاتا ہوں کہ صرف تعطیلات میں اپنے بچوں کو کسی بزرگ کے پاس بھیج دیا کریں اور خود بھی رہ لیا کریں اور میں اس کا اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ تعلیم انگریزی یا نوکری نہ چھڑاویں گے بلکہ اگر آپ خود بھی چھوڑنا چاہیں گے تو وہ نہ چھوڑنے دیں گے۔

کیونکہ وہ حکیم ہیں سمجھتے ہیں کہ ضعفاء کے لئے نوکری چھوڑنے میں زیادہ مفاسد ہیں۔

غرض تمام تر وجہ آپ کے شبہوں کی یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت معلوم نہیں تو جب بزرگوں کے قرب میں انکشاف حقیقت کا اثر ہے تو خدا کے قرب میں تو یہ اثر کیسے نہ ہوگا تو خلاصہ یہ ہے کہ تم مجتبیٰ بنو اگر کہو خدا نے تو مجتبیٰ بنا لیا۔ چنانچہ هو اجتباكم کا یہی ترجمہ ہے۔ ہم کو کیا ضرورت ہے۔ تو سبحان اللہ! اگر کوئی کہے کہ شام کو فلاں شخص نے تمہاری دعوت کی ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہی خود تمہارے منہ میں بھی دے گا اس نے تو تمہارے لئے سامان کیا ہے۔ باقی کھاؤ تم خود اسی طرح اجتباء کا سامان تمہارے لئے کر دیا ہے باقی تم اس کو حاصل کرو۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک گوجر کے ہاں ایک موروثی پیر آیا۔ گوجر بولا اب کے تو بہت ہی دبلے ہو رہے ہو۔ پیر صاحب بولے تم نماز نہیں پڑھتے۔ تمہارے بدلے میں پڑھتا ہوں۔ تم روزہ نہیں رکھتے میں ہی رکھتا ہوں۔ علیٰ ہذا سب اعمال۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پل صراط پر جو کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے تمہارے عوض چلنا

پڑتا ہے تو کہاں تک دبلا نہ ہوں۔ گوجر بولا بہت ہی کام کرنا پڑتا ہے جا میں نے فلاں کھیت تجھے دیا۔ پیر خوش ہوئے کہا کہ قبضہ کرا دے وہ ساتھ چلا دھانوں کی پتلی پتلی ڈولیں ہوتی ہیں ایک جگہ پیر پھسل کر گر گئے گوجر نے ایک لات دی کہ تو پل صراط پر کیا چلتا ہوگا۔ جھوٹا ہے میں ایسے جھوٹے کو کھیت نہیں دیتا۔ اب وہ کھیت بھی چھین لیا اور چوٹ بھی لگی۔

تو اسی طرح اب کوئی چاہے کہ مجتبیٰ تو ہم ہوں گے مگر کام سارے کوئی دوسرا کرے نہیں بلکہ طریقہ بتلا دیا اب تم کرو یہ سب **ھو اجتباکم** کے متعلق بیان تھا۔ اب اس مقصود یعنی نفی حرج کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

دشواری کی حقیقت

وہ عرض یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ دین میں دشواری ہے اس کے معنی کیا ہیں۔ کیونکہ اس کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہے۔ تو اسلام میں کونسی دشواری ہے۔ آیا یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔

مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا وقت دس بجے سے ہے تو کیا کبھی پابندی دشوار نہیں ہوتی ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی چھوڑ نہیں دیا۔ تو جب قانون کی پابندی ہوگی اس میں دشواری ضرور ہوگی۔ تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں۔ **لاتتبعوا الھوی** (مت پیروی کرو خواہشات کی) اور اس سے صاف **انها لكبيرة الا على الخاشعين** (بے شک وہ نماز ضرور دشوار ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو) غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے۔ یہ تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے احدیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے۔

مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا۔ ایک سوار ادھر سے گزرا۔ لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوار ذرا یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈال دو۔ اس کو اس کی آرام طلبی سے سخت حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ یہ حیرت

ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی آپ کو کیا خبر یہ میرے ساتھ کیسا ہے۔ کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا مجھ کو جو جمائی آئی اس سے منہ کھل گیا۔ ایک کتا منہ میں آ کر پیشاب کرنے لگا۔ یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے میں ضرور اس کے منہ بیر دوں گا۔ سوار حیرت میں غرق ہو گیا اور لاحول پڑھتا ہوا چل دیا۔ تو حضرت اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو تو کھانا بھی مشکل ہے۔

ہمارے ایک عزیز کے دو بھائی ہیں۔ ایک چھوٹے ایک بڑے۔ بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا تو ایسی نظیریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی۔ تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو۔ مگر اس کو کسی نے نہ کہا کہ بڑا سخت قانون ہے۔ وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے اس لئے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے لیکن جو ڈکیتی پیشہ ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ایک جماعت بیہودوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو۔ حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے۔ مگر یہ ان کو گراں ہے تو لوگ انسانیت ہی سے خارج ہیں۔ تو محض پابندی سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ پھر اسلام ہی پر کونسا اعتراض ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت تو تسلیم اور یہ سختی نہیں مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے۔ تو واقعی یہ دشواری دشواری ہے مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔

اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوئی ہے۔ قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے۔ مثلاً یہ قانون ہو جائے کہ اگر چھٹانک بھر سے زیادہ کوئی کھائے تو پھانسی ہوگی۔ یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی سب کو تکلیف ہو۔ اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آئے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آ جائے اور

عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے۔ پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرور تنگی ہوگی۔ کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشاء ان باغیوں کی بغاوت ہے۔

مثلاً کوئی اگر ایسی جگہ پہنچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں اور یہ شخص وہاں پہنچ کر کوئی چیز خریدے اور دام دے دے۔ پھر اس سے کہا جائے کہ گو قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لے کر پوری چیز دو مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے اس لئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہئے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا ان بدمعاشوں کی بدمعاشی' قانون کا منشاء تو یہ ہے کہ سیر بھر کی سیر بھر دو۔ مگر ان بدمعاش لوگوں نے بدمعاشی کی اور سیر بھر کی آدھی سیر دی تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں۔ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے وہ دشواری یہ ہے کہ جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کی مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آئے اگر پچاس قیامتیں بھی آجائیں جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی اب جس کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ۔ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کئے کو اسلام پر تھوپنا ایسا ہے کہ۔

حملہ برخود مے کنی اے سادہ مرد   ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اے سادہ مرد! تو اپنے ہی پر حملہ کرتا ہے اس شیر کی طرح جس نے اپنے پر حملہ کیا۔

مثنوی میں شیر کی حکایت لمبی چوڑی لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکہ دیا اور کہا میں تمہارے راتب کے لئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا۔ شیر کو غصہ آیا کہ بتلاؤ وہ کہاں ہے اس نے ایک کنویں پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا۔ بس شیر اس کنویں میں جا کودا۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

حملہ برخود مے کنی اے سادہ مرد   ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اے سادہ مرد! تو اپنے اوپر حملہ کرتا ہے اس شیر کی طرح جس نے اپنے اوپر حملہ کیا۔

اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔

آئینہ شریعت

اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے ایک آئینہ دیکھا اس میں اپنی صورت پر نظر پڑی آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بدشکل تھا تب تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔

ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا۔ لوٹے میں ایک ٹکڑا گر پڑا۔ جھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی۔ سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے باپ سے کہا ابا اس نے میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھیننے اٹھے جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل بولے کہ لعنت خدا کی بڈھا ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ تف ہے تیری اوقات پر وہ کس کو تف کہہ رہے تھے اپنے کو۔

اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا اور وہ تنگی اپنی صفت تھی اس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت تنگی کی اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر سب کی اجازت دے دے۔ ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جائیں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی ممانعت ہوگی اتفاق سے ایک دیہاتی پہنچا کہ صاحب کھاؤں کیا۔ جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک وہ بولا یہ تو ملتا نہیں کہا مونگ کی دال۔ کہا یہ بھی نہیں ملتی۔ کہا فرنی کہنے لگا یہ بھی نہیں ہے۔ پھر خود پوچھا بیگن کھا لوں۔ کہا ہرگز نہ کھانا کریلہ کے متعلق پوچھا اس کو بھی منع کیا۔ آلو سے بھی روک دیا تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ طب کا فتویٰ تو یہی ہے۔ دیہاتی نے باہر آ کر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ وہ بھی نہ کھاؤ۔ تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے یا یہ کہا جائے گا کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں کی اجازت دے دی لیکن وہ مقام ایسا کورہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں تو یہ طب کی تنگی تو نہیں اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔

اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری جیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت مجوز کہے گی اور پانچ کو لامجوز۔ لیکن اگر آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور بیس کو متروک کر دیں تو یہ تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانون شریعت کی۔ پس یہ الزام تو بحمد اللہ بوجہ احسن واکمل رفع ہو گیا اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو علم دین پڑھئے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسع کیا ہے۔

درستی اعمال کی ضرورت

اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے۔ اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو۔ وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ شریعت میں دشواری نہیں مگر حالت موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ دوسروں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے۔ عارضی دشواری تو ہو گئی تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہنچ گیا البتہ اعتقاد درست ہو گیا کہ شریعت میں دشواری نہیں۔ مگر عمل کس طرح سے کریں کیا لین دین چھوڑ دیں۔ کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز معاملات اکثر ناجائز' تجارت اکثر ناجائز تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے سو اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔ اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے غیر مسلم ہے۔

سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے اور دوسرا وہ کہ ان کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے نماز روزہ کرے حج کرے تکبر نہ کرے باجا گاجا چھوڑ دے۔ تو بتلایئے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے۔ تو اس میں تو آج ہی سے اصلاح کر لیجئے پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جائیں گے کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں کہ خواہ مخواہ آپ نے ان کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جائیں گے اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمال صالح کا موجود ہو گا اس لئے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب وقلیل ہیں درست فرمائیں گے۔

جیسے ایک شعلہ جوالہ کہ دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی۔ مگر جب نور وظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے اور اس درستی میں گویا کہا جا سکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید ہے پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال صالحہ میں بھی یہی خاصیت یہی کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہؓ کی ترقی کا راز یہی ہے ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں جاتا مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں خوب کہا ہے۔

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں۔

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے۔ غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوئی تھی مگر جب قوت ہو گی تمام موانع مضمحل ہو جائیں گے اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جائے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے جیسے کسی نے یہ سن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ چاند ہی نہ دیکھیں گے۔ غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے۔ یہ ہے وہ راز

اگر بالفرض اصلاح بھی نہ ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جائے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمتی چلی جائے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے۔

اگر ایک شخص پر چار جرم عائد ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو ٹل سکتے ہیں مگر ایک نہیں ٹل سکتا۔ تو کیا کوئی یہ کہے گا۔

چو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست

(جب پانی سر کے اوپر سے گزر جائے پھر ایک نیزہ کیا اور ایک ہاتھ کیا)

ہرگز نہیں بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے تو اسی طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے۔

معاش اور شریعت

اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو اول تو چونکہ آپ کو شریعت کے احکام معلوم نہیں ہیں اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ احکام کی تحقیق کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تھوڑے سے تغیر سے وہ ناجائز جائز ہو جائے گا۔

مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اگر آپ کہیے کہ صاحب اچھا مسئلہ سنا کہ نرخ کے حساب سے سو روپیہ کی چاندی ایک سو بیس بھر آئی مگر اب سو روپیہ کی سو ہی روپیہ بھر لی۔ اچھا عمل کیا کہ بیس

روپیہ کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کے لئے مولوی کو خیر باد کہہ دیں گے۔ تو سنئے بات یہ ہے اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا۔ کیا کوئی جائز شکل معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے ہیں کہ ان روپوں میں ایک گنی بھی ملالو تو ایک سو بیس روپیہ بھر چاندی جو آئے گی تو پچاس روپیہ بھر تو پچاس کی آئے گی اور باقی کو اس گنی میں شریعت محسوب کردے گی۔ تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے۔

تو بتلایئے کیا نقصان ہوا۔ اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں صاحبو پوچھتے تو رہو۔ اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہہ دیں گے کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے جائز کردیں۔

جیسا کہ ایک مطوف سے ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی سعی میں تھک کر کہا تھا کہ مولوی صاحب اب تو معاف کردو۔ اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء ہند مثل بعض علماء مصر کے کرنے لگیں ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز ہے۔ تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں علماء سے۔

جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اس کی تصدیق کر کے توجیہ کردیا کرو چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے نکلا کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی۔ وہ اس کے سم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی۔ سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سم اور ماتھے کا کیا جوڑ نوکر بولا سچ ہے حضور وہ اس وقت سم سے پیشانی کھجلا رہا تھا۔ تو حضور علماء سے ایسی نوکری ہوتی نہیں نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کرے کہ ہوں۔

تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہہ دیں مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جاوے گا۔ تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا اس طرح ختم ہو جاوے گا۔ ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جاویں گے کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے مگر اس میں بھی دو درجے ہیں۔ ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں۔ بس اس کو چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس کا چھوڑنا مضر حوائج ضروریہ نہیں۔ اور ایک درجہ وہ ہے کہ اس کو کرتے رہو اور گو یا جائز تو نہ ہوں گے مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہو جاویں گے وہ یہ کہ جس میں دو برتاؤ کرنا چاہئیں ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کیا کرے۔ اب

تو یہ غضب ہے کہ لوگ توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پچھتائے اور دعا کیجئے کہ اے اللہ! مجھے معاف فرمائیے مواخذہ نہ کیجئے تو یہ کیوں نہیں کرتے۔ کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہو جاؤ گے؟ ہرگز نہیں بلکہ تم نوکر ہی رہو گے۔

دوسرے یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ کوئی دوسری سبیل میرے لئے نکال دیجئے۔ تو اس میں یا تو کوئی سبیل نکلے گی اور جو کوئی دوسری سبیل نہ نکلے تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو لکھا جاوے گا۔ جری گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاوے گا اور یہ توسع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور اس توسع میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جاوے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہو جائے مثلاً یہی کہ چلو آریہ بنیں۔ تو یہ توسع این بلا دفع بلاہائے بزرگ کا مصداق ہے۔

اور میں کفر سے بچا رہا ہوں۔ کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اس کو سوجھتا ہے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب جب تھانہ بھون میں رہتے تھے ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائیداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے حضرت دعا فرما دیتے۔ ایک بار آ کر کہنے لگے کہ اب تو اس نے حد ہی کر دی اور جائیداد غصب ہی کرنے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کر۔ اس نے کہا بہت اچھا۔ دفعۃً حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا ہرگز صبر مت کرنا۔ جاؤ نالش کرو ہم دعا کریں گے اور حضرت سے فرمایا آپ تو صابر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے۔ اس میں تو اتنی قوت نہیں۔ یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستائے گی تو یہ جھوٹی گواہی دے گا چوری کرے گا تو دوسروں کو صبر نہیں کرایا کرتے۔

تو یہ ہے اصل راز اس توسع کا۔ تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ سنیں گے مگر یہ اس لئے ظاہر کر دیا گیا کہ یہ کفر سے بچانا ہے۔ لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معاصی میں آڑ نہ بنا لیں کہ یہ جز تو بہت اچھا ہاتھ آیا۔ بات یہ ہے کہ اول تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاصی میں۔ اس کا توڑ یہ نہیں ہو سکتا دوسرے اس میں یہ قید تو لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو۔ جیسے کوئی بیت الخلاء میں بیٹھا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انہوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے۔ آخر

ضرورت سے پاخانہ میں گئے تو چٹخنی لگ گئی اور ان کے کھولنے سے نہ کھلی۔ بڑے پریشان۔ لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کر دیا۔ آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم دلائی۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پاخانہ ہے اس میں قسم کھلانی جائز نہیں تو جس طرح وہ پاخانہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو۔ کیا کوئی پاخانہ میں جا کر فخر کرتا ہے بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں۔ بس اس کی یہ حالت ہوگی کہ۔

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش   چوں کشاید چابک و برجستہ باش

جب تجھے میخ سے باندھیں بندھ جا۔ جب کھولیں ہوشیار اور چالاک ہو۔ تو نکلنے کی فکر تو کرو گو کچھ امید نہ بھی ہو۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید   خیرہ یوسف وارے باید دوید

اگرچہ جہان میں ظاہر رخنہ نہیں ہے۔ یوسف کی طرح دوڑنا چاہئے یوسف کا قصہ یہ ہوا کہ جب زلیخا نے دروازہ بند اور مقفل کرا لیا اور آپ نکلنے کے لئے دوڑے ہیں عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے۔ اسی کو فرماتے ہیں کہ۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید   خیرہ یوسف وارے باید دوید

(اگرچہ دنیا میں ظاہر رخنہ نہیں مگر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا چاہئے)

اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالٰی یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑ انکر بھی لگ گئی اتنے پر بھی فضل ہو جائے گا۔ اب بتائیے اس میں کون سی مشکل چیز ہے میں تو نوکری نہیں چھڑاتا مگر نفور رہیں سو یہ کیا مشکل ہے۔ اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے۔ بے باکی ہے۔ یہ فخر کیسا اور تکبر کیسا اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے سو اہل اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ تو اب کون سا مرتبہ اختلاف کا رہ گیا۔ نرا قانون تو دشوار نہیں ہے اور قانون سخت نہیں۔ صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہو جاتی ہے تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں مخل ہی نہیں۔

اور جو مخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہو سکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہو سکے وہ اولاً بہت مختصر ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پچھتانا اور توبہ کرتے رہنا تو اب وہ کون سا جز ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہو گیا کہ **ماجعل علیکم فی الدین من حرج** الآیہ (نہیں کی تم پر دین میں کچھ تنگی)

صورت اصلاح

اس کے بعد ایک عملی مرحلہ دشواری کا اور رہ گیا مگر وہ بہت ہی معمولی ہے۔ وہ یہ کہ تدبیرات مذکورہ کے لئے جو ہمت کی ضرورت ہے اور لوگ ہمت سے کام نہیں لیتے حتیٰ کہ کم ہمتی کے سبب توبہ تک کا ارادہ نہیں کرتے یا کر کے توڑ دیتے ہیں۔

بہ شب توبہ کرد و سحر گہ شکست
(رات کو توبہ کی اور صبح توڑ دی)

ایسے بہت سے لوگ ہیں تو اس کا صرف ایک علاج ہے وہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے اور کچھ علاج نہیں۔ اب چاہے آپ مجاہدہ کریں یا وظیفہ پڑھیں اس سے فائدہ مطلوب حاصل نہیں مگر مشائخ کے یہاں آج کل وظیفہ بہت سستا ہے۔ نماز کی پابندی کے لئے ایک وظیفہ پھر اس وظیفہ کے دوام کے لئے ایک اور وظیفہ۔ مگر بالکل بے جوڑ علاج۔ بھلا وظیفوں کو ترک گناہ میں کیا دخل ہر چیز کا علاج الگ ہے وظیفہ صرف ذریعہ ہے غلبہ ذکر علی القلب کے لئے بشرطیکہ دنیا کے لئے نہ ہو۔ باقی اگر ایک شخص کو عادت ہے لڑکوں کو دیکھنے کی تو یہ روزہ یا وظیفہ سے نہیں جاتی۔ اگر روزہ میں کمی شہوت کی ہوتی ہے مگر مجھ سے ایک ستر برس کے بوڑھے نے جو ایک اسلامی ریاست میں کلکٹر تھے شکایت امرد پرستی کی اور روتے تھے۔ بھلا ستر برس کے بڈھے میں کیا شہوت ہوتی۔ تو وظیفہ سے اس میں کیا ہوتا پس اس کا علاج یہی ہے کہ کسی اہل اللہ کے پاس چلا جاوے کہ۔

گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی　　چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی
نفس نتواں کشت الا بظل پیر　　دامن آں نفس کش را سخت گیر

اگر چہ تو سخت پتھر ہے جب اللہ والے سے تعلق قائم کرے موتی ہو جائے۔ مرشد کے زیر سایہ ہونے کے بغیر نفس کشی نہیں ہو سکتی۔ کسی نفس کشی کا دامن پکڑ۔

غرض اس کا علاج اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ کسی اہل اللہ کے پاس رہے مگر اس کے پاس رہنے کے کچھ آداب ہیں وہ یہ کہ اس طرح سے رہے کہ۔

قال را بگذار مرد حال شو　　پیش مرد کاملے پامال شو

زبانی جمع خرچ چھوڑ صاحب حال ہو۔ کسی کامل مرد کے سامنے زانو ادب تہ کر۔

نیز اس کے ساتھ رہنے میں یہ ضرور ہے کہ جو کہے وہ کرو اور اطمینان رکھو کہ وہ کہے گا ایسا کہ جو آسان ہو مگر نیت یہی رکھو کہ اگر سخت بھی کہے گا تو ہر گز خلاف نہ کریں گے۔ نیز اس

کے زجر سے برا نہ مانو کیونکہ بعض امراض کا علاج یہی ہے۔

ایک صاحب نے میرے پاس ایک دفتر سوالات کا بھیجا۔ میں نے لکھا کہ یہاں آؤ اور سمجھ لو۔ انہوں لکھا کہ آؤں گا مگر دو شرط سے ایک تو یہ کہ گفتگو کے وقت چلانا نہیں۔ دوسرے یہ کہ تمہارے گھر کا کھانا نہ کھاؤں گا۔ میں نے لکھ دیا آؤ دونوں شرطیں منظور ہیں۔ آئے ملے میں نے کہا صاحب ایک شرط سے رجوع کرتا ہوں یعنی یہ کہ چلانا نہیں۔ میں ضرور چلاؤں گا کیونکہ بعض مرض کا علاج چلانا ہی ہے اور اس میں بڑی برکت ہے اور اگر کہیے کہ دھوکہ دے کر بلایا ہے تو اگر منظور نہیں آمد و رفت کا کرایہ لیجئے اور جائیے۔ آخر سیدھے ہو گئے۔ میں نے کہا کھانے کی نسبت کیا رائے ہے۔ کہنے لگے وہی پہلی شرط ہے۔ میں نے کہا بہتر! پھر میں اٹھ کر گھر چلا تو پیچھے سے انہوں نے ایک لڑکا بھیجا کہ میں نے اس شرط کو بھی چھوڑ دیا کھانا بھی کھاؤں گا۔ پھر ان سے گفتگو کی اور تسلی ہو گئی اور میں نے ان کو نصیحت بھی کہ مختلف کتابیں نہ دیکھو زیادہ خرابی اسی سے ہے۔ غرض یہ ضرور ہے کہ اگر وہ ڈانٹیں تو برا نہ مانو۔

در بہ ہر زخمے تو پر کینہ شوی
پس کجا بے صیقل چو آئینہ شوی

اگر تو ہر زخم سے رنجیدہ خاطر ہوتا ہے تو آئینہ کی طرح صاف کب ہو سکے گا۔

مولانا نے ایک حکایت بڑی عجیب لکھی ہے کہ ایک قزوینی کسی کے پاس گیا کہ میری کمر پر شیر کی تصویر گود دے وہ گودنے بیٹھا ایک سوئی چبھوئی چلایا کہ یہ کیا کرتا ہے۔ اس نے کہا تیری فرمائش پوری کرتا ہوں کہنے لگا کہاں سے شروع کیا ہے بولا دم سے کہنے لگا شیر بے دم سہی۔ اس نے دوسری جگہ سوئی رکھی پھر چلایا کہ اب کیا بناتا ہے اس نے کہا شکم۔ بولا شکم کی ہوگا۔ اس نے تیسری جگہ سوئی لگائی۔ پھر چلایا کہ یہ کیا ہے بولا کہ کان کہنے لگا کان بھی نہ سہی۔ وہ گودنے والا بڑا پریشان ہوا۔ سوئی پھینک دی اور کہا کہ

شیر بے گوش و سر و شکم کے دید
ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

(بغیر کان سر اور پیٹ والا شیر کس نے دیکھا خدا نے ایسا شیر تو پیدا ہی نہیں کیا)

یعنی خدا نے بھی تو ایسا شیر پیدا نہیں کیا اس پر مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن
پس تو از شیر ژیاں دم کم مزن

(جب تو سوئی چبھوانے کی طاقت نہیں رکھتا تو شیر کا نام نہ لے)

اور اسی مقام پر فرماتے ہیں۔

در بہ ہر زخمے تو پر کینہ شوی   پس کجا بے صیقل چو آئینہ شوی

(اگر تو ہر زخم سے رنجیدہ خاطر ہوتا ہے تو آئینہ کی طرح کب صاف ہوگا)

آخر نوکری کی خوشامد میں حکام کی ڈانٹ سہتے ہو۔ اگر اصلاح باطن کے لئے شیخ کا زجر سہہ لیا تو کیا بڑی بات ہے۔ تو ان کے پاس رہنے سے اعمال صالحہ کا عزم قوی ہو جاتا ہے اور بری چیزوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور پھر بڑے بڑے کام آسان ہو جاتے ہیں۔

ہمت اور محبت

یہی مراد ہے ہمت سے اور راز اس کا یہ ہے کہ ان کے پاس رہنے سے یہ شخص صاحب محبت ہو جاتا ہے اور محبت کی خاصیت ہے کہ

از محبت تلخہا شیریں شود

(محبت سے تلخیوں میں بھی مٹھاس محسوس ہوتی ہے)

محبت وہ چیز ہے کہ میں نے ایک نوجوان کو اسی سفر میں دیکھا کہ وہ کسی بیوہ پر عاشق ہو گیا۔ کہتا تھا کہ راتوں کا جاگنا اور نماز کو جانا سہل ہو گیا اور پہلے فرض نماز کے لئے اٹھنا بھی دشوار تھا۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ یہ نفع عارضی ہے اور چونکہ نفع سے زیدہ اس میں مفاسد ہیں تو ایسا ہے کہ **قل فیھمآ اثم کبیر ومنافع للناس** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں)

اس پر ایک اور واقعہ یاد آیا کہ میں ایک بار کاندھلہ گیا۔ نماز عشاء کے بعد سونے کے متعلق یہ تجویز ٹھہری کہ مسجد کی سمت شمال کی طرف ایک سہ دری تھی وہاں سوئیں گے۔ اتنے میں محلہ میں سے ایک رقاصہ کی آواز گانے کی آئی۔ میں نے کہا اب یہاں نہیں رہوں گا کسی مردانے مکان میں سونے کا انتظام کیا جائے میرے ساتھ ایک صوفی آزاد تھے وہ وہاں ہی رہے اور صبح کو کہنے لگے کہ اس کی آواز سے آج نماز میں خوب یکسوئی ہوئی۔ خطرات بالکل نہیں آئے میں نے کہا کہ خیال کا نہ آنا کافی نہیں بلکہ دوسری طرف کا خیال آنا چاہئے۔ یعنی خدا کی طرف کا اس کی آواز اس سے بھی مانع تھی تو یہ مفسدہ اس منفعت سے بدرجہا زیدہ ہے۔

مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی ایک ترک کی کہ اس کی مجلس میں مطرب نے اس قسم کی غزل گائی۔

گلے یا سوسنے یا سرو یا ماہی نمیدانم   ازیں آشفتہ بیدل چہ مے خواہی نمیدانم

(تو پھول ہے یا سوسن ہے یا سرو ہے یا چاند ہے میں نہیں جانتا کیوں اس پریشان عاشق سے کیا چاہتا ہے میں نہیں جانتا)

اور اسی طرح نمیدانم نمیدانم کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ اس ترک کو غصہ آیا اس نے ایک گھونسہ دیا اور کہا کہ کم بخت کب تک نمیدانم نمیدانم کہے گا۔ جو جانتا ہے وہ کہہ۔

تو مولانا اس مقام پر فرماتے ہیں کہ مقصود اثبات ہے نفی نہیں۔ تو اس نفی خطرات سے چونکہ مفسدہ پیدا ہوا کہ اثبات اس مردار کا ہوا نہ کہ خدا کا۔ اس لئے یہ نفی مقصود نہیں۔ خدا کا اثبات مطلوب ہے جو کہ یہاں مقصود ہے۔ تو جو حکایت اوپر بیان کی گئی کہ وہ عاشق ہو گئے اور نماز میں جانے لگے تو یہ کچھ بھی نہیں معصیت اگر ذریعہ بن جاوے عبادت کا تب بھی وہ معصیت ہی رہے گی۔ چنانچہ اگر کوئی مسجد کے قریب میں ناچ کرانے لگے کہ اس بہانے سے لوگ جمع ہو جاویں گے پھر ان کو مسجد میں لے چلیں گے یہ تو جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ جس کی صبح کو اٹھنا بھی مشکل تھا اب وہ عشق کی بدولت رات کو جاگتا ہے تو۔

عشق مولےٰ کے کم از لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیا کم ہے اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے تو برت کی زو خاک برابر ہیں) اور سنو

ترا عشق ہم چوں خودی ز آب وگل   رباید ہمہ صبر و آرام دل

(آپ کا عشق آب وگل کی خودی کی مانند ہے جس سے دل کو صبر اور آرام ملتا ہے)

اور یہ حالت ہوتی ہے

چو در چشم شاہد نیاید زرت   زر و خاک یکساں نماید برت

(جب بندہ کی آنکھ محبوب کے ایک ذرے کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی تو سالکین طریق سے تم کو تعجب ہے کہ حقیقت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں)

جب محبوب کی نظر میں ترا سونا نہ آئے تو تیرے نزدیک سونا اور خاک برابر ہے۔ تو اس حالت پر نظر کرتے ہوئے۔

عجب داری از سالکان طریق   کہ باشند در بحر معنی غریق

(سالکین طریق سے تم کو تعجب ہے کہ حقیقت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں)

غرض محبت کا یہ خاصہ ہے اور اہل اللہ کے پاس بیٹھ کر خدا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

پس یہ تدبیر ہے ہمت کی اور ظاہر ہے کہ اس میں کچھ دشواری نہیں۔ تو اب سارے مرحلے طے ہو گئے اور یہ صحبت اگر کسی سے متصل نہ ہو سکے تو مختلف زمانوں میں سہی یعنی جب کسی کو جتنا موقع اس کا ملے دریغ نہ کرے حق تعالیٰ مدد فرمائیں گے۔

مصاحبت کی صورت

مصاحبت کی دو صورتیں ہیں ایک تو زندوں کے پاس بیٹھنا اور ایک قبروں پر۔ یہ بھی بزرگوں کا طرز ہے اور ہر چند کہ اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی مگر اب لوگوں نے اس میں غلطی کی ہے کہ انہوں نے قبروں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ دولت باطنی کا بھی اور ظاہری کا بھی مدار قبروں ہی پر سمجھ لیا ہے اور سب زندوں کو چھوڑ دیا۔ اس لئے اس تقسیم کی تصریح کی تاکہ زندوں سے استغناء نہ ہو جائے بلکہ اصل تو یہی ہے بلکہ اہل قبور سے مستفید ہونے کی شرط خود زندوں سے مستفید ہونا ہے اور ان کے مقابل بعضے وہ لوگ ہیں جو اولیاء کے منکر ہیں اور بعضے فیوض قبور ہی کے منکر ہیں۔ میں نے ایک رسالہ دیکھا ہے اہل ظاہر کا کہ اس نے استفادہ عن اہل القبور کی نہی پر اس پر استدلال کیا لاتجلسوا علی القبور (قبروں پر مت بیٹھو) جو جلوس سے مراد جلوس للاستفادہ لیا ہے حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں۔ (بلکہ اس کے معنی قعود قبر پر ہے یا اس پر بیٹھنا جس سے اس کی اہانت ہے)

میں نے ایک رسالہ لکھا ہے اس میں میں نے حدیث سے ثابت کر دیا ہے کہ اہل قبور سے فیض ہوتا ہے اور ہمارے بعض بیانوں سے شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ بزرگوں کے قائل نہیں۔ کیا کہا جائے یہ محض تہمت ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بزرگوں کے بندے ہو جائیں۔ یہ تو ہو گا نہیں۔ صاحب! میں تو آپ کو خود بزرگ بنانا چاہتا ہوں۔ تو دیکھ لو بزرگ کاہے سے ہوئے ہیں۔ صرف طاعت سے میں اس کی تعلیم کر رہا ہوں۔

ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ملفوظات کے یاد کرنے سے چنداں نفع نہیں تم خود ایسے ہی کیوں نہ ہو جاؤ کہ تم سے ویسے ہی ملفوظات صادر ہونے لگیں۔ تو اس رسالہ سے ہم لوگوں پر سے یہ شبہ بھی بزرگوں کے انکار کا رفع و زائل ہو جائے گا اور بحمد اللہ وہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ ایک غیر مقلد نے مطبع میں وہ کتاب دیکھ کر ناظم مطبع سے کہا کہ مصنف کو لکھ دو کہ اس میں اختصار نہ کرے۔ اور ایک شخص میرے پاس آئے جو کہ بیعت کے منکر تھے۔ وہ اس کو دیکھ کر خود بیعت

ہو گئے۔ اس میں ساڑھے تین سو حدیثیں ہیں اور ہر حدیث سے کم سے کم ایک مسئلہ تو ضرور ہی ثابت ہے اور بعض سے کئی کئی اس کتاب کا نام ہے تکشف اس کا منگانا ضروری ہے اور ایک رسالہ میرا القاسم میں نکلتا ہے ''اصلاح انقلاب'' اس سے ظاہری اعمال کی اصلاح ہوگی۔ وہ بھی ضروری ہے غرض اس کتاب تکشف میں یہ ثابت کیا ہے کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضروری کہ اگر کوئی پوچھے کہ حلوہ کھانا جائز ہے یا نہیں۔ ایک تو قانونی جواب ہے کہ جائز ہے اور ایک شفیق کا جواب ہے کہ مریض کو جائز نہ کہے اسی کو شیخ کہتے ہیں۔

سماع اے برادر بگویم کہ چیست　　مگر مستمع را بدانم کہ کیست
اگر مرد لہوست و بازی و لاغ　　قوی ترشود دیوش اندر دماغ
اگر از برج معنی بود طیر او　　فرشتہ فروماند از سیر او

چنانچہ ضلع بارہ بنکی کی حکایت ہے کہ ایک شخص کہتے تھے کہ ایک شخص نے عورت سے سماع سنا اور مجلس ہی میں سے اس کو ایک کوٹھڑی میں لے جا کر منہ کالا کیا اور باہر آ کر اپنی اس حرکت کی توجیہ کی کہ جب آ گیا جوش نہ رہا ہوش یہ دونوں لفظ چھوٹے سین سے فرمائے اور شیخ اس تفصیل کے بعد صاحب حال پر اعتراض کرنے والوں کو دفع کرتے ہیں۔

مکن عیب درویش حیران و مست　　کہ غرق ست ازآں میزند پا و دست

یعنی اس پر اعتراض نہ کرو ایسی ہی تفصیل حضرت جامی فرماتے ہیں۔

زندہ دلاں مردہ تناں را رواست　　مردہ دلاں زندہ تناں را خطاست

جن کے دل بوجہ تعلق مع اللہ کے زندہ ہیں اور بدن مردہ ہوں ان کے لئے سماع جائز ہے اور جن کے دل مردہ ہوں اور تن زندہ ہوں ان کا سننا غلطی ہے۔

غرض محققین کی عادت ہے کہ وہ ایک ہی فتویٰ سب کو نہیں دیتے اس لئے طبیب سے جب حلوہ کھانے کی نسبت پوچھا جائے تو اس کو پوچھنا چاہئے کہ حلوہ کون کھائے گا۔ اگر معلوم ہو کہ مریض کھائے گا ناجائز کہہ دے۔ اگر معلوم ہو کہ تندرست کھائے گا جائز کہہ دے۔ اب یہ ممانعت مریض کی سن کر اگر کوئی کہے کہ یہ تو حلوا کے منکر ہیں تو کیسی بے وقوفی ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک نو عمر مولوی نے پوچھا کہ قبروں سے فیض حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ کون فیض لینا چاہتا ہے انہوں نے کہا کہ میں

۔ مولانا نے فرمایا کہ نہیں ہوتا تو یہ ہے محققین کی شان غرض فیض تو شرائط خاصہ سے ہوتا ہے لیکن ان کو کار فرما سمجھنا یہ تو صریح شرک ہے۔

رام پور کی ایک حکایت سنی ہے مولوی عبدالحق خیر آبادی کی کہ ایک پٹھان ملنے آئے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ خان صاحب کیسے فرصت ہو گئی۔ آج کل تو آپ کو دیہات میں بہت انتظام کرنا ہوگا۔ خان صاحب بولے کہ انتظام تو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر آیا ہوں مولوی صاحب نے فرمایا آہا ہم تو ان کو ولی سمجھتے تھے مگر معلوم ہوا کہ پدھان ہیں۔ خان صاحب کو بہت ناگوار ہوا کہ انہوں نے بے ادبی کی مگر واقع میں بے ادبی خود انہوں نے کی۔ تو بعضے آدمی سب کام اولیاء اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔

میں نے مکہ میں دیکھا کہ ایک شاہ صاحب نے آ کر حضرت کے بھتیجے حافظ احمد حسین صاحب کو کچھ روپیہ امانت سپرد کیا۔ حافظ صاحب نے کہا اللہ کی سپردگی میں رکھ جاؤ۔ تو آپ کیا کہتے ہیں کہ اللہ کے سپرد تو کرنا چاہئے ہی نہیں اور اس پر ایک مہمل حکایت ہانک دی کہ کسی شخص کی ایک دوکان تھی۔ وہ جب جاتا دکان حضرت غوث اعظمؒ کے سپرد کر کے جاتا۔ اس کا ایک بھائی تھا وہ ہمیشہ دل میں اس پر نکیر کرتا ایک بار یہ بھائی دکان پر تھا۔ یہ جب جانے لگا تو خدا تعالیٰ کے سپرد کر گیا۔ اسی دن چوری ہو گئی۔ دوسرے بھائی کو خبر ہوئی۔ کہنے لگا تو نے نادانی کی کہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا اللہ تعالیٰ کا تو کام یہی ہے کہ اس سے لیا اس کو دے دیا اور حضرت غوث اعظم تو محکوم ہیں یہ خلاف امانت کر نہیں سکتے۔ اور حکایت ان شاہ صاحب احمد حسین صاحب کے سامنے بیان کی۔ وہ بہت جھلائے کہ کوئی بڑا مردود ہوگا۔

اب مشکل ہم لوگوں کی ہے کہ ہم نہ وہابی نہ بدعتی۔ ہمارا مشرب یہ ہے کہ اعمال ظاہرہ میں فقہا کی تقلید کرتے ہیں اور اعمال باطنہ میں صوفیہ کی اور اعمال ظاہرہ میں صوفیہ کی تقلید نہیں کرتے۔ مثلاً سماع وغیرہ کہ ان کو باطن میں کچھ دخل نہیں خواہ یہ جائز ہو یا جائز و ناجائز دونوں سے مرکب۔ تو اس میں تو ہم فقہاء کے مقلد ہیں اور جو اعمال باطنہ ہیں اس میں ہم صوفیہ کے مقلد ہیں تو ہمارے بزرگوں کا مشرب حنفی صوفی ہے۔ تو ایسے شخص کی کم بختی دونوں طرف سے آتی ہے۔ اب عرس میں شریک نہ ہوئے تو وہابی اور ذکر جہر کیا تو بدعتی ہونے کا اعتراض۔

اسی طرح فیض قبور میں نہ تو ہم ایسے قائل کہ سب کام وہی کرتے ہیں اور نہ اس کے

قائل کہ اس سے کچھ ہوتا نہیں۔ ضرور ہوتا ہے مگر فیض دو ہیں۔ ایک تعلیم کا اور ایک تقویت نسبت کا۔ تعلیم کا فیض تو قبور سے نہیں ہوتا۔ یہ تو زندہ بزرگوں سے ہوتا ہے اس لئے کہا ہے کہ۔

گربہ زندہ بہ از شیر مردہ

(زندہ بلی مردہ شیر سے اچھی ہے)

اور ایک درجہ ہے تقویت نسبت کا کہ کسی زندہ کی بدولت نسبت حاصل ہو گئی اب اس کو بڑھانا چاہتا ہے تو یہ قبور سے ہو جاتا ہے۔ تو جو صاحب نسبت نہ ہو اس کو تو چاہئے کہ زندہ پیروں سے لے قبور سے لینے کی کوشش کرنا اس کو بیکار۔

ایک موضع ہے ضلع انبالہ میں براس۔ وہاں مولانا رفیع الدین صاحب تشریف لے گئے۔ وہاں کے متعلق بعض بزرگوں کو مکشوف ہوا ہے کہ بعض انبیاء کی قبور ہیں تو مولانا رفیع الدین صاحب گردن جھکا کر بیٹھے تھے بعضے طالب علم بھی اسی طرح بیٹھے۔ میں نے کہا کہ ادھر سے تو اندھے ہو ہی ادھر کی آنکھیں بھی کیوں بند کیں۔

تو زندہ بزرگوں کی خدمت میں رہ کر جب وہاں سے قابلیت دیکھ کر اجازت ہو تو اس وقت اس غرض سے قبور پر جائیں اور غیر صاحب نسبت تو فاتحہ پڑھ آئے کیونکہ یہ بھی ثواب ہے کہ کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھ کر چلا آئے اور جو صاحب نسبت ہے اس کا دوسرا حال ہے تو جس مرتبہ کا کوئی شخص ہو جو اس کے مناسب ہو اس کا التزام رکھے۔ یہ کلام تھا صحبت اموات کا۔ باقی اصل طریق صحبت ہے احیاء کی۔ اسی سے علم صحیح حاصل ہوتا ہے اسی سے ہمت میں قوت ہوتی ہے جو شرط اعظم ہے۔ سہولت اعمال کی۔ جس کا راز وہی ہے جو عرض کیا گیا کہ اس صحبت سے محبت بڑھتی ہے اور جو محبت سے سہولت ہوتی ہے۔

الحمد لله ماجعل علیکم فے الدین من حرج

(تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی)

پر ہر پہلو سے کلام کافی ہو گیا اب ختم کرتا ہوں۔

دعا کیجئے کہ علم و عمل کی توفیق ہو۔ (پھر دعا کے بعد جلسہ ختم کیا گیا)

حق الاطاعت

حق اطاعت کے متعلق یہ وعظ ۲۱ شوال ۱۳۲۹ھ بروز یکشنبہ کاندھلہ میں ہوا جو سوا دو گھنٹوں میں ختم ہوا اور مولانا سعید احمد نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمده و نستعینه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل علیه و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یهده اللّٰہ فلا مضل له و من یضلله فلا هادی له و نشهد ان لا اله الا اللّٰہ وحده لا شریک له و نشهد ان محمدا عبده و رسولهٗ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه و علی اله واصحابه و بارک وسلم. اما بعد

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم. قال اللّٰہ تبارک و تعالی واطیعوا اللّٰہ والرسول لعلكم ترحمون (آل عمران ۱۳۲)

(یعنی تم اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کیا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے)

شریعت وطریقت

یہ ایک آیت ہے جس کے الفاظ نہایت ہی مختصر ہیں مگر اس میں ایک ایسا جامع مضمون مذکور ہے جس سے کوئی جزو نہ شریعت کا خارج ہے نہ طریقت کا اور یہاں کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ آیت شریعت اور طریقت دونوں کو کیسے جامع ہو سکتی ہے۔ کیونکہ شریعت اور طریقت تو سنا ہے کہ دو مقابل اور مغائر راستے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے عام مسلمان بھائیوں میں جہاں اور بہت سی بے بنیاد باتیں شائع ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ شریعت اور طریقت کو جدا سمجھتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ ظاہری احکام کے بجالانے کا نام شریعت ہے اور باطنی احکام کے بجالانے کا نام طریقت ہے اور باطنی احکام ظاہر کے مبائن ہیں۔ اکثر طبائع میں یہ فاسد اعتقاد جما ہوا ہے کہ شریعت اور ہے طریقت اور۔ بہت سی باتیں جو شریعت میں ناجائز ہیں وہ طریقت میں جائز ہیں اور ایسا سمجھنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو دائرہ اباحت کو وسیع کرتے ہیں اور محرمات کو بہت کم سمجھتے ہیں اور یہ لوگ تو گویا شریعت کو کوئی چیز ہی نہیں سمجھتے سو

ان کا تو کچھ ذکر نہیں۔ ذکر ان لوگوں کا ہے جو شریعت کو بھی کوئی چیز سمجھتے ہیں مگر دونوں کو قسیم اور مقابل سمجھ رکھا ہے اور گو شریعت وطریقت میں تھوڑا فرق ہے اور وہ کلیہ وجزئیہ کا فرق ہے۔ یعنی شریعت کل ہے اور طریقت اس کا جزو ہے مگر لوگوں نے اس کے سمجھنے میں یہ غلطی کی کہ شریعت صرف احکام ظاہری اور طریقت صرف احکام باطنی کا نام سمجھ لیا۔ قرآن شریف میں اس مضمون کلیت شریعت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ثم جعلناک علی شریعة من الامر فاتبعها ولاتتبع اھواء الذین لایعلمون.

(پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔ سو آپ اسی طریقہ پر چلے جایئے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلئے)

اس مقام پر شریعت کو اھواء (خواہشات) کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اھواء کا مقابل مطلق دین ہے خواہ احکام ظاہری ہوں یا احکام باطنی۔ باقی اس کے یہ معنی نہیں کہ بعض چیزیں احکام ظاہری کی رو سے حرام ہیں اور احکام باطنی کی رو سے حلال ہیں۔

اور باطن سے وہ مراد نہیں جس کو عوام باطن کہتے ہیں۔ میری مراد باطن سے وہ ہے جس کی خبر نہ مدعیان باطن کو ہے نہ مدعیان ظاہر کو۔

مدعیان ظاہر نے تو دین صرف اس کو سمجھ رکھا ہے کہ نماز پنج وقت ادا کر لی جائے مال نصاب کو پہنچ جائے تو زکوۃ دے دی اور زیادہ مال ہو تو حج کر لیا جائے باطن کی ان کو کچھ خبر نہیں۔ چاہے دل میں کیسے ہی امراض بھر رہے ہوں۔ دل میں تکبر ہے بغض ہے حسد ہے ریہ ہے مگر اپنے کو دیندار شمار کرتے ہیں نہ ان کو اپنی خبر نہ دوسرے کی۔ اپنے اندر ہزاروں عیب ہوں تب بھی پروا نہیں اور دوسرے لوگوں پر ظاہری احکام میں ذرا کمی ہونے سے ملامت اور ہنسی کرتے ہیں۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل　　و اندروں قہر خدائے عزوجل

یعنی ظاہری حالت ان میں ایسی ہے جیسے کافر کی قبر مزین ہوتی ہے اور اس کے اندر خدائے تعالیٰ کا قہر وغضب نازل ہوتا ہے۔

ظاہری حالت تو یہ کہ بایزید بھی دیکھ کر شرما جائیں اور باطن کی یہ حالت کہ کچھ پوچھے نہیں۔ انہیں لوگوں کو حدیث میں فرماتے ہیں۔

السنتھم احلی من السکر قلوبھم امر من الذنب

باتیں شکر سے بھی زیادہ شیریں اور دل میں تکبر اور حسد تحقیر وغیرہ بھرے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی کیفیت ہے جو اہل ظاہر ہیں اور ان میں ایسے لوگ کثرت سے ہیں جن کو باطن کی کچھ خبر نہیں۔

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام
زہے شریعت و ملت زہے طریقت و کیش

ریا کو حلال شمار کرتے ہیں اور شراب کے پیالہ کو حرام۔ یہ اچھی شریعت و ملت ہے اور اچھی طریقت اور مذہب ہے۔

ظاہر و باطن

ریا تفاخر کے لئے کام کرنا یہ باطن کا گناہ ہے اور شراب پینا ظاہر کا گناہ۔ اس کو حرام سمجھتے ہیں اور باطن کے گناہ کو حلال۔

صاحبو! اسلام اور دین کے یہ معنی کہ دونوں پہلو برابر ہوں۔ جیسے حسین وہ ہے کہ اس کا خط اور خال اور آنکھ ناک غرض ہر عضو موزوں ہو۔ ہر ادا دلکش ہو ایک شخص کی آنکھ رخسار ہاتھ پاؤں سب درست ہوں مگر ناک نہ ہو تو اس کا سب حسن خاک میں مل جائے گا۔ اسی طرح تدین کو سمجھو۔ دیندار وہ ہے جس میں ظاہری و باطنی اجزاء دین کے سب ہوں۔ جس نے ایک ادا بھی چھوڑ دیا وہ دیندار نہیں چاہے دوسری ادا کیسی عمدہ اور دلکش ہو۔ جیسے حسین وہ ہے جس کی ساری ادائیں اچھی ہوں۔ مالدار وہ نہیں سمجھا جاتا جو پیسہ کا مالک ہو زمیندار وہ نہیں سمجھا جاتا جس کے پاس ایک بیگھہ زمین ہو۔

مجھے ایک طالب علم کا لطیفہ یاد آ گیا کہ وہ ایک گاؤں میں گئے۔ نماز کی سختی سے تاکید کی اور بے نمازیوں کو سخت الفاظ کہے گاؤں کے لوگ بگڑ گئے اور واعظ کو ایذا دینے کے درپے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے نمازیوں سے کہا ہے تم بتلاؤ کہ کبھی بقرعید کی نماز بھی تم نے پڑھی ہے کہنے لگے ہاں۔ انہوں نے کہا بس تم نمازی ہو۔

سو تم بھی سمجھتے ہو کہ یہ دفع الوقتی تھی۔ ایسا شخص نمازی نہیں سمجھا جاتا۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ سارے اہل ظاہر ایسے ہی ہیں مگر اکثر حالت یہی ہے۔ غرض مالدار وہ نہیں ہے جس کے پاس ایک پیسہ ہو اسی طرح دیندار وہ نہیں ہے جس کا صرف ظاہر اچھا ہو۔ تو غرض یہ ہے

کہ باطن کو ہم نے چھوڑ رکھا ہے اور اس کو کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ اور جو کوئی سمجھاتا ہے کہ تیرا روزہ اور زکوٰۃ کام نہ آئے گا اس سے لڑتے جھگڑتے ہیں مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ظاہر کی اصلاح ضروری نہیں بلکہ یہ شکایت ہے کہ باطن کو بالکل ہی چھوڑ رکھا ہے ورنہ باطن کی اصلاح بھی بغیر اصلاح ظاہر کے ممکن نہیں کیونکہ مثلاً جب ظاہری فرض کو چھوڑا تو باطن بھی تو مقہور ہوا اور یہ دال (دلالت کرنے والا) ہوگا عدم انقیاد (تابع ہونا) باطن پر۔

یہ تو اہل ظاہر کا حال تھا کہ باطن کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ اب لیجئے مدعیان باطن کو۔ سو وہ بھی جبو سے باطن کے بے خبر ہیں۔ کیونکہ باطن یہ ہے کہ جو احکام متعلقہ قلب ہیں ان کو بجا لائے۔ باطن یہ نہیں کہ کشف ہو۔ کرامت ہو جو کہہ دیا وہ ہو گیا اس کو دین سے کوئی تعلق نہیں۔ دجال کو بڑا تصرف حاصل ہوگا جو کسی ولی کو حاصل نہیں ہوا۔ جب کہہ دے گا بارش ہو جائے گی۔ زمین کے خزانے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیں گے مگر پھر ملعون ہے اور کافر۔ بلکہ اکابر صوفیہ تو ایسے تصرفات کے قصد کرنے کو بھی برا سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ حال ہوتا ہے۔

با وجودت ز من آواز نیاید کہ منم!

(تیرے وجود کے سامنے مجھ سے آواز نہیں آتی کہ میں ہوں) تصوف تو اس کا نام ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کردے کہ جس حال میں چاہے رکھے پھر تصوف کا دعویٰ کب جائز ہوگا البتہ جس چیز کی طلب کا خدا ہی کا حکم ہے وہاں یہی تسلیم ہے کہ اس کو بجا لایا جائے۔ اور یہ اس لئے کہا کہ شاید کوئی یہ کہے کہ پھر نماز بھی نہ پڑھو کہ یہ بھی تسلیم کے خلاف ہے۔

سنئے! کسی بڑے حاکم کے سامنے الٹ پلٹ کرنا جیسا تفویض (سپرد کرنے) کے خلاف ہے ایسا ہی اس کے حکم کی تعمیل نہ کرنا بھی تفویض کے خلاف ہے۔ جس کام کو کہا اسے کرو جس کو نہیں کہا اسے نہ کرو۔ اگر کوئی شخص حکم کی موافقت نہیں کرتا تو اس کو کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو سپرد کردیا۔ تو جو کہہ دیا اس کو کرنا ہی تفویض ہے۔ غرض اکابر ان تصرفات کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ ان کا حکم نہیں اور بدوں حکم کے کچھ کرنا تفویض و تسلیم کے خلاف ہے۔

حاصل یہ کہ باطن یہ نہیں ہے کہ جو عوام کا مزعوم ہے بلکہ احکام باطنیہ وہ عبادت ہیں جو قلب کے متعلق ہیں کیونکہ جیسے عبادت بدنیہ نماز وغیرہ فرض واجب ہیں ایسے ہی عبادات قلبیہ بھی بعض فرض و واجب ہیں۔ مثلاً ایمان قلب کا فعل ہے کیونکہ ایمان تصدیق کا نام ہے

اور تصدیق دل سے ہوتی ہے یا نماز میں نیت فرض ہے۔ یہ بھی فعل قلب ہے اور یہ سب دل کی عبادتیں ہیں یا مثلاً شکر کرنے کا حکم ہے یہ بھی فعل قلب ہے کیونکہ شکر کے معنی قدردانی کے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ دل سے ہوتی ہے نیز صبر کا حکم ہے۔ سو یہ بھی دل سے ہوتا ہے اس لئے کہ صبر کے معنی مکارہ (رنج وسختی) پر اپنے کو ضبط کرنے کے ہیں۔ اول قلب میں استقلال اور خلوص پیدا ہوتا ہے اس کے بعد ضبط کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو دل کی عبادات کا بیان تھا۔

گناہوں کی جڑ

اب دل کے گناہ سنئے۔ حب الدنیا راس کل خطیئة کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔ یہ دل کا اتنا بڑا گناہ ہے کہ سارے گناہ اس کی فرع (شاخ) ہیں۔ کیا اب بھی کسی کو یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ باطن کوئی چیز نہیں اور نہ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

اس حدیث میں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ تمام گناہوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے مگر حضور نے یہ نہیں فرمایا کہ کسب الدنیا راس کل خطیئة (لم أجد هذا الحديث في "موسوعة أطراف الحديث") (دنیا کمانا ہر گناہ کی جڑ ہے) حب اور چیز ہے کسب اور چیز ہے۔ حب دنیا حرام ہے اور کسب کرنا بضرورت اداء حقوق حدود شرعیہ کے اندر رہ کر بعض کے لئے واجب ہے اگر اس کو ترک کر دیا جائے تو ان بعض کو ملامت ہوگی اور مستحق عتاب ہوں گے۔ بعض اس لئے کہا کہ یہ حکم کلی نہیں۔ بعض کو ملامت بھی نہیں ہوگی کیونکہ مثلاً سلطنت میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض کے ذمہ جمہوری تعلق ہوتا ہے ان کو خود کسب کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان کی تنخواہ بذمہ سلطنت ہوتی ہے اور بعض کے ذمہ ایسا تعلق نہیں ہوتا ان کے لئے عدم کسب اور آوارہ گردی جرم ہے کیونکہ جب معاش نہیں تو کھانا پینا کہاں سے ہوگا۔ خواہ مخواہ چوری جوا نقب لوٹ وغیرہ کرنا شروع کرے گا جس سے ملک میں فساد اور بدنظمی پھیلنے کا اندیشہ ہے اس حکمت سے آوارہ گردی قانونا ممنوع ہے پس عام رعایا کے لئے تو عدم الکسب (نہ کمانا) جرم ہوا اور سرکاری آدمی کیلئے جس کے ذمہ جمہوری تعلق ہے کسب ممنوع ہے اس کو خزانہ شاہی سے تنخواہ دی جاتی ہے چنانچہ اگر کوئی گورنمنٹ کا ملازم تجارت کرے تو مجرم ہوگا اور اس سے کہا جائے گا کہ تجارت چھوڑ دو یا سرکار کو چھوڑ دو دونوں ایک ساتھ کرنے

کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہی راز ہے جس کی طرف مولانا نے اشارہ فرمایا ہے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں　　ایں خیال ست ومحال ست وجنوں

یعنی خدا کو بھی چاہو اور دنیائے حقیر کو بھی۔ یہ خیال محال اور جنون ہے اسی طرح اللہ کے بندوں میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں سرکاری آدمی کے لئے جو کہ سرکاری خدمت کرتا ہو کسب کرنا جرم ہے اور وہ خدمت تفرغ للعبادۃ (عبادت کے واسطے فارغ ہونا) ہے لازمی ومتعدی جیسے اصلاح وارشاد خلق جیسا کہ ارشاد ہے **وماخلقت الجن و الانس الالیعبدون۔** (میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں) جو لوگ اس کی تعمیل میں مشغول ہیں جس کے لئے انبیاء مبعوث ہوئے اس کے لئے کسب کرنا جرم ہے اسی لئے کوئی نبی تاجر نہیں ہوا جیسے ان کو کسب کی اجازت نہیں لوگوں سے مانگنے کی بھی اجازت نہیں۔

قل لآ اسئلکم علیه مالاً ان اجری الا علی الله

میں تم سے اس تبلیغ پر کچھ مال نہیں مانگتا میرا معاوضہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ذمہ میں ہے۔

اور فرماتے ہیں۔

وامرت ان اکون من العابدین ولم او مر ان اکون من التاجرین او کماقال

یعنی مجھ کو اس بات کا حکم ہوا ہے کہ میں عبادت کرنے والوں سے ہوں نہ تجارت کرنے والوں میں سے۔

تو جو کام کرے اس کے لئے بھی یہ جرم ہے کہ تاجر وغیرہ بنے اس کی تنخواہ سرکار سے ہے۔ اس کو خزانہ شاہی سے وظیفہ ملتا ہے جیسے سلطنت کا خزانچی نہیں کہہ سکتا کہ میں دینے والا ہوں اسی طرح خادمان دین کی خدمت کر کے کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں دینے والا ہوں اس لئے کہ دل کی کل باتیں خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جس طرف اس کو پھیرتا ہے اسی طرف سارے اعضاء پھر جاتے ہیں اگر وہ دل میں یہ بات نہ ڈالتا کہ فلاں شخص دین کی خدمت کر رہا ہے اس کی خدمت کرنا ہمارے لئے باعث اجر ہے تو قیامت تک ممکن نہ تھا کہ تم کچھ بھی کسی کو دے سکتے۔ اگر یہ زعم ہو کہ اگر ہم ہاتھ روک لیں تو معلوم ہو جاوے کہ پھر انہیں کیسے

ملتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ روک لو۔ یہ بھی ہو چکا ہے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

هم الذين يقولون لاتنفقوا على من عند رسول الله حتىٰ ينفضوا ولله خزائن السموٰت والارض ولكن المنافقين لا يفقهون يقولون لئن رجعنا الى المدينة ليخرجن الاعزمنها الاذل ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين ولكن المنافقين لايعلمون.

یعنی یہ منافقین وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں ان پر کچھ خرچ مت کرو۔ یہاں تک کہ یہ آپ ہی منتشر ہو جائیں گے۔ ان کا یہ کہنا محض جہالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں تمام خزانے آسمانوں کے اور زمین کے لیکن منافقین نہیں سمجھتے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ میں لوٹ کر جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو نکال دے گا۔ ان کا یہ کہنا بھی جہالت محض ہے۔ بلکہ اللہ ہی کی عزت ہے اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی لیکن منافقین نہیں جانتے۔

یہ منافقین جن کا اس آیت میں ذکر ہے ان کو دو چیزوں کا زعم تھا۔ ایک مال کا اور دوسرے جاہ کا۔ اور انہی دو باتوں کی وجہ سے یہ غریب مسلمانوں کو ذلیل اور حقیر سمجھتے تھے۔ یہی مرض آج کل پھیلا ہوا ہے اور اس کی کمی کی وجہ سے اس زمانہ کے بعض مسلمان علماء کی تحقیر کرتے ہیں سو اس میں غور کرو۔ یہ قرآن ہے ناول تو نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ منافقین یوں کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں ان کو روٹی مت دو یہاں تک کہ خود ہی بھاگ جائیں گے۔ خدا تعالیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں فرماتے ہیں کہ پاگل ہوئے ہو آسمان اور زمین کے سب خزانے خدا ہی کی ملک ہیں مگر تم کو خبر نہیں۔ یہ تو مال پر غرہ تھا جس کا جواب بھی آپ نے سن لیا۔ جاہ پر غرہ یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ مدینہ پہنچ کر ہم سے عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک سفر میں لوٹتے ہوئے ایک انصاری ایک مہاجر میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ انصاری نے انصار کو آواز دی۔ مہاجر نے مہاجرین کو پکارا اور قریب تھا کہ فساد ہو جاتا کہ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنچ گئے اور آپ نے دونوں فریق کو سمجھا دیا اس پر منافقین نے کہا کہ یہ مہاجرین اپنے گھر بار چھوڑ کر ہماری روٹیوں سے پلے ہیں اور پھر ہمیں سے لڑتے ہیں مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا یعنی ہم ان مسلمان مہاجرین کو نکال دیں گے۔ حق

تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں۔

لله العزة ولرسوله وللمومنين ولكن المنافقين لا يعلمون

یعنی عزت اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے اور مسلمانوں کے لئے ہے لیکن منافقین نہیں جانتے۔

اور کیسی خوبصورتی سے فرمایا کہ ان کے مقدمات کو تسلیم فرمالیا کہ ہاں سچ کہتے ہو عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا مگر عزت خدا کے لئے ہے اور رسول اللہ کے اور مسلمانوں کے لئے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہم تم کو نکال دیں گے اس آیت میں ان کی حکایت مع شکایت اور جواب کے اس طرح بیان کی گئی ہے کہ خصم (مقابل) کو بالکل ساکت کر دیا البتہ شاید یہ شبہ ہو کہ یہ جواب کیا ہوا کیونکہ یہ تو محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے کہ عزت اللہ اور رسول کے لئے ہے کوئی دلیل تو بیان نہیں کی گئی حالانکہ دلیل کی ضرورت ہے کیونکہ مخاطب اس کا منکر ہے۔ تو سمجھئے کہ جواب دو طرح ہوتا ہے حکیمانہ اور حاکمانہ اور دونوں کے جدا جدا مواقع ہیں حکیمانہ جواب جب دیا جاتا ہے جب مخاطب میں فہم کی قابلیت ہو اور وہ سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہو اور سمجھنے کے بعد حق ماننے کا ارادہ رکھتا ہو اور اگر مخاطب میں یہ باتیں نہ ہوں جواب حاکمانہ دیا جاتا ہے چنانچہ حکام ظاہری بھی کبھی حکیمانہ جواب دیتے ہیں کبھی حاکمانہ۔ آپ نے علوم درسیہ پڑھے ہیں۔ طبیعت فلسفیانہ جواب کی خوگر ہوگئی ہے اس لئے یہ جواب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ خدا میں جہاں حکیمانہ شان ہے ویسے ہی حاکمانہ شان بھی ہے تو خدا تعالیٰ نے یہاں حاکمانہ جواب دیا ہے کیونکہ پورا اطمینان ہے کہ جب چاہوں گا ان منافقین کو نکال باہر کر دوں گا مگر ہم لوگوں کے مذاق چونکہ بگڑ گئے ہیں اس لئے قرآن کے جوابات میں شکوک واوہام پیدا ہوتے ہیں کہیں آیات میں ربط معلوم نہیں ہوتا مگر سچ کہا کسی نے۔

تو نہ دیدی گہے سلیماں را   کے شناسی زباں مرغاں را

تم نے کبھی سلیمان علیہ السلام کو آنکھ سے تو دیکھا نہیں۔ پھر تم پرندوں کی بولی کب سمجھ سکتے ہو۔ یعنی تم کو کبھی قرآن کھول کر پڑھنے کی توفیق تو ہوئی نہیں پھر اس کے مطالب اور معنی کو کیونکر سمجھ سکتے ہو۔

قرآن کا اثر

ہمیں کبھی قرآن کو کھول کر پڑھنے کی بھی توفیق کم ہوتی ہے پھر مطالب و مضامین سے کیونکر مناسبت ہو۔ اسی لئے قرآن سب سے پہلے پڑھانا چاہیے تاکہ خوب رچ جائے اور طبیعت کو مناسبت الفاظ سے تو پیدا ہو جائے اس کے بعد جب معانی سمجھنے کا وقت آئے گا تو اس کی یہ حقیقت معوم ہوگی جو اس آیت میں مذکور ہے۔

لو انزلنا هذا القرآن علیٰ جبل لرایته خاشعاً متصدعاً من خشیة الله

یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔

اس وقت دل شکوک و اوہام سے ملوث نہ ہوگا۔

میں ایک حکایت بیان کرتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اگر دل سادہ ہو اور ذہن خالی ہو تو پھر قرآن کا اثر کیا ہوتا ہے۔ ہم پر اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ دل سادہ نہیں رہا۔ حضرت اسمعی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ سفر پر جا رہے تھے راستہ میں ان کو ایک بدوی نے روکا اور مال چھین لینے کا قصد کیا انہوں نے کہا کہ تجھ کو خدا کا خوف نہیں آتا کہ ناحق لوگوں کا مال چھینتا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا نے ہمارا رزق اسی طرح مقرر فرمایا ہے اور ہمارا اسی طرح گزران ہے۔ اسمعی نے کہا کہ تو جھوٹ کہتا ہے تیرا رزق آسمان میں ہے وہاں سے حسب تقدیر پہنچتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں **و فی السمآء رزقکم وماتوعدون** (یعنی تمہارا رزق اور جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سب آسمان میں ہے) اس نے کبھی قرآن مجید نہیں سنا تھا ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ پھر کہا کہ اے اسمعی میں اپنے رب پر ایمان لایا اور آج سے تدبیر کو ترک کیا۔

دیکھئے اس بدوی کا دل سادہ تھا اس کو ایک بھی شبہ نہ ہوا۔ وہ پاگل نہیں تھا۔ اس نے خالی الذہن ہو کر کلام باری کو سنا اور خلو ذہن کے سبب اس کو فوراً یقین پیدا ہو گیا اور اس سے متاثر ہو گیا۔ ہم نے شکوک و اوہام میں پھنس کر یقین کو دھو ڈالا۔ قلب مسخ ہو گیا۔ اس لئے کلام اللہ کا بھی حالانکہ وہ خدا کا کلام ہے اور نہایت سچا موثر کلام ہے ہمارے دلوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

دیکھو! تختی پر اول نقش جم جاتا ہے اور اگر مشق کرتے کرتے مسخ ہو گئی تو پھر میر پنجہ کش کا جیم بھی اس پر نہ جمے گا۔ اس بدوی کا دل خالی تھا قرآن کی آیت سنتے ہی اس کا یقین پختہ

ہو گیا اصمعی کو اور اونٹ کو چھوڑ کر چل دیا۔ حقیقت میں عمل کے لئے تھوڑا علم بھی کافی ہے اس کے بعد اصمعی نے اس کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے پوچھا کہ اس آیت سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ اصمعی نے پڑھا۔

فورب السمآء والارض انه لحق مثل مآانکم تنطقون۔

یعنی قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ وہ برحق ہے جیسا تم باتیں کر رہے ہو۔ سنتے ہی دل پر ایک صدمہ پہنچا وہ کون ظالم ہوگا جس نے حق تعالیٰ کی تکذیب کی تھی کہ جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یہ قسم کھائی اور اس صدمہ سے دم نکل گیا۔

اس سے سبق لینا چاہئے۔ قرآن وہ چیز ہے کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک بچی نے قرآن مجید کے ایک مضمون کو مجھ سے سنا اور ہچکی بندھ گئی۔ ہم ظلمات میں ہیں اور اس کو علم سمجھتے ہیں۔

علم اور جہل

حدیث میں ہے کہ بعض علم بھی جہل ہے۔

علم رسمی سربسر قیل ست و قال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

علم رسمی محض قیل وقال ہے نہ اس سے کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے نہ حال۔

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی زدل بربایدت

یعنی واقع میں علم وہی ہے جو تم کو محبوب حقیقی کا راستہ بتائے اور دل سے گمراہی کے زنگ کو دور کر دے۔

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت دردلت افزوں کند

یعنی خواہشات نفسانی کو تمہارے سر سے باہر کر کے تمہارے دل میں خدائے تعالیٰ کا ڈر اور خوف بڑھادے۔

تو نہ دانی جز یجوز ولا یجوز خود نہ دانی کہ تو حوری یا عجوز

تم سوائے یجوز (یہ جائز ہے) اور لا یجوز (یہ ناجائز ہے) کچھ نہیں جانتے اپنی خبر نہیں کہ تم حور یعنی مقبول ہو یا عجوز یعنی مردود ہو۔

کہتے ہیں کہ مجوز کا قانون یاد ہو تو پھر سب معاف ہے۔ کیوں صاحبو! اگر ایک بیرسٹر باغی ہو تو کیا ماخوذ نہ ہوگا بلکہ زیادہ ماخوذ ہوگا کہ تو نے قانون سے واقف ہو کر کیوں بغاوت کی۔ تو نے بالقصد بغاوت کی۔ اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ قانون دان لوگ بڑی احتیاط کرتے ہیں۔ اس کا یہی راز ہے کہ ان کی خطاؤ قصور بدنیتی پر محمول کی جائے گی اور ناواقفوں کے بارے میں ہم نے خود دیکھا ہے کہ حکام کہتے ہیں کہ اس نے بدنیتی سے نہیں کیا ناواقفی سے خطا ہو گئی ہے۔ خود عذر سکھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کہ پھر نہ کرنا تو معلوم ہوا کہ محض علم کی کثرت کچھ مفید نہیں بلکہ اس سے اور زیادہ مؤاخذہ ہوتا ہے کہا گیا ہے۔

ویل للجاهل مرة وللعالم سبع مرات

یعنی جاہل کے لئے ایک ہی مؤاخذہ ہے اور عالم کے لئے سات گنا مؤاخذہ ہے۔

تو جب بلا عمل اس علم کی یہ حالت ہے تو دنیا کے علوم کا کیا کہنا وہ تو سراسر ظلمات ہیں۔ ایسی حالت میں قرآن کی حلاوت کیسے محسوس ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مال تو زید کے پاس ہے خدا کے پاس کہاں۔ تو یہ جواب یعنی للہ خزائن (اللہ ہی کے لئے خزانے ہیں) درست کیسے ہوا۔

تو جواب وہی ہے کہ یہ جواب حاکمانہ اسی لئے تو ہے کہ بظاہر یہ چیزیں ہمارے پاس معلوم ہوتی ہیں۔ تو حاصل جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہ چیزیں ظاہر میں تمہارے پاس ہیں مگر در حقیقت سب خزانے ہمارے پاس ہیں اور اگر ظاہر میں بھی یہ چیزیں ہمارے پاس نہ ہوتیں کہ ظاہری قبضہ بھی ہمارا ان پر نہ ہوتا تو یہ جواب حکیمانہ ہوتا حاکمانہ نہ ہوتا۔ اور اگر غور کیا جائے تو اس میں حکیمانہ جواب بھی ہے۔ میں نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ جتنے خزانے ہیں خدا کی ملکیت ہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ چیزیں اگرچہ ہمارے قبضہ میں ہیں مگر ہم ان کے حقیقی مالک نہیں بلکہ یہ سب ہمارے پاس مستعار ہیں۔ ان سب کا مالک حقیقی حق تعالیٰ ہے اور مشہور ترجمہ میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ چیزیں خدا کے پاس کہاں ہیں اور اس ترجمہ میں یہ شبہ نہیں۔ جیسے بادشاہ دنیاوی تمام خزانوں کا مالک ہوتا ہے اور وہ خزانچی کو حکم دیتا ہے کہ دے دو اسی طرح خدا کا حکم ہوتا ہے کہ خادمان دین کی خدمت کرو۔ مگر اتنا فرق ہے کہ حاکم دنیوی کے حکم کے بعد خزانچی اپنے اختیار سے باہر نہیں ہو جاتا اور یہ وہ حکم ہے کہ دینے والا مضطر ہو جاتا ہے اللہ والے پھینکتے ہیں اور وہ منتیں کرتا ہے جس کا دل چاہے ہاتھ روک لے۔

ھانتم ھٰؤلآء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فمنکم من یبخل و من یبخل فانما یبخل عن نفسه واللہ الغنی و انتم الفقراء

ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے۔ سو بعض تم میں ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو کوئی بخل کرتا ہے وہ تو خود اپنے لئے بخل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو کسی کے محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو۔

خدا غنی ہے اور محتاج تم ہو خرچ کرنے کا جو حکم ہے تمہارے ہی نفع کے لئے ہے کہ آخرت میں اس کی ضرورت ہوگی۔ تو خرچ کرنے کا حکم تمہاری احتیاج پر نظر کر کے دیا گیا ورنہ خدا کو تمہاری کچھ ضرورت نہیں۔

وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم

اگر تم خرچ کرنے سے باز رہو تو خدا تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کردے گا۔ پھر تم جیسے نہ ہوں گے تم سے اچھے ہوں گے۔ ان کے ہاتھ سے ہم کام لے لیں۔ یہ معنی ہیں للہ خزائن السموات والارض (اللہ ہی کے لئے ہیں خزانے آسمانوں اور زمین کے) کے بہرحال اس قول کا جواب حکیمانہ وحاکمانہ قرآن میں موجود ہے۔

مقام علماء

اب بھی بہت لوگ مال اور جاہ کے ناز میں ہیں اور اہل علم کی توہین کرتے ہیں وہ اس جواب کو اچھی طرح سن لیں اور سمجھ لیں کہ یہ لوگ سرکاری ملازم ہیں۔ اگر کلکٹر کے لباس میں پیوند ہو تو اس کی ذلت نہیں کی جاسکتی اور نہ اس سے اس کی عزت کم ہوتی ہے تو اگر ایک اہل اللہ کے پاس اچھا کپڑا نہ ہو تو اس کی ذلت کرنا کب جائز ہوسکتی ہے۔ سرکاری آدمی جس حال میں بھی ہو اس کی توہین جرم ہے۔ حق تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتے ہیں۔

من عادی لی ولیا فقد اذنته بالحرب (سنن ابن ماجه : ۳۹۸۹)

کہ جو کوئی میرے ولی سے عداوت رکھے تو اس کو اعلان جنگ سناتا ہوں۔

صاحبو! اگر ایک چھوٹی سی سلطنت اعلان جنگ دے دے تو بڑی بڑی سلطنتوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور اولیاء اللہ کی عداوت پر احکم الحاکمین اعلان جنگ سناتے یں۔ مگر اللہ رے غفلت کہ پھر بھی غافل ہیں کہ اس کے منتظر ہیں کہ توپ خانہ لگادیا جائے۔

صاحبو! حکام دنیا کے ادنیٰ ملازموں کی توہین تو جرم ہو اور احکم الحاکمین کے ملازموں کی توہین جرم نہ ہو۔ علماء سرکاری آدمی ہیں ان کے لئے کسب کرنا ایک درجہ میں ناپسند ہے اور عوام کے لئے یہ حکم ہے کہ کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ یعنی جیسے نماز روزہ فرض ہے ایسے ہی حلال رزق حاصل کرنا بھی فرض ہے ان کو ترک اسباب میں بزرگوں کی نقل مناسب نہیں۔

ایک بزرگ ایک مقام پر تھے۔ ایک شخص اپنی اولاد کو نصیحت کرنے لگے کہ بھائی کچھ کھانے کمانے کی لیاقت حاصل کرلو۔ انہوں نے کہا کیا ضرور دیکھئے حضرت مولانا گنگوہیؒ کچھ نہیں کماتے پھر کیسے آرام میں ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ افسوس کہ مولانا کی اس بات کو دیکھا مگر ان کے کمالات کو نہ دیکھا۔ یہ ہمت نہ ہوئی کہ ہم بھی دین کی خدمت کریں۔ توکل سہل معلوم ہوا کیونکہ اس میں کچھ کرنا تو پڑتا ہی نہیں مگر خبر بھی ہے توکل ہر ایک کا کام نہیں۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

ناز و ادا کے لئے حسین چہرہ چاہئے جب تم حسن نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس مت جاؤ۔

عیب باشد چشم نابیناؤ باز　　زشت باشد نقش نازیبا و ناز

یعنی جس طرح نابینا آنکھ کے لئے کھلا ہوا ہونا عیب ہے اسی طرح نازیبا شکل کے لئے ناز برا ہے۔

چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش　　ہمچو او با گریہ و آشوب باش

جب تم یوسف نہیں ہو یعقوب ہی رہو اور ان کی طرح گریہ و آشوب میں رہو۔ یعنی جب تم کامل نہیں ہو تو کاملوں کی ریس مت کرو۔

جو جس کام کے لائق ہے اس کے لئے اس کے اسباب مہیا کر لئے ہیں تو عوام کا کام کسب کرنا ہے اور علماء کی یہ حالت ہے۔

للفقرآء الذین احصروا فی سبیل اللہ لایستطیعون ضربا فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیآء من التعفف تعرفھم بسیماھم لایسئلون الناس الحافاً.

صدقات اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مقید ہو گئے ہیں۔ ان کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ ناواقف ان کو بے سوالی سے تونگر خیال کرتا ہے تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو کہ فقر و فاقہ کا چہرہ پر ضرور اثر نمایاں ہوتا ہے وہ

لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے۔

اس میں احصروا فرمایا ہے جس کا ترجمہ سہل یہ ہے کہ محبوس ہو گئے دین کے کام میں اور تجارت وغیرہ کے لئے سفر نہیں کر سکتے۔ مجھے خوب یاد آیا کہ آج کل بعض لوگ مولویوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں کھانے کمانے کے قابل نہیں۔ مگر یہ اپاہج کا خطاب ان کو خدائی دربار سے ملا ہے فرماتے ہیں **لایستطیعون** ضربا فی الارض یعنی ان کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ پس اس کہنے پر برا نہ مانا کرو بلکہ یہ پڑھ دیا کرو۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم   مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

ہم اگر مفلس و دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے۔ محبوب حقیقی اور اس کی محبت کے متوالے ہیں۔

اے گروہ علماء و طلباء اگر کوئی تمہیں دیوانہ کہے تو برا نہ مانو۔ پس یہ اپاہج ہی ایسا وصف ہے کہ سب انبیاء اس سے متصف تھے۔

انبیاء در کار دنیا جبری اند   کافراں در کار عقبے جبری اند

یعنی انبیاء علیہم السلام تو کار دنیا میں جبری اور تارک اسباب ہیں اور کفار کار عقبی میں جبری اور تارک اسباب ہیں۔

انبیاء را کار عقبے اختیار   کافراں را کار دنیا اختیار

یعنی انبیاء علیہم السلام کو کار عقبے اختیار ہوا ہے کہ اس کے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔ کفار کو کار دنیا اختیار ہوا ہے کہ اس سے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔

تبلیغ دین

ایسی چیز جس میں تم سب انبیاء کے شریک ہو تمہارے لئے فخر کی بات ہے اور خوشی کی جگہ ہے کہ تم کو وہ لقب دیا گیا ہے جو خدا کے یہاں سے ملا ہے سچ ہے۔

الفضل ماشهدت به الاعدا

(یعنی بزرگی وہی ہے جس کی دشمن بھی شہادت دے دیں) یہ خطاب شرف کی دلیل ہے خوش ہونے کی بات ہے تو آپ کی سمجھ میں آیا کہ اس آیت میں کون لوگ مراد ہیں۔ وہ لوگ مراد ہیں جو دین کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں نہ مزدوری کریں نہ تجارت

کریں۔ لوگ اس مضمون کو نظر تحقیر سے دیکھتے ہیں کہ یہ بھی کوئی ہے مگر تھوڑے دنوں سے لوگ اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں کہ ایک جماعت محض دین کے لئے وقف ہو جو دنیا کا کوئی کام نہ کرے مگر اس کا افسوس ہے کہ اس ضرورت کے احساس میں بھی انہوں نے دوسری ہی قوموں کا اتباع کیا۔ مسلمانوں کا مذاق یہ ہو گیا ہے کہ قرآن وحدیث سے ان کو تشفی نہیں ہوتی بلکہ بعض اہل علم بھی ایسے دیکھے گئے جن کو قرآن وحدیث سے شفاء نہیں ہوتی اور جب غیر قومیں اسی کام کو اختیار کر لیں تو تسلی ہو جاتی ہے۔ ذرا اپنے قلوب کو ٹٹول کر دیکھ لو۔ خیر سمجھنے کا جو بھی ذریعہ ہو ہمارا کام چل گیا۔ آپ سن رہے ہوں گے کہ بعض غیر مسلم قوموں نے اپنے دین کی تعلیم کے لئے ایک قوم کو وقف کر دیا ہے جن کو دنیا کے کام کرنے کی بالکل اجازت نہیں۔ ان کا کام صرف دین کی اشاعت ہے اور ان کے مصارف کا سارا وزن قوم پر ہے۔ اور ان کے ایسا کرنے کا راز یہ ہے کہ وہ سمجھ گئے کہ ایک شخص دین و دنیا دونوں کے کام بخوبی نہیں کر سکتا۔ اس لئے مجبوراً ان کو ایک جماعت دین کی خدمت کے لئے خاص کر دینی پڑی۔

اے مسلمانو! مذہب باطل والے اس راز کو سمجھ گئے افسوس ہے کہ مذہب حق والے نہ سمجھ سکیں۔ ہمیں دوسروں سے سبق سیکھنا چاہئے اگرچہ جائے افسوس ہے کہ شفیق معلم سے تو سبق نہ سیکھا مخالف معلم سے سیکھا۔ حضرات جتنی انجمنیں آج کل قائم ہو رہی ہیں۔ اس لحاظ سے تو موجب خوشی ہیں کہ کام کرنے کا دل میں خیال پیدا ہوا مگر جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ یہ سب دوسری قوموں کو دیکھ کر خیال پیدا ہوا ہے تو ایک گونہ رنج کی موجب ہیں۔ مسلمانوں کو ہر کام میں قرآن پر نظر کرنی چاہئے تھی اور اسی سے سبق لینا چاہئے تھا اور یوں کہنا چاہئے تھا کہ حسبنا کتاب اللہ یعنی ہم کو قرآن شریف ہی کافی ہے) مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ حدیث وفقہ کوئی چیز نہ ہوئی کیونکہ قرآن ایک متن ہے حدیث وفقہ سب اس کے لئے شروح ہیں۔ اسی کو فقہاء نے کہا ہے القیاس مظہر لا مثبت (یعنی قیاس حکم کا ظاہر کرنے والا ہے ثابت کرنے والا نہیں ہے) تو حدیث وفقہ نے قرآن کے مطالب کو ظاہر کر دیا ہے کوئی حکم قرآن کے خلاف نہیں بیان کیا۔

اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک صندوق مقفل ہے اور کنجی سے اسے کھول دیا اور بہت سے جواہرات نظر آنے لگے تو یہ جواہرات کنجی سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ وہ صندوق میں موجود تھے مگر پوشیدہ تھے۔ کنجی نے ان کو ظاہر کر دیا تو حدیث وفقہ قرآن کے لئے کنجی ہیں۔

جتنے علوم ہیں سب قرآن ہی سے نکلے ہیں اس کی تو یہ شان ہے۔

عباراتنا شتی و حسنک واحد — و کل الی ذاک الجمال یشیر

یعنی عنوانات مختلف ہیں اور حسن یعنی قرآن ایک ہی ہے ہر عنوان اس ایک ہی حسن کی طرف مشیر ہے۔

ایک محبوب ہے جس نے صبح کو دھانی جوڑا پہنا۔ شام کو دوسرا جوڑا پہنا تو جو عاشق نہیں وہ تو نہیں پہچانے گا مگر عاشق کہے گا۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش — من انداز قدت را می شناسم

کہ جو لباس چاہے پہن لے۔ میں تو چال سے پہچان لیتا ہوں۔ تو قرآن کا جو عاشق ہے اس کو حدیث و فقہ میں بھی قرآن ہی نظر آتا ہے۔

مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی حضرت مولانا گنگوہی سے فرمایا کرتے تھے کہ حدیث تو آپ کے سامنے آ کر حنفی ہو جاتی ہے۔ ان حضرات کو حدیث میں فقہ نظر آتی تھی اور ان اہل نظر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ۔

بسکہ در جاں فگار و چشم بیدارم توئی — ہر چہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

یعنی میری جان فگار اور چشم بیدار میں تو ہی سمایا ہوا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھی کو گمان کرتا ہوں۔

جیسا کہ اہل اللہ کو ہر چیز میں خدا نظر آتا ہے مگر معاذ اللہ یہ معنی نہیں کہ یہ سب خدا ہیں۔ استغفر اللہ! بندہ بندہ ہے خدا خدا ہے۔ جیسا کہ قرآن قرآن ہے اور حدیث حدیث۔

مولانا جامی کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ حال میں فرما رہے تھے کہ۔

ہر چہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

(یعنی جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ ہی کو پہنچاتا ہوں) کسی منکر نے مسخرہ پن سے کہا کہ مولانا اگر خر پیدا مے شود (اگر گدھا ظاہر ہو) تو آپ نے کیا مزے کا جواب دیا کہ پندارم توئی (تجھی کو گمان کرتا ہوں)

تو افسوس یہ ہے کہ ان کی حالت کی خبر نہیں کہ وہ شب و روز کس طرح دین کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں کہ ان کو ہر وقت اسی کی دھن ہے۔ ہر دم خدا کی محبت میں مستغرق ہیں۔

پھر وہ دنیا کے کام کس طرح کر سکتے ہیں۔ حضرت طلب ایسی چیز ہے کہ ماسوائے مطلوب سے بالکل جدائی ہو جاتی ہے۔ تو قرآن میں جو فرمایا ہے۔ **احصر وا فی سبیل اللہ لایستطیعون الایۃ** کہ وہ مقید اور اپاہج ہیں وہ جو کچھ نہیں کر سکتے۔ یعنی دنیا کے کاموں سے اپاہج ہیں ورنہ دینی کام میں ان سے بڑھ کر چست کون ہو گا اور اگر غور کیا جائے تو یہ اپاہج ہاتھ پیر چلانے والوں سے بدرجہا افضل ہیں باقی عرف کا تو کوئی علاج نہیں اور اب تو عرف بھی بدل گیا۔ غرض جب ہندوؤں نے یہ عہد کر لیا کہ ان کے مذہب (باطل) کی خدمت کے لئے ایک جماعت وقف کر دی جائے۔ جس کو دنیاوی امور سے کچھ سروکار نہ ہو تو کیا مذہب حق کی خدمت کے لئے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں پس ان لوگوں کے لئے جو خدام دین ہیں کسب ناپسندیدہ ہے اوروں کے لئے نہیں بلکہ اوروں سے ترک کسب پر باز پرس ہو گی۔

حب مال

اب جسے دیکھو توکل کرنا چاہتا ہے لوگوں نے توکل کا نام سیکھ لیا ہے۔ مگر کام بہت کم ہے۔ سعدی خوب فرماتے ہیں۔

نان از برائے کنج عبادت گرفتہ اند
صاحب دلاں نہ کنج عبادت برائے ناں

اہل خدمت نے روٹی گوشہ کے لئے لی ہے نہ کہ گوشہ روٹی کے لئے اب خدا کے ساتھ معاملہ ہے خود دیکھ لو گے کہ گوشہ نشینی سے اکثر کی نیت کیا ہے۔ حاصل یہ کہ کسب الدنیا تو فرض ہے گو بعض ہی کے اعتبار سے سہی مگر حب الدنیا (دنیا کو محبوب بنانا) گناہ ہے۔ اب اگر کوئی حب الدنیا کو منع کرتا ہے تو اس پر لوگ الزام رکھتے ہیں کہ اپاہج بنانا چاہتا ہے۔

صاحبو! استنجے کے ڈھیلے کتنی ضرورت کی چیز ہے مگر کوئی ان سے محبت کرنے لگے کہ ہر دم اسی کی دھن میں رہے تو اس کو بے وقوف ضرور کہا جائے گا۔ آخرت کے مقابلے میں دنیا استنجے کے ڈھیلے سے بھی بدتر ہے۔ لہذا اس سے کام لینے سے اور اس کام لینے کے لئے کمانے سے کہ وہ کسب ہے کوئی منع نہیں کرتا۔ البتہ اس کی محبت اور دھن یقیناً قابل ملامت ہے کہ یہ حب ہے پس حب دل میں ہوتی ہے اور کسب ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ دنیا دل میں نہ ہو اور ہاتھ میں ہونے کا کچھ ڈر نہیں۔ اسی طرح مال کی حالت ہے کہ فی الید (ہاتھ میں) ہونا نافع اور فی القلب (دل میں ہونا) مضر ہے حدیث میں ہے نعم المال

الصالح الرجل الصالح (یعنی نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے) اگر مال نہ ہوتو جئے کس طرح سے اس لئے مال اچھی چیز ہے مگر جب تک قلب میں نہ جائے اور ہاتھ ہی میں رہے یہ ذکر تھا معاصی قلب کا۔ پس شریعت اس مجموعہ احکام ظاہری و باطنی کا نام ہے۔ اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ شریعت و طریقت میں عطف الجزو علی الکل (کل پر جز کا عطف ہے یعنی شریعت کل ہے اور طریقت اس کا جزو ہے)۔

حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

بہر حال یہ وہ آیت ہے کہ اس میں شریعت و طریقت دونوں کو بھر دیا ہے۔ یہ تمہید تھی اب ترجمہ اور مقصد بیان ہوتا ہے کہ خدا کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو۔ یہی مضمون قرآن میں جا بجا مختلف طور پر مذکور ہے کہیں صرف **اطیعوا اللہ** (خدا کا کہنا مانو) ہے کہیں فقط **اطیعوا الرسول** (رسول کا کہنا مانو) اور کہیں دونوں کو ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس سے ایک عجیب مسئلہ ظاہر ہو گیا کہ اطاعت تو فقط اللہ تعالیٰ کی ہے اور واسطہ اس میں حضور ہیں۔ تو جہاں **اطیعوا اللہ** (اللہ کی اطاعت کرو) کے **والرسول** (اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی) بھی فرما دیا ہے وہاں معنی یہ ہیں کہ رسول کا کہنا مانو ان کے ذریعے سے اللہ کی اطاعت ہوگی اور کہیں **اطیعوا الرسول** ہی فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کو خدا سے تعلق ہو اس کے ساتھ تعلق کرنا خدا کے ساتھ تعلق کرنا ہے۔ اس سے صاف طور پر اہل سلوک کا ایک شبہ کھل گیا وہ یہ ذکر **لا الہ الا اللہ** (خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) میں **لا الہ** کہتے وقت جو ماسوائے اللہ کے محبت کو قلب سے نکالا جاتا ہے تو کیا رسول کی محبت کو بھی نکالا جائے۔

جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت خدا کی محبت کا غیر نہیں کیونکہ حضور سے محبت اسی لئے ہے کہ وہ ذریعہ ہیں وصول الی اللہ (اللہ تعالیٰ تک پہنچنے) کا تو یہ تو بعینہ خدا کی محبت ہے تو یہ لا الٰہ کے تصور سے خارج نہ کی جائے گی۔

مولانا نے ایک مقام پر اس کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص نے لعل سے پوچھا کہ تو کس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے؟ اپنے کو یا آفتاب کو۔ اس نے کہا کہ جس کو زیادہ محبوب بتلاؤں اس سے دوسرے کا محبوب ہونا لازم آتا ہے کیونکہ اگر اپنے نفس سے محبت ہے تو بوجہ لعل ہونے کے

وصف کے ہے اور اس کا یہ وصف آفتاب سے آیا ہے۔ تو آفتاب سے محبت ہوئی اور اگر آفتاب سے محبت ہے تو اسی لئے کہ اس نے یہ وصف میرے نفس کو عطا کیا ہے تو اپنے نفس کی محبت ہوئی۔

اس تمثیل سے یہ مسئلہ خوب حل ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی واسطے محبت ہے کہ آپ مظہر (ظاہر ہونے کی جگہ) صفات خداوندی ہیں۔ حق تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ آپ نور من انوار اللہ (انوار الٰہی کا ایک نور ہیں) آپ موصل (الی اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے) ہیں تو یہ بعینہ خدا ہی کی محبت ہے۔

کسی نے حضرت جنید رحمہ اللہ کو دیکھا ہاتھ میں تسبیح لئے ہوئے پوچھا کیا آپ مبتدی ہیں۔ آپ نے فرمایا اسی نے تو منتہی اور واصل الی اللہ بنایا تو کیا ایسا رفیق چھوڑ دیں۔

ایک بزرگ اسی معنی میں فرماتے ہیں۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است   افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

یعنی مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے محبوب کے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے قدموں پر فدا ہوتا ہوں کہ ان کا گزر محبوب کے کوچہ میں ہوا ہے۔

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را   کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

یعنی اپنے ہاتھ کو ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ انہوں نے محبوب کا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے۔

اپنے ہاتھ پیر پر ناز کرتے ہیں اور جان فدا کرتے ہیں۔ حقیقت میں ان حضرات کا فہم بہت عالی ہوتا ہے اپنے ہاتھوں کو اپنا سمجھ کر نہیں چومتے بلکہ یہ سمجھ کر کہ اس سے طاعت و عبادت ہوتی ہے آنکھ پر اپنی آنکھ سمجھ کر ناز نہیں کرتے بلکہ اس لئے کہ اس نے انوار محبوب کا معائنہ کیا ہے اور یہی عالی فہمی تو ہے جس کی وجہ سے افلاطون نے صوفیہ کو حکماء سے اکمل بتلایا ہے۔

حکماء و فلاسفہ

اس کی حکایت یہ ہے کہ کسی نے افلاطون کو خواب میں دیکھا تھا اول بڑے بڑے حکماء کی نسبت پوچھا۔ وہ یہی کہتا تھا کہ لاشی لاشی۔ (کچھ نہیں کچھ نہیں) اس کے بعد پوچھا کہ جنید و شبلی کی نسبت کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا کہ **اولئک هم الفلاسفة حقاً** (حقیقی فلاسفہ اور حکماء یہی

ہیں) اور آج کل کا فلسفہ تو ان حکماء کے فلسفہ سے بھی گرا ہوا ہے۔ کیونکہ فلاسفہ یونان نے اگر چہ غلطیاں بھی کی ہیں مگر پھر بھی ان کے کمال میں کوئی شک نہیں۔ صرف عقل کے ذریعے سے بہت سے مسائل الٰہیہ صحیح معلوم کیے۔ امور معاد (آخرت) و علم آخرت کے بھی قائل ہوئے۔ اور یہ سائنس دان تو بقول ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب کے صناع ہیں۔ فقط مشاہدات کا علم رکھتے ہیں جو چیز آنکھ سے نظر آ گئی اس کی تحقیق کر لی۔ عقلیات سے انہیں کچھ مس نہیں۔ صناعت بھی فلسفہ کا ایک شعبہ ہے مگر نہایت ادنیٰ درجہ کا۔ فلاسفہ یونان کے سامنے ان کو فلاسفی کہنا ایسا ہے جیسا غلط اور نا تمام قل ھو اللہ پڑھنے والے کو پورے حافظ قرآن کے سامنے حافظ کہنا ہاں جن لوگوں کو فلسفہ کی حقیقت ہی معلوم نہیں وہ انہیں کو کامل خیال کرتے ہیں۔

جیسا ایک گاؤں کا قصہ ہے کہ کسی کے سر میں درد تھا۔ دوسرا دم کرنے کھڑا ہوا تو قل ھو اللہ کی پہلی آیت کو اس طرح بگاڑ کر پڑھا کل باللہ حد اور پھونک ماردی۔ تو ایک گاؤں والا یہ کہتا ہے جاسو ہرے تو تو ہا بج (حافظ) ہی ہو گیا۔ تو جیسے قل ھو اللہ تبت کا حافظ گاؤں کے نزدیک حافظ ہے ایسے ہی آج کل کے لوگ ان کو فلسفی کہتے ہیں۔ ورنہ فلسفہ کہتے ہیں اصل میں۔

معرفت حقائق الاشیاء علی ماھی علیہ فی نفس الامر بحسب الطاقۃ البشریۃ

یعنی نفس الامر اور واقع میں جس رنگ ڈھنگ پر چیزیں ہیں بشری طاقت کے موافق ان کے حقائق کا معلوم کرنا۔

اور اس کے کئی شعبے ہیں' طبیعات' عنصریات' الٰہیت وغیرہا علم طبیعات کو کائنات سے ایسی نسبت ہے جیسے مکان سے بدرو کو۔ اگر کوئی شخص کسی کے مکان میں جا کر بدرو دیکھے اور اس کو پوری تحقیق کرے۔ یقیناً اس شخص کا علم ناقص ہے اس سے وہ شخص بڑھ کر ہے جس نے گھر کے اندر کی عمدہ چیزیں معلوم کر لیں۔ تو فلاسفہ یونان آج کل کے سائنس والوں سے یقیناً بڑھے ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے مشاہدات کے علاوہ عقلیات و مخفیات کا علم حاصل کیا اور پھر ان سے وہ بڑھے ہوئے ہیں جنہوں نے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کی۔ کیونکہ اس تمام عالم کو خدا تعالیٰ شانہ کے روبرو دیکھئے تو یہ حالت ہے۔

اگر آفتاب است و یک ذرہ نیست   وگر ہفت دریاست یک قطرہ نیست

یعنی اگر تمام آفتاب ہے تو حق تعالیٰ کے روبرو اس کی ایک ذرہ کی بھی نسبت نہیں اور اگر تمام عالم سات دریا ہیں تو اللہ تعالیٰ کے روبرو اس کی ایک قطرہ کی بھی نسبت نہیں ہے۔

پس پورا فلسفی وہی ہے کہ جس نے خدا کو پہچان لیا ہے۔ اسی واسطے تو افلاطون کہتا ہے **اولئک هم الفلاسفة حقاً** (حقیقت میں فلاسفر یہی لوگ ہیں) تو اہل اللہ کا فہم عجیب ہوتا ہے۔

حضرت شیخ ابوالبرکات کے پاس ابوعلی بن سینا گیا۔ کسی نے اس کی نسبت پوچھا کہ حضرت یہ کیسا شخص ہے۔ فرمایا کہ بوعلی اخلاق ندارد۔ (اخلاق نہیں رکھتا) ابوعلی نے سن کر ایک کتاب تصنیف کی جس میں علم اخلاق کو خوب بیان کیا اور ان کے پاس بطور جواب کے بھیجی۔ انہوں نے ایک جملہ میں ساری کتاب اڑا دی کہ من کے گفتہ بودم کہ اخلاق نداند۔ گفتہ بودم کہ اخلاق ندارد۔ (یعنی میں نے کب کہا تھا کہ اخلاق نہیں جانتا بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ اخلاق نہیں رکھتا) بلکہ یہ بھی تو اخلاق نہ ہونے کی بات ہے کہ خواہ مخواہ اعتراض کے جواب دینے کی کوشش کی۔ بوعلی لاجواب رہ گیا۔

ایک اور بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ کچھ جمع نہ کرتے تھے۔ سب اڑا دیا کرتے تھے۔ کسی بزرگ نے ان کو لکھا کہ لا خیر فی الاسراف۔ (یعنی اسراف میں خیر نہیں) انہوں نے کیا عجیب جواب دیا۔ الاسراف فی الخیر (یعنی خیر میں اسراف نہیں ہوتا)۔

اہل علم صوفیہ اور فلاسفہ کی تحقیقات کو مقابلہ کر کے دیکھئے۔ جہاں تک ان کی نظر پہنچتی ہے فلاسفہ کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی۔ مگر شاید کوئی صاحب یہ کہیں کہ یہ لوگ تو بڑے بھولے ہوتے ہیں تو سمجھو کہ یہ دنیا کے امور سے ناتجربہ کار ہوتے ہیں بدعقل نہیں ہوتے اور ناتجربہ کار ایک بڑا فلسفی بھی ہوتا ہے تو کیا وہ حکیم نہیں رہا۔

ایک عربی خواں طالب علم سے ایک کالج کے تعلیم یافتہ نے پوچھا کہ بتاؤ کل کواکب کتنے ہیں اس نے کہا کہ سات سیارہ اور ثوابت مرصودہ ایک ہزار بائیس ہیں اور غیر مرصودہ منضبط نہیں۔ اس نے کہا تم کو اتنی بھی خبر نہیں۔ کیا فلسفہ پڑھتے ہو۔ عربی خواں نے کہا بتاؤ سمندر میں کتنی مچھلیاں ہیں۔ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس نے کہا تم کو زمین کی خبر نہیں کیا فلسفہ پڑھتے ہو۔

غرض ناتجربہ کاری اور چیز ہے اور کم عقلی اور چیز ہے۔ اہل اللہ ہرگز کم علم نہیں۔ ہاں دنیا کے امور سے ان کو چونکہ دلچسپی نہیں اس لئے ناتجربہ کار ہوتے ہیں۔ لوگ ان کو بے

وقوف سمجھتے ہیں۔

ملاجیون کا قصہ جونپور کے پل کی بابت مشہور ہے ملاجی ایک مرتبہ مکان پر بیوی کے مقابلہ میں شاہی فوج اتنی بات پر چڑھا لائے تھے کہ اس نے اصرار کیا تھا نمک ٹھیک ہے زیادہ نہیں ہے۔

خیر یہ تو مشہور قصہ ممکن ہے کہ صحیح ہو یا غلط ایک بزرگ کم عمر کو ہم نے دیکھا ہے اصول شاشی پڑھتے تھے۔ ایک طالب علم کا پیٹ بڑھا ہوا تھا میں ہنسی میں اس کو حاملہ کہا کرتا تھا۔ یہ سن کر اسے یقین آ گیا کہ مردوں کو بھی حمل ہوتا ہے۔

ان کی کرامت سب سے اول یہ ظاہر ہوئی کہ عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے اتفاق سے ٹاٹ میں ایک سواں لگا ہوا تھا۔ وہ ان کی ران میں گھس گیا۔ مگر اس بندہ خدا کو نماز میں کچھ خبر نہ ہوئی۔ جب سلام پھیر چکے تو کہا ذرا دیکھو۔ میری ران میں کس چیز نے کاٹا ہے۔ لالٹین لا کر دیکھا تو ٹاٹ نیچے تک خون سے آلودہ تھا اور ان کا پائجامہ بھی تمام خون سے بھر گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ٹاٹ سینے والے سواں اس میں لگا کر چلے گئے تھے۔ وہ ان کی ران میں آدھا گھس گیا۔ مجھے اس وقت اس شخص کی نماز پر سخت حیرت ہوئی اور اب معلوم ہوا کہ یہ کوئی خدا کا برگزیدہ بندہ ہے۔ پھر ایک دن کرتہ میں خود بخود آگ لگ گئی۔ اللہ اللہ۔

دردلم بسکہ گرمی عشق ست   موئے بر سینہ ام نمے روید

میرے دل میں عشق کی گرمی ہے۔ اس وجہ سے سینہ پر بال نہیں اگتے ہیں۔

تو اب ان لوگوں کو بے وقوف نہ کہیں گے بلکہ ناتجربہ کار تھے۔ ممکنات کو ممکن سمجھتے تھے خدا کی قدرت پر نظر تھی۔ کسی نے کوئی ممکن بات غلط ہی کہہ دی اس کو جھوٹا نہ کہتے تھے کیونکہ سمجھتے تھے کہ خدا کو سب قدرت ہے ممکن ہے کہ ایسا ہو پھر کسی مسلمان کو جھوٹا کیوں سمجھا جائے۔ تو یہ حضرات بیوقوف نہیں ہوتے بڑے عاقل ہوتے ہیں اور جو بعض طالب علم کچھ بیوقوف نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کا انتخاب عالم دین بنانے کے لئے غلط ہے۔

کسی کے دو لڑکے ہوں۔ ایک سمجھ دار اور دوسرا کم سمجھ۔ سمجھ دار کو انگریزی پڑھائے گا۔ اور بے وقوف کو عربی۔ پس علم دین نے تھوڑا ہی بیوقوف بنا دیا وہ تو پہلے ہی ایسا تھا اور اسی کو انتخاب میں لیا گیا۔ اسی طرح فقراء میں عوام جہلاء جس کے اکثر معتقد ہوتے ہیں وہ

بھی ایسے ہی ہوتے ہیں آپ نے عقلا کو نہیں دیکھا۔

حقیقت طاعت

کلام دور چلا گیا۔ اوپر یہ مضمون تھا کہ جیسے لعل کی محبت بوجہ مظہر نور آفتاب ہونے کے آفتاب کی محبت ہے اسی طرح رسول کی محبت و اطاعت بعینہ خدا کی محبت و اطاعت ہے۔ پس **اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول** (اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو) سب صحیح ہو گیا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اطاعت کا حکم دیا ہے اور اس کا ثمرہ یہ بیان فرمایا **لعلکم ترحمون**۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

اس آیت کے متعلق دو مضمون ہیں۔ مختصر بیان کرتا ہوں ایک تو یہ کہ اس میں اطاعت کا حکم ہے لوگ اس کے معنی کہنا ماننا سمجھتے ہیں مگر اس میں ایک جزو بھی ہے جسے لوگ بیان نہیں کرتے یعنی اطاعت کے معنی خوشی سے کہنا ماننا ہے کیونکہ طوع اس کا مادہ ہے اور طوع کے معنی رضا و خوشی کے ہیں تو اس میں حکم صرف کہنا ماننے کا نام نہیں بلکہ خوشی اور رضامندی کے ساتھ کہنا ماننے کا ہے۔

اب ٹٹولنا چاہئے کہ رغبت اور خوشی سے کہنا ماننے والے کتنے ہیں۔ بہت کم ہیں۔ اکثر تو اس واسطے نماز روزہ کرتے ہیں کہ اگر نہ کریں گے تو پٹیں گے عذاب ہو گا۔ اس مذاق کے لوگوں کو اگر عذاب کا ڈر نہ ہو تو کبھی کہنا نہ مانتے سو اس کا نام اطاعت نہیں یہ تو سزا کے خوف سے کام کرنا ہوا۔

اطاعت یہ ہے کہ جنت

اور دوزخ نہ ہوں تب بھی کہنا مانے۔ چاہے کچھ انعام ملے یا نہ ملے سزا کی وعید ہو یا نہ ہو۔ ہر حال میں سر تسلیم خم رہے۔ کیونکہ ان کی ذات کی عظمت کا یہی مقتضا ہے۔ صاحب کمال کی اطاعت کرنے کو خود بخود جی چاہا کرتا ہے اس کی طرف خود قلب مائل ہوا کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کون صاحب کمال ہو گا جس میں ظاہری اور باطنی ساری خوبیاں جمع ہیں اور سب خوبیوں کے دینے والے بھی وہی ہیں۔

صاحبو! اگر غلام سے کہا جائے کہ یہ کام کرو اور وہ ساتھ ہی یہ کہے کہ کیا ملے گا تو انصاف سے کہو وہ بے ہودہ ہے یا نہیں۔ بیشک ایسا غلام گردن زنی (گردن مارنے کے

لائق) ہے جو بدلہ لے کر اپنے آقا کا کام کرے اس کی تو حالت ہونی چاہئے تھی۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

یعنی زندگی عطا فرمائیں تو آپ کی مہربانی ہے اور اگر آپ قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں دل آپ پر آ گیا ہے جو کچھ تصرف کریں میں راضی سے ہوں۔

ثمرات کے لئے جس نے اطاعت کی اس نے ثمرات کی اطاعت کی۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت مزدوروں کی طرح مزدوری کی وجہ سے مت کرو۔ یعنی ثمرات کے لئے عبادت واطاعت مت کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی وجہ سے کرو۔ ثمرات خود مرتب ہو جائیں گے۔ اس لئے آقائے حقیقی خود بندہ پروری کی روش کو جانتے ہیں۔

خدا کو خدا سمجھ کر عبادت کرو یہ ہے خوشی سے کہنا ماننا اور یاد رکھو خوشی سے کہنا وہ مانے گا جس کو محبت ہو۔ ظاہراً اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ محبت تو قلبی کیفیت ہے اور دل پر کیا اختیار ہے مگر یہ خیال غلط ہے دل کی حرکت کا ارادہ کرو۔ دیکھو حرکت ہوتی ہے یا نہیں تم نے نہ ارادہ کیا نہ سیکھا پہلے ہی سے خیال پکا لیا دل پر کیا اختیار ہے۔

دیکھو! بچہ کو پہلے پہل چلنا نہیں آتا مگر ماں باپ کو چلتا دیکھ کر وہ بھی سیکھ جاتا ہے۔ اگر ماں باپ سے نہ سیکھے تو ہرگز نہیں چل سکتا۔ آپ صاحبوں نے تحصیل کا قصد نہیں کیا اگر طلب ہوتی تو ڈھونڈتے اور کامیاب ہوتے مگر افسوس کہ ناامید ہو کر بیٹھ رہے۔ شریعت نے کم ہمتی کی تعلیم نہیں دی۔ حضور نے عالی ہمتی کا حکم فرمایا ہے۔

ایک شخص آپ کے فیصلہ میں ہار گیا تو اس نے کہا حسبی اللہ نعم الوکیل (یعنی اللہ تعالیٰ مجھ کو کافی ہیں اور وہ اچھے کارساز ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تدبیر کرو اور جب کچھ نہ بنے تب کہو حسبی اللہ نعم الوکیل دنیا کے بارے میں سب حضور کی اس تعلیم پر عمل کرتے ہیں کہ پہلے اپنی طرف سے انتہا درجہ کی کوشش کر دیتے ہیں مگر دین کے بارے میں یہ حکم یاد نہیں رہتا اس میں آپ ہی ہمت ہار بیٹھے ہیں۔

اسباب محبت

چنانچہ یہ شبہ بھی اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ دل پر کیسے اختیار ہوگا۔ تو سنو واقعی محبت کی کیفیت قلبی ہے اور براہ راست تمہارے اختیار میں نہیں مگر اس کے لئے چند اسباب ہیں۔ وہ تمہارے اختیار میں ہیں۔ تو دارومدار ان اسباب پر ہے اور وہ موقوف محبت پر نہیں **ماجعل علیکم فی الدین من حرج** ''دین میں تنگی نہیں جب محبت کا حکم ہے تو اس کی تحصیل کے اسباب بھی آسان فرمائے ہیں۔ سنئے! میں ان اسباب کو بیان کرتا ہوں جن سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے چند باتوں کا التزام کرنا چاہئے۔

ایک تو اس کا کہ کسی وقت خاص میں خدائے تعالیٰ کے انعامات کو سوچا کرے اور اس کے ساتھ ہی اپنی نالائق حرکتوں کا مطالعہ کرے اور غور کرے کہ اگر حکام ظاہری کی اتنی مخالفتیں کرتا تو کیا انجام ہوتا اور ان کی نگاہوں میں کیسی ذلت ہوتی۔ مگر حق تعالیٰ نے باوجود میری سرکشی کے اپنے انعامات مجھ سے بند نہیں کئے۔

ولیکن خداوند بالا و پست بعصیاں در رزق بر کس نہ بست

یعنی خدائے عالی نے گناہوں کی وجہ سے کسی پر رزق کا دروازہ بند نہیں کیا۔

ایک جزو تو یہ ہے۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ احکام ظاہریہ شرعیہ کو بتکلف شروع کر دے یہ تجربہ ہے کہ اعمال میں محبت کرنے کا خاصہ ہے کہ اگر اول اول محبت نہ بھی ہو تو بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے مقناطیس کی کیفیت ہے کہ لوہا جب دور ہے تو کچھ نہیں اور جہاں پاس آیا تو یہ خود کھینچ لیتا ہے۔ اعمال میں بھی مقناطیسی اثر ہے۔

تیسرا جزو یہ ہے کہ کچھ وقت ذکر کے لئے بھی نکال لے خواہ تھوڑی ہی دیر ہو خواہ بلا مرید بنے ہوئے۔ مگر خلوت میں ہو ذرا توجہ کے ساتھ۔

چوتھا جزو یہ ہے کہ اہل اللہ کے پاس بیٹھا کرے۔ ان شاء اللہ ان کی صحبت کا اثر یہ ہو گا کہ بہت جلد دنیا کی محبت دل سے کم ہو جائے گی اور اہل اللہ کی پہچان یہی ہے کہ ان میں دنیا کی محبت کم ہو اور ان میں خدا کی محبت ہو۔

طریق اصلاح

مگر ان کو اپنی باتوں میں نہ لگاؤ۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ بزرگوں کے پاس جا کر دنیا بھر

کی حکایتیں بیان کرتے ہیں۔ اس سے نقصان کا اندیشہ ہے کیونکہ اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگرچہ تمہاری دل شکنی کے خیال سے وہ اپنے اخلاق کی وجہ سے تم پر ظاہر نہ کریں اور یہ بھی نازیبا حرکت طبیب کے پاس اپنا معالجہ کرانے جایا کرتے ہیں یا قصے بیان کرنے کو۔ اور بہت بولنے والے کو ان کے یہاں سے کچھ ملتا بھی نہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی

یعنی مدعی اور ظاہر پرست کے سامنے عشق اور مستی کے اسرار و مت بیان کرو ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو۔

مگر ایسا بھی نہ کرو کہ بالکل خاموش ہی ہو جاؤ کہ وہ کوئی بات خود پوچھیں تو بھی نہ بولو بلکہ اپنی حالت کہو۔ طریق اصلاح پوچھو فضولیات قصے وغیرہ مت چھیڑو۔ اسی طرح اگر کسی کامل کی صحبت میں بیٹھو گے تو انشاء اللہ بہت جلد اثر ہوگا۔

صحبت نیکاں اگر یک ساعت ست بہتر از صد سالہ زہد و طاعت ست

اگر اہل اللہ کی صحبت یک ساعت بھی میسر ہو جائے۔ تو وہ سینکڑوں برس کے زہد و طاعت سے بہتر ہے۔

یہ نہایت اکسیر ہے اس کا خلاصہ ہے کہ خدا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اگر کہیں کوئی کامل نظر نہ پڑے تو اس کا بدل یہ ہے کہ ان کے ملفوظات کا مطالعہ کرو مگر حقائق و معارف کو مت دیکھو بلکہ ان کے مجاہدات کو اور شوق و طلب کے واقعات کو غور سے پڑھو۔ ان کا بھی وہی اثر ہے جو صحبت کا اسی صحبت و مطالعہ و تذکرہ کی نسبت کہتے ہیں۔

مقام امن و مئی بے غش و رفیق شفیق گرت مدام میسر شود زہے توفیق

یعنی امن کی جگہ اور مئی سے خالص محبت الہٰی مراد ہے اور مرشد کامل اگر ہمیشہ تم کو میسر ہوتے ہیں تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ یہ تو اول درجہ کی بات ہے دوسرے کو کہتے ہیں۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است صراحی مے ناب و سفینہ غزل است

اس زمانہ جو رفیق خلل سے خالی ہے۔ وہ اہل اللہ کے ملفوظات اور دل عشق اور محبت

الٰہی سے مالا مال ہے۔

یہ دوسرا درجہ ہے۔ مئے ناب سے محبت الٰہی مراد ہے اور سفینہ سے ملفوظات مراد ہیں۔ مجھ سے بعض لوگوں نے اپنی بیویوں کی شکایات کی کہ نماز پڑھتی نہیں ہیں۔ میں نے کہا کسی کو مولانا بھی آئے تو یوں کرو کہ گھر میں جا کر ان کو کچھ مت کہو بیٹھ کر کتاب لے کر پکار پکار کر پڑھنا شروع کرو۔ ایک چلہ نہ گزرنے پائے گا کہ سب درست ہو جائیں گی۔ چنانچہ لوگوں نے مجھے خبر دی کہ واقعی اس کا بہت جلدی اثر ہوا۔ لوگ بے تدبیری کرتے ہیں حال یہ ہے۔

بے خبر بودند از حال دروں　　　استعیذ اللہ مما یفترون

اندرونی حالت یعنی اصل تدبیر سے لوگ بے خبر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہم ان کی بے تدبیری سے پناہ مانگتے ہیں۔

ہرچہ کردند از علاج و از دوا　　　رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

یعنی جو کچھ انہوں نے تدبیر و علاج کیا اس سے رنج بڑھتا رہا اور حالت ابتر ہو گئی۔ جب طبیب کامل آئے گا تو یہ کہے گا۔

گفت ہر دارد کہ ایشاں کردہ اند　　　آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

جو علاج اور تدبیر انہوں نے کی ہے اس سے لوگوں میں درستی کی بجائے نادرستی بڑھ گئی۔ یہ حقیقت میں علاج ہی نہ تھا۔ مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو تھاول تشریف لے گئے۔ لوگ مسجد میں حاضر ہوئے ایک بے نمازی بھی آئے۔ لوگ کہنے لگے یہاں آج بھولے سے کہاں آئے ہو اور مولانا سے بھی کہا کہ یہ کبھی نماز نہیں پڑھتے۔ مولانا نے فرمایا کہ تم کو کیسے خبر ہوئی ممکن ہے کہ گھر میں نماز پڑھ لیتے ہوں۔ اس نے کہا اب تو مجھے مولانا نے نمازی کر دیا۔ اب نہ نماز چھوٹے نہ جماعت ایک ذرا سی نرمی پر ساری عمر کا بے نمازی پکا نمازی ہو گیا۔

یہ ہیں ورثۃ الانبیاء (انبیاء کے سچے وارث) کہ سختی کی جگہ سختی کرتے ہیں نرمی کی جگہ نرمی برتتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی بزرگ کو ایک جگہ سختی کرتے دیکھ لیا بس ہر جگہ کے لیے یہی نسخہ یاد کر لیا کہ ہر جگہ سختی ہو۔

جیسے ایک طبیب کسی رئیس کی نبض دیکھنے گئے تھے ساتھ میں صاحبزادے بھی تھے۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر مریض سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نارنگی کھائی ہے۔ اس نے اقرار کیا۔ جب حکیم صاحب واپس ہوئے تو صاحبزادے نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیسے معلوم کر لیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے۔ حکیم نے کہا کہ میں نے اس کی چارپائی کے نیچے چھلکے پڑے ہوئے دیکھے تھے۔ اس سے سمجھا صاحبزادے نے یہاں سے کلیہ قاعدہ نکال لیا کہ چارپائی کے نیچے جو چیز پڑی ہوا کرے مریض اسی کے کھانے سے بیمار ہوا کرتا ہے باپ کے انتقال کے بعد جو صاحبزادے کے خلافت ملی تو اسی رئیس کے یہاں ایک دفعہ بلائے گئے۔ آپ نے نبض دیکھ کر کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نمدہ کھایا ہوا ہے کیونکہ اتفاق سے اس وقت چارپائی کے نیچے نمدہ پڑا ہوا تھا رئیس نے دھکا کر گھر سے باہر نکال دیا۔

تو بعض لوگوں کو ایک ہی نسخہ یاد ہوتا ہے مگر حکیم وہ ہے جو مرض کی شناخت کر کے اس کے مناسب دوا دے۔ ایسے ہی طبیب روحانی وہ ہے کہ سختی کی جگہ سختی اور نرمی کی جگہ نرمی برتے اور بعض دفعہ ناواقف معترض جوش کو دیکھ کر سختی سمجھ جاتا ہے حالانکہ وہ سختی نہیں ہوتی وہ جوش ہوتا ہے اور یہ جوش وہاں آتا ہے جہاں دین کی بے حرمتی ہو اس میں انسانی فطرۃ مجبور ہے جب اپنے محبوب کے ساتھ گستاخی ہوتے دیکھتا ہے وہ اپنے قبضہ میں نہیں رہ سکتا میں کالج میں گیا تو مجھ سے لوگوں نے کہا کہ مولوی بڑے متعصب ہوتے ہیں میں نے کہا صاحبو! انصاف فرمایئے گا۔ کہ اگر آپ کی والدہ ماجدہ کی شان میں کوئی گستاخی کرنے لگے تو کیا تم کو جوش نہ آئے گا ضرور آئے گا اگر نہ آئے تو تم سے زیادہ بے غیرت کوئی نہیں۔ تو میں بقسم کہتا ہوں کہ مولویوں کے نزدیک دین ماں باپ سے زیادہ پیارا ہے اس سے زیادہ انہیں کوئی چیز عزیز نہیں۔ پھر اگر ان کو دین کی بے حرمتی پر جوش آئے تو ان کو متعصب کیوں کہا جاتا ہے بلکہ افسوس اس شخص کی حالت پر ہے جس کو ماں باپ کی بے حرمتی پر تو جوش آئے اور دین کے بے حرمتی کو ٹھنڈے دل سے دیکھ لے اور اسے کچھ بھی غیرت نہ آئے۔ غضب کی بات ہے کہ تمہاری نگاہوں میں دین کی وقعت ماں باپ کے برابر بھی نہیں۔ اس جواب کو سن کر سب کی آنکھیں نیچی ہو گئیں کالج کے نوجوان میں یہ وصف قابل تعریف ہے

کہ بات کو سمجھ کر پھر اپنی بات سے لوٹ جاتے ہیں خواہ اس واپسی پر قائم نہ رہیں۔

تو صاحبو! یہ سختی نہیں ہے یہ غیرت وحمیت اسلامی ہے یہ تو جزو دین ہے البتہ ہر جگہ سختی بری چیز ہے تو جس کے پاس کوئی بزرگ نہ ہو وہ بزرگوں کے ملفوظات اور ان کے احوال واقوال کا مطالعہ کرتا رہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اگر یہ چار جزو کا نسخہ زیر عمل رہے گا تو میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ چالیس دن کے اندر اندر ضرور اس کے دل میں محبت خدا تعالیٰ پیدا ہو جائے گی۔ اور میں کیا میرا دعویٰ کیا یہ بھی خدا اور رسول کے ارشاد پر اعتماد کر کے کہتا ہوں۔ کوئی اپنے گھر سے نہیں کہتا۔

مگر اس میں ایک غلطی ہوتی ہے وہ یہ کہ لوگوں کے مزاج میں عجلت ہے۔ وہ یوں چاہتے ہیں کہ تھوڑے دنوں میں یہ حال ہو جائے کہ اللہ کا نام سن کر لوٹ پوٹ ہو جائے۔ وہ محبت کے معنی غلط سمجھتے ہیں لوگ اسی کو محبت سمجھتے ہیں کہ نام سن کر لوٹ پوٹ ہو جائے۔ یہ صحیح نہیں۔ محبت نام ہے میلان قلبی کا اس کے مراتب کثیرہ ہیں۔ یہ بھی ایک مرتبہ ہے کہ نام سن کر بے تاب ہو جائے ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ خدا کی طرف دل کھنچنے لگے اور جیسے مراتب مختلف ہیں اسی طرح قسمیں بھی مختلف ہیں۔ ایک عقلی دوسری طبعی اور جس محبت کو حاصل کرنے کا حکم ہے وہ محبت عقلی ہے اسی لئے **اطیعوا اللہ** (اللہ کا کہا مانو) فرمایا یہ نہیں فرمایا کہ **اطیعوا اللہ طبعاً** (اللہ کی طبعاً اطاعت کرو) اب میدان وسیع ہو گیا ہے کہ کم از کم یہی سمجھ کر اطاعت کرو کہ خدا ہم سے خوش ہو گا مگر اس پر بس نہ کرو۔ آگے بڑھتے رہو یہاں تک کہ اطاعت میں لطف آنے لگے اور پھر اس کے بغیر چین نہ پڑے نہ سمجھانے کی ضرورت رہے۔

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہر چہ بروے میرسی بروی مالیست

اے برادر! محبوب حقیقی کی درگاہ بے نہایت ہے جس مرتبہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو آگے بڑھتے جاؤ۔

تقاضائے عظمت

دوسرا مضمون اس آیت کے متعلق یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **لعلکم ترحمون** (تاکہ تم پر رحم کیا جائے) اس میں ایک بہت باریک بات ہے وہ یہ کہ جتنے حکام دنیا میں ہیں ان کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر اطاعت نہ کرو تو سزا ہوتی ہے اور اطاعت کرو تو کچھ انعام نہیں اور

جہاں معاوضہ ہوتا ہے وہ زیادہ کام کرنے کا ہوتا ہے نفس اطاعت پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ پابندی قوانین بلا معاوضہ ہر شخص کے ذمہ ہوتی ہے اگر پابندی نہ کرے تو مستحق سزا ہوتا ہے اور کوئی پابندی کرے تو اپنے فرض منصبی کو ادا کر رہا ہے مستحق معاوضہ نہیں ہوتا تو کیا اس کو ظلم کہا جا سکتا ہے کیا کوئی اسے خلاف انصاف کہہ سکتا ہے جو شخص حکومت کا راز جانتا ہے وہ اس کو ظلم نہیں کہہ سکتا بلکہ خود حکومت کا حق سمجھتا ہے تو دنیا میں تو ہوتا ہے کہ کام لیا جاوے اور کچھ نہ دیا جاوے مگر یہ نہیں ہوتا کہ بغیر کام کئے صرف اطاعت پر کچھ دیا جائے۔

اب گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو نماز پڑھنے سے منتظر ہیں کہ کچھ ملے گا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی قدر دل میں نہیں **وما قدروا الله حق قدره** (جیسی اللہ تعالیٰ کی قدر ہونی چاہئے ویسی انہوں نے قدر نہیں کی) اگر اتنی بھی خدا کی قدر ہوتی جتنی حکام دنیوی کی تو کیا خدا کا ہم پر حق نہیں ہے۔ پھر کیا منہ لے کر ہم معاوضہ وانعام کے متمنی ہیں۔ معلوم ہوا کہ خدا کی عظمت دل میں نہیں ہے۔ اگر عظمت ہوتی تو اگر کچھ بھی نہ ملتا تب بھی اطاعت کرتے مگر حق تعالیٰ کے قربان جایئے کہ اطاعت کا بدلہ صرف سزا نہ دینا گوارا نہ کیا بلکہ فرماتے ہیں **لعلکم ترحمون** (تا کہ تم پر رحم کیا جائے) اور رحمت کا لفظ فرمایا جو جنت دیدار بقاء سب کو شامل ہے اور پھر شفقت تو دیکھئے کہ ترحمون فرمایا **یرحمکم الله** (اللہ تعالیٰ تم پر رحم کریں) نہیں فرمایا۔ نکتہ یہ ہے کہ اتنا بھی شرمندہ نہ کیا کہ ہم تم پر احسان کریں گے تا کہ عبادت کے ساتھ احسان کے بھی زیر بار نہ ہوں۔ بلکہ بصیغہ مجہول فرمایا کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

ایک نکتہ اور رہ گیا کہ **لعلکم** کیوں فرمایا کیونکہ لعل تو امید و شک کے مقام پر استعمال کیا جاتا ہے اور حق تعالیٰ اس سے بری ہیں۔ تو نکتہ یہ ہے کہ شاہی محاورہ ہے محاورہ میں شاید اور امید کا لفظ یقین ہی کے لئے ہوتا ہے بادشاہ یوں ہی خطاب کیا کرتے ہیں کہ تم کو امید رکھنی چاہئے اگر عظمت باری کو پیش نظر رکھا جائے تو اشکال وارد ہی نہ ہوتا۔ شاہی خطوط میں کثرت سے یہ محاورہ مستعمل ہے۔ لکھتے ہیں امیدوار بودہ بدانند (تم کو امیدوار رہنا چاہئے) اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن مجید سب کتابوں سے پہلے پڑھے جب تک طرز تصنیفی کا دماغ خوگر نہ ہو۔

یہ مضمون تو آیت کے متعلق تھا۔ مقصود یہ ہے کہ احکام خداوندی کو مانو اور ان کا ماننا ان کے جاننے کے اوپر موقوف ہے بدوں جانے قانون کی پابندی کیسے ممکن ہے۔ پس علم دین

حاصل کرو میں نے علم دین کی فضیلت بیان نہیں کی کیونکہ ضرورت کا بیان کافی ہے اور ضرورت آپ کو معلوم ہو گئی کہ بدوں علم دین حاصل کئے اطاعت خدا ناممکن ہے۔ اب ایک فضیلت بھی بیان کرتا ہوں تاکہ زیادہ رغبت ہو فرماتے ہیں **العلماء ورثة الانبياء** **عالم انبیاء** (سنن ابن ماجہ ۲۲۳' کنز العمال: ۲۸۶۷۹) علیہم السلام کے وارث ہیں) امام محمد کو کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا جب میں درگاہ رب العزت میں حاضر ہوا مجھ سے فرمایا گیا کہ کیا مانگتے ہو میں نے عرض کیا **یارب اغفرلی** (اے پروردگار مجھ کو بخشش) ارشاد ہوا کہ اے محمد! اگر میں نے تم کو عذاب دینا ہوتا تو تم کو یہ علم عطا نہ کرتے اور اسی سے بعض نے استنباط کیا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے بجز علماء کے کیونکہ ارشاد ہے **من یرد اللہ بہ خیراً یفقہ فی الدین** (مسند الامام احمد ۳:۹۴) (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا چاہتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا کر دیتے ہیں)

اب سمجھ میں آیا کتنی بڑی ضرورت ہے اور کیسی فضیلت ہے علم دین کی کہ خدا تعالیٰ بدوں اس کے خوش نہیں ہو سکتے۔ رضاء حق علم دین حاصل کرنے پر موقوف ہے۔ ہاں اگر کوئی خدا ہی کو خوش کرنے کی ضرورت نہ سمجھے تو ایسے لوگ میرے مخاطب نہیں مگر ایسا ہو نہیں سکتا جس انسان کو بیوی بچوں سے صبر نہیں وہ خدا کو صبر کر کے کیوں چین سے بیٹھ سکتا ہے۔ عرفاً وہ شخص بہت باہمت سمجھا جاتا ہے جس کو بیوی بچوں کا صبر آ جائے مگر نہیں اس سے بڑھ کر باہمت گو مذموم سہی وہ ہے جس نے خدا کو چھوڑ دیا اور صبر آ گیا۔

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن صبر چوں داری زرب ذوالمنن

تم کو جب بیوی بچوں سے صبر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ سے تم کو کیوں کر صبر آ گیا ہے۔

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں صبر چوں داری زنعم الماہدوں

جب تم کو حقیر دنیا چھوڑ کر صبر نہیں آ سکتا تو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر کیوں کر چین آ گیا ہے۔

ہائے بیوی بچوں کی ناراضگی تو نہ اٹھائی جائے پھر خدا کی ناراضگی کیوں کر اٹھا سکتا ہے۔ اپنے ایک ادنیٰ ہم جنس کو ناخوش کر کے تو چین سے نہیں رہ سکتا احکم الحاکمین رب العالمین کو ناخوش کر کے کیوں کر آرام سے بیٹھ سکتا ہے جب خدا کے خوش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ بدوں اطاعت کے ہو نہیں سکتی اور اطاعت بدوں علم ناممکن تو میں پوچھتا ہوں کہ

آپ نے اس کا کیا بندوبست کیا۔

مگر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ میرا مطلب یہ ہے کہ سب مولوی بنو۔ اور بعضوں کو یہ ڈر ہوا ہوگا کہ علم کی ضرورت ثابت کرکے لاؤ روپے کی آواز بلند ہوگی تو میں دونوں ہاتھوں کا اطمینان دلاتا ہوں۔ نہ میں سب کو مولوی بننے کو کہوں نہ چندہ مانگوں بلکہ میں تو اراکین مدارس کو بھی یہی کہا کرتا ہوں کہ چندہ کی تحریک نہ کیا کریں کسی کو سو دفعہ جی چاہے دے نہ چاہے نہ دے اپنا تو یہ مشرب ہے **لااسئلکم علیه اجراً** (یعنی ہم اس پر اجرت نہیں مانگتے) اور میں تو یہ یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ مدارس والے کھچ جاویں اور استغناء برتیں تو دینے والے خوشامد کرکے دیں گے مگر چونکہ یہ سمجھ رکھا ہے کہ مانگنے ہی سے ملتا ہے حق تعالیٰ بھی اسی طرح دیتے ہیں۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ کسی سے نہیں کہا جاتا کہ سب کے سب مولوی بنو مگر ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ سب عالم دین بنو اور عالم دین مولوی کو نہیں کہتے بلکہ ان دونوں میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ہر مولوی عالم دین ہے مگر ہر عالم دین مولوی نہیں ہوتا علم دین کبھی صحبت سے حاصل ہوتا ہے کبھی پڑھنے سے اس پر میں سب کو مجبور کرتا ہوں کہ علم دین جس طرح ہو حاصل کرو۔

طریق تعلیم

اس میں تفصیل اس طرح ہے کہ مسلمانوں میں دو قسم کے لوگ ہیں امراء اور غرباء۔ پھر امراء میں دو قسم کے ہیں نوجوان اور بوڑھے۔ جن کی عمر پڑھنے کی ہے یعنی جوان وہ تو اپنے لئے علم دین بمعنی مولویت تجویز کریں میں یہ نہیں کہتا کہ انگریزی ان کو نہ پڑھاؤ انگریزی پڑھائیں مگر ترتیب بدل دیں کیونکہ موجودہ ترتیب میں بہت خرابیاں ہیں اور صرف انگریزی پر اکتفا کرنے کی تو اجازت ہی نہیں کیونکہ اس میں نہ دین درست ہوتا ہے نہ دنیا۔

ایک صاحب کو میں نے دیکھا ہے کہ انگریزی پڑھ کر واپس آیا نماز میں شریک ہوئے اور دو رکعت امام کے ساتھ پڑھ کر سلام پھیر دیا کچھ خبر نہیں کہ نماز ہوئی یا نہیں اور خبر کیسے ہو جو فکر ہی نہیں۔

اس سے بڑھ کر میں ایک اور بات کہتا ہوں کہ صرف انگریزی پڑھا ہوا بعض دفعہ کفر کی باتیں زبان سے کہہ جاتا ہے اور اس کو خبر تک نہیں ہوتی اس کے تحت میں مسلمان بی بی ہوتی

ہے اور حرام کے بچے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ کلمہ کفر سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ جب نکاح نہ رہا تو اولاد سب حرامی ہوئی مگر اس شخص کو کچھ بھی خبر نہیں ہوتی افسوس ہے کہ مسلمانوں کو اس پر ذرا توجہ نہیں گو یہ کہنے کی بات نہیں مگر بغیر کہے رہا بھی نہیں جاتا۔ ایک شخص نے علی الاعلان یہ کہا کہ یہ مذہبی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے۔ ہاں آپ بہت بڑے فلاسفر تھے اس لئے میں آپ کی عظمت کرتا ہوں۔ اب بتلاؤ ایمان گیا یا رہا۔ اس کا تو ایمان گیا ہی مگر اس کے نکاح میں ایک عفیفہ (پاک دامن عورت) ہے اس بے چاری کا کیا حشر ہوگا۔ تو اس کا انسداد بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس انگریزی کے ساتھ کچھ دین کا بھی حصہ ہو۔

صاحبو! رؤسا جو انگریزی پڑھتے ہیں ان کو اس سے روپیہ کمانے کی ضرورت نہیں بلکہ بوجہ ضرورت زمانہ پڑھتے ہیں اس کے لئے نہ ڈگری کی ضرورت نہ پاس کی ضرورت ان لوگوں کو اول علم دین پڑھانا چاہئے اس کے بعد یہ ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ غرض میں انگریزی پڑھنے سے منع نہیں کرتا اتنا ضرور کہتا ہوں کہ پہلے علم دین پڑھاویں کیونکہ پہلا نقش زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ما الحب الا للحبیب الاول

(یعنی محبوب اول ہی کے لئے محبت گہرا اثر رکھتی ہے) یہ میرا خیال ہے جو میں نے عرض کر دیا۔

گر نیاید بگوش رغبت کس بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(اگر کسی کو یہ بات مرغوب نہ ہو تو وہ جانیں۔ ہم پر پہنچانا تھا پہنچا دیا۔ منوانا ہمارا کام نہیں)

یہ تو امراء کا حال ہے رہے غرباء ان کی تقسیم یہ ہے کہ ان کے جو بچے غنی الطبع ہیں ان کو علم دین پڑھاؤ اور جو حریص و دنی ہیں ان کو ضرورت سے آگاہ کر دو۔ پورا مولوی مت بناؤ۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ سب کو پورا عالم بنا دیا جائے چاہے اس کی طبیعت کیسی ہی ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ لندن میں ایک جماعت انتخاب کنندگان کی ہے وہ جس کو جس کے قابل دیکھتے ہیں اسی کی تعلیم دیتے ہیں۔ تو غرباء کے بچوں میں انتخاب کرو جس میں استغناء اور توکل کی شان ہو اسے مولوی بناؤ۔ تو دو قسم کے لوگ علماء ہوئے ایک امراء اور ایک غرباء کی یہ قسم۔

رہے اور لوگ یعنی بڈھے لوگ امراء کے، اور غرباء کی دوسری قسم کے بچے (یعنی حریص و دنی) اور غرباء کے بوڑھے لوگ تو ان کو قرآن پڑھا دو اور نصاب دین خواہ اردو ہی کا ہو پڑھا کر اپنے اپنے کام میں لگا دو۔

اب رہ گئیں عورتیں ان کے لئے یہ طریقہ ہے کہ مردوں کو چاہئے کہ گھر میں جا کر ایک کتاب کے دو تین صفحے روزانہ سنا دیا کریں۔ ایک قسم اور رہ گئی وہ یہ کہ بعض پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ہفتہ میں ایک دن مقرر کر لیں اور ایک سمجھ دار آدمی دو چار ورق سمجھا کر سنا دیا کرے۔

لیجئے میں سب کو مولوی نہیں بناتا صرف یہ کہتا ہوں کہ علم دین جس طرح ہو حاصل کرو اور اس کے لئے میں نے آسان طریقے بھی بیان کر دیئے۔ بتلایئے کہ اس میں کسی کا کیا نقصان ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر جگہ ایک باضابطہ مدرسہ ہو جو سب کا مرکز ہو ورنہ واعظ و مولوی کی تلاش میں دقت ہوگی باہر سے بلانا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ باہر کا آدمی ہر وقت نہیں آ سکتا نہ زیادہ مدت تک ٹھہر سکے گا۔ الحمد للہ کہ آپ کے اس شہر میں ایک مدرسہ جاری کیا گیا ہے جس کے لئے آپ سے روپیہ نہیں مانگا جاتا ہاں اولاد مانگی جاتی ہے اگر کسی کے پاس اولاد نہ ہو تو زبانی امداد کریں یعنی دعا کریں۔ اور دوسروں کو رغبت دلائیں۔

فلیسعد النطق ان لم یسعد المال

(یعنی اگر کوئی مالی امداد نہ کر سکے تو وہ زبانی امداد کرتا رہے) اب اس جملہ پر ختم کرتا ہوں اس بیان کو کہ مدرسہ کی طرف سب لوگ توجہ کریں جس کے پاس مال ہو مال سے جس کے اولاد ہو اولاد دے جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ دعا کرے۔ اے اللہ! اس کو وسعت دے۔

و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین و صلی اللہ تعالیٰ وسلم علی خیر خلقه سیدنا محمد و اٰله و صحبه اجمعین.

اتباع المنیب

یہ وعظ ۱۹ صفر ۱۳۳۱ھ کو کھڑہ ابوتراب لکھنؤ شہر میں کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا جو ۴ گھنٹے ۲۵ منٹ میں ختم ہوا سامعین کی تعداد تخمیناً ۲۵۰۰ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد لله نحمد و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له و نشهد ان محمد اعبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و على اله واصحابه و بارک وسلم. اما بعدفاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمٰن الرحيم وان جاهداک علیٰ ان تشرک بی ماليس لک به علم فلا تطعهما وصاحبهما فى الدنيا معروفاًواتبع سبيل من اناب الى ثم الى مرجعكم فانبئكم بما كنتم تعلمون. (لقمان:۱۵)

یعنی اور اگر تجھ پر وہ دونوں (یعنی والدین) اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا اور اس کی راہ چلنا جو میری طرف رجوع ہو پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر میں تم کو جتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے تھے۔

ناصحین کو نصیحت

یہ ایک آیت ہے سورہ لقمان کی۔ اس وقت اس کے تمام اجزاء کے متعلق بیان کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ صرف ایک جملہ کا بیان مقصود ہے۔ مگر برکت کے لئے نیز ادب کے لئے پوری آیت تلاوت کی گئی۔ مقصود صرف واتبع سبیل من اناب الی کا بیان کرنا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں اور خطاب عام ہے کہ اتباع کرو ان کے طریقہ کا جو میری طرف رجوع کریں۔ یہ اس آیت کا ترجمہ ہے اور اس کے ماقبل اور مابعد بھی اسی کے مناسب مضمون ہے اور تمہید کے طور پر اس کا بیان بھی کروں گا مگر مقصود وہی جملہ واتبع سبیل من اناب الی (ان کے طریقہ کی اتباع کرو جو میری طرف رجوع کریں) ہے۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے لقمان علیہ السلام سے کچھ حکمتیں نقل کی ہیں جن کی انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی تھی اور منجملہ حکمتوں کے ایک نصیحت ادائے حقوق والدین

کی بھی نصائح ضروریہ میں سے تھی جو کہ حضرت لقمان نے بیان نہیں کی تھی یا تو اس لئے کہ انہیں حق تعالیٰ کے حقوق کا بیان کرنا مقصود تھا اور یا اس لئے کہ انہوں نے خودغرضی کے ایہام سے اس کا بتلانا مناسب نہ سمجھا ہو اور اس سے پہلوتہی کی ہو مگر چونکہ بغیر اس کے مضمون ناتمام رہا جاتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے درمیان میں اس کو ذکر کر دیا اور جس آیت سے اس کو شروع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حق تعالیٰ ہی نے فرمایا ہے حضرت لقمان سے منقول نہیں ہے کیونکہ شروع میں فرمایا ہے **ووصینا الانسان الایه** (ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے) متکلم کے صیغہ سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے کہ یہ نصیحت خود حق تعالیٰ نے فرمائی ہے حضرت لقمان سے منقول نہیں ہے اور اس سے ایک مسئلہ بھی مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ نصیحت میں خودغرضی کے ایہام سے بھی بچنا مناسب ہے جیسا کہ لقمان علیہ السلام نے کیا کیونکہ حقوق والدین کی نصیحت سے چونکہ اپنے بیٹے کو نصیحت فرما رہے تھے ایہام خودغرضی کا ممکن تھا پس خودغرضی کے ایہام سے بچنا چاہئے کیونکہ اکثر ایسی صورت میں مخاطب کے قلب پر اس نصیحت کا اثر نہیں ہوتا اور یہ ایک اصل کلی قاعدہ کلیہ) ہے اس کے فروع اور جزئیات بہت ہیں جن کی آج کل ضرورت واقع ہوتی ہے اور یوں تو ہر اصل کے فروع بہت سے ہوتے ہیں مگر اس اصل کے خاص وہ فروع بھی متعدد جن سے اکثر سابقہ پڑتا ہے۔

چنانچہ ایک فرع یہ ہے کہ اکثر لوگ وعظ یا نصیحت اس لئے کرتے ہیں کہ اپنے گروہ کو قوت ہو۔ آج کل یہ عام طور پر ہو رہا ہے ہرچند اس میں نیت بخیر بھی ہوتی ہے کیونکہ اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس پر لانا چاہتے ہیں مگر اپنی غرض یہی ہوتی ہے نیت یہ ہوتی ہے کہ مجمع اہل حق کا بڑھے گا تو ہم کو قوت ہوگی۔ گو یہ نیت نہ ہونے کی صورت میں بھی قوت حاصل ہوتی مگر اس کے قصد اور لزوم میں بڑا فرق ہے پس قصد اور نیت تو یہ نہ ہونی چاہئے گو یہ بات لازم آجائے بلکہ نیت تو یہ ہونی چاہئے کہ لوگ حق کو قبول کریں اس میں برکت ہوتی ہے اور مجمع اہل حق کو قوت اور ترقی بھی ہوتی ہے اور جب براہ راست مجمع بڑھانے کی ہی نیت ہو گو وہ مجمع اہل حق کا ہی سہی مگر یہ تجربہ ہے کہ اس کا اثر سامعین پر ضعیف ہوتا ہے بلکہ بعض وقت مقصود کے خلاف اور برا اثر ہوتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ایسا ملکہ اور ایسی فہم عطا کی ہے کہ نیت اور مقصود اس سے مخفی نہیں رہتا پس سامعین کو معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں کیا مقصود ہے پس ویسا اثر بھی ہوتا ہے لہذا ناصحین کے لئے ضروری ہے کہ بے غرض ہو کر تبلیغ کریں۔

علماء کو نصیحت

تبلیغ سے مقصود صرف یہ ہو کہ مخاطب کو نفع ہو۔ اب اس نفع سے چاہے جو کچھ بھی لازم آجائے یہ ایک فرع تھی اس اصل مذکور کی۔

اب دوسری فرع سنیئے کہ اس کا بیان بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اس میں اہل علم کی اصلاح ہے اور ہم کو عوام سے زیادہ اہل علم کو مشورہ دینے کی ضرورت ہے اس لئے کہ عوام کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ان کی اصلاح ہوگئی تو عوام کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔ اور اگر ان میں کمی ہوگی تو ان کا اور ان کی بات کا اثر بھی ویسے ہی ناقص متعدی (دوسرے تک پہنچنے والا) ہوگا جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا۔ پس ضرورت معلوم ہوئی کہ اس اصل سے جو مسئلہ خواص کے مناسب مستنبط ہوتا ہے اس کا بھی اختصار کے ساتھ ذکر ہو جائے۔

سو وہ یہ ہے کہ بعض اوقات علماء کسی خاص شخص کے فرمائشی مضمون پر وعظ کہتے ہیں چاہے وہ مجمع کے مناسب ہو یا نہ ہو تو ایسا بھی نہ کرنا چاہئے اور مجھ کو یہ باتیں پیش آتی ہیں اس لئے میں کہتا ہوں چنانچہ ایک مقام پر مجھ سے کہا گیا کہ ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کرنا کیونکہ اس مقام پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم لوگ نعوذ باللہ حضور کی عظمت کم کرتے ہیں مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کیونکہ اس سے مخاطب کو کیا نفع ہوا۔ اس لئے کہ مخاطبین میں کوئی بھی حضور کے فضائل کا منکر نہیں تو اس مجمع میں اس مضمون کو بیان کرنے سے سوائے اس کے کیا غرض ہے کہ اپنے کو خوش عقیدہ اور نیک خیال ظاہر کر دیں تو دو گھنٹہ وقت صرف کروں اور حاصل یہ ہو کہ ہم کو بزرگ سمجھے۔

ایک مقام پر جودھپور میں یہ رائے دی گئی کہ بعض لوگ تمہاری جماعت پر عدم تقلید کا شبہ کرتے ہیں اس لئے امام ابو حنیفہ کے فضائل کا ذکر کرو۔ میں نے کہا کہ اس بیان سے بجز اس کے کہ اپنا تبریہ (پاکی بیان کرنا) ہو اور کیا حاصل ہے اور میں نے کہا کہ مجھے تو غیرت آتی ہے کہ چند مسلمان اشتیاق کے ساتھ احکام سننے کے لئے آئیں اور بجائے اس کے اپنی عقیدت ان کے ذہن میں جمائی جائے رہی یہ بات کہ ہماری طرف سے ان کا گمان بد ہے تو ہوا کرے ہم اپنا حق ادا کرتے ہیں کسی کی سمجھ میں آئے تو عمل کرے ورنہ فوق کل ذی علم علیم (ہر جاننے والے سے بڑھ کر جاننے والا موجود ہے)

پس اس قسم کے خیال اکثر مصلحت کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ایسا کرنے لگتے ہیں اس لئے میں اس کو بیان کرتا ہوں کہ یہ مناسب نہیں۔ اس میں خودغرضی کا شبہ ہے اگر کسی کو واقعی آپ کے متعلق تحقیق کرنی ہوگی وہ دوسرے ذرائع سے کرے گا۔ باقی اپنے منہ سے اپنا تبریہ (پاکی بیان کرنا) یہ بالکل تہذیب اور مروت کے خلاف ہے بلکہ خود تو یہ کہنا چاہئے کہ ہم اس سے بھی بدتر ہیں اور اس اصل سے ایک اور فرع غامض (باریک) سمجھ میں آئی کہ علماء کے لئے مناسب یہ ہے کہ تعلقات دنیویہ میں زیادہ مشغول نہ ہوں اور یہ بات شاید اول وہلہ میں عقلاء کی سمجھ میں نہ آئے مگر میں اس کو سمجھائے دیتا ہوں کیونکہ آج کل عقل کی بہت پرستش ہوتی ہے جب تک کہ کوئی بات ان کی عقل میں نہ آئے اس وقت تک اس کو قبول نہیں کرتے اور اس قسم کی باتوں کو آج کل تنزل کی تعلیم کہا جاتا ہے مگر الحمدللہ میں علماء کو کہہ رہا ہوں اور وہ اس کو تنزل نہ کہیں گے۔

تو بات یہ ہے کہ جو علماء دنیا کے کاروبار کرتے ہیں ان کی بابت معلوم ہوا ہے کہ ان معاملات کے متعلق جب وہ کوئی فتویٰ بیان کرتے ہیں تو لوگ اس کی وقعت نہیں کرتے۔ چنانچہ اسی کی بناء پر عوام کی زبان زد ہے کہ مولوی اپنے مطلب کے فتوے نکال لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ دنیوی جھگڑے ہیں اس وجہ سے لوگوں کو ان پر اعتماد نہیں اور یہ جھگڑے نہ ہوں تو ان کی سختی احتیاط پر محمول ہوگی اور نرمی واقفیت زمانہ پر محمول ہوگی غرض ہر حال میں وہ محمود ہوں گے اور گو یہ محمود ہونا مقصود نہیں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ان سے لوگوں کو فائدہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر مریض کو طبیب پر اعتماد نہ ہو تو مریض گیا گزرا۔ پس طبیب کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی بات ایسی نہ کرے کہ مریض کا اس پر سے اعتماد جاتا رہے اور مریض اس سے بدگمان ہو جائے اور یہی معنی ہیں اتقوا مواضع التھم (یعنی تہمت کے موقعوں سے بچو) کے

اس کو پہلے مضمون کے متعارض نہ سمجھئے کہ پہلے کہا تھا کہ کسی کا ہماری طرف سے گمان بد ہو تو ہوا کرے کیونکہ مواضع التھم (تہمت کی جگہیں) سے بچنے کے امر میں یہ قید ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی کام ایسا نہ کرے کہ بدگمانی ہو اور وہاں محض اظہار حق ہی ہے جو کہ مامور بہ ہے بدگمان ہوئے ہیں تو وہ ایسا ہو گیا کہ۔

وما نقموا منھم الآ ان یؤمنوا باللہ العزیز الحمید

یعنی ان کفار نے ان مسلمانوں میں کوئی عیب نہیں پایا بجز اس کے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو کہ زبردست سزاوار حمد ہے۔

تو وہاں وہ فعل مامور بہ اور سراسر محمود ہے اور یہاں ایسے امور ہیں کہ ضروری نہیں ہیں ان سے بچنا ممکن ہے۔ پس اگر ان سے نہ بچے گا تو لازم آئے گا۔ کہ خود اپنے آپ سے لوگوں کو بدگمان کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ علماء اپنی جائیدادیں تلف کر دیں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس میں جو توسیع ہوتی ہے اس سے بچیں کیونکہ وہ غیر ضروری ہے۔ پس غیر ضروری کے لئے متہم ہونا مناسب نہیں۔ یہ وجہ ہے جس کے لئے میں کہتا ہوں کہ اہل علم کے لئے تقلیل تعلقات (تعلقات میں کمی کرنا) مناسب ہے تو یہ بھی اسی اصل کی فرع ہے کیونکہ اس میں خودغرضی کے ایہام سے بچنے کو کہا گیا ہے اور توسیع تعلقات کی صورت میں نصیحت کرنے سے خودغرضی کا ایہام ہوتا ہے پس اس ایہام سے بچنا لازم ہے اور اس سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ توسیع تعلقات کو ترک کیا جائے نہ یہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر (یعنی اچھے کام کا امر کرنا اور بری باتوں سے روکنا) ہی کو ترک کر دیا جائے کیونکہ وہ تو مامور بہ ہے۔ پس یہ بھی اسی کی ایک فرع ہوئی یہ طلباء کے کام کی بات ہے کیونکہ یہ پڑھ کر مقتداء بنیں گے اس وقت ان کو اس سے فائدہ ہوگا۔

مقام اتہام سے بچنا

ایک فرع یہ بھی ہے کہ اہل علم کو کبھی کسی کا فیصلہ نہ لینا چاہئے کیونکہ اس سے بھی بدگمانی ہوتی ہے جس کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ ان سے بدگمان ہو جاتا ہے اور مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے کیونکہ اول میں بعض مواقع میں مجھ سے ایسی غلطی ہو گئی ہے کہ میں نے فیصلہ لے لیا ہے مگر اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا پھر مجھے تجربہ ہو گیا۔

چنانچہ پہلے پہلے جب میں وطن گیا تو لوگ اپنے فیصلے لاتے تھے۔ ایک مکان کا فیصلہ تھا میں نے محنت کر کے جزئیات فقہیہ تلاش کیں اور اس کے موافق فیصلہ لکھا مگر جس کے خلاف تھا اس نے اس کو نہیں مانا وہ معاملہ سرکار میں لے گئے۔ میرے فضول کئی دن اس میں برباد ہوئے۔

ایک اور فیصلہ تھا کہ اس میں ایک فریق تو ایک عورت تھی اور دوسرا فریق ایک مرد۔ اس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ تو دو ہی مرتبہ میں مجھے تجربہ ہو گیا کہ اہل علم کو ہرگز فیصلے میں نہ پڑنا چاہئے۔ اس وقت سے میں نے یہ تجویز کر لی ہے کہ جو میرے پاس فیصلہ لاتا ہے اس سے کہہ دیتا ہوں

کر فیصلہ تو عمائد کے پاس لے جاؤ انہیں سے فیصلہ کراؤ۔ لیکن اگر شاید وہ مسائل اور احکام شریعت سے واقف نہ ہوں تو اس وقت یہ ہونا چاہئے کہ فریقین متفق ہو کر ایک استفتاء لکھیں جس پر دونوں کے دستخط ہوں اور اگر استفتاء کے مضمون میں فریقین کا اتفاق نہ ہو تو اس میں بھی عمائد سے رجوع کریں تاکہ وہ تنقیح کر کے استفتاء کے مضمون کو درست کریں اور جب مضمون منقح ہو جائے تو اس پر دونوں فریق دستخط کریں اور میرے پاس لائیں تو میں جواب لکھ دوں گا تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک نے کچھ اپنے موافق لکھ کر فتوی حاصل کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہو کہ پھر دونوں کو عدالت میں جا کر کھڑا ہونا پڑے اور وہ فتوے بیکار ہو جائیں اور بدنامی بھی ہو کہ کوئی مولوی کچھ لکھتا ہے اور کوئی کچھ لکھتا ہے پس بہتر یہ ہے کہ فتوی تو لیں علماء سے اور اس کو نافذ کرائیں عمائد اہل شہر سے کیونکہ فیصلہ کرنا عمائد اور اہل اثر کا کام ہے۔ میں نے یہ معمول اختیار کیا ہے۔

فیصلہ لینے میں ضرر یہ دیکھا کہ جب دو فریق باہم مخالف ہو کر فیصلہ کے لئے قضیہ لائیں گے تو ضروری بات ہے کہ فیصلہ ایک کے موافق ہوگا اور دوسرے کے خلاف تو بعض اوقات تو وہ فیصلہ واقع کے موافق ہوتا ہے اور بعض مرتبہ واقع کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ فیصلہ کرنے والا عالم الغیب تو نہیں ہے کہ اس کو صحیح واقعات کا علم ضروری ہو۔ پس ممکن ہے واقعات اس فیصلہ کرنے والے سے مخفی رہیں اور معلوم نہ ہو سکیں ہر چند کہ ایک فریق ظاہر کرتا ہے مگر دلیل نہ ہو سکنے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں ہوتا پس اگر فیصلہ واقعات کے خلاف ہوا تو عوام گالیاں دیتے ہیں کہ یہ کیا اندھوں کی طرح فیصلہ کیا ہے بس معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ان کی سفارش کر دی ہے اس وجہ سے ایسا فیصلہ کر دیا۔ سو یہ نتیجہ ہوتا ہے اور ہارنے والے کو اس روز سے اس مقتداء سے دینی تعلق کم ہو جاتا ہے جس سے اس کا دینی ضرر ہوا۔ اگر فیصلہ واقعات کے خلاف ہے تب تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اور اگر واقعات کے مطابق بھی ہو جب بھی اکثر لوگ اس فیصلہ کرنے والے کو ایک فریق کے ساتھ ضرور سمجھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں اس کا دینی اثر ہونا ممکن تھا وہاں بھی یہ لوگ اس میں کھنڈت ڈالتے ہیں اور ان کو اس کی طرف سے بدگمان کرتے ہیں۔ بس کا وہ قصہ ہو جاتا ہے کہ۔

غضب ایک شیر کے واسطے تو نے
نیستاں کو جلا دیا

ایک ذرا سے فائدہ کے لئے کہ فیصلہ کرنے سے ہمارا لوگوں میں اثر ہوگا جس سے

دینی کام لیں گے۔ بہت لوگوں کو اپنے سے بدگمان کرلیا اور ان پر جو دینی اثر ہوتا اس کو غارت کردیا۔ اور عجب نہیں کہ حضرت ابوذر کو حضورؐ نے اسی لئے یہ مشورہ دیا ہو کہ۔

لاتلین مال یتیم و لا تقضین بین اثنین (اتحاف السادۃ المتقین ۳۱۸:۸)

یہ حدیث طویل کا ایک جزو ہے۔ اس میں یہ مضمون ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ سے فرمایا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں تمہارے لئے وہی پسند کرتا ہوں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ایک تو یتیم کے مال کا متولی نہ بننا۔ دوسرے تم پنچ نہ بننا اور اس کی وجہ یہ فرمائی کہ انی اراک ضعیفا کہ تم ضعیف ہو ان کاموں کا تحمل نہیں کرسکو گے اور عدم تحمل کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ نازک تھے پس جب فیصلہ کرنے کے بعد کوئی مخالفت کرے گا تو پریشان ہو جائیں گے اور ان کی مخالفت اور اعتراضات کا تحمل نہ کرسکیں گے برخلاف اس کے کہ فیصلہ کرنے والا صاحب حکومت ہو جیسے شیخین کہ ان کے فیصلے کی اول تو مخالفت نہیں کی جاتی اور اگر کی جائے تو وہ مخالفت کو رفع فرما سکتے ہیں برخلاف ایک ایسے بزرگ کے جس کو اختیارات حاصل نہ ہوں کہ وہ مخالفت کو رفع نہیں کرسکتے۔ پس یہ بھی اس اصل کی ایک فرع ہو سکتی ہے کہ خود غرضی کے ایہام سے بچیں۔

فقہاء نے ایسا ہی ایک جزیہ لکھا ہے کہ علماء کو گواہی دینا مناسب نہیں اور وجہ یہ لکھی ہے کہ اگر یہ کسی کی طرف سے گواہی دیں گے تو فریق مقابل کو ان سے عداوت ہو جائے گی لہٰذا ان کو گواہی دینا مناسب نہیں ہے۔ پس فقہاء کے اس قول سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ علماء کو فیصلہ نہ لینا چاہئے اور فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ علماء کو مناسب نہیں کہ ہر جگہ کی دعوت قبول کرلیں۔ پس جب انہوں نے دیکھا کہ عوام کا علماء سے کتنا تعلق ہے اور ان کا منصب کیا ہے تو یہاں تک مشورہ دیا کہ ہر جگہ کی دعوت بھی نہ قبول کی جاوے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ لوگ دعوت کرکے حقیر سمجھتے ہیں اور طلبہ کی دعوت تو آج کل اسی خیال پر کرتے ہیں کہ بلائیں دفع ہوں گی۔ تو گویا طلبہ بلاخوار ہوئے۔

عوام کے اس خیال کے قرائن یہ ہیں کہ اکثر صدقہ میں عوام نے کالی چیزیں پسند کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تیل اور ماش دیتے ہیں اور پھر اس کے لئے تجویز کیا ہے مہتروں کو کہ وہ بھی اکثر کالے ہوتے ہیں۔ پس اس شدت کے ساتھ کالے ہونے کی رعایت کرنے سے معلوم ہوا کہ اس بلا کو صدقہ میں لپٹا ہوا خیال کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جو شخص اس کو کھائے گا بلا اس کے ساتھ چلی جاوے گی تو ایسوں کو تجویز کرو جن کے ضرر پہنچنے سے کوئی رنج نہ ہو۔ اس لئے کہیں تو مہتروں کو تجویز کیا اور کہیں طلباء کو تجویز کیا کہ طلباء سے زیادہ کون

مفت کا ہوگا تو یہ حال ہے لوگوں کا۔

میں نے تو اسی لئے اپنے یہاں یہ طریقہ مقرر کر دیا ہے کہ طلباء کو دعوت میں جانے کی اجازت نہیں بلکہ بعض لوگوں نے طلباء کا کھانا اپنے یہاں مقرر کرنا چاہا تو میں نے کہہ دیا کہ اگر اپنے ملازم کے ہاتھ دونوں وقت مہذب طریقہ سے بھیج سکو تو منظور کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ طلباء تمہارے در پر کھانا لانے کے واسطے نہ جائیں گے تو وجہ یہ ہوئی کہ عوام کی حالت سے میں نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ وہ ان کی تذلیل کرتے ہیں تو اس صورت میں ان کو اپنی حفاظت کی ضرورت ہے۔

دنیاداروں کو نصیحت

عوام اہل علم کی نسبت بالکل یہ سمجھتے ہیں کہ چندیں شکل برائے اکل (اتنی شکلیں کھانے کے لئے ہیں) کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں سب اپنے کھانے کے لئے کرتے ہیں۔ کوئی مدرسہ قائم کرے اور اس کی خدمت اور امداد کے لئے چندہ کرے مگر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنے لئے وصول کرتے ہیں اور مدرسہ کا صرف بہانہ ہے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ علماء کو اس میں ہرگز نہ پڑنا چاہئے بلکہ علماء تو پڑھائیں اور چندہ کریں اہل دنیا۔ مگر اہل دنیا نے اس کام کے لئے بھی علماء ہی کو تجویز کیا ہے سو کام تو سارے علماء کریں اور دنیادار صرف ان پر الزام لگانے کے لئے ہوں۔ اور افسوس ہے کہ جتنی کچھ مضرتیں پہنچ رہی ہیں ان سب کا الزام علماء پر لگایا جاتا ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ان کو چاہئے کہ تبلیغ اسلام میں سعی کریں اور دنیا کا کچھ کام نہ کریں مگر اس میں علماء کوتاہی کرتے ہیں کہ غیر ممالک میں تبلیغ کرنے نہیں جاتے بلکہ دنیا کے کاروبار میں لگ جاتے ہیں۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ آخر علماء کہاں سے کھائیں اس وقت تو جو صورت کسی کو میسر ہوئی اس میں مشغول ہیں کہ کوئی مطب کر رہا ہے کوئی کچھ کر رہا ہے حالانکہ اہل علم اس سے تنگ ہیں مگر کیا کریں۔ پس یہ حضرات جو رائے دیتے ہیں ایک مد بھی تو ایسی کھول دیں جس سے اہل علم کی کفالت ہوتی رہے اور اس وقت تو علماء اپنی معاش کی بھی فکر کرتے ہیں اور جتنی ہو سکتی ہے دین کی بھی خدمت کرتے ہیں۔ پس یہ عجیب بات ہے کہ یہ حضرات علماء کو رائے تو دیتے ہیں اور جب ان سے علماء کے کھانے کی صورت پوچھی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ چندہ کریں۔ تو مولویوں کو اکبر کے بھنڈ کا ہاتھی مقرر کیا ہے۔

مشہور ہے کہ اکبر نے کسی بھانڈ کو ایک ہاتھی انعام میں دیا تھا اور اس کی خوراک کے لئے کچھ نہیں دیا۔ پس اس بھانڈ نے یہ کیا کہ جب اکبر کی سواری ادھر کو نکلی تو اس طرف اس ہاتھی کے گلے میں ڈھول ڈال کر چھوڑ دیا۔ اکبر کی سواری جب وہاں پہنچی اور اس ہاتھی کو اس حالت میں دیکھا تو اس بھانڈ کو بلایا اور دریافت کیا کہ تو نے ایسا کس واسطے کیا۔ اس نے کہا کہ میرے اندر اتنی وقعت کہاں ہے کہ اس کو اپنے پاس سے کھلاؤں۔ اس لئے میں نے اس کے گلے میں ڈھول ڈال دیا ہے کہ بھائی جیسے ہم مانگ کر کھاتے ہیں اسی طرح تو بھی مانگ اور کھا۔

اب ہمارے بھائی علماء کے لئے یہی منصب تجویز کرتے ہیں کہ مانگو اور کھاؤ کتنی بڑی غیرت کی بات ہے یہ تو آپ غنیمت سمجھتے نہیں کہ علماء آپ کو تنگ نہیں کرتے اور تقاضا نہیں کرتے حالانکہ ان کا حق ہے اس لئے وہ تقاضا کر سکتے ہیں کیونکہ آپ کے ذمے ان کا دین ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں للفقراء الذین احصروا کہ صدقہ ان لوگوں کا حق ہے کہ اللہ کے کام میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ نہ تجارت کرتے ہیں نہ زراعت کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک شخص سے دو کام نہیں ہوتے تو للفقراء میں لام استحقاق کا ہے کہ ان کا حق ہے تو حق تعالیٰ کی تصریح سے ان کا قرض دیانۃ واجب ہے پس جب کہ ان کا حق ہے تو وہ مطالبہ بھی کر سکتے ہیں مگر غیرت علم کی وجہ سے مطالبہ نہیں کرتے کیونکہ علم وہ چیز ہے کہ صاحب علم کے دماغ میں اس سے علو اور استغناء پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ جو لوگ اس وقت ادھر ادھر وعظ کے ذریعہ سے مانگتے اور علماء کے طبقہ کو ذلیل کرتے پھرتے ہیں ان میں دینداری تو کیا استعداد علمی بھی نہیں ہے تو یہ علماء نہیں ہیں۔ بس یہی ہے کہ ادھر ادھر کے مضامین یاد کر لئے ہیں۔ اب انہی پر لوگ اور علماء کو بھی قیاس کرتے ہیں حالانکہ جو عالم ہو گا گو باعمل نہ ہو پھر بھی وہ ایسی حرکتوں سے علم کی تذلیل نہ کرے گا اس لئے وہ کونے میں پڑے ہیں نہ تقاضا کرتے ہیں نہ مطالبہ اس حالت کو غنیمت نہیں سمجھتے بلکہ ان پر اعتراض کر کے ان کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم بھی ہمارے عیب نکالو پس یہ رائے بالکل نامناسب ہے کہ علماء چندہ مانگیں چندہ تو اور لوگوں کو کرنا چاہئے یہ کام علماء کا نہیں ہے کیونکہ اس میں علماء پر خود غرضی کا شبہ ہوتا ہے چنانچہ علماء جب چندہ مانگتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ چندہ وصول کر کرا کے اپنے پاس رکھ لیں گے پس علماء کو چاہئے کہ اس سے بچیں تو یہ بھی اسی اصل کی ایک فرع ہے۔

سفارش اور اس کی حقیقت

ایک فرع اس کی یہ ہے کہ پیر کو چاہئے کہ اپنے مریدوں کے دنیا کے جھگڑوں میں نہ پڑے کیونکہ اس میں بھی خود غرضی کا شبہ ہو جاتا ہے پھر ان کے معاملات میں سے جو کھلی معصیت ہوں اس میں تو نہ پڑنا اور شرکت نہ کرنا ظاہر ہے اور جو معاملہ ایسا ہو کہ اس کو اس کی تحقیق نہیں تو اس میں بھی نہ پڑے کہ اس کی تفتیش شروع کردے اور اسی میں داخل ہے اپنے معتقدوں کی سفارش کرنا۔ آج کل سفارش بھی نہ کرنا چاہئے اس میں بھی خود غرضی کا شبہ ہے کیونکہ اس زمانہ میں سفارش سفارش نہیں رہی۔ سفارش کی حقیقت ایک قصہ سے معلوم ہوگی۔

وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت بریرہؓ لونڈی تھیں۔ حضرت عائشہ نے ان کو خرید کر آزاد کردیا اور شرعی قانون یہ ہے کہ لونڈی جب آزاد ہو تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے خاوند سے الگ ہو جائے۔ پس جب یہ آزاد ہوئیں تو اپنے شوہر سے علیحدہ ہوگئیں حضرت مغیث ان کا نام تھا۔ ان کی یہ کیفیت تھی کہ روتے ہوئے ان کے پیچھے پھرتے تاکہ حضرت بریرہؓ ان سے الگ نہ ہوں۔ ایک مرتبہ حضرت عباسؓ سے حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اس پر تعجب ہے کہ مغیث تو بریرہ سے اس قدر محبت رکھتے ہیں اور بریرہ مغیث سے اس قدر بغض رکھتی ہیں۔ چنانچہ پھر بہ نفس نفیس خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے مغیث کی سفارش کی کہ ان سے علیحدہ مت ہو۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ سفارش کرتے ہیں یا امر کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ امر تو نہیں کرتا۔ پس انہوں نے جواب دیا کہ جب امر نہیں ہے تو میں قبول نہیں کرتی۔

حضرت بریرہؓ کیسی قانون دان تھیں کہ دریافت کرلیا کہ امر ہے یا سفارش۔ اگر امر ہو تو اس کو قبول کرنا لازم ہے اور سفارش ہو تو نہیں۔ یہ ہے آزادی خیال تو کیجئے کہ کجا بریرہ اور کجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم۔ مگر نہایت آزاد ہو کر سوال کرتی ہیں کیونکہ جانتی ہیں کہ شریعت نے جو دعویٰ کیا ہے اسی پر عمل بھی ہے اور یہ بھی ایک بڑا فرق ہے شریعت اور دوسرے قوانین میں کہ شریعت میں دعویٰ کے ساتھ عمل بھی ہے اور اور جگہ جگہ دعویٰ تو ہے مگر اس کے ساتھ عمل نہیں۔

مثلاً مساوات کہ اس وقت اصول تمدن میں ہے اور اسی کی ایک شاخ خبط آمیز یہ نکلی ہے کہ عورت اور مرد مساوی ہوں سو ان لوگوں نے مساوات کا مطلقاً دعویٰ کیا ہے اور شریعت

بھی ایک حد کے اندر مساوات کا دعویٰ کرتی ہے لیکن شریعت کے دعویٰ میں اور دوسرے لوگوں کے دعویٰ میں دو فرق ہیں ایک تو یہ فرق ہے کہ..... شریعت نے مطلق مساوات کا دعویٰ نہیں کیا ہے بلکہ اس کی ایک حد مقرر کر دی ہے اور دوسرے لوگ مساوات مطلقہ کے مدعی ہیں اور دوسرا فرق یہ ہے کہ شریعت میں عمل بھی ہے کہ جو متبع شریعت ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں میں جو مساوات مطلقہ کے مدعی ہیں ان میں عمل نہیں۔

تو شریعت نے جو قانون مقرر کیا ہے عمل کرنے کے لئے مقرر کیا ہے کہ ادنیٰ رعیت سے لے کر پیغمبر تک کو اس پر عمل کرنا ہوگا۔ خیال تو کیجئے کہ خود حضورؐ سفارش کرتے ہیں اور حضرت بریرہؓ اس پر سوال کرتی ہیں کہ امر ہے یا سفارش ہے اور جب کہا جاتا ہے کہ امر نہیں ہے سفارش ہے تو وہ کہتی ہیں کہ میں نہیں مانتی۔ اب تو کوئی کسی استاد سے یا کسی پیر سے یا باپ سے ایسا کر کے دیکھے غرض یہ کہ اس قصے سے سفارش کا درجہ معلوم ہوگیا کہ سفارش یہ ہے کہ جس کے پاس سفارش لے جائیں اس کو مجبور نہ ہونا پڑے خلاصہ یہ کہ اس پر زور نہ ڈالا جائے۔

اب آج کل سفارش دیکھئے کہ اول ہی سے زوردار الفاظ کی فکر ہوتی ہے حالانکہ سفارش کے لئے لازم ہے کہ زور نہ ہو اور یہ قاعدہ ہے کہ اذا انتفی اللازم انتفی الملزوم۔ یعنی جب لازم نہ ہو تو ملزوم بھی نہیں ہوسکتا تو جب سفارش کے لئے زور نہ ہونا لازم ہے اور اب زور ڈالا جاتا ہے جو لازم کا نقیض ہے تو لازم نہیں پایا گیا پس ملزوم بھی نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ آج کل کی سفارش سفارش نہیں رہی۔

دوسرے سفارش کی یہ بھی پہچان ہے کہ اگر وہ شخص اس کو قبول نہ کرے تو اس سفارش کرنے والے کو گراں نہ ہو اور نہ اس کے دل میں رنج ہو لیکن آج کل کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ شخص سفارش قبول نہ کرے تو سفارش کرنے والے کو بہت صدمہ ہوتا ہے اور بے انتہا گراں ہوتا ہے پس سفارش کی جو علامت تھی وہ بھی نہیں پائی جاتی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں ڈھاکہ گیا اور نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ اب لوگوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ میری آپ سے ملاقات ہوگئی ہے اس لئے وہ مجھ سے سفارشیں کرائیں گے۔ پس اگر کوئی مجھ سے آپ کے پاس سفارش لکھوا کر لائے تو آپ اس سے مجبور ہو کر اپنے مصالح کے خلاف نہ کریں۔ انہوں نے ایک عجیب بات کہی کہ میں اس پر عمل ہی نہ کروں گا تاکہ

لوگ جلدی ہی آپ کو دق کرنا چھوڑ دیں۔

پس یہ ہے سفارش کہ مخاطب کو بالکل آزادی ہو۔ اس پر کسی طرح کا جبر اور دباؤ نہ ہو۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ آج کل کی کیا حالت ہے۔ سفارش کرنے والے کس قدر زور اور دباؤ ڈالنے کی فکریں کرتے ہیں اور اگر وہ ان کی سفارش پر عمل نہ کرے تو تمام عمر شکایت رہتی ہے کہ ہماری بے قدری ہوئی اللہ آج کل کے لوگوں کی سفارش حضور کی سفارش سے بھی زیادہ ہو گئی۔ حضور کی سفارش کو تو بریرہؓ کہیں کہ میں نہیں مانتی اور حضور کی بے قدری نہ ہو اور آج کل اگر سفارش نہ قبول ہو تو بے قدری ہوتی ہے تو اس قسم کے قصوں میں پڑنا مناسب نہیں ہے نہ اس وجہ سے کہ سفارش بری چیز ہے بلکہ اس لئے کہ اب وہ سفارش نہیں رہی البتہ اگر ایسے قیود اس میں مصرح ہوں جس سے مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ ان کا دباؤ ڈالنا مقصود نہیں مثلاً یہ کہ واللہ اگر قبول نہ کرو گے تو ہم برا نہ مانیں گے۔ اور تم اپنی طبیعت پر بار نہ ڈالنا اگر ایسی صفائی سے کی جاوے گی تو جائز ہے۔ لیکن اگر ایسا کرو تو خط لے جانے والا یہیں رکھ دے۔ پس ملاحظہ فرمایئے سفارش سفارش نہیں رہی ورنہ سفارش تو موجب اجر ہے اس سے کیسے ممانعت ہو سکتی ہے۔

غرض آج کل علماء اور مشائخ کو زور ڈالنا مناسب نہیں ورنہ اس سے خود غرضی کا شبہ ہوگا کیونکہ اس کی غرض آپ کی غرض سمجھی جاتی ہے اور اسی وجہ سے سفارش کے قبول کرنے میں ان پر احسان سمجھا جاتا ہے تو ان کو مناسب نہیں کہ کسی کے احسان کو اپنے اوپر لیں۔ اگر اس شخص کے ساتھ احسان ہی کرنا ہے تو مناسب ہے کہ خود ہی احسان کریں اور اس کی حاجت پوری کرنے کو دوسرے کو نہ کہیں کہ وہ ان پر احسان رکھے۔

علماء اور دنیا

اسی طرح علماء کو لوگوں کے رشتہ ناتوں میں بھی نہ پڑنا چاہئے اور مجھے سفارش کرانے والوں پر تعجب ہوتا ہے کہ بزرگوں کو انہیں قصوں کا کر لیا ہے گویا انہوں نے تسبیح اسی لئے لی ہے کہ لوگوں کی دنیا کو درست کیا کریں۔ جس نے اپنی دنیا پر لات مار دی ہے۔ اسے دوسروں کی دنیا درست کرنے سے کیا غرض۔ ان کے پاس دنیوی جھگڑے لے جانے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے سنار سے کوئی شخص کھرپا درست کرا دے۔ سو علماء اور مشائخ تو صرف اس کام کے ہیں کہ ان سے شریعت کے احکام اور مسائل پوچھو۔ امراض باطنی کا ان سے

علاج کراؤ۔ یہ کیا واہیات بات ہے کہ لڑکی کا رشتہ کراتے ہیں وہ لوگ اس کام کے نہیں۔

یہاں سے بطور فرع کے سمجھ میں آیا ہوگا کہ جب زندوں سے دنیا کے کام لینا منع ہے تو مردوں سے بدرجہ اولیٰ منع ہوگا۔ اب لوگ قبروں پر جا کر ان سے دنیا کے کاموں میں مدد اور اعانت چاہتے ہیں۔ اور قبروں پر جانے میں بالکل یہی اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ممد (مددگار) و معاون ہو جائیں گے۔ سو یہ اور بھی بے ادبی ہے اس لئے کہ وہ حضرات مقرب ہیں اور جب دنیا میں زندہ رہ کر دنیوی تذکروں اور جھگڑوں کو پسند نہیں فرماتے تھے تو اب عالم آخرت میں جا کر کیسے پسند کریں گے جب کہ امور آخرت میں مستغرق بھی ہیں اور ایسی حالت میں ان سے دنیوی قصوں میں مدد چاہنا دین کے خلاف تو ہے ہی نیز عقل کے خلاف بھی تو ہے کیونکہ جب دنیا ان کے پاس نہیں رہی تو ان سے دنیا مانگنا اور یا دنیوی کاموں میں مدد اور اعانت کی خواہش کرنا کیسے عقل تسلیم کر سکتی ہے۔ ہاں ان سے وہ چیز مانگو جو ان کے پاس ہو۔ تو اب بھی صاحب نسبت ان سے فیض حاصل کر سکتا ہے اور روپیہ اور بیٹا تو ان کے پاس ہے بھی نہیں پھر وہ تم لوگوں کو کیسے دیں گے۔ کوئی قبر کھول کر دیکھے تو وہاں ایک روپیہ بھی نہیں ہوگا تو پھر ایسی چیزیں ان سے مانگو جو ان کے پاس بھی نہیں کیسی بے عقلی کی بات ہے۔

رہا یہ خیال کہ وہ دعا کر دیں گے تو ایسا کون خیال کرتا ہے کوئی بڑا ہی خوش عقیدہ ہوگا کہ اس خیال سے قبروں پر جاتا ہوگا ورنہ عام عقیدہ تو یہی ہے کہ وہ خود دیتے ہیں۔

چنانچہ کانپور میں ایک بڑھیا ایک شخص کے پاس آئی کہ بڑے پیر صاحب کی نیاز دے دو۔ انہوں نے کہا کہ بڑی بی نیاز تو اللہ میاں کے دیئے دیتا ہوں اور ثواب بڑے پیر صاحب کو پہنچائے دیتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں اللہ تعالیٰ کی نیاز تو میں دلا چکی۔ اس پر بڑے پیر صاحب ہی کی نیاز دے دو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عوام بزرگوں کو صاحب اختیار بالاستقلال سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ جامع مسجد میں ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ ایک پرزہ تعزیہ میں لٹکانے کو لکھ دو ہم نے کہہ دیا کہ یہاں کسی کو ایسا پرزہ لکھنا نہیں آتا۔

ایک اور قصہ مجھے یاد آیا۔ ایک صاحب یہاں تک بیان کرتے تھے کہ میں نے تعزیہ میں ایک پتلا موم کا رکھا دیکھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ پتلا کیسا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ پتل

اس واسطے رکھا ہے کہ لڑکا اس شکل کا ہو۔

ایسا ہی ایک اور قصہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عرضی لٹکائی اور اولاد کی درخواست کی۔ ایک شخص نے اس عرضی کے نیچے یہ لکھ دیا کہ تمہاری بیوی بانجھ ہے اسے طلاق دے کر دوسری شادی کرو اور یہ شعر لکھ دیا۔

زمین شورہ سنبل بر نیارد
درو تخم عمل ضائع مگر داں

یعنی شور زمین میں سنبل نہیں اگتا اس میں تخم عمل ضائع نہ کرو۔

اور اس کے نیچے لکھ دیا۔ راقم امام حسین۔ عرضی والے نے جو اس جواب کو دیکھا تو بہت بگڑے کہ یہ کس نے میرے ساتھ مذاق کیا۔ کسی نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ اور کسی نے لکھ دیا ہو ممکن ہے کہ انہوں ہی لکھ دیا ہو کیونکہ اگر وہ اس کے پڑھنے پر قادر ہیں تو لکھنے پر بھی ضرور قادر ہوں گے۔ لہذا ممکن ہے کہ خود حضرت امام ہی لکھ گئے ہوں۔ آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے اور یہ ادب اور شریعت اور عقل سب کے خلاف ہو رہا ہے۔

غرضیکہ جب زندوں سے اس قسم کی باتیں کرنا خلاف ادب ہے تو مردوں سے تو اور بھی زیدہ خلاف ادب ہوں گی۔ ان حضرات کو ایسی باتوں سے نفرت ہوتی ہے جیسے کسی مہذب مجلس میں پاخانہ پیشاب کے ذکر سے۔ میں سچ کہتا کہ ان حضرات کو دنیا کے تذکرہ سے بھی نفرت ہوتی ہے۔

حضرت رابعہ کے یہاں چند بزرگوں نے دنیا کی مذمت کی تو انہوں نے فرمایا کہ تم میرے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو دنیا کی محبت ہے من احب شیئاً اکثر ذکرہ (جس شخص کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے اس کا ذکر اکثر کرتا ہے)

یہاں ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو دنیا کی مذمت فرمائی ہے تو کیا معاذ اللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دنیا کے ساتھ محبت تھی۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے لئے مذمت فرمائی ہے کہ جو لوگ اس کو مذموم نہیں سمجھتے یعنی عوام کے لئے وہاں مذمت کرنے کی ضرورت تھی اور جہاں کہ سب زاہد ہوں اور دنیا سے نفرت کرنے والے اور دنیا کو مذموم سمجھنے والے ہوں وہاں اس کی مذمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس حضور کی مذمت فرمانے پر اس کو قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ یہ حضرات تو خود دنیا کو مذموم سمجھتے ہیں پھر ان سے مذمت کرنے کی کیا ضرورت ہوئی۔ البتہ

اگر کسی جلسہ میں محب دنیا موجود ہوں تو وہاں چونکہ دنیا کی مذمت کی ضرورت ہے لہذا مذمت کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ پس اس سے معلوم ہوگیا کہ اہل حال کو مذمت کرنے سے اس کا محب ہونا کیسے لازم آیا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ بلاضرورت مذمت بھی اس شے کی کی جاتی ہے جس کی کچھ قدر ہو دیکھئے پیشاب پاخانہ کی کوئی مذمت نہیں کرتا۔ پس مذمت کرنے سے ایسی حالت میں یہ مقصود ہوتا ہے کہ ہم ایسے عالی ہمت ہیں کہ دنیا جیسی عزیز چیز کو بھی نگاہ میں نہیں لاتے۔ اس وجہ سے حضرت رابعہ نے فرمایا کہ تم دنیا کو دوست رکھتے ہو۔

غرض یہ کہ علماء کے پاس دنیا کے جھگڑے نہ لے جانے چاہئیں اور اگر کوئی کہے کہ ایک کلمہ سے کسی کا بھلا ہو جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے تو میں کہوں گا کہ سفارش کرنے والے کا نفع ہوتا ہے مگر اس بے چارہ کا نقصان بھی تو ہوتا ہے جس کے پاس سفارش کی جاتی ہے کہ اس کو دب کر ماننا پڑتا ہے چاہے اس کے مصالح کے کتنا ہی خلاف ہو تو یہ اچھی نفع رسانی ہوئی کہ اس سے دوسرے کو نقصان پہنچا۔ ایک کا تو ہوا نقصان اور دوسرے کا نفع۔

حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء

(یعنی ایک کی نفع رسانی ہوئی دوسرے کے بہت سے مصالح فوت ہوگئے)۔

اس کے نفع کا تو خیال ہوا اور دوسرے کے نفع کا خیال نہ ہوا۔ خلاصہ یہ کہ علماء کو لوگوں کے دنیا کے قصوں میں نہ پڑنا چاہئے یہ بھی اسی اصل کی فرع ہے اور بھی بہت سے اس اصل کے فروع ہیں مگر جو کچھ بیان ہو گئے کافی ہیں اس لئے اور ضروری نہیں حاصل یہ ہے کہ کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے خود غرضی کا شبہ ہو۔

حقوق والدین

اب میں اصل بیان کی طرف آتا ہوں کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے اسی ایہام خود غرضی سے بچنے کے لئے حقوق والدین کا ذکر نہیں کیا تھا اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ نے اس کو ذکر فرمایا ہے کہ۔

ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ الایۃ

ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی اس کی ماں نے اس کو پیٹ میں رکھا۔

اور حقوق والدین کے بعد فرماتے ہیں کہ والدین کی اطاعت علی الاطلاق نہیں بلکہ اسی

وقت تک ہے جب تک خدا کے خلاف نہ کہیں اور اگر وہ خدا کے خلاف کوئی بات کہیں تو نہ مانو اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کرو۔ یہ تو رابطہ کے لئے بیان کیا گیا۔ اب آگے وہ جملہ ہے جس کا بیان اس وقت مقصود ہے وہ یہ ہے کہ واتبع سبیل من اناب الی (یعنی ان کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کہ میری طرف سے ہٹاتے ہیں ان کی اطاعت نہ کرو گو ماں باپ ہی ہوں۔ بلکہ ان کی اطاعت کرو جو کہ میری طرف متوجہ ہوئے اور اس کے مابعد میں وعید فرمائی ہے کہ چونکہ میرے پاس تم سب کو آنا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں کا اتباع کرو جو کہ میری طرف متوجہ ہوئے ورنہ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو پھر ہم تم کو بتائیں گے کہ تم نے کیا کام کئے۔ یہ مقام کا حاصل ہوا اختصار کے ساتھ۔

پس اس جملہ کا مطلب تو معلوم ہو گیا۔ اب مجھ کو اس سے ایک مسئلہ کا ذکر کرنا ہے جو بہت ہی معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اور ہر چند کہ مسلمان کے لئے وہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا مگر ہماری ناحقیقت شناسی کی وجہ سے وہ معرکۃ الآرا ہو گیا وہ مسئلہ ہے اتباع کا۔

اتباع کے معنی

اتباع کے معنی تو سب کو معلوم ہیں لیکن اس کے محل میں اختلاف ہو گیا کہ اتباع کے قابل کون ہے۔ یہ مسئلہ مسلمان کے لئے تو معرکۃ الآرا اس لئے نہ ہونا چاہئے تھا کہ مسلمان من حیث مسلمان (اس حیثیت سے کہ وہ مسلمان ہے) کو خدا کے حکم کی اطاعت کرنی چاہئے کیونکہ مسلمان رعیت خدا کی ہے اور جس کی رعیت ہیں اسی کے حکم کی اطاعت بھی کرنی چاہئے۔

یہ مثال میں اس لئے اختیار کرتا ہوں کہ آج کل کوئی بات بدوں نظیر کے نہیں مانی جاتی سو اس نظیر میں غور کیجئے تاکہ اس سے یہ سمجھ میں آ جائے کہ مسلمان ہونے کا مقتضا یہی ہے کہ خدا کی اطاعت ہو۔ کیونکہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں بادشاہ کی رعیت ہے تو اس کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ یہی کہ اس شخص کے لئے اس بادشاہ کا ہر قانون واجب الانقیاد (فرمانبرداری) ہے گو وہ اس کی سمجھ میں نہ آئے اگر کوئی شخص باوجود رعیت ہونے کے اپنے بادشاہ کے کسی قانون کو نہ مانے تو سب لوگ اس کو ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ تو رعیت ہو کر ایسا کام کر رہا ہے جو رعیت ہونے کی شان کے خلاف ہے تیری سمجھ میں نہ آئے۔ مگر چونکہ اپنے بادشاہ کا قانون ہے اس لئے ماننا چاہئے اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے اول یہ معلوم ہو

جائے کہ اس قانون میں فائدہ اور مصلحت کیا ہے تب عمل کروں گا۔ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ کہنا بغاوت ہے۔ بس اب آپ ہی بتلایئے کہ اس شخص کو جو رائے دی جاتی ہے یہ کیسی رائے ہے ظاہر ہے کہ بالکل صحیح اور درست ہے تو اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ وہ شخص رعیت ہے اور رعیت ہونے کا مقتضا ہی یہ ہے کہ اپنے بادشاہ کا مطیع ہو۔

بس اب سمجھو کہ مسلمان ہیں خدا کی رعیت تو ان کو خدا کا مطیع ہونا ضروری اور خدا کے ہر قانون پر عمل کرنا۔ اور اس کا ماننا فرض ہے گو کوئی قانون سمجھ میں بھی نہ آئے جیسا کہ ابھی بیان ہوا کہ رعیت کو بادشاہ کا ہر قانون ماننا چاہئے۔ افسوس ہے کہ انسان کی رعیت ہونے کا تو یہ اثر ہو کہ اس کے ہر قانون کو ماننا چاہئے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہو اگرچہ سمجھ میں نہ آئے اور اس میں حجت کرنا بغاوت میں داخل ہو اور خدا کی رعیت ہونے کا یہ اثر نہ ہو بلکہ اس کے حکم میں کھنڈت ڈالتے پھریں اور اس کو بغاوت نہ سمجھیں۔

علماء پر اتہام

ہاں اگر کوئی شخص کہے کہ ہم خدا کے حکم میں کھنڈت نہیں ڈالتے بلکہ ہم کو یہی شبہ ہے کہ یہ حکم خدا اور رسول کا ہے بھی یا نہیں چنانچہ اس وقت بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو علماء نے گھڑ لیا ہے۔ خدا اور رسول کا یہ مطلب نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ جس زمانہ میں جیسی ضرورت ہو ویسا کرلو۔

مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک شخص نے لکھا ہے کہ قرآن شریف میں یہ خوبی ہے کہ وہ سب تحقیقات پر منطبق ہو جاتا ہے۔ اپنے نزدیک تو اس شخص نے قرآن شریف کی بڑی مدح کی مگر واقع میں یہ مذمت ہوگئی کیونکہ ان کے قول پر ان کی ایسی مثال ہو گئی جیسے ایک نجومی کا قول تھا کہ لڑکا نہ لڑکی۔ وہ ایک پرچہ پر لکھ کر دے جاتا تھا۔ اگر لڑکا ہو گیا تو یہ کہتا کہ میں نے جو لکھا تھا وہی ہوا کہ لڑکا۔ نہ لڑکی۔ یعنی لڑکا ہونے کی صورت میں وہ (نہ) کو لڑکی کے ساتھ ملاتا اور اگر لڑکی ہوگئی تو بھی کہتا کہ میرے قول کے موافق ہے کیونکہ میں نے بھی تو یہی لکھا تھا کہ لڑکا نہ۔ لڑکی یعنی لڑکا نہیں ہوگا بلکہ لڑکی ہوگی۔ یعنی اس صورت میں نہ کو ما قبل کے ساتھ ملاتا اور جو کچھ نہ ہوتا تو کہہ دیتا۔ میں نے یہی کہا تھا کہ لڑکا نہ لڑکی یعنی نہ یہ نہ وہ۔ غرض اس کا انعام ہر طرح زندہ رہتا تھا پس اسی طرح ہمارے بھائی مسلمان چاہتے ہیں کہ معاذ اللہ قرآن مجید کی یہ گت بنائیں کہ جیسی ضرورت ہو اسی پر اس کے الفاظ کو چپکا دیں۔

تو آج کل جو اس مشرب کے لوگ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ خدا اور رسول کا تو یہ مطلب ہے نہیں بلکہ یہ مولویوں نے گھڑ لیا ہے۔ پس ہمارا اعتراض مولویوں پر ہے نہ کہ قرآن وحدیث پر اور حدیث سے تو ان لوگوں نے انکار کیا ہی تھا کہ بھلا ایسی لمبی حدیثیں لوگوں کو سن کر یاد کیسے ہو گئیں جس کا جواب بحمد اللہ رسالوں میں کافی موجود ہے مگر اب قرآن شریف پر بھی ہاتھ صاف کیا کہ ایسی ایسی تاویلیں اور کھینچ تان کرنے لگے کہ جیسی ضرورت ہو اس پر چپک جاوے۔

میں نے اخباروں میں ایسے مضامین بہت دیکھے۔ اب اخباروں میں مذہبی احکام کے متعلق بھی رائیں شائع کی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اخبار کے متعلق لکھ دیا تھا کہ ان کو دیکھنا جائز نہیں۔ اس پر اعتراض کیے جانے لگے کہ لو اخبار بھی حرام ہو گئے کہ نہیں دیکھنا چاہئے تو سمجھو کہ میں نے اخبار دیکھنے کو منع نہیں کیا۔ مگر ایک تو ہے خبر اور ایک ہے رائے اور اخبار ہے خبر کی جمع۔ سو خبروں کا دیکھنا تو جائز ہے لیکن وہ ایڈیٹروں کی رائیں اور تحقیقات جو دین کے متعلق ہوں نہ دیکھنا چاہئے تو میں نے اصل میں اخبار دیکھنے کو منع نہیں کیا بلکہ انشات یعنی ایڈیٹروں کی رائیں اور تحقیقات کو دیکھنے سے منع کرتا ہوں۔ وہ بھی جب کہ دین کے متعلق ہوں اور وہ بھی اس لئے نہیں کہ دین میں رائے کو دخل ہی نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ رائیں فاسد ہوتی ہیں۔

ملاحظہ کیجئے کہ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ربوا حرام ہونے کی دلیل قرآن مجید میں نہیں۔ دیکھئے تو کیسے غضب کی بات ہے کہ جس کے بارے میں نص صریح موجود ہے اس کا انکار کرتے ہیں اور جب کوئی انہیں جواب دیتا ہے کہ ربوا کا لفظ تو قرآن مجید میں مصرح ہے **احل اللہ البیع و حرم الوبوا** (یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے) تو کہتے ہیں کہ اس ربوا سے یہ ربوا مراد نہیں بلکہ وہ ربا ہے بضم را (را کے پیش کے ساتھ) ربودن سے اس سے غضب مراد ہے۔ کیا خوب! قرآن میں فارسی گھس گئی۔

تو یہ ایسا ہوا جیسا کہ ایک جولاہے نے ماں کو دینا بند کر دیا تھا ایک ملاجی نے اس سے کہا کہ تو ماں کے حقوق کیوں نہیں ادا کرتا۔ تو اس نے کہا کہ قرآن میں بیوی کے کھانا کھلانے کا حکم ہے **اطعمهم من جوی** (جوی بعض دیہات میں بیوی کو کہتے ہیں) (من جوع) اور ماں کے لئے کہیں یہ حکم نہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ بیوی کے لئے تو کھانا ہی کھلانے کو کہا اور ماں کے لئے تو یہ حکم کیا ہے کہ ماں کا سب (ماکسب) مگر وہ بے وقوف تھا ورنہ کہتا کہ لایلاف تبت یدا سے پیچھے ہے یعنی سیپارہ میں تو وہ ناسخ ہے۔ غرض جیسا کہ اس

نے من جوع کا من جوی کہا تھا انہوں نے ماکسب۔ کا ماں کا سب بنا دیا۔

اسی طرح آج کل کہتے ہیں کہ ربوا کی ممانعت قرآن میں نہیں ہے اب کسی نے کہا کہ ظالم ربوا تو قرآن میں موجود ہے تو کیا کہتے ہیں کہ ہاں ہے تو مگر وہ ربوا نہیں ہے بلکہ ربا ہے کیونکہ اعراب تو مولویوں نے لگائے ہیں کیا ٹھکانہ ہے جہل کا۔

ایک شخص نے راندیر سے خط لکھا کہ ایک شخص بہت دور تک ڈگریاں حاصل کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے تیمم کیا تو جیسے وضو میں کلی کیا کرتے ہیں اس طرح منہ میں مٹی بھر لی۔ غرض خاکش بدہن (اس کے منہ میں خاک) کا مضمون خوب صادق آیا۔ حضرات ان معترضین کے علم کی یہ حالت ہو رہی ہے پس جس کی معلومات کی یہ حالت ہو اور وہ کرے اجتہاد خیال کیجئے کتنے غضب کی بات ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اخباروں کے اندر جو اس قسم کے مضمون ہوں وہ نہ دیکھیں اور غضب یہ ہے کہ مسلمان تو قرآن وحدیث میں اجتہاد کرتے تھے اب کفار بھی کرنے لگے۔

چنانچہ ایک انگریز صاحب نے کہا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعون اڑ کر لگتا ہے کیونکہ قرآن میں حکم ہے کہ جہاں طاعون پھیلے وہاں کے آدمی دوسری جگہ نہ جائیں۔ تو یہ دوسری جگہ جانے کی ممانعت کس لئے کی۔ اس لئے کہ یہ لوگ دوسری جگہ جائیں تو ان سے وہاں کے لوگوں کو لگ جائے گا۔ تو ایک تو یہ غضب کہ ممانعت تو کی گئی ہے حدیث میں اور آپ فرماتے ہیں کہ قرآن میں ممانعت کی گئی ہے اور دوسرے یہ کہ ممانعت کی وجہ اپنی طرف سے تراشتے ہیں۔ گویا کوئی اور وجہ ہو نہیں سکتی تو گویا قرآن وحدیث ایسی چیز ہوگئی کہ غیر مسلم بھی اس میں اجتہاد کرنے لگے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اب فاسد رائیں شائع کی جاتی ہیں اس لئے منع کیا جاتا ہے کہ ایسے رسالے اور ایسے مضامین ہی نہ دیکھیں۔ خیر اخبار کا ذکر تو طبعاً آ گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ قرآن وحدیث کا یہ مطلب ہی نہیں جو علماء بیان کرتے ہیں بلکہ اس کے وہی معنی صحیح ہیں جو کہ ہم نے سمجھے۔

قانون کے صحیح مفسر

تو اس شبہ کے اٹھانے کے لئے میں دوسری نظیر دیتا ہوں کہ قانون وہ ہے جو کہ پارلیمنٹ نے تجویز کیا ہے اور اس کے وہ معنی ہیں جو کہ جج سمجھتے ہیں کیونکہ آپ سے براہ راست تو خط وکتابت ہی

نہیں۔ جو وہ خود آپ سے اس کے معنی بیان کرتے۔ پس جن لوگوں کو انہوں نے قانون فہمی کا اہل سمجھ کر عہدہ دیا ہے وہ جو معنی قانون کے بیان کریں اس کو ماننا پڑے گا کہ قانون کے در حقیقت یہی معنی ہیں دیکھئے جب ایک ہائیکورٹ کا جج ایک فیصلہ دیتا ہے تو کیا اس وقت آپ کا یہ کہنا قابل سماعت ہو گا کہ قانون کے یہ معنی نہیں جو تم نے سمجھے۔ ہرگز نہیں اور اگر کوئی ایسا کرے کہ اس کے ساتھ گلنچ ہو اور حکم نہ مانے تو اس کو قانون کے مخالف قرار دیا جائے گا اور اس کے لئے سزائے جیل تجویز کی جائے گی۔ اگر اس وقت آپ یہ کہیں کہ صاحب آپ حکم ہی نہیں سمجھتے قانون کے یہی معنی ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ تو کیا آپ کا یہ عذر قابل سماعت ہوگا۔ ہرگز نہیں! بلکہ یہ جواب ملے گا کہ تم اپیل کرو۔ دیکھئے کہ ہائیکورٹ کے جج قانون کے سمجھنے والے تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ اور وہ جو قانون کے معنی بیان کریں۔ اس کی مخالفت قانون ہی کی مخالفت قرار دی گئی ہے کیونکہ پارلیمنٹ کے حکام ہر مقدمہ کا فیصلہ خود تو نہیں کرتے بلکہ وہ اصول کلیہ بنا دیتے ہیں۔ اس لئے قانون کے سمجھنے والے ہائیکورٹ کے جج قرار دیئے گئے ہیں۔ تو ہرچند کہ ہائیکورٹ کی مخالفت کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ میں پارلیمنٹ کے خلاف نہیں کرتا بلکہ جو یہ اس قانون کے معنی بیان کرتے ہیں اس کے خلاف کرتا ہوں مگر اس کا یہ عذر نہیں سنا جائے گا اور اس کو پارلیمنٹ ہی کا مخالف سمجھا جائے گا۔

بس ایسے ہی حضرات ائمہ مجتہدین چونکہ قرآن و حدیث کے سمجھنے والے مان لئے گئے ہیں۔ اس لئے ان کی مخالفت خدا اور رسول کی مخالفت ہے کہ حدیثیں کسی شخص کو ان سے زیادہ معلوم ہوں مگر کثرت معلومات سے مجتہد نہیں ہوسکتا۔

شاہد نیست کہ موے ومیانے دارد   بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

محبوب وہ نہیں کہ جس کے بال عمدہ کمر پتلی ہو محبوبیت اس کی آن اور ادا میں ہوتی ہے جو محبوب اور دلکش ہوتی ہے۔

مجتہدین کو حق تعالیٰ نے ایک خاص شان عطا فرمائی ہے۔ اب کوئی اللہ تعالیٰ سے لڑے کہ ان کے اندر یہ قابلیت کیوں رکھی اور ہمارے اندر کیوں نہیں رکھی۔ تو یہ بات ہم سے پوچھنے کی نہیں۔ خدا تعالیٰ سے پوچھئے لیکن پھر کل کو یہ بھی پوچھنا کہ انبیاء کو نبوت دی مجھے کیوں نہیں دی۔ ایک وہ نظم ہے کہ فلاں کو دی پیغمبری میری بار کیوں دیر اتنی کر دی۔ اول نظم سے آخیر تک خدا کی شکایت ہے تو اگر ایسی ترقی ہے تو خدا خیر کرے۔

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ

آنکس کہ تو نگرت نمے گرداند   او مصلحت تو از تو بہتر داند

یعنی خدا تعالیٰ جو تم کو توانگر نہیں بناتے وہ تمہاری مصلحتوں کو تم سے بہتر جانتے ہیں۔

غرض یہ کہ خدا نے مجتہدین میں ایک کمال پیدا کیا ہے جو ہم لوگوں میں نہیں ہے اور اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس وقت قرآن سے تم چند ایسی جزئیات استنباط کرو جن کا حکم فقہاء کے کلام میں نہ دیکھا ہو۔ پھر اول معاملات میں فقہاء کا قول دیکھو اور اپنے استنباط کو ان کے استنباط کے ساتھ موازنہ کرو تب معلوم ہوگا کہ فقہاء اور مجتہدین کی کیا شان ہے۔ مگر اس کے لئے بھی ضرورت ہے علم کی۔ ایسا کرنے پر بہت آسانی سے فیصلہ ہوسکتا ہے کہ ہم میں اور ائمہ مجتہدین میں کتنا فرق ہے۔

پس اس تفاوت کی وجہ سے عوام کو تو ایسی مثال ہے جیسے عام رعیت اور علماء کی مثال ایسی ہے جیسے وکلاء اور آئمہ مجتہدین جیسے ہائی کورٹ کے جج پس ایک رعیت کو ہائیکورٹ کے جج بلکہ ایک معمولی جج کی مخالفت جائز نہیں تو عوام کو علماء کی مخالفت کب جائز ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولویوں سے غلطی نہیں ہوتی بلکہ غلطی ہو جاتی ہے مگر اس کا پکڑنا عوام کا کام نہیں ہے بلکہ علماء ہی کا کام ہے اور جب تک کہ ایک متدین عالم کا فتویٰ بلا تعارض موجود ہے عامی کے ذمے واجب ہے کہ اس کا اتباع کرے تو اب اس کے کہنے کی کہاں گنجائش رہی کہ میں تو علماء کی مخالفت کرتا ہوں۔ خدا اور رسول کی مخالفت نہیں کرتا پس معلوم ہوا کہ علماء کی مخالفت کسی طرح جائز نہیں۔ حتیٰ کہ اگر آپ کے سامنے ترجمہ حدیث کا موجود ہو جب بھی آپ کو علماء کی مخالفت جائز نہیں کیونکہ ترجمہ سمجھنے کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے جیسے کہ قانون کا ترجمہ ہو گیا ہے مگر پھر بھی کوئی شخص جج کی مخالفت میں اپنی رائے پیش نہیں کرسکتا خواہ وہ کسی کتاب کے پیش کرنے کے ساتھ ہو اور اگر کرے تو اب بھی اس کا وہی حال ہوگا۔ جو قانون کا ترجمہ نہ ہونے کی حالت میں ہوتا یعنی قانون کا مخالف قرار دیا جائے گا۔ تو اسی طرح اگرچہ حدیث کا ترجمہ ہو گیا ہے مگر پھر بھی آپ کو اجتہاد کرنا اور علماء سے مزاحمت کرنا جائز نہیں اور جس طرح حکام کی مخالفت کرنے والا واقع میں گورنمنٹ کی مخالفت کرنے والا ہے۔ اسی طرح علماء کی مخالفت کرنا حضورؐ سے مخالفت کر کے یہ عذر کرنا کہ ہم خدا اور رسول کے خلاف نہیں کرتے نہایت نازیبا اور لچر عذر ہے۔

اتباع علماء کی ضرورت

بحمد اللہ یہ امر بہت خوبی کے ساتھ طے ہو گیا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ علماء کا اتباع کریں۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ کو علم دین سے اتنی بھی مناسبت نہیں جتنی کہ ہر شخص کو طب کے ساتھ ہوتی ہے کیونکہ طب سے تو ہر ایک شخص کو کم وبیش مناسبت ہوتی ہے اور تجربہ بھی ہوتا برخلاف علم دین کے کہ وہاں کسی کا تجربہ کام نہیں دیتا تو جتنی طب کے ساتھ مناسبت ہے اتنی بھی دینیات کے ساتھ نہیں۔ مگر باوجود اس کے کتنا ہی بڑا کوئی شخص ہو مگر جب بیمار ہوگا طبیب ہی سے رائے لے گا کبھی طب کی کتابیں دیکھ کر مسہل نہ لے گا اگر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ صفرا کا فساد ہے جب بھی اپنی رائے سے علاج نہیں کرے گا۔ کیا کسی نے ایسا کیا ہے ہرگز نہیں اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی یہ رائے دے بھی کہ طبیب کی کیا ضرورت ہے تو کہیں گے کہ بغیر طبیب کے علاج نہیں ہونا چاہئے اپنی عقل اور رائے سے خدا جانے کیا خرابی پیدا ہو۔ اس کے راز سے طبیب ہی واقف ہیں۔

پس طب میں تو باوجود مناسبت ہونے کے اپنی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا مگر علم دین میں باوجود مناسبت نہ ہونے کے ہر شخص اجتہاد کرنے لگتا ہے تو گویا شریعت میں کوئی راز ہی نہیں ہے اور وہ ایسی پامال اور معمولی شے ہے کہ اس کے لئے علم کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے۔ حالانکہ جیسے وہاں کوئی کیسا ہی عاقل سے عاقل ہوگا مگر بدوں اتباع طبیب کے چارہ نہیں اسی طرح امور شریعت میں سوائے اتباع علماء دین کے چارہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ غیر ماہر کو ماہر کا اتباع کرنا ضروری ہے۔

پس عقلی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ علماء کا اتباع آپ کو ضروری ہے اور وہ جو احکام بتاتے ہیں وہ درحقیقت خدا اور رسول کے احکام ہیں۔ پس جب یہ خدا اور رسول کے احکام ہیں تو ہر مسلمان کو ان کا اتباع کرنا چاہئے کیونکہ مسلمان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے خدا اور رسول کا اتباع کرنا ضروری ہے اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اتباع میں اختلاف نہ ہوتا مگر ہماری نادانی دیکھئے کہ اس میں بھی اختلاف کیا اور ایسا کام کیا جیسا کہ ایک طالب علم نے کیا تھا کہ دستار فضیلت ان کے بندھ گئی تھی مگر ان کو آتا جاتا خاک نہ تھا۔

آج کل یہ بھی ایک مرض ہو گیا ہے کہ لوگ کتابوں کے ختم کرنے کو اصل سمجھتے ہیں

اگرچہ سماعت ہی سے ہو اور کتاب کی عبارت ایک دن بھی نہ پڑھنا پڑے اور اب تو بعضوں کی یہ حالت سنی ہے کہ سبق میں شریک بھی ہیں مگر اس کی خبر نہیں کہ سبق کہاں ہو رہا ہے اور کس مسئلہ کی تقریر ہو رہی ہے۔

لکھنؤ کا عجیب واقعہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ صدرا کا سبق ہو رہا تھا اور ایک طالب علم جو اس میں شریک تھے بجائے صدرا کے شمس بازغہ لے کر آئے تھے۔ اتفاق سے ایک مقام پر مدرس کو شبہ ہوا تو انہوں نے ہر طالب علم سے دریافت کرنا شروع کیا کہ تمہاری کتاب میں کیا عبارت ہے ان حضرات سے جو دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ ابھی میری نظر سے وہ عبارت چوک گئی ہے دیکھ کر بتلاتا ہوں۔ آخر جب انہیں دیکھنے میں بہت دیر ہوئی تو ان مدرس صاحب نے کتاب ان کے سامنے سے اٹھالی تاکہ خود دیکھ لیں مگر دیکھا تو شمس بازغہ ہے۔ تب انہوں نے کہا کہ کیا تم روزمرہ یہی کتاب لاتے ہو اس نے کہا جی ہاں! میں تو روزمرہ یہی کتاب لاتا ہوں۔

تو جیسے یہ طالب علم تھے وہ بھی ایسے ہی تھے ان کی کتابیں ختم ہو گئی تھیں اور دستار فضیلت بندھ گئی۔ جب چلے تو استاد سے کہنے لگے کہ مجھے آپ نے پگڑی تو باندھ دی مگر مجھے تو کچھ آتا جاتا نہیں۔ اگر کوئی مجھ سے کچھ پوچھ بیٹھے تو میں کیا جواب دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہیں ایک ایسی بات بتلاتا ہوں کہ ہر سوال کا جواب ہو جائے۔ جب کوئی شخص تم سے کچھ پوچھے اور اس کا جواب تمہیں معلوم نہیں ہو تو یہ کہہ دیا کرنا کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کیونکہ قریب قریب ہر مسئلہ میں کسی نہ کسی عالم کا اختلاف ہے ہی۔ آخر انہوں نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا۔ لوگ سمجھتے کہ بڑا ہی وسیع النظر عالم ہے کہ تمام علماء کے اقوال اس کے پیش نظر ہیں پس لوگوں میں اس کی دھاک بندھی ایک شخص اس معاملہ کو سمجھ گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ لا الہ الا اللہ کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں۔ انہیں تو ایک ہی جواب یاد تھا۔ کہنے لگے کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے تب لوگوں پر ان کی اصلیت ظاہر ہوئی۔

ہم نے اس طالب علم جیسی حالت بنا رکھی ہے کہ ہر چیز میں اختلاف جو چیز اختلاف کی نہ تھی اس میں بھی اختلاف بنایا۔ لو یہ بھی کوئی اختلاف کی بات تھی کہ خدا اور رسول کا کہنا ماننا ضروری ہے مگر اس میں بھی مسلمانوں میں اختلاف ہوا اور کیا یہ ایسا مضمون ہے کہ اس کے سمجھانے کے لئے کوئی جلسہ کیا جائے مسلمانوں کے کان میں تو علماء کا یہ قول پہنچ جانا کافی ہونا چاہئے تھا کہ یہ خدا

کا حکم ہے جیسا کہ صاحب جج کا کہنا کہ یہ حکم گورنمنٹ کے قانون کے موافق ہے کافی ہوتا ہے سو اس میں کوئی خفا نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ اس ظاہر بات میں بھی مسلمانوں کا اتفاق نہ ہو سکا تو یہ ایک جدید مرض مسلمانوں میں پیدا ہوا کہ انہوں نے خدا کے حکم میں بھی اختلاف کرنا شروع کیا مگر چونکہ اب اس مرض میں ابتلا ہو گیا ہے اس لئے اس کا علاج بیان کرنا ضروری معلوم ہوا کیونکہ

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است　　اگر خاموش بنشینم گناہ است

یعنی اگر یہ دیکھوں کہ اندھا ہے اور اس کے راستہ میں کنواں ہے اس حالت میں اگر خاموشی اختیار کروں تو گناہ ہے۔

جدید مرض

بظاہر یہ معوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ مرض جدید ہے اس لئے اس مرض کا علاج بھی جدید ہوگا۔ مگر قربان جایئے کہ ہر مرض کا علاج قرآن حدیث میں موجود ہے۔ بعض مرتبہ طبیب بھی کہہ دیتے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرض ہے۔ چنانچہ میں نے ایک شخص کو دیکھا ہے کہ اس کے حلق سے لقمہ پسلی میں جاتا تھا۔ بہت سے طبیبوں کو دکھلایا مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی کیا وجہ ہے یہ کمال طب روحانی میں ہے کہ کسی مریض کو جواب نہیں دیا جاتا۔ وہاں تو طبیب سے جواب بھی مل جاتا ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہے یا یہ کہ اس مرض کا طب کی کتابوں میں ذکر نہیں اور طب روحانی میں یہ کہیں نہیں۔ چنانچہ سب سے بڑھ کر مرض کفر اور شرک کا ہے اس کا علاج بھی مذکور ہے کہ اگر سو مرتبہ بھی ہو تو پھر بھی یہ ارشاد ہے۔

قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ تحقیق وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے۔

یہ آیت ایسوں ہی کے بارہ میں نازل ہوئی کہ کفار نے کہا تھا کہ ہمارا کفر کیسے معاف ہو گا تو جواب نازل ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اسی طرح اس مرض کا بھی علاج قرآن مجید میں موجود ہے۔ گو مسلمانوں کا یہ اختلاف ایک مرض جدید تھا۔ اس عنوان سے تو

جدید نہیں کہ خدا اور رسول کا کہنا نہیں مانتے مگر اس عنوان سے جدید ہے کہ ہم علماء کا کہنا نہیں مانتے۔ یہ آفت ابھی نازل ہوئی ہے پہلے نہ تھی۔ تو اتنا جدید مرض مگر اس کا بھی علاج قرآن مجید میں ہے کہ **واتبع سبیل من اناب الی** (ان کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) ورنہ آسان بات یہ تھی کہ واتبع دین اللہ (اللہ کے دین کا اتباع کرو) فرما دیتے مگر حق تعالیٰ کو تو خبر تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ لوگ علماء کے اتباع سے بچنا چاہیں گے۔ اس لئے فرمایا کہ سبیل من اناب الی (ان لوگوں کے راستہ کا جو میری طرف متوجہ ہیں) کہ ان کا بھی اتباع تمہارے ذمہ ضروری ہے۔ تو یہ کتنا عجیب و غریب قصہ ہے۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ قرآن میں ہر امر کا فیصلہ ہے چنانچہ کتنا جدید مرض تھا مگر اس کا علاج مذکور ہے۔

یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ بہت سے عقلاء جو یہ رائے دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں اس کی ضرورت ہے کہ علم کلام جدید تیار ہو۔ علم کلام قدیم آج کل کے لئے کافی نہیں ہے بالکل غلط رائے ہے۔ دیکھئے یہ کتنا جدید مرض تھا مگر پھر بھی قرآن مجید میں اس کا علاج مذکور ہے اسی طرح ہر شبہ کے جواب کے لئے قرآن و حدیث ہی کافی ہے۔

میں ایک جگہ گیا تو ایک معزز عہدہ دار خیر خواہ قوم نے کہا کہ علماء کو چاہئے کہ علم کلام جدید تیار کریں۔ میں نے کہا کہ بہتر ہے کلام جدید تیار ہو جائے گا مگر اس کی صورت یہ ہے کہ دس انگریزی یافتہ نوکر رکھئے اور انگریزی کتابیں جمع کیجئے جن میں اسلام پر اعتراض کئے گئے ہیں۔ وہ انگریزی تعلیم یافتہ ان کا اردو میں ترجمہ کریں اس طرح سائنس کا بھی ترجمہ ہو جائے گا اور پھر جب ترجمہ ہو جائے تو ان کو موقوف کر دیجئے اور ان کی بجائے علماء کو منتخب کر کے رکھیے۔ وہ ان اعتراضات کے جواب لکھیں جیسے اس کے قبل بادشاہوں نے کیا ہے پھر جب ان اعتراضات کے جوابات مکمل ہو جائیں تو ان کے بجائے پھر انگریزی تعلیم یافتہ رکھے جائیں وہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کر دیں۔ تو ایک زمانہ تک یہ سلسلہ جاری رہے اور اس کے اخراجات کے لئے عام چندہ نہ کیجئے بلکہ روسا میں سے ایک سو آدمی مقرر کیجئے اور پچیس پچیس روپے ماہوار سب سے لیجئے تو بہت آسانی سے علم کلام جدید تیار ہو سکتا ہے۔ بس یہ سنتے ہی خشک ہو گئے وہ تو علماء پر مشق کرتے ہیں میں نے کہا کہ میں ان کا آسان علاج کروں کہ ہمیشہ کے لئے یہ سیدھے ہو جائیں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ جب کبھی ملے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔

سو علماء پر مشق ہونے کی وجہ یہی ہے کہ چاہتے ہیں کہ چندہ بھی یہی جمع کریں اور کام بھی یہی کریں۔ ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے اور جب ایسی صورت تجویز کی جاتی ہے جس میں انہیں بھی کام کرنا پڑے تو پھر چپ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حاصل یہ کہ جس کو میں نے علم کلام جدید کہا ہے وہ محض عنوان کے اعتبار سے جدید ہے معنوں کے اعتبار سے جدید نہیں کیونکہ کوئی بات ایسی نہیں ہے جو کلام قدیم میں نہ ہو لیکن آج ہمارے اکثر عقلاء یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کافی نہیں اس طرح فقہ بھی کافی نہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے جو ماہر ہوگا وہ سمجھے گا کہ کوئی شبہ ایسا نہیں نکلتا جس کے لئے علم کلام قدیم میں اصول نہ ہو۔ مگر مہارت کی ضرورت ہے ہاں اس معنی کر اس کو جدید کہہ دو کہ اس کا عنوان نیا ہوگا۔ یہی حال فقہ کا ہے۔

مجھے ایک فقہ کا مسئلہ یاد آ گیا کہ مجھ سے ایک مرتبہ یہ سوال کیا گیا کہ یہ جو گراموفون ہے اس میں قرآن بھی بھرا ہوا ہوتا ہے اور اس میں اس کے نقوش ہوتے ہیں۔ تو اس ریکارڈ کو جس میں قرآن بھرا ہوا ہو بلا وضو ہاتھ لگانا جائز ہے یا نہیں۔ میں نے اس کا ایک جواب دیا۔ ممکن ہے کہ کسی کو اس سے بہتر جواب آتا ہو۔ مگر میں نے یہ جواب لکھا کہ یہ دیکھا جاوے کہ ان نقوش کی ان حروف پر دلالت ہے یا نہیں۔ مثلاً ایک ریکارڈ میں قرآن ہے اور ایک ریکارڈ میں اور کوئی مضمون ہے تو کیا ان میں ایسا امتیاز ہے کہ صرف ان نقوش کو دیکھ کر شناخت ہو جاوے کہ یہ قرآن ہے اور یہ فلاں مضمون ہے۔ اگر اس میں امتیاز ہے کہ اس کو دیکھ کر یہ شناخت مضمون کی ہو جاتی ہے تو وہ ایسا ہے جیسا کہ حافظ کے دماغ میں قرآن مرتسم (چھپا ہوا) ہوتا ہے اس کا بلا وضو چھونا جائز ہے۔

غرض کہ جو کلام اور فقہ قدیم کو اچھی طرح پڑھے ہوئے ہوگا اور اس کو اس میں مہارت ہو جاوے گی تو میں تو ذمہ داری کرتا ہوں کہ وہ اسی پرانے فقہ اور پرانے علم کلام سے ہر سوال کا جواب دے گا۔ تو نہ فقہ جدید کی ضرورت ہے نہ کلام جدید کی مگر چونکہ ہر شخص کا ایسا فہم نہیں ہے اس لئے اگر آج کل کے شبہات کے جدید عنوان سے جواب ہو جاویں تو مضائقہ نہیں ہے۔ مجھے اس وقت یاد آیا کہ ایک کتاب ہے میری **"الانتباهات المفیدہ"** اس میں شبہات جدیدہ کا خوب حل کیا گیا ہے غرض یہ کہ قرآن مجید ایسی کافی کتاب ہے کہ اس میں جدید مرضوں کا علاج ہے۔

اتباع میں غلو

ایک یہ بھی نیا مرض تھا جس کی نسبت کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے کہ حکم الٰہی کے اتباع میں اختلاف کرنے لگے اور پھر اس میں کئی طبقے ہو رہے ہیں جن میں سے ایک تو وہ کہ ان کے نزدیک اتباع ہی کی ضرورت نہیں جیسا کہ میں نے ان کی حالت پہلے بیان کی کہ جو خود ان کی سمجھ میں آتا ہے وہ کرتے ہیں۔ اتباع علماء ہی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتے۔ سو ایسے لوگ ہیں تو بہت کم مگر ان کا اثر بہت ہے کیونکہ اکثر معزز لوگ ہی اس جماعت میں ہیں۔ ان کے اثر سے اندیشہ ہے بہت لوگوں کی تباہی کا۔ اس لئے ان کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے اور ایک وہ لوگ ہیں کہ وہ اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں مگر اس کا کوئی معیار نہیں ہے بلکہ وہ حالت ہے کہ۔

لختے برد از دل گزرد ہر کہ زپیشم　　　من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

جو شخص میرے سامنے سے گزرے دل کا ایک ٹکڑا لے جائے اس لئے کہ میں اپنے صد پارہ دل کا قاش فروش ہوں۔

جو سامنے آ گیا اس کے معتقد ہو گئے خلاصہ یہ ہے کہ ان کو اتباع میں اس قدر غلو ہے کہ ہر ایک کے اتباع کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں کوئی مردہ خواب میں کہہ دے کہ فلاں فلاں کام کرنا یا کسی کے اوپر بھوت آ جائے اور وہ کہے کہ چوراہے پر مٹھائی رکھ آنا غرض کوئی ہو انہیں سب کی مان لینا۔ ان کے ہاں روز ایک معبود تراشا جاتا ہے آج اس کا اتباع کر رہے ہیں کل کو دوسرے کا۔ مگر یہ اتباع کون سا ہے۔ یہ زیادہ تر اعتقادی ہے اور عملی کم ہے عملی اتباع صرف اسی کا کرتے ہیں جو نفس کے موافق ہو۔ غرض یہ لوگ بزرگوں کے بھی معتقد ہو گئے اور مجذوبوں کے بھی اور سالکوں کے بھی اور ہر شخص کی خدمت بھی کرنے لگے اور گو کہنا سب کا کرتے نہیں مگر اعتقاد سب کا ہے تو ایک جماعت میں تو اتباع ایسا سستا ہے اور ایک میں اتباع بالکل ہی نہیں پس اس میں دو قسم کے لوگ ہوئے ایک تو سب کے متبع اور معتقد ہونے والے اور دوسرے وہ جو کسی کے بھی متبع نہیں۔ پس ایک جماعت میں تفریط ہے اور ایک میں افراط ہے۔ حق تعالیٰ اس کا فیصلہ فرماتے ہیں کہ

واتبع سبیل من اناب الی

(یعنی جو لوگ میری طرف متوجہ ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو)

اتبع سے تو اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی اور سبیل من اناب سے علاج ہے اس جماعت کا جو ہر کس و ناکس کے معتقد ہو جانے والے ہیں اور اتباع کا صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے کیونکہ اس جملہ سے حق تعالیٰ نے اتباع کا معیار بتلا دیا اور معیار سے مراد ہے صحیح معیار۔

بزرگی کے معیار

ورنہ یوں تو آج کل معیار بہت ہیں جیسے کشف کہ بعض نے اس کو اتباع کا معیار بنایا اور ہر صاحب کشف کو بزرگ قابل اتباع سمجھا بعض نے معیار بنایا کرامت کو بعض نے وجد وسماع کو بعض نے حرارت کو کہ جس کے اندر زیادہ ہو اور بہت روتا ہو وہ بزرگ ہے۔ بعض نے معیار بنایا تصرفات کو کہ ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور مدہوش کر دیا تو سمجھے کہ یہ بڑا بزرگ ہے اور بعض نے معیار بنایا تجرد کو۔ گو بعض حالتوں میں اس کی اجازت ہے مگر یہ معیار تو نہیں۔ بعض نے معیار بنایا تند مزاجی کو۔ چنانچہ سب سے زیادہ اس کے معتقد ہوتے ہیں جو پتھر ڈھیلے مارے۔ وہ تو ان پر ظلم کرتے ہیں اور یہ ان کے معتقد ہوتے ہیں اور جو گالیاں دیتے ہیں یہ ان کو بھی کہتے ہیں کہ مجذوب ہیں کیونکہ صاحب کشف ہیں۔ سو کشف ان کے نزدیک بڑا کمال ہے حالانکہ کشف مجنونوں کو بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ میرے ہاں ایک عورت کو جنون ہوا تو اس کو کشف ہوتا تھا۔ مگر جب مسہل دیا گیا تو اس کے ساتھ ہی کشف بھی ختم ہو گیا۔ شرح اسباب میں لکھا ہے کہ مالیخولیا کے مرض میں کشف ہونے لگتا ہے پس کشف کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ لوگ ایسوں کے معتقد ہوتے ہیں جو گالیاں دیتے ہیں۔ میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ فلاں بزرگ آ کر گالیاں نہ دیں تو کام نہیں ہوتا انہیں خود تمنا ہوتی ہے کہ ہمیں گالیاں دیں۔ جیسا ہمارے ہاں ایک عورت نے جس کے اولاد نہ جیتی تھی نذر مانی تھی کہ اگر میرے لڑکا ہو اور وہ لڑکا ماں کی گالی کھا کر آئے تو پانچ روپے کی شرینی تقسیم کروں تو جیسے وہ احمق لڑکے کی گالی کھانے سے خوش ہوتی تھی ایسے ہی یہ مرد بھی گالیاں کھا کر خوش ہوتے ہیں اور ایک حضرت وہ ہیں کہ گالیاں دے کر بھی حضرت رہے۔ میں نے بعض لوگوں

کو خود یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فلاں مجذوب جب سے نرم ہو گئے ہیں کام ہی نہیں ہوتے۔ غرض بزرگی کے معیار عجیب وغریب قائم کر رکھے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو خبر نہیں کہ بزرگی ہے کیا چیز؟ اس فن کو جانتے ہی نہیں اور یہ لوگ تو کیا اکثر اہل علم بھی نہیں جانتے کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ میں نے اہل علم کو بھی دیکھا ہے کہ اکثر دوسروں کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ اور بعضوں کے نزدیک بزرگی کا معیار یہ ہے کہ وہ اکھڑ باتیں بکیں۔

ہمارے ہاں ایک شخص تھا اس سے اکثر سٹے والے پوچھنے جاتے تھے کہ ہم جیتیں گے یا ہاریں گے۔ وہ اس کے جواب میں بڑبڑانے لگتا۔ ان لوگوں نے کچھ اصطلاح مقرر کر رکھی تھی۔ اس اصطلاح کے موافق اس کی بکواس سے اپنا جواب سمجھ لیتے تھے۔

یہ حال ہے لوگوں کے اعتقاد کا کہ کوئی شخص صوفی بن جائے پھر اس کی ہر بات بزرگی ہو جاتی ہے۔ خاموش رہیں تو خاموش شاہ کہلائیں گے اور گالیاں دیں اور خلاف شریعت کریں تو مجذوب کہلائیں۔ ایک دفعہ بزرگی کی رجسٹری ہو جانی چاہیے پھر وہ ایسی پختہ ہو جاتی ہے جیسے بی بی تمیزہ کا وضو۔

مشہور ہے کہ بی بی تمیزہ نامی ایک فاحشہ عورت تھی۔ ایک بزرگ نے اسے نصیحت کی اور وضو کرا کے نماز پڑھوائی اور تاکید کر دی کہ ہمیشہ اسی طرح پڑھا کرنا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ایک مدت کے بعد وہ پھر ان کو کہیں ملی تو انہوں نے اس سے دریافت کیا کہ نماز پڑھا کرتی ہو۔ اس نے کہا کہ جی ہاں پڑھا کرتی ہوں انہوں نے کہا اور وضو بھی کیا کرتی ہو۔ اس نے جواب دیا کہ وضو اس روز آپ نے کرا نہیں دیا تھا۔

جیسا اس کا وضو ایسا پکا تھا کہ بدکاری سے ٹوٹا نہ پیشاب پاخانہ سے آج کل کی بزرگی بھی ایسی ہی پختہ ہے کہ اس میں کسی طرح خلل ہی نہیں آتا حتیٰ کہ اگر نماز بھی نہ پڑھیں تب بھی بزرگ ہیں۔ ایک شخص نے اپنے پیر کی نسبت کہا تھا جو کہ نماز نہیں پڑھتے تھے کہ وہ مکہ میں جا کر نماز پڑھا کرتے ہیں۔

غرض ایک مرتبہ جس سے اعتقاد ہو گیا پھر خلل نہیں پڑتا۔ ہاں ایک صورت میں خلل پڑتا ہے کہ شریعت کی بات بتلانے لگے۔ اگر ایسا کرے تو کہتے ہیں کہ میاں یہ تو نرا ملا ہے اور جو شریعت کے خلاف کرے تو اس کو سمندر کہتے ہیں کہ اس کو کوئی معصیت گندہ نہیں کر سکتی یہ تو سمندر ہے

سمندر میں چاہے کتنی ہی نجاست پڑ جائے اس کو ناپاک تھوڑا ہی کر سکتی ہے لیکن اگر سمندر پیشاب ہی کا ہو تو کیا تب بھی وہ پاک ہوگا یہ حضرات تو سر سے پیر تک گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایک پیر صاحب اپنی مریدنی کا گانا سن رہے تھے۔ گانا سنتے سنتے آپ کو مستی سوار ہوئی اور تخلیہ میں لے جا کر اس کے ساتھ منہ کالا کیا اور وہاں سے باہر آ کر فرماتے کیا ہیں کہ جب آ گیا جوش نہ رہا ہوش۔ مگر مریدوں کے نزدیک پھر بھی بزرگ ہی رہے۔ سبحان اللہ! کیا اچھی بزرگی ہے کہ چاہے کیسا ہی کام کر لیں مگر پھر بزرگ کے بزرگ۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے وہ درگت بنائی کہ یا تو اتباع ہی نہ تھا اگر ہوا تو بلا معیار ہوا۔ اول اتباع کی شکایت تھی پھر جب اتباع ہوا تو ایسا کہ اس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں سو وہ قصہ ہوا کہ۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

علماء کی کوتاہی

آج کل زیادہ لوگ دوسری ہی قسم کے پائے جاتے ہیں اور اول قسم کے لوگ کم ہیں مگر ان کا زیادہ اثر ہے سو واقع میں ان کا علاج حق تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اتباع ضروری ہے اور اتباع سے کیسے چارہ ہو سکتا ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے برابر تو کوئی عاقل نہیں کہ کفار بھی حضورؐ کے عاقل ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ میں ایک لطیفہ کہا کرتا ہوں کہ کفار مسلمانوں سے زیادہ حضور کی عقل کے قائل ہیں کیونکہ یہ تو سب کو مسلم ہے کہ دین اسلام کو بے انتہا ترقی ہوئی۔ مگر اس کے سبب میں اختلاف ہے کفار تو اس کا سبب حضور کی قوت کو مانتے ہیں اور مسلمان اس کا سبب حق تعالیٰ کی نصرت کو مانتے ہیں سو وہ حضور کو اتنا بڑا عاقل سمجھتے ہیں کہ جن کاموں کے لئے ہمارے نزدیک نصرت الٰہی کی ضرورت ہوئی وہ ان کے لئے حضور کی عقل کو کافی سمجھتے ہیں پس آپ کے عاقل ہونے میں کسی کو کچھ شبہ نہیں۔ مگر باوجود اس کے حضور کی کیفیت یہ تھی کہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ خیر البقاع (بہترین جگہ) کونسی جگہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں۔ جبرائیل سے پوچھ کر بتلاؤں گا۔ حضرت جبرئیل تشریف لائے تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بھی معلوم نہیں رب العالمین سے دریافت کر

کے بتلاؤں گا۔ پس وہ دریافت کرنے گئے اور جب واپس آئے تو فرمایا کہ اس مرتبہ مجھ کو حق تعالیٰ سے اتنا قرب ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کل ستر ہزار پردے درمیان میں رہ گئے تھے اور حق تعالیٰ نے فرمایا کہ خیر البقاع مساجد ہیں۔

سو دیکھا باوجود اس علم و فضل کے یہ فرما دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔ سو حضور کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات معلوم نہیں ہوتی بے تکلف فرما دیتے کہ مجھے نہیں معلوم اور آپ نے صرف اسی واقعہ میں ایسا نہیں کیا بلکہ اور بہت سے امور میں حضور نے ایسا ہی کیا ہے۔ خود خدا تعالیٰ حضورؐ کے حق میں فرماتے ہیں **وما انا من المتکلفین**۔ کہ آپ فرما دیجئے کہ میری یہ عادت نہیں کہ جو بات مجھ کو معلوم نہ ہو اس میں تکلف کروں۔ پس عالم کی یہ شان ہونی چاہئے کہ جو بات معلوم نہ ہو بے تکلف کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں۔ اب عوام کی تو کیا شکایت علماء بھی جہل کو چھپاتے ہیں۔

کانپور میں کسی نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ سور کا چمڑا پاک ہے یا ناپاک مسئلہ معلوم نہ تھا اس لئے ٹالنے کے لئے کہا کہ اس مسئلہ کی تمہیں کیا ضرورت ہے اس نے کہا کہ آخر مسئلوں کی مسلمان ہی کو تو ضرورت ہوتی ہے آپ نے جواب دیا کہ یہ بہت دور کا مسئلہ ہے تم کیا سمجھو گے اس نے کہا کہ آخر آپ بتائیے تو سہی۔ تب آپ نے کہا کہ قواعد سے تو پاک معلوم ہوتا ہے غرضیکہ اتنے حیلے حوالے کئے اور پھر مسئلہ غلط بتایا مگر یہ نہیں کہا گیا کہ مجھے نہیں معلوم اور بعضے غلط مسئلہ بتلانے کی جرات نہیں کرتے مگر سائل کو بے وقوف بنا کر اپنی جان بچاتے ہیں۔

چنانچہ ایک گلہری کنویں میں گر گئی تھی۔ ایک شخص اس مسئلے کے دریافت کرنے کے لئے ایک مولوی صاحب کے پاس گیا جو کہ بڑے معقولی تھے انہیں خود بھی اس کا حکم معلوم نہ تھا اور یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس لئے آپ نے شقیں نکالنی شروع کیں تا کہ وہ ساکت ہو جائے۔ پس فرمانے لگے کہ گلہری کے گرنے میں کئی احتمال ہیں یا تو خود گری ہے یا کسی نے اس کو گرایا ہے۔ اگر خود گری ہے تو دو احتمال سے خالی نہیں یا تو آہستہ چل کر گری ہے یا دوڑ کر۔ اور اگر کسی نے اس کو گرایا ہے تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں یا تو اس کو گرانے والا آدمی ہے یا جانور۔ اور ہر شق کا جدا حکم ہے (اتنا جھوٹ بولا) اب بتلاؤ کہ کونسی صورت واقع ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو معلوم نہیں انہوں نے کہا پھر مسئلہ ویسے ہی پوچھے چلے آئے جاؤ کام کرو۔

تو یہ بڑے منتقیوں کا حال ہے حالانکہ جناب باری تعالیٰ نے حضورؐ کے حق میں فرمایا

وما انا من المتکلفین (میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) میں نے بڑے بڑے علماء کے فتوے دیکھے ہیں کہ انہوں نے جواب میں لکھ دیا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں۔ اب علماء میں یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ کسی مسئلہ میں اپنی لاعلمی کا اظہار نہیں کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اب اگر کوئی کہتا بھی ہے کہ مجھے معلوم نہیں تو اس کی بات کا یقین نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے ایک مسئلہ دریافت کیا تھا میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں تو انہوں نے شکایت کی کہ مجھ سے خفا معلوم ہوتے ہیں جو ایسا کہہ دیا ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کو یہ مسئلہ معلوم نہ ہو تو گویا مولوی کو عالم الکل ہونا چاہئے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ کیفیت تھی کہ آپ باوجود اس علم و فضل کے فرمادیتے تھے کہ مجھے معلوم نہیں پھر اور کون عالم الکل ہوسکتا ہے غرض جب حضورؐ ہی اتباع کرتے تھے جیسے کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا تو پھر اور کون اتباع سے مستغنی ہوسکتا ہے اور آپ کو اتباع کا حکم بھی تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا آپ کو ارشاد ہے۔

ثم جعلنک علےٰ شریعة من الامر فاتبعها

(دین کے جس طریقہ پر ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کردیا ہے اسکا اتباع کیجئے)

دیکھئے یہاں شریعت کا لفظ صاف موجود ہے کہ شریعت کا اتباع کیجئے اس سے کس قدر جی خوش ہوتا ہے کہ مولوی شریعت کے اتباع کو کیسے نہ کہیں خود اللہ تعالیٰ شریعت کے اتباع کا حضورؐ کو حکم فرمارہے ہیں اور من الامر میں الف لام عہد کا ہے اس سے مراد دین ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کردیا ہے آپ اس کا اتباع کیے جایئے۔

حق تعالیٰ کا اتباع

پس جب اتنے بڑے صاحب علم کو ضرورت ہے اتباع شریعت کی تو ہم کو کیوں نہ ضرورت ہوگی تو ہر ایک کو اپنے بڑے کے اتباع کا حکم ہوا۔ حضور سے بڑھ کر تو کوئی نہیں تھا۔ تو آپ کو حکم ہوا اتباع وحی کا اور صحابہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لئے انہیں حکم ہوا کہ حضورؐ کا اتباع کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا **فاتبعونی یحببکم اللہ** سو میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھیں گے) اور علیکم بسنتی میری سنت کو اپنے اوپر لازم پکڑو)

پس حضور کو حکم ہے وحی کے اتباع کا اور صحابہؓ کو حکم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا۔ پھر علماء کو حکم ہے صحابہ کے اتباع کا اور نیچے آکر عوام کو حکم ہے علماء کے اتباع کا۔ چنانچہ ارشاد ہے

واتبع سبیل من اناب الی اور متبوع مستقل سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ پھر حضور کا اتباع کرنے کو جو کہا گیا ہے سو وہ اس لئے کہ حق تعالیٰ کا اتباع حضور ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید سمجھانے کا وعدہ حضور ہی سے کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **ثم ان علینا بیانه** (یعنی پھر اس کا بیان کرا دینا ہمارا ذمہ ہے) اور حضور فرماتے ہیں

علمنی ربی فاحسن تعلیمی (کشف الخفاء للعجلونی ۷۲:۱، کنز العمال ۱۳۸۹۵)

(میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی پس اچھی ہوئی میری تعیم)

تو آپ کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے ارشاد کے موافق خدا کے احکام کا اتباع کیا جائے یہی معنی خلفائے راشدین کے اتباع کے ہیں نہ یہ کہ خلفائے راشدین مستقل متبوع ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدین کو دین خوب سمجھایا۔ اس وجہ سے دین کا اتباع صحابہ کے فرمانے کے مطابق کرنا چاہئے اور چونکہ خدا تعالیٰ کے احکام کا اتباع صحابہ کے ارشاد کے موافق کیا جاتا ہے اسی لئے اس کو صحابہؓ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے کہ **سنت الخلفاء الراشدین** (سنن ابی داؤد کتاب السنۃ ب: ۵، سنن الترمذی: ۲۶۷۶) (خلفاء راشدین کی سنت) علیٰ ہذا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دین کو حضرات ائمہ مجتہدین نے لیا اور سمجھا اور ایسا سمجھا کہ ان کی تحقیقات کے موافق اتباع کرنا چاہئے مگر نہ اس وجہ سے کہ وہ متبوع مستقل ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اگر ہم خود اتباع کرتے تو بہت جگہ احکام الٰہی کے سمجھنے میں غلطی کرتے اور چونکہ ہم سے زائد سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی تحقیق کے موافق اتباع کرنا چاہئے۔

پس جب کہ ثابت ہو گیا کہ متبوع مستقل صرف حق تعالیٰ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ اور ائمہ مجتہدین کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کا اتباع ان کے ارشاد کے موافق کیا جائے تو حنفی کہنے اور محمدی کہنے میں جواز و عدم جواز میں کچھ فرق نہ ہوگا کیونکہ اگر اس نسبت سے اتباع بالاستقلال و بالذات مراد لیا جائے تب تو یہ نسبت دونوں میں صحیح نہ ہوگی کیونکہ ایسا اتباع تو خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اگر اس نسبت کے یہ معنی ہیں کہ ان کے ارشاد کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کیا جاتا ہے اس معنی کے اعتبار سے دونوں کی نسبت صحیح ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کی نسبت کو جائز کہا جائے اور دوسرے کی نسبت کو ناجائز پس معلوم ہو گیا کہ حنفی کہنے میں کوئی

قباحت نہیں اس نسبت کو کفر شرک کہنا غلطی ہے کیونکہ اس نسبت سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ متبوع مستقل ہیں بلکہ یہی معنی ہیں کہ ان کی تحقیق کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ہم کو ان کے متعلق اجمالاً یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں ورنہ بحیثیت مستقل متبوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے تو جیسی نسبت ہم ابوحنیفہ کی طرف کرتے ہیں ایسی سبیل من اناب الی۔ (جو لوگ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو) قل ھذا سبیلی ادعوا الی اللہ (آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے خدا تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں) سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسولؐ اور ان لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یصدون عن سبیل اللہ (وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں) میں سبیل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ تو یہ ایسا ہے کہ

عبارا تنا شتی و حسنک واحد (عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی ہے۔)

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　من انداز قدت را می شناسم

یعنی جو لباس چاہے پہن لے میں تو قد سے ہی پہچان لیتا ہوں یعنی جو قرآن کا عاشق ہے اس کو حدیث وفقہ میں بھی قرآن نظر آتا ہے۔

بات یہ ہے کہ جن کو محبت ہوتی ہے وہ محبوب کو ہر حالت میں پہچان لیتے ہیں اسی طرح جنہوں نے دین کو سمجھا ہے ان کے سامنے وہ قرآن کے لباس میں آئے یا حدیث کے لباس میں آئے وہ یہ شعر پڑھ دیتے ہیں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　من انداز قدت را می شناسم

کیونکہ لباس کے بدلنے سے ذی لباس تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔

مجھے ایک واقعہ سے بہت تعجب ہوا کہ میرے ہاں ایک مہمان آئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک شخص مقیم خانقاہ سے ان مہمان کو دکھلا کر یہ کہا کہ ان کو پہچان لو جب مکان سے کھانا آوے تو انہیں کھلا دینا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے جب کھانا آئے گا تو انہیں کھلا دوں گا تھوڑی دیر کے بعد کھانا آیا تو انہوں نے میرے پاس آ کر کہا کہ میں نے ان مہمان صاحب کو بہت ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہیں ملے۔ میں نے کہا یہ بیٹھے تو ہیں۔ انہوں

نے کہا کہ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھے ان کے پاس تو چادر نہیں ہے۔ میں نے کہا واقعی معقولی قاعدہ سے تو وہ نہیں رہے کیونکہ چادر اتر جانے سے تشخص بدل گیا۔ تو جیسے وہ مہمان ایک چادر کے اتر جانے سے بدل گئے ایسے ہی بعضوں نے حدیث کو اور دوسروں نے فقہ کو صرف عنوان بدلنے سے قرآن سے الگ کر دیا حالانکہ وہ سب اصل میں ایک چیز ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک مطب لکھنؤ کا کہلاتا ہے اور اور ایک دہلی کا۔ مگر ہیں دونوں طب یونانی۔ اسی طرح قرآن وحدیث اور فقہ گو فرعیات کے اندر مختلف ہیں مگر ہیں سب دین الٰہی۔ اگر فرعیات میں تھوڑا سا اختلاف ہو گیا تو کیا وہ دین الٰہی نہیں رہا جیسے طب یونانی اصول کا نام ہے۔ تو کیا لکھنؤ کا مطب اور دہلی کا مطب فرعیات کے اندر مختلف ہونے سے طب یونانی نہیں رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس کو سبیلی (میرا راستہ) فرمایا تھا اس کو یہاں سبیل من اناب الی (ان لوگوں کا راستہ جو میرے طرف متوجہ ہوئے) فرما رہے ہیں۔ پس سبیلی اور سبیل من اناب الی مصداق کے اعتبار سے ایک ہوئے۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا۔

ثم جعلنک علیٰ شریعة من الامر فاتبعها

دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کر دیا ہے آپ اسی کا اتباع کئے جایئے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں **اتبع ملته ابراهيم حنيفا** کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے۔ اب اس کے کیا معنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی شریعت محمدیہ کا ایک لقب یہ ہے ملت ابراہیم۔ یہ ہے عنوان کا اختلاف۔ باقی اصل اتباع احکام الٰہیہ کا ہے پھر اتباع علماء کے عنوان سے کیوں متوحش ہوتے ہیں۔

لباس کی اہمیت

مگر آج کل لوگ اس لفظ اتباع سے بے حد گھبراتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ علماء کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ مولویوں نے تو شریعت بڑھا لی ہے کہ ہر بات کو اس میں شامل کر لیا ہے حتیٰ کہ لباس کو بھی جزو مذہب بنا دیا ہے حالانکہ وہ ایک دنیوی امر ہے۔ پس ان کا اتباع کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ لباس کے مسئلہ میں تو ذرا بھی اخفاء نہیں۔ میں اس کی نظیر دیتا ہوں۔ دیکھیے

فوج کی وردی معین ہوتی ہے۔ ہم تو جب جانیں کہ انسپکٹر یا سپرنٹنڈنٹ معائنہ کے لئے آئیں اور کانسٹیبل وردی نہ پہنیں۔ تو یہ بھی وہی بات ہے بلکہ شریعت میں لباس کے اندر بہت گنجائش دی گئی ہے کہ جن لباسوں کی ممانعت کی ہے ان کی تعیین کردی ہے اور باقی سب کی اجازت دے دی ہے اور یہاں جس کی اجازت ہے اس کو متعین کردیا ہے اور باقی سب کی ممانعت کردی ہے۔ یہاں وردی کی تعیین میں کلام کرنے کی کسی کو جرات نہیں ہوگی مگر اللہ میاں چونکہ دنیا میں کچھ نہیں کہتے اس وجہ سے دین کے اندر ہر شخص کو جرات ہے۔ تو اب اگر ریل پر کچھ نہ کہا تو کیا اسٹیشن پر بھی کچھ نہ کہیں گے۔ اب بہت جلد اسٹیشن پر پہنچ جاؤ گے وہاں بے ٹکٹ بیٹھنے کی سزا ملے گی۔

فسوف ترى اذا انكشف الغبار　　　افرس تحت رجلك ام حمار

آنکھوں کے سامنے سے غبار ہٹنے دو۔ ہٹنے دو۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر۔

اس وقت حال معلوم ہو جائے گا جیسا کہ سپرنٹنڈنٹ معائنہ لکھ لے جائے تو ابھی گو اس نے کچھ نہیں کہا مگر جب پیشی ہوگی اس وقت پتہ چلے گا اور اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو نقد ہی چاہئے اور آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ تو ادھار ہے فی الحال تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اندر نقد مضرت بھی ہے کہ کفار جو کہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں ان کے ساتھ مشابہت ہے تو عند اللہ مبغوض ہونا کیا یہ مضرت نہیں ہے اور نقد ہے۔ اگر اس پر کہا جائے کہ صاحب کفار کی مشابہت سے کوئی کافر تو نہیں ہو جائیں گے اور اصل مضرت تو یہ ہے تو میں کہوں گا کہ جیسے کفار کی وضع سے کافر نہیں ہو جاتے اسی طرح بیگم صاحبہ کی وضع بنانے سے بیگم نہ بن جائیں گے پھر ہم تو جب جانیں کہ بیگم صاحبہ کی وضع بنالیں اور صرف ایک گھنٹہ کے لئے آ کر کرسی پر جلوہ افروز ہو جائیں۔ افسوس کہ یہ عذر یہاں تو مانع ہے اور وہاں نہیں۔

بس حضرت بالکل رسم کا اتباع ہے ورنہ جو خرابی عورت کا لباس پہننے میں ہے وہی کفار کا لباس پہننے میں ہے۔ تو کفار کی وضع اختیار کرنے میں یہ خرابی نقد ہے اس کا کوئی معقول جواب دیں۔ سو ان کے پاس معقول جواب تو کچھ بھی نہیں اور یوں ہر بات میں لا نسلم (ہم نہیں تسلیم کرتے) کہنا تو طوطے کی طرح دریں چہ شک (اس میں کیا شک) کہنا ہے۔ کوئی معقول جواب دیں۔ غرض وضع کے اندر مضرت ادھار ہو یا نقد ہو اس کے متعلق بھی احکام شرعیہ ہیں۔

دین کا اختصار

مگر اب لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ شریعت تو مختصر تھی اور مختصر بھی اتنی کہ من قال لا الله الا الله دخل الجنة (یعنی جس نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا جنت میں داخل ہو گیا) صرف لا الہ الا اللہ ہی کہنا کافی تھا۔ حتیٰ کہ بعض تعلیم یافتوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس میں محمد رسول اللہ کے قائل ہونے کی بھی قید نہیں۔ پس منکر رسالت کو بھی نجات ہو گی۔ ایک صاحب اس سے بھی ترقی کر کے کہتے ہیں کہ منکر توحید کو بھی نجات ہو گی کیونکہ توحید امر طبعی ہے اور امر طبعی کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا۔ بس جو شخص زبان سے اس کا انکار کرتا ہے حقیقۃ اس کا قائل ہے۔ اس لئے اس کی بھی نجات ہو جائے گی۔ گویا لا الہ الا اللہ بھی نہ رہا شریعت سے یہاں تک استثناء کی کہ اس کے تمام اجزاء کو مستثنیٰ کر لیا۔ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کے برابر ہو گیا اور مستثنیٰ منہ کچھ بھی نہ رہا۔ معاذ اللہ اس زیادتی کی کچھ انتہا ہے۔ صاحبو! اب ہماری وہ حالت ہو گئی ہے کہ ہم لوگوں کی کوئی بات بھی اصل حالت پر نہ رہی کسی کا شعر ہے۔

اے بسرا پردہ یثرب بخواب   خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

اے حضورؐ ذرا خواب راحت سے اٹھئے تو سہی۔ دیکھئے کہ آپ کی امت کس بلا میں گرفتار ہے۔

تمام عالم میں ایک طوفان برپا ہے ظهر الفساد فی البر و البحر (خشکی و تری سب میں فساد برپا ہے) اور یہ ایسا اختصار ہے جیسا کہ ایک بڑھیا نے ایک باز کو پکڑ لیا تھا اور اس کے ٹیڑھے ناخن اور چونچ دیکھ کر اس کو بہت ترس آیا کہ یہ ایسے ناخنوں سے چلتا کیوں کر ہو گا اور اس چونچ سے دانہ کیسے چگتا ہو گا۔ پس اس نے اس کو مضر سمجھ کر کتر دیا۔

جیسے اس نے باز کا اختصار کیا تھا اسی طرح ہمارے بھائی دین کا اختصار کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولویوں نے شریعت کو پھیلا بہت دیا۔ تو سمجھ لو کہ شریعت مولویوں کی پھیلائی ہوئی نہیں ہے۔ ہاں اس اعتبار سے منسوب ہے مولویوں کی طرف کہ جو خدا اور رسول کے کلام کا مطلب تھا۔ انہوں نے اس کی تفسیر کر دی ہے۔ اس لئے اس حکم کو ان کا فتویٰ کہہ دیا جاتا ہے پس ان کی طرف اس کی نسبت ایسی ہے جیسی کہ اس آیت میں کہ و اتبع ملة ابراهيم حنيفا (ملت ابراہیمی کا اتباع کرو) باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل ہیں مگر پھر بھی کہا

جاتا ہے کہ واتبع ملة ابراهيم (آپ دین ابراہیم کا اتباع کیجئے) اگر اس کے معنی یہ ہوں کہ جو ان کا طریقہ ہے اس کا اتباع کیجئے تب تو یہ بڑا سخت مضمون ہے کیونکہ یہ تو امتی کا کام ہے کہ دوسروں کے طریقہ کا اتباع کرے نہ کہ نبی کا۔ تو بے تکلف توجیہ اس کی اس تقریر سے سمجھ میں آجائے گی کہ ملت ابراہیم اس ملت الہیہ کا نام ہے اس کے بہت سے لقب ہیں۔ اس میں سے ایک لقب ملت ابراہیم بھی ہے۔ چونکہ یہ دونوں شریعتیں فروع میں بھی بکثرت متفق ہیں۔ اس مناسبت سے اس ملت کا نام ملت ابراہیم رکھا گیا ہے۔ تو واقع میں ملت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع نہیں ہے بلکہ ملت الہیہ کا اتباع ہے جو کہ ایک مناسبت سے ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کردی گئی تو جیسے یہاں پر ملت الہیہ کو ملت ابراہیم کہہ دیا گیا ہے اسی طرح اگر اس دین کو مذہب شافعی یا مذہب ابوحنیفہ یا قول قاضی خاں کہہ دیا جاوے تو کیا مضائقہ ہے۔

اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو مولوی صاحب کا فتویٰ ہے کوئی خدا اور رسول کا تو حکم نہیں ہے حالانکہ وہ مولوی صاحب کا فتویٰ نہیں بلکہ خدا کا مسئلہ ہے مولوی صاحب نے اس کو سمجھ کر بتلا دیا ہے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ القیاس مظہر لا مثبت (یعنی قیاس حکم شرعی کو ظاہر کرنے والا ہے اس کو ثابت کرنے والا نہیں) پس اب بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم علماء ہی کا اتباع لازم ہوا کیا خوب کہا ہے۔

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ　　　چارہ نبود در مقامش جز چراغ

یعنی جب آفتاب چھپ گیا تو اب سوائے چراغ کے اور کیا علاج ہوسکتا ہے تو جب صاحب وحی ہماری نظروں سے غائب ہوگئے تو سوائے اتباع علماء کے اور کیا چارہ ہوسکتا ہے۔

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب　　　بوئے گل را از کہ جوئم از گلاب

(جب پھولوں کا زمانہ رخصت ہوا اور باغ پر خزاں آگئی تو میں پھول کی خوشبو گلاب میں تلاش کرتا ہوں)

یہ شعر بجمیع اجزائہ (اپنے تمام اجزاء کے اعتبار سے) تو یہاں منطبق نہیں ہے کیونکہ گلستان شریعت بحمداللہ ویسا ہی ہرا بھرا ہے مگر مطلب یہ ہے کہ اب چونکہ صاحب وحی تشریف نہیں رکھتے۔ اس لئے اب دین کو ان لوگوں سے حاصل کرنا چاہئے جن کے اندر صاحب وحی کا فیض موجود ہے کیونکہ اس وقت بھی جو کچھ فیوض ہیں وہ حضور ہی کے تو ہیں جو مجتہدین اور علماء کو حضورؐ سے حاصل ہوئے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ پس بغیر ان کا

اتباع کیے ان کا چارہ نہیں اور اصل میں یہ علماء کا اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول کا اتباع ہے جس کا طریقہ ان سے معلوم کر لیا جاتا ہے اور گو یہ سبیل من اناب (راستہ ان لوگوں کا جو منیب ہیں) کہلاتا ہے مگر واقع میں سبیل اللہ اور سبیل رسول ہے علماء چونکہ اسے ہم کو سمجھا دیتے ہیں اسی معنی کر وہ واسطہ ہیں صرف اس مناسبت سے ان کی طرف منسوب کر کے سبیل من اناب کہا گیا۔

خلاصہ یہ کہ تباع کے مخاطب تو وہ لوگ تھے جو سرے اتباع ہی کو ضروری ہی نہیں سمجھتے اور کسی کا اتباع ہی نہیں کرتے۔ اس سے تو ان لوگوں کی اصلاح کی گئی ہے۔

معیار اتباع

اب رہ گئے وہ لوگ جو اتباع تو کرتے ہیں مگر کوئی معیار صحیح نہیں مقرر کرتے بلکہ ہر کس و ناکس کا اتباع کرنے لگتے ہیں سو آگے ان کی اصلاح کرتے ہیں کہ سبیل من اناب (ان لوگوں کے راستہ کا جو منیب ہیں) کا اتباع کرو اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھیے کہ واتبع من اناب الی (ان لوگوں کا اتباع جو میری طرف متوجہ ہوئے) نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ایہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں۔ اس لئے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا واتبع سبیل من اناب الی (ان لوگوں کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) کہ وہ خود متبوع نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے وہ ہے متبوع۔ یہ ہے اتباع کا معیار کہ جس شخص کا اتباع کرو اس کو دیکھ لو وہ صاحب انابت ہے یا نہیں۔ جو صاحب انابت ہو اس کا اتباع کرو سبحان اللہ! کیا عجیب معیار ہے۔ پس اتباع اسی معیار کے موافق کرنا چاہئے اور سب معیار چھوڑ دینے چاہئیں۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ (اللہ کی طرف توجہ کرنے) کو معیار بنایا۔ اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو ماننے۔ چنانچہ فرماتے ہیں یهدی الیه من ینیب (یعنی جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت کرتے ہیں) کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے کہ اس کے افعال درست ہوں۔ پس اب اناب ں سے مراد وہ شخص ہوا جو کہ باعمل ہو اور عمل بدوں علم کے ہو نہیں سکتا۔ تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو

کہ جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہو بس دو چیزیں اصل ٹھہریں۔

ایک علم دین...... اور...... ایک عمل دین......

اور اب تک جتنے معیار لوگوں نے مقرر کر رکھے ہیں ان میں نہ عمل ہے نہ علم اور علم و عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے وہ توجہ الی اللہ ہے۔ پس سب سے اول تو علم ہونا چاہئے اور پھر اس پر یہ اثر مرتب ہونا چاہئے کہ عمل اور توجہ الی اللہ ہو۔ سبحان اللہ! کیا جامع کلام ہے کہ ایک اناب کے لفظ میں تینوں امور (علم و عمل و توجہ الی اللہ) کی طرف اشارہ فرما دیا۔ پس اب معلوم ہوا کہ کامل اور اتباع کے قابل وہ ہوگا جس میں یہ تینوں باتیں ہوں۔ یہ میں اس لئے بیان کرتا ہوں کہ اس وقت لوگوں کو قابل اتباع اور کاملین کی پہچان نہیں رہی کہ ہر کس و ناکس کے معتقد ہو جاتے ہیں اور صرف معتقد ہی نہیں بلکہ غلام بننے کو تیار ہوتے ہیں خواہ کوئی بھی آ جائے یہ ان کے مرید ہو جائیں گے چونکہ آج کل لوگ اس طرح آنکھ بند کر کے ہر ایک کے متبع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اتباع کا ایک معیار ہونا چاہئے اور صحیح معیار اس کا اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ جس میں تین چیزیں (علم اور عمل اور توجہ الی اللہ) ہوں وہ ہے قابل متبوع ہونے کے بس اس کا اتباع کیجئے۔ پس متبوع میں تین چیزیں دیکھئے ایک علم دوسرے عمل کا کسی گناہ کبیرہ میں مبتلا نہ ہو اور صغیرہ پر اصرار نہ ہو اور تیسرے الی اللہ جس کی شناخت یہ ہے کہ اس کی صحبت میں ایک خاص برکت ہو اس کی صحبت حق تعالیٰ کی مذکر (دلانے والی) ہو۔

پس جس شخص میں یہ تمام خوبیاں ہوں وہ ہے اس قابل کہ اس کے طریقہ کا اتباع کیا جائے۔ خواہ وہ طریقہ خود اس کی زبان سے بلا واسطہ پہنچے یا کسی معتبر واسطہ سے کیونکہ اتباع کیا جاتا ہے علماء مجتہدین کے طریقہ کا اور تمام علماء مجتہد ہوتے نہیں پس وہ جو علماء کہ مجتہد نہیں ہیں وہ بھی چونکہ مجتہدین ہی کی تحقیقات بیان کرتے ہیں اس لئے ان کا اتباع بھی ضروری ہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجتہدین کا اتباع جو کیا جاتا ہے ان میں درویشی کا رنگ کہاں تھا جس کو انابت سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے۔

آں طرف کہ عشق مے فزود درد بو حنیفہ شافعی درسے نکرد

یعنی جس چیز سے عشق اور درد کو ترقی ہوتی ہے اس کا ابو حنیفہ اور شافعی نے کبھی درس نہیں دیا اگر یہ مولانا کا شعر ہے مجھ کو اس وقت یاد نہیں۔ تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ ان کے

تصوف کا لون جدا تھا کہ وہ زیادہ تر عبادات اور معاملات کی اصلاح میں مشغول تھے۔ ان متعارف کیفیات کا وہ اہتمام نہ فرماتے تھے۔

چنانچہ امام ابو یوسف کا قصہ ہے کہ وہ مرض وفات میں تھے۔ ایک شخص ان کی عیادت کو آئے۔ تو دیکھا آپ کچھ سوچ رہے تھے انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ فرمایا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ رمی جمار راکباً (سوار ہو کر) افضل ہے یا ماشیاً (پیدل ہو کر) تم بتلاؤ کہ ان میں کونسی افضل ہے۔ انہوں نے کہا کہ ماشیاً افضل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اخطات کہ تم نے غلطی کی۔ پھر انہوں نے کہا کہ راکباً افضل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اخطات کہ یہ بھی صحیح نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے کہ جس رمی کے بعد اور رمی ہو وہ تو ماشیاً افضل ہے اور جس رمی کے بعد رمی نہ ہو تو وہ راکباً افضل ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس کے بعد یہ شخص وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازہ تک پہنچے تھے کہ گھر سے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ معلوم ہوا کہ آپ کی وفات ہو گئی اور یہ شخص حیران رہ گئے کہ اللہ اکبر ان حضرات کو علم دین سے کس قدر محبت ہے کہ مرتے دم تک اسی میں مشغول رہتے ہیں۔

سو ان حضرات کے تصوف کا یہ رنگ تھا۔ امام محمد سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے تصوف میں کوئی کتاب نہیں لکھی؟ فرمایا کہ کتاب البیوع ہے نہیں اس سے معاملات درست ہوتے ہیں اور اکل حلال میسر ہوتا ہے اور اکل حلال سے باطن میں نور پیدا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ معاملات وغیرہ کا درست بھی ضروری ہے اب لوگوں کے نزدیک معاملات تصوف میں داخل ہی نہیں رہے آج کل جو اپنے کو صوفی کہتے ہیں کہ ان کے نہ معاملات درست نہ اخلاق۔ غرض یہ کہ اصل مقصود انابت ہے خواہ لون اس کا کوئی ہو۔ پس جن چیزوں کو اس کے حصول میں داخل ہوگا وہ تو مقصود ہوں گی اور جن چیزوں کو اس میں دخل نہ ہوگا وہ مقصود نہ ہوں گی۔

کشف و کرامات کی حقیقت

اب دیکھنا چاہئے کہ کشف و کرامت وغیرہ جس کو آج کل لوگ مقصود سمجھتے ہیں یہ چیزیں انابت کے اندر کچھ دخل رکھتی ہیں یا نہیں۔ اس میں حقیقت بتلاتا ہوں سنیئے! انابت کے لئے قرب ضروری ہے پس جس بات سے قرب ہو وہ انابت میں دخل رکھتی ہے اور جس بات سے کچھ قرب نہ ہو اس کو انابت میں کچھ دخل نہیں کیونکہ ان سے کچھ قرب نہیں ہوتا اور

اگر تین مرتبہ سبحان اللہ کہے تو اس سے قرب ہوتا ہے پس ہزار کشف و کرامت سے تین مرتبہ سبحان اللہ کہنا افضل ہے حضرت جن اعمال کو آپ حقیر سمجھتے ہیں وہی اصل مقصود ہیں۔

اس وقت بعض اہل طریقہ کو بھی یہ غلطی ہوئی ہے کہ وہ حالات اور کیفیات کو اصل مقصود سمجھ گئے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ مقصود بالذات یہی نماز روزہ ہیں۔ کیفیات وغیرہ تو انہیں نماز روزہ کی درستی کے لئے ہیں۔ اعمال اور کیفیت کی بالکل ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک ہوتی ہے غذا اور ایک ہوتی ہے دوا۔ مگر مقصود غذا ہوتی ہے اور دوا صرف اس لئے ہوتی ہے کہ حالت مرض میں چونکہ غذا جزو بدن نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے غذا کے جزو بدن ہونے کی قابلیت ہوجائے پس دوا مقصود نہیں ہوتی۔

سو جیسے اصل مقصود غذا ہے اور دوا محض معین ہے۔ اسی طرح یہاں اصل مقصود نماز روزہ ہے اور کیفیت بطور دوا کے ہیں کہ ان کو مجاہدات سے محض اس لئے حاصل کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ نماز روزہ کی قابلیت پیدا ہوجاوے جیسے کہ دوائی کھائی جاتی ہے کہ اس سے ہم میں اتنی قابلیت ہوجاوے کہ غذا جزو بدن بنے۔ پس یہ مجاہدات معالجات کے درجہ میں ہوئے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ نماز کی قابلیت تو کیفیات پر موقوف نہیں ہے جن لوگوں نے مجاہدات نہیں کئے اور ان کو کیفیات حاصل نہیں ہوئیں۔ نماز پڑھتے ہیں تو بات اصل میں یہ ہے کہ نماز کے بھی حقوق ہیں۔ اگر یہ نماز پڑھتے ہیں مگر جو اس کے حقوق ہیں وہ ان سے ادا نہیں ہوتے۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **مقبلاً علیها بقلبه**

پس نماز کی طرف دل متوجہ ہو۔ پس نماز کے اندر خشوع اور خضوع بھی ہونا ضروری ہے اور فرماتے ہیں **ان تعبدالله كانك تراه** (الصحیح البخاری ۱۴۴۲:۶ السنن الکبری للبیہقی ۲۰۳۰۱) کہ حق تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا خدا کو دیکھتے ہو اس کا مطلب نہیں کہ خیال کرلیا کرو کہ خدا کو دیکھ رہے ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی عبادت کرو جیسے کہ اگر خدا کو دیکھتے ہوتے تو اس وقت عبادت کس طرح کرتے اور ظاہر ہے کہ اس وقت نماز کے اندر کسی بات کی فروگذاشت نہ کرتے۔ حضور قلب بھی ہوتا ہے اور خشوع بھی تعدیل ارکان بھی ہوتی۔ پس اب بھی اس طرح کی عبادت کرو اور **فان لم تكن تراه فانه يراك** یہ اس کی علت ہے۔ یعنی ایسے عبادت اس لئے ضروری ہے کہ گو تم خدا کو نہیں دیکھ سکتے مگر خدا تو تم کو دیکھتا ہے اور اس کا مقتضا بھی اسی اہتمام کے ساتھ عبادت کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر تم

خداتعالی کو دیکھتے ہو تو جیسے اس کا یہ مقتضا تھا کہ نماز کے اندر کوئی فروگذاشت نہ ہو اسی طرح اس کا بھی یہی مقتضا ہے۔ لہذا اب بھی ویسی نماز پڑھنی چاہیے جیسی اس صورت میں پڑھتے۔

پس یہ معنی ہیں اس حدیث کے اور اسی لئے اس کا نام احسان ہے یعنی نیکو کردن عبادت (یعنی عبادت کو اچھی طرح ادا کرنا) پس مطلوب ایسی عبادت ہے نماز ہو تو ایسی قرآن مجید کی تلاوت ہو تو ایسی ہو۔ مطلوب تو عبادت کا یہ درجہ ہے اور یہ درجہ ہم کو حاصل نہیں ہے۔ پس اس کو حاصل کرنا ضروری ہے اور تحصیل کے طریق مختلف ہیں تو جن کی استعداد کامل ہے ان کی تو ذرا توجہ بھی کافی ہے اور جن کی استعداد ضعیف ہے ان کو صرف توجہ سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی بعض دفعہ تو خود حدیث ہی کے لئے یہ توجہ ناکافی ہوتی ہے پس ضرورت اس کی ہوئی کہ توجہ کو یکسوئی کا عادی کریں پھر اس سے نماز میں کام لیں۔ صحابہ کی استعداد چونکہ کامل تھی۔ ان کو محض توجہ کافی تھی اور ہماری استعداد میں ہوا ضعف اور ہم کو ہوا حضور سے بعد۔ اس لئے اب ہم کو ضرورت ہوئی اس بات کی کہ کچھ شغل کریں تاکہ توجہ میں یکسوئی حاصل ہو جائے پھر اس سے عبادت میں کام لیں تاکہ جیسی عبادت مطلوب ہے ویسی ہی ادا ہو۔ اس میں لوگوں کو آج کل بڑی غلطیاں واقع ہو رہی ہیں کہ ناواقف لوگ مجاہدات سے کیفیات مکاشفات ہی کو اصلی مقصود سمجھتے ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہو کر لذت حاصل کرتے ہیں۔

صاحبو! یہ بہت خطرناک بات ہے اس سے غلطی میں پڑ جانے کا بہت قوی شبہ ہے کیونکہ کیفیات تو اہل باطل کو بھی ہو جاتی ہے رہے مکاشفات مثلاً الوان واصوات سو یہ بہت کم ملکوتی ہوتے ہیں بلکہ اکثر متخیلہ کی صورتیں ہیں۔ اور اگر ملکوتی بھی ہوئیں تو وہ ہے کیا چیز وہ بھی مخلوق ہی تو ہے پس جب آپ اس کے تماشہ میں لگ گئے اور اس سے لذت حاصل کرنے لگے۔ تو آپ نے ایک مخلوق کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کیا تو ہر حال میں توجہ الی المخلوق (مخلوق کی طرف توجہ) ہی رہی اور مقصود ہے توجہ الی الخالق (اللہ تعالی کی طرف توجہ کرنا) پس مقصود سے اب بھی دور ہی رہے۔

اسی لئے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ حجابات نورانی حجابات ظلمانی سے زیادہ شدید ہیں کیونکہ طالب ان کو مقصود سمجھ لیتا ہے اس وجہ سے ان میں مشغول رہ کر حق تعالی سے محجوب ہو جاتا ہے اور حجابات ظلمانی کو ہر شخص مذموم سمجھتا ہے اس لئے ان کے ازالہ کی فکر

کرتا ہے۔ پس چونکہ حجابات نورانی بہت اشد ہیں۔ اسی لئے ہمارے ہاں اس کی نفی کی تعلیم ہے۔ سالک کو تو یہ حال ہونا چاہئے کہ۔

اے برادر بے نہایت درگہے ست
ہر چہ بروے می رسی بروی مایست

اے بھائی! بے نہایت درگاہ ہے جس مقام پر پہنچو وہاں مت ٹھہرو بلکہ آگے بڑھو۔

خلاصہ یہ کہ اشغال سے مقصود یہی ہے کہ طبیعت کو ان کے ذریعہ سے یکسوئی کی عادت ہو اور پھر اس یکسوئی سے عبادت میں کام لیں۔ پس یہ دوا ہیں غذا نہیں۔ جیسے دوا اصلاح مزاج کے لئے ہوتی ہے اسی طرح یہ اشغال اصلاح حال و اصلاح طبیعت کے لئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ منتہی اشغال کو ترک کر دیتا ہے۔ البتہ ان حالات کے بقاء کے لئے کسی قدر شغل کرتا رہے تو وہ دوسری بات ہے۔ باقی سب اشغال چھوٹ جاتے ہیں غالب ذکر رہ جاتا ہے تو یہ ہے حقیقت اشغال اور کیفیات کی کہ یہ سب توجہ الی اللہ کے اسباب ہیں اور قرب میں خود ان کو کچھ دخل نہیں بلکہ اس میں دخل ہے اعمال کو جن سے نسبت مع اللہ حاصل ہو۔ جس سے حق تعالیٰ کے احکام بے تکلف ادا ہونے لگیں اور ذکر بے تکلف ہونے لگے اور اس ادا احکام اور ذکر سے پھر ایک اور شے مقصود ہے یعنی رضاء حق۔ پس جس چیز کو رضا میں دخل ہے وہ تو جزو تصوف ہے اور جس چیز کو اس میں دخل نہیں وہ تصوف سے خارج ہے اور جو اس میں مخل ہو وہ تصوف کے منافی ہے۔

اب تو یہ غضب ہے کہ بعضے لوگ معاصی کو بھی مضر اور تصوف کے منافی نہیں سمجھتے بلکہ شغل سے جو ایک حرارت پیدا ہو جاتی ہے اسی کو کافی سمجھتے ہیں گو اعمال کیسے ہی ہوں۔ حالانکہ صرف اس حرارت کے حاصل ہونے سے مقصود تک رسائی نہیں ہو جاتی۔ ابھی تو مقصود سے اتنی دور ہے جیسے مکہ جانے والا بمبئی پہنچا ہو تو یہ بمبئی ہے مکہ نہیں ہے مکہ تو ابھی بہت دور ہے۔ پس اب اس حرارت و ذوق سے طاعات میں کام لینا چاہئے تب کہیں مقصود تک رسائی ہوگی اب بعض لوگ صرف اسی کیفیت کو بزرگی سمجھتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اس کو بزرگی سمجھنا بہت خطرناک امر ہے۔ کیونکہ جس شخص کا ایسا اعتقاد ہوگا اس نے اگر حرام غذا کھائی یا کسی پر ظلم کیا تو بزرگی واقع میں تو ہوگئی مگر یہ شخص ابھی تک دھوکہ میں ہے کہ اپنے کو ویسا ہی سمجھے ہوئے ہے جیسا کہ پہلے تھا کیونکہ اس کے نزدیک بزرگی نام ہے کیفیات کا اور معاصی سے کیفیات زائل نہیں ہوتیں۔ رات کو ذکر کرنے بیٹھے تو پھر غوطہ سا لگ گیا۔ پس جب اس کی پہلی کیفیت زائل نہ ہوئی تو یہ سمجھے کہ معاصی بزرگی میں کچھ مخل نہیں۔ اس لئے

بار بار کہتا ہوں کہ جو چیزیں انابت میں مخل ہیں وہ بزرگی کے بھی منافی ہیں۔

منیب کا طریقہ

غرض یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس میں انابت دیکھو اس کے طریقہ کا اتباع کرو اور وہ طریقہ واقع میں خدا اور رسول کا طریقہ ہے پھر اس کو منیب کا طریقہ جو کہا گیا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی کتاب۔ تو کتاب حقیقۃ تو اس کی نہیں ہوئی کیونکہ اس کے تمام مضامین اس شخص کے نہیں ہوتے۔ مثلاً صحیح بخاری کہ اس کے اندر جو حدیثیں ہیں وہ امام بخاری کی تو نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ پس کتاب کو اس شخص کی صرف اس معنی کر کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کو جمع کیا ہے اسی طرح یہ طریقہ حقیقت کے اعتبار سے تو حق تعالیٰ کا ہے اور منیب کا صرف اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ اس کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ پس اتباع کا یہ معیار ہے اب جس سے عقیدت پیدا کرتے ہو یہ دیکھ لیا کرو کہ وہ اس معیار کے مطابق ہے یا نہیں۔

اس سے ایک دوسری بات بھی ثابت ہوئی کہ دین کس قدر سہل ہے دیکھئے حق تعالیٰ نے ہم کو کیسا آسان معیار بتلایا ہے۔ اب آج کل لوگ چونکہ اس معیار سے کام نہیں لیتے اور نئے نئے معیار تراشتے ہیں اس لئے بہت پریشان ہوتے ہیں اور ہزاروں فرقے ہوتے جاتے ہیں۔ کوئی اہل قرآن ہے کوئی عامل بالحدیث ہے۔ بعض نے پنجاب میں نبوت ہی کا دعویٰ کر دیا۔ اب اگر معیار صحیح نہ ہو تو کتنی پریشانی ہے۔ چنانچہ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جنہوں نے اپنی تھوڑی عمر میں مذاہب منسوبہ الی الاسلام (اسلام کی طرف مذاہب منسوب) میں کئی کئی مذہب اختیار کئے۔ بعض نے اسلام کو چھوڑ کر دوسرے خارستان کی بھی زیارت کی کہ گویا **یصبح مومنا ویمسی کافرا**۔ (سنن الترمذی ۲۱۹۷، المستدرک للحاکم ۳: ۵۲۵، ۵۳۱) (صبح کرتے ہیں مومن ہو کر اور شام کرتے ہیں کافر ہو کر) کے مصداق ہو گئے اور ان کی وہ حالت ہو گئی کہ۔

بیزارم ازاں کہنہ خدائے کہ تو داری
ہر روز مرا تازہ خدائے دگریست

یعنی تمہارے قدیمی خدا سے میں بیزار ہوں مجھ کو ہر روز نئے خدا کی ضرورت ہے۔

آج کل لوگوں کی اس تلون مزاجی کی وجہ سے واللہ اتنی بدگمانی بڑھ گئی ہے کہ اگر کوئی شخص مرتد ہونے کے بعد پھر مسلمان ہو جائے تب بھی اس کے اسلام پر اطمینان نہیں ہوتا مگر خیر یہ شریعت کی خوبی ہے کہ وہ ہر مرتبہ ان کے اسلام کو قبول کر لیتی ہے۔

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ.....!

(یعنی سو مرتبہ اگر توبہ توڑ چکے ہو تو پھر آ جاؤ) شریعت کا مسئلہ ہے کہ چاہے کیسا ہی شخص ہو جب وہ اسلام میں داخل ہونا چاہے اس کا اسلام قبول کر لیا جائے گا کیونکہ شریعت کی یہ تعلیم ہے اس لئے مسلمانوں کی قوم بہت بھولی ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ کسی نے کیسی ہی برائی کی ہو مگر جب وہ عذر کرتا ہے یہ فوراً اس کو قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ان میں کرم بہت ہوتا ہے۔ حدیث ہے **المومن غر کریم** (سنن ابی داؤد: ۴۷۹۰، سنن الترمذی، ۱۹۶۴) (مومن کریم بھولا ہوتا ہے) پس کرم کی وجہ سے ہر ایک کی بات مان لیتے ہیں اور دھوکہ میں آ جاتے ہیں سو کرم علت ہے بھولے ہونے کی مسلمانوں میں سب جگہ ایسا ہی دیکھ لیجئے کہ جو ان سے کہے کہ میں تمہارا دوست ہوں بس یہ اس کو دوست سمجھنے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ دوستی کا برتاؤ کرنے لگتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ترقی متعارف ان کو نہیں ہوتی کیونکہ اس کے لئے چالاکی ضروری ہے غرض یہ شریعت کی خوبی ہے کہ ایسوں کا اسلام قبول کر لیتی ہے۔

حاصل یہ کہ بعضوں نے کفر کی بھی سیر کی۔ سو ان سب خرابیوں کی وجہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلائے ہوئے معیار کو بھول گئے۔ اگر من اناب الی کی معیار کو مقرر کر لیتے تو ہرگز یہ خرابیاں نہ ہوتیں۔

متبوع کی شناخت

بعضے اتباع تو اہل انابت ہی کا کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ یہ خود رائی کرتے ہیں کہ ان منیبین میں سے کسی ایک کو اتباع کے لئے متعین نہیں کرتے جس مسئلہ میں ان میں سے جس کا چاہا اتباع کر لیا۔ یہ خود رائی بھی بہت مضر ہے۔ مناسب یہ ہے کہ زندہ لوگوں میں سے ایک شخص کو اپنی متبوعیت کے لئے پسند کر لیجئے اور میں یہ بہت فائدہ کی بات بتلاتا ہوں۔ تجربہ سے معلوم ہے کہ سلامتی اسی کے اندر ہے گو اہل انابت متعدد ہوں مگر متبوع ان میں سے ایک کو بنا لیا جائے اور اسی کے سبیل کا اتباع کیا جائے۔

پس اب ان میں سے ایک کو ترجیح دینے کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے۔ سو وہ یہ ہے کہ جس کا انابت زیادہ ہو یعنی یہ دیکھ لیجئے کہ اس کا علم کیسا ہے تقویٰ کی کیا حالت ہے۔ پھر دیکھئے کہ نسبت مع اللہ کیسی ہے اور یہ معلوم ہوگا کہ اس کی صحبت میں رہنے سے یعنی اگر اس کے پاس بیٹھنے سے دنیا کی محبت کم ہو تو سمجھو کہ اس کی نسبت کامل ہے اور وہ متبوع بنانے کے قابل ہے اور اگر اپنی استعداد ضعیف ہونے کی وجہ سے اس کی صحبت کا اپنے اندر یہ اثر محسوس نہ ہو کہ دنیا کی محبت کھو دو تو

صرف اتنی بات سے بدگمان نہ ہو جائے کیونکہ استعداد ضعیف ہونے کی وجہ سے اثر بھی بہت ضعیف ہوتا ہے۔ جس کا ابھی احساس نہیں ہوتا۔ سالہا سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کیا اثر ہوا۔ پس جب اپنے اندر اثر محسوس نہ ہو تو اس کے پاس کے رہنے والوں کو دیکھے کہ ان لوگوں کی حالت کیسی ہے۔ اگر ان میں سے اکثر کی حالت اچھی دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ شخص کامل ہے۔

حضرت یہ تجربہ ہوا ہے کہ جو اہل باطل ہوتا ہے اس کے مخصوصین اور مقربین نہایت بدتر حالت میں ہوتے ہیں ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ لوگ ان کو بزرگ سمجھتے تھے اور ان سے پانی پڑھوا کر لے جاتے تھے ان کے مخصوصین کی یہ حالت تھی کہ موٹے موٹے دانوں کی تسبیح لوگوں کو دکھلانے کے لئے پاس رکھتے تھے اور نماز روزہ کچھ نہ کرتے تھے۔

اہل باطن کے پاس رہنے والوں میں اکثر کی حالت اچھی ہو تو سمجھ لو کہ ضرور وہ شخص کامل ہے۔ اس کو متبوع بنا لو اور ہرگز نہ چھوڑو اور اگر اس کے مخصوصین میں اکثر کی حالت خراب دیکھو تو سمجھو کہ اسی کی حالت خراب ہے۔ خود اسی کے پاس کے رہنے والوں میں کہاں سے آئے۔

بقول رامپور کے ایک شخص کے کہ وہ اہل باطن میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں جا پھنسا تھا اور بات کی پچ کی وجہ سے اس کو نہیں چھوڑتا تھا کسی نے اس سے کہا کہ میاں تم کو پیر سے کچھ حاصل بھی ہوا؟ اس نے کہا کہ جب سقاوہ ہی میں نہ ہو تو بدھنے میں کہاں سے آئے۔

ایسے شخص کو چھوڑ دو۔ وہاں اتنی بات ہے کہ اس کو برا مت کہو برا کہنے سے کیا فائدہ۔ اگر کسی طبیب کا علاج پسند نہ آئے تو اس کا علاج نہ کرو مگر اس کو برا بھلا کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس متبعین کے تعدد کی حالت میں جس میں انابت اقوی معلوم ہو اس کو اختیار کر لو اور اس کے ہوتے ہوئے صرف اسی کا اتباع کرو۔ اسی میں راحت ہے۔ فی نفسہ یہ بھی جائز ہے مختلف لوگوں کا اتباع ہو۔ مثلاً کسی شیخ سے کوئی شغل پوچھ لیا اور کسی دوسرے سے اور کوئی شغل پوچھ لیا تو اسی طرح متعدد کا اتباع بھی فی نفسہ جائز ہے۔

سلف اور خلف کا فرق

سلف کی یہی حالت تھی کہ کبھی امام ابوحنیفہ سے پوچھ لیا کبھی اوزاعی سے۔ اور اسی سلف کی حالت دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لالچ ہوتا ہے سو فی نفسہ تو یہ جائز ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہو گیا ہے اس کے سمجھنے کے لئے اول ایک مقدمہ سن لیجئے۔ وہ یہ کہ حال غالب کا اعتبر رہتا

ہے سو حالت غالبہ کے اعتبار سے آج میں اور اس وقت میں یہ فرق ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں تدین غالب تھا ان کا مختلف لوگوں سے پوچھنا یا اتفاقی طور پر ہوتا تھا اور یا اس لئے کہ جس کے قول میں زیادہ احتیاط ہوگی اس پر عمل کریں گے پس اگر تدین کی اب بھی وہی حالت ہوتی تو ایک کو خاص کرنے اور اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اب تو وہ حالت ہی نہیں رہی اور کیسے رہتی حدیث میں ہے **ثم یفشو الکذب** کہ خیر القرون کے بعد کذب پھیل جائے گا اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی سو جتنا خیر القرون سے بعد ہوتا گیا اتنی ہی لوگوں کی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اب تو وہ حالت ہوگئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب ہے۔ اب مختلف لوگوں سے اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہوگی اس پر عمل کریں گے۔

ہمارے وطن کے قریب ایک قصبہ ہے۔ وہاں ایک مرد کا ایک عورت سے نکاح ہوا۔ پھر بعد میں معوم ہوا کہ ان دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا۔ ایک شخص میرے پاس دریافت کرنے آئے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا ان کا نکاح جائز نہیں ان میں جدائی کر دینی چاہئے۔ کہنے لگے اس میں تو بڑی بدنامی ہے اب تو کوئی صورت جواز کی نکال ہی دیجئے۔ میں نے کہا کہ تفریق میں اول تو بدنامی نہیں بلکہ تفریق نہ کرنے میں ہے کہ لوگ کہیں گے کہ بھائی بہن کو جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے اگر ہو تو ہوا کرے۔ جب شریعت کا حکم ہے تو بدنامی کا کچھ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ کہنے لگے کہ اس نے تو پی کر اگل بھی دیا تھا۔ میں نے کہا کہ خواہ اگلا ہو یا نہ اگلا ہو حرمت کے حق میں یکساں ہے۔

جب میرے پاس سے انہیں صاف جواب ملا تو وہ دہلی پہنچے وہاں ان کو ایک عامل بالحدیث مل گئے مجھے اس وقت ان پر طعن کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس شخص کی غرض پرستی بیان کرنی ہے کہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لئے عامل بالحدیث کے پاس گیا کہ شاید یہاں کوئی بات مل جائے۔ اس نے کہا کہ اگر پانچ گھونٹ سے کم پیا ہے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ آپ نے ایک استفتاء تجویز کیا کہ ایک لڑکے نے ایک عورت کا دودھ دو گھونٹ پیا تھا حرمت ثابت ہوئی یا نہیں۔ انہوں نے جواب لکھ دیا کہ **لاتحرم المصة و لا المصتان** (سنن ابی داؤد ۲۰۶۳، سنن الترمذی) (یعنی ایک یا دو گھونٹ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی) آپ بہت خوش ہوئے اور ان میاں بیوی کو وہ فتویٰ لا کر دے دیا کہ یہ بھی تو عالم ہی کا فتویٰ ہے اس پر

عمل کرلیا جائے گا تو کون سی خرابی ہے۔

آج کل لوگوں میں ایسی غرض پرستی ہے۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ بندہ خدا تو کیا گن رہا تھا کہ اس نے کتنے گھونٹ پئے تھے اور بالفرض اگر اس کی تعداد معلوم بھی تھی تو اس کی کیا وجہ ان کے فتوے کو تو مانا جنہوں نے حلال بتایا اور ان کے فتوے کو نہ مانا جنہوں نے اس کو حرام بتلایا۔ حالانکہ جنہوں نے حلال بتلایا یہ شخص ان کا ہم مذہب بھی نہ تھا۔ ہاں اگر اول ہی سے اس کا وہی مذہب ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر اول تو یہ شخص ان کے مذہب پر نہ تھا۔ جب دیکھا کہ ان کے مذہب سے کام نکلتا ہے تو ان کا مذہب لے لیا اس نے دین پر دنیا کو ترجیح دی اور افسوس ہے کہ بعضے اہل علم کو بھی اس میں شبہ ہو گیا کہ اصل میں کیا حرج ہے۔ ایک مجتہد فیہ مسئلہ میں دوسرے امام کے مذہب پر عمل کرلیا جائے مگر حضورؐ نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ انما الاعمال بالنیات کو نیت کا اعتبار ہے۔ آج کل دوسرے امام کے مذہب پر دین ہونے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اپنی دنیوی غرض کے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

علامہ شامی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے یہاں اس کی لڑکی کے لئے پیام بھیجا۔ اس نے کہا اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ تم رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرو۔ فقیہ نے اس شرط کو منظور کرلیا اور نکاح ہو گیا۔ اس واقعہ کو ایک بزرگ کے پاس ذکر کیایا تو انہوں نے اس کو سن کر سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر سوچ کر فرمایا کہ مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہنے کا خوف ہے۔ اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا بدوں اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو صرف دنیا کے لئے اس کو چھوڑ دیا۔

لوگوں کی یہ حالت دنیا طلبی کی ہو گئی ہے۔ ایسے وقت میں اگر تقلید شخصی نہ ہو تو یہ ہوگا کہ ہر مذہب میں سے جو صورت اپنے مطلب کی پاویں گے اختیار کرلیں گے۔ مثلاً اگر وضو کرنے کے بعد اس کے خون نکل آیا تو اب امام ابو حنیفہ کے مذہب پر تو وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعی کے مذہب پر نہیں ٹوٹا۔ سو یہاں تو یہ شخص شافعی کا مذہب اختیار کرلے گا اور پھر اس نے بیوی کو بھی ہاتھ لگا دیا تو اب شافعی کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور حنفیہ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے گا۔ حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک بھی وضو نہیں رہا امام ابو حنیفہ کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور امام شافعی صاحب کے نزدیک عورت کو چھونے

کی وجہ سے مگر اس شخص کو اس کی ذرا پروا نہ ہوگی۔ ہر امام کی رائے وہ اسی میں قبول کرے گا جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور جو اس کے مطلب کے خلاف ہے اس کو نہ مانے گا۔ سو دین تو رہے گا نہیں غرض پرستی رہ جائے گی۔ پس یہ فرق ہے ہم میں اور سلف میں ان کو تقلید شخصی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان میں تدین غالب تھا اور سہولت اور غرض کے طالب نہ تھے۔

تقلید شخصی کی ضرورت

بخلاف ہمارے کہ ہم میں غرض پرستی ہے۔ ہم سہولت پسند اور غرض کے بندے ہیں۔ اس لئے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی خاص ایک شخص کی تقلید کریں۔ سو ہم تقلید شخصی کو فی نفسہ واجب یا فرض نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اور ترک تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے ترک تقلید کی حالت میں اگر تمام مذاہب سے احوط (زیادہ احتیاط والے) کو تلاش کر کے عمل کریگا تو مصیبت میں رہے گا اور اگر آسان کو تلاش کریگا تو غرض پرستی میں پڑ جائے پس تقلید میں راحت بھی ہے اور نفس کی حفاظت بھی ہے اور جیسے کہ مجتہدین کی تقلید شخصی میں یہ حکمت ہے اسی طرح اس مذہب کے علماء اخیار (نیک) میں سے ایک ہی کو متعین کر لینے میں یہی حکمت ہے کیونکہ زمانہ کی حالت بدل گئی ہے کہ لوگوں میں غرض پرستی غالب ہے اور ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف ہے۔ پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑ جائیں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا اور اس اختلاف علماء ہی کی وجہ سے عام لوگ یہ شبہ کرنے لگے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کی جدا رائے ہے ہم کدھر جائیں مگر اس کا تو میرے پاس ایسا جواب ہے کہ اس کا کسی سے رد ہی نہیں ہو سکتا۔

وہ یہ کہ طبیب کے پاس بھی تو آخر جاتے ہی ہو ان میں بھی تو آپس میں اختلاف ہوتا ہی ہے۔ تو جس طرح ان کاموں میں ایک کو منتخب کر لیتے ہو اسی طرح یہاں کیوں پریشانی ہے کہ کس کا کہنا مانیں۔ اس کا بھی یہی انتظام کر لو کہ ایک عالم اور ایک شیخ کو منتخب کر لو پس ہر شخص کو اکثر دو آدمیوں کے متعین کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ایک عالم کی اور ایک شیخ کی کیونکہ کئی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک اعمال صالحہ اور ایک اس کی تکمیل کی۔ پس دو شخصوں سے تعلق پیدا کرو۔ عالم سے تو اعمال صالحہ سیکھو اور شیخ سے اس کی تکمیل کرو اور اگر کوئی

جامع مل جائے جس سے دونوں چیزیں حاصل ہو جائیں تو خوش قسمتی ہے اگر پریشانی سے اپنی نجات چاہتے ہو تو ایسا کرو اور اس کی ہی سخت ضرورت ہے۔

پھر ہر ایک امر میں جو شبہ ہو اس سے پوچھ لو۔ جو کام کرنا چاہو پہلے اس سے پوچھ لو اگر وہ جائز بتلائے تو کرو ورنہ نہیں اور یہ بھی سمجھ لو کہ باتیں دو قسم کی پوچھی جاتی ہیں۔ ایک تو احکام دوسرے اس کے دلائل جو بات وہ بتلائے اگر اس کی دلیل تمہاری سمجھ میں نہ بھی آئے تو تب بھی اس شخص کی اطاعت نہ چھوڑو بلکہ اس کی بات بلا دلیل مان لو۔ دنیوی امور میں بھی عقلاء کا یہی طریقہ ہے۔ آخر سول سرجن کا قول مان لیتے ہو کچھ اگر مگر نہیں کرتے تو دلیل نہ سمجھ میں آئے۔ اسی طرح دین میں جس کو متبوع قرار دو اس سے زیادہ گڑبڑ نہ کرو زیادہ محقق نہ بنو عمل کرو اگر محقق بننے کا شوق ہو تو مدرسہ میں آکر پڑھو۔ غرضیکہ ایک شخص کو متبوع مقرر کر لینے میں بہت پریشانیوں سے بچ جاؤ گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے اس مسئلہ مختلف فیہا کا جو آج کل بہت معرکۃ الآراء سمجھا جاتا ہے فیصلہ کیا ہے اور دونوں مرضوں کا علاج کیا ہے۔ خودرائی کا بھی اور عدم معیار کا بھی۔ جس کا حاصل وہ ہے کہ اتباع کرو سبیل حق کا مگر بواسطہ من اناب الی (ان لوگوں کے جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے) کے اور گو من اناب میں متعدد اشخاص کے اتباع کرنے کا مضائقہ نہ تھا لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایک کے متعین کر لینے میں راحت اور انتظام اور نفس کی حفاظت ہے۔ پس اس زمانہ میں علماء اور مشائخ کو اس جانچ سے جانچئے اگر کوئی جامع مل جائے تو ایک کو ورنہ دو کو منتخب کر کے ان کا اتباع کیجئے۔

اگر دین پر چلنا چاہتے ہو تو اس کا یہ طریقہ ہے ورنہ بدوں اس کے آج کل دین سالم رہنے کا کچھ اعتبار نہیں۔ جو شخص اس طریقہ کے خلاف کرے گا کچھ تعجب نہیں جو وہ دین سے بہک جائے۔ میں نے ایک ایسی بات بتلا دی ہے کہ عمر بھر کے لئے دستور العمل بنانے کے قابل ہے اور جو اس پر عمل کرے گا اس کو کبھی گمراہی نہ ہوگی۔

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

و صلی الله تعالیٰ علی خیر خلقه محمد و اله و اصحابه اجمعین و اٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

شرط الایمان

شرائط ایمان کے متعلق یہ وعظ ۳ شعبان ۱۳۳۰ھ کو انبہٹہ خانقاہ شاہ ابوالمعالی پر کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوا حاضری دو سو کے قریب تھی۔ مولوی محمد عبداللہ صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمد و نستعینه و نستغفره و نؤمن به و نتوکل علیه و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یهده اللہ فلا مضل له و من یضلله فلا هادی له و نشهد ان لا اله الا اللہ و حده لا شریک له و نشهد ان سیدنا و مولانا محمدا عبده و رسوله صلی اللہ تعالی علیه و علی آله واصحابه و بارک وسلم. اما بعدفاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم. فلا وربک لایؤمنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینهم ثم لایجدوا فی انفسهم حرجاً مماقضیت و یسلموا تسلیماً. (النساء ۶۵)

یعنی پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ نہ کرائیں پھر اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر تسلیم کر لیں۔)

تمہید

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ایک بہت ضروری مضمون کا ذکر فرمایا ہے کہ جو باعتبار مکلفین کے بھی عام ہے اور باعتبار وقت کے بھی۔ یعنی بعض مضامین تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی ضرورت سب مکلفین کو عام نہیں ہوتی ہے کسی کو ضرورت ہوتی ہے کسی کو نہیں ہوتی جیسے زکوٰۃ ہے جس کے پاس مال ہے وہ اس کا مخاطب ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ مخاطب نہیں ہے۔ اور بعض مضامین باعتبار مکلفین کے تو عام ہوتے ہیں لیکن ان میں باعتبار وقت کے عموم نہیں ہوتا۔ جیسے نماز دیکھیے طلوع شمس سے نصف النہار تک کوئی نماز نہیں ہے اور بعض احکام وہ ہیں کہ ان کی ضرورت ہر مسلمان کو ہے اور ہر وقت ہے۔ ایسے احکام متعدد ہیں۔ ان میں سے ایک یہ حکم بھی ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ چونکہ اس حکم میں کوتاہی اور اہمال بہت ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کو اس وقت بیان کیا جاتا ہے اس لئے کہ حاجت بیان کرنے کی اسی مضمون کی ہے جس کی ضرورت ہو۔ ترجمہ آیت سے اس مضمون کی تعیین ہو جائے گی اور تعیین کے بعد اس میں جو کوتاہی ہے وہ بھی آسانی سے تسلیم کر لی جائے گی۔

وجوہ اطاعت

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ قسم کھا کر فرماتے ہیں فلا وربک اس میں لا حرف نفی کے بعد قسم لے آئے اور منفی کا ذکر بوجہ قرینہ مقام کے چھوڑ دیا گیا۔ یعنی یہ بات نہیں جو منافقین سمجھے ہوئے ہیں کہ باوجود دعویٰ ایمان کے تحکیم الی الطاغوت (شیطان سے تصفیہ کرانا) کو اختیار کریں اور حضور کے حکم سے اعراض کریں اور قبل از مقصود نفی کا لانا نہایت بلاغت ہے۔ اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ قبل ذکر مقصود کے اس کی ضد کی نفی کر دیتے ہیں تا کہ اس سے یکسوئی ہو کر ذہن خالی ہو جائے اور مقصود کی طرف متوجہ ہونے کے لئے آمادہ ہو جائے۔

پس فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے رب کی قسم ہے یہاں چند امور قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قسم کھا کر کیوں فرمایا۔

دوسرے یہ کہ اگر قسم ہی کھانا تھا تو اپنے اسماء میں سے اسم رب کو کیوں خاص فرمایا۔

تیسرے یہ کہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کیوں مضاف کیا۔

بات یہ ہے کہ جو مضمون اس آیت میں ارشاد ہوا ہے وہ چونکہ نہایت قابل اہتمام ہے اور قسم کھا کر جو بات کہی جاتی ہے طبعی بات ہے کہ نفس میں اچھا اثر کرتی ہے اس لئے تو قسم کھائی۔ باقی رہی یہ بات کہ وربک کیوں فرمایا۔ واللہ (اللہ کی قسم) یا والرب (رب کی قسم) کیوں نہ فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود اصلی اس آیت کا آپ کا مطاع یعنی واجب الاطاعت ہونا بیان کرنا ہے۔ چنانچہ الالیطاع (تا کہ آپ کی اطاعت کی جاوے) میں اس کی تصریح ہے۔ اور آدمی جو دوسرے کی اطاعت کرتا ہے اس کی تین وجہ ہوا کرتی ہیں کا بھی خود اقتضا یہ ہے کہ محبوب کی اطاعت کی جائے جناب باری تعالیٰ کو وربک سے حضور کا تینوں وجہ سے مطاع ہونا بیان کرنا منظور ہے۔

مظہر صفات حق تعالیٰ

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جاننا چاہئے کہ حق تعالیٰ شانہ کی بے انتہا صفات ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

قل لو کان البحر مداداً لکمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمٰت ربی ولو جئنا بمثلہ مدداً

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی خوبیاں وصفات لکھنے کے لئے سمندر (کا پانی) ہو تو میرے رب کی صفات وخوبیاں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے اگرچہ اس سمندر کے مثل ایک دوسرا سمندر اس کی مدد کے لئے ہم لے آئیں۔

اور یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو ایک خاص صفت سے تعبیر فرما کر اور حضور کی طرف مضاف کر کے قسم کھائی ہے جس کا مطلب بعنوان دیگر یہ ہوا کہ ہم اپنی ذات کی اس حیثیت سے کہ ہم آپ کے مربی ہیں قسم کھا کر کہتے ہیں۔ تو جیسے قسم میں آپ کی طرف اضافت اعتبار کرنے سے آپ کی عظمت شان ظاہر ہوتی اسی طرح وربک سے بھی آپ کا عظیم الشان ہونا ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق کی گویا قسم کھائی ہے۔ اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ بہت سے علاقے ہیں مثلاً خالقیت رزاقیت ربوبیت وغیرہ۔ ان علاقوں میں سے یہاں ربوبیت کا ذکر فرمایا اور تربیت کے معنی شیئا فشیئا (رفتہ رفتہ) ایسی شے کو جس کی شان سے تربیت ہے اس کے کمال پر پہنچانا ہے۔ پس فلا وربک کے اس تقدیر پر یہ معنی ہوئے کہ قسم ہے۔ آپ کے مربی کی۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کی طبیعت اور فطرت ہے سلیم اور طبائع سلیمہ کا مقتضی یہ ہے کہ اس صلے میں کہ خالق کا اس پر احسان ہے وہ خلق خدا پر احسان کرتا ہے۔ پس اس قاعدہ سے آپ خلق کے محسن ہوئے۔ یہ تو محسن ہونا آپ کا قاعدہ عقلیہ سے ہوا۔

دوسری وجہ بطرز فن تصوف آپ کے محسن ہونے کی اور بھی ہے وہ یہ کہ صفات حمیدہ حقیقۃً ذات باری تعالیٰ کے لئے ہیں اور مخلوق کے اندر ان کا ظل ہے مثلاً مخلوق کسی مجرم کا قصور معاف کر دے تو یہ صفت عفو کا پرتو ہے اور اگر کوئی کسی کو کچھ دے تو یہ جوادیت کا اثر ہے اور یہ مسلم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام افراد بنی آدم میں سے صفات باری تعالیٰ کے مظہر اکمل واتم ہیں۔ پس صفت احسان کے بھی آپ مظہر اتم ہوئے۔ تو آپ تمام جہان کے محسن ہوئے اور تربیت کا منشا چونکہ ہمیشہ محبت ہوتا ہے اور اس کی اضافت ہے حضور کی طرف تو گویا یہ فرمایا فلا ومحبک (آپ کے محب کی قسم) اور جو خدا کا محبوب ہو وہ مخلوق کا بدرجہ اولیٰ محبوب ہونا چاہئے پس آپ محبوب بھی ہوئے تمام مخلوق کے تو فلا وربک سے آپ کا عظیم الشان ہونا اور محسن ہونا اور محبوب ہونا سب ثابت ہوا اور چونکہ آپ مظہر صفات حق ہیں اور حق تعالیٰ کی صفت محبیۃ للمربوب (مربوب کے لئے محب ہونے کی صفت) ثابت ہوئی۔ پس آپ محب بھی اپنے

غلاموں کے ہوں گے۔ پس فلا وربک ہر سہ وجہ اطاعت کو مع زیادہ صفتہ المحبۃ مشتمل ہو گیا۔

سلامت فطرت کا مقتضی

پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مقصود اصلی آیت کا حضورؐ کا واجب الاطاعت ہونا بیان کرنا ہے۔ پس قبل دعویٰ کے فلا وربک سے اس کے دلائل اور مناشی بیان کر دیئے تا کہ اطاعت آسان ہو جائے۔ اس لئے کہ انسان طبعاً حریت پسند ہے۔ نفس کی جبلت یہ ہے کہ مستقل ہو کر رہے اور کسی قانون کے زیر اثر نہ ہو لیکن حقیقت میں یہ آزادی سلامت فطرت کے خلاف ہے۔ سلامت فطرت کا مقتضی تو یہ ہے کہ آدمی زیر حکومت رہے۔ اس لئے کہ راحت اور فلاح دنیوی واخروی اسی میں ہے وہ شخص کبھی راحت نہیں پا سکتا جو آزاد ہو کر رہنا چاہتا ہو اور کسی کا اتباع نہ کرتا ہو۔ دنیا کے اعتبار سے کہ ہر امر میں متردد رہے گا کہ خدا جانے فلاں امر میں میری رائے درست ہے یا نہیں اور دین کے اندر تو ظاہر ہی ہے کہ بدوں اتباع کے چارہ ہی نہیں۔ اطاعت میں سارا بوجھ دوسرے پر رہتا ہے۔

صاحبو! بڑا فرق ہے اس میں کہ مریض قرابادین میں خود دیکھ کر نسخہ لکھے اور اس میں کہ طبیب سے پوچھ کر معالجہ کرے اور راز اس میں یہ ہے کہ اطباء نے لکھا ہے رای العلیل علیل (بیمار کی رائے بھی بیمار (ضعیف) ہوتی ہے) یہ علالت تصحیح رائے قائم کرنے سے مانع ہوتی ہے۔

مجھ سے ایک وکیل سفر میں ملے۔ میں نے ان سے سفر کی علت پوچھی کہنے لگے کہ ایک اپنے ذاتی مقدمہ میں جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کو تو وکیل نہ کرنا پڑتا ہوگا۔ کہنے لگے کہ خود صاحب معاملہ ہونے کے سبب عقل درست نہیں ہوتی۔ اس لئے ہم کو بھی وکیل کرنا پڑتا ہے حالانکہ خود بھی وکیل تھے۔

اکابر کو ہمیشہ سے دیکھا ہے کہ اپنے چھوٹوں تک سے مسئلہ کی تحقیق کرتے ہیں۔ جب ماہرین فن کی یہ حالت ہے تو غیر ماہرین کو بطریق اولیٰ ماہرین کی اطاعت ضروری ہے۔

اگر کوئی کہے کہ دوسرے کی اطاعت کی صورت میں بھی بسا اوقات کام بگڑ جاتا ہے تو جواب یہ ہے کہ نبی کی اطاعت میں تو اس کا احتمال ہے نہیں مگر مطلق اطاعت میں یہ ممکن ہے۔ لیکن پھر بھی حالت اطاعت میں کام بگڑنے حالت عدم اطاعت میں کام خراب ہونے میں بڑا فرق ہے۔ وہ یہ کہ حالت اطاعت میں کوئی ملامت نہ کرے گا بلکہ معذور سمجھیں گے

اور مستقل ہو کر کرنے میں اگر خراب ہو گا تو ملامت اور اعتراض ہو گا اور نیز اپنے کو بھی حسرت ہو گی پس عقل اور طبع سلیم کا مقتضی یہی ہے کہ مستقل نہ ہو۔ لیکن چونکہ ہم نے سلامتی کو ضائع کر دیا ہے اس لئے ہم کو اس کے خلاف کا فطرت ہونا نظر آتا ہے غرض مستقل اور آزاد ہو کر رہنا ہر طرح خطرناک ہے اور اتباع اور تقلید میں کسی وجہ سے بھی خطرہ نہیں۔

بیعت کے معنی

مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک درویش تھے ان کا لقب تھا رسول نما۔ اور وجہ لقب کی یہ تھی کہ ان کو ایسی قوت تصرف تھی کہ جو شخص طالب ہوتا تھا کہ مجھ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا دو وہ اس پر متوجہ ہوتے تھے اس کی نظروں سے درمیانی حجاب مرتفع ہو جاتے تھے اور وہ زیارت جمال باکمال نبوی سے مشرف ہو جاتا تھا۔ وہ بزرگ جس وقت اپنے شیخ سے بیعت ہونے گئے تو شیخ نے فرمایا کہ استخارہ کر لو کہ سنت ہے وہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر ۵ منٹ سے بھی کم میں واپس آ گئے۔ شیخ نے پوچھا کہ استخارہ کر لیا۔ کہا کہ حضور کر لیا شیخ نے فرمایا کہ اتنی دیر میں آپ نے کیسے استخارہ کر لیا۔ وضو نہیں کیا، نماز نہیں پڑھی، دعا استخارہ نہیں پڑھی کہنے لگے کہ میں نے اس طرح استخارہ کیا ہے کہ میں نے اپنے نفس سے کہا کہ اے نفس! تو جو بیعت کرتا ہے تو بیعت کے معنی دوسرے کے ہاتھ بک جانا ہیں تو تجھ کو اپنے تمام اختیارات سلب کر دینے اور بدست غیر ہو جانے سے کیا نفع ہے۔ نفس نے جواب دیا کہ بلا سے خدا تو ملے گا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ خدا ملے ہی۔ خدا کے ذمے کسی کا قرض تو نہیں ہے۔ نفس نے کہا کہ خیر کچھ حرج نہیں خدا کو خبر تو ہو گی کہ فلاں شخص نے ہم کو طلب کیا تھا اس پر میں کچھ جرح نہیں کر سکا۔ شیخ نے فرمایا کہ تمہارا استخارہ سب سے اچھا ہے۔ پس غلامی واقعی طبعاً گراں ہے۔ جس کو کچھ ملا ہے اسی کی بدولت ملا ہے۔

وسعت رحمت

الحاصل اس طبعی گرانی کی ہی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اول دلائل حضور کی اطاعت کے واجب ہونے کے بیان فرما دیئے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کے یہاں مثلاً کوئی مہمان آ رہا ہو۔ اور کسی قرینے سے معلوم ہو کہ اس کو اگر خبر ہو گی تو گراں گزرے گا۔ تو اس کی گرانی دفع کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ تم کو خبر بھی ہے تمہارے یہاں کون آ رہا ہے۔

تمہارے یہاں وہ شخص آرہا ہے جو تم کو روپے بھیجتا ہے رفیع القدر ہے اور تم اس پر عاشق ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کی وہ شان بیان فرمائی جس سے سامع کو بے اختیار محبت اور شوق اطاعت کا پیدا ہو۔ یعنی عظیم الشان ہونا محسن ہونا محبوب ہونا۔ تو آپ کی اطاعت کی طرف اب کیوں نہ میلان ہوگا اور آئندہ کے مضمون سے اب کوئی وحشت نہ ہوگی۔

دیکھئے جو شخص کسی کام کو بیگار سمجھے اس کو اگر ابتداء ہی کوئی کام بتلا دیا جائے تو وہ اس کو گراں ہوگا اور اگر پہلے یہ کہہ دیا جائے کہ تم کو حصہ ملے گا پھر کہا جائے کہ فلاں کام کرو اس سے وہ کام سہل ہو جائیگا۔ اسی طرح جو لوگ شریعت کے احکام کو بیگار سمجھتے ہیں ان کی گرانی رفع کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ اسباب سہولت کو ذکر میں مقدم فرما دیا۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ حق تعالیٰ کی بندوں پر کس درجہ رحمت ہے اور کتنی محبت ہے کہ ہماری تربیت کے لئے وہ انداز اور وہ طریقے اختیار فرمائے ہیں جیسے شفیق باپ اپنے بچہ کے ساتھ کرتا ہے اور ہم کو اس طور سے اپنی راہ پر لگانے کے لئے کہ اس میں سراسر ہمارا ہی نفع ہے ایسے پھسلایا ہے جیسے بچوں سے کوئی کام لینے کے لئے ان کو پھسلاتے ہیں۔

حسن تربیت

اہل اللہ نے بھی ہمیشہ ایسی ہی تدبیروں سے کام لیا ہے بعض علماء خشک ان کی تدابیر پر ہنستے ہیں۔ لیکن یہ تدبیریں ایسی ہیں کہ اگر طبیعت میں ذرا بھی سلامتی ہو تو ضرور ان تدابیر سے اصلاح ہوتی ہے۔

حضرت شیخ فرید کے ایک مرید جوان کی ایک کنیزک کے ساتھ تعلق ہو گیا اور حضرت شیخ کو اس کی خبر ہو گئی بجائے اس کے کہ اس کو ملامت کریں کیونکہ بعض اوقات عشق ملامت سے بڑھ جاتا ہے۔ آپ نے ایک لطیف تدبیر کی۔ وہ یہ کہ اس لونڈی کو دوائے مسہل پلا دی۔ چنانچہ مادے کا اخراج شروع ہوا اور بہت سے دست اس کو آئے اور سب مادے کو ایک طشت میں جمع رکھنے کا حکم دیا۔ دست آنے سے اس لونڈی کا رنگ و روغن جاتا رہا اس کے بعد اس لونڈی کے ہاتھ کھانا اس مرید کے پاس بھیجا۔ بجائے اس کے کہ اس لونڈی کی طرف ملتفت ہو اس کو ایک نفرت ہوئی۔ اور اس کی طرف التفات بھی نہ کیا اس لئے کہ اس کا عشق تو اس کے رنگ و روغن ہی کی وجہ سے تھا۔ اس کے رنگ ہی کے ساتھ عشق بھی رخصت ہو گیا۔

عشقہائے کز پے رنگے بود   عشق نبود عاقبت ننگے بود

جو عشق محض رنگ وروپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں بلکہ محض ننگ ہوتا ہے یعنی اس کا انجام حسرت وندامت ہے۔

عشق بامردہ نباشد پائیدار   عشق را با حی و با قیوم دار

مردہ کے ساتھ عشق کو پائیداری نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ حی وقیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے۔

حضرت شیخ نے بھنگن کو حکم دیا کہ وہ نجاست لے آوے وہ لائی گئی اس مرید سے فرمایا کہ یہ کنیزک تو وہی ہے۔ اس میں سے صرف یہ نجاست کم ہوگئی ہے اس سے تمہارا میلان جاتا رہا۔ معلوم ہوا کہ تمہارا محبوب یہ تھا محبوب حقیقی کو چھوڑ کر تم اس گندگی پر گرے تھے۔ طبع اس کی سلیم تھی فوراً تائب ہوگیا اور اس سے نفرت ہوگئی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بدکاری کی اجازت دے دیجئے۔ اگر آج کل کے علماء خشک سے کوئی یہ کہے تو بے حد برہم ہوں۔ لیکن کیا ٹھکانہ ہے تحمل کا۔ بجائے اس کے کہ زجر وتوبیخ فرمائیں فرماتے ہیں کیا تو راضی ہے کہ تیری ماں کے ساتھ ایسا فعل ہو اس نے عرض کیا کہ نہیں۔ پھر فرمایا کیا تو پسند کرتا ہے کہ تیری بہن کے ساتھ ایسا ہو کہا کہ نہیں۔ فرمایا تو پھر کسی کی ماں بہن کے ساتھ تم کیسے اس کو پسند کرتے ہو۔ اس کی سمجھ میں آگیا اور توبہ کی۔

لیکن اس طرز سے کام لینا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس لئے کہ اہل مداہنت بھی اپنی مداہنت پر اس سے استدلال کر سکتے ہیں۔ نرمی اور سختی دونوں کے حدود ہیں۔ یہ کام شیوخ کاملین اور اکابر امت کا ہے۔ ہر شخص اپنے کو اس پر قیاس نہ کرے۔ یہ حکیم کا کام ہے جو حکمت موہوبہ من اللہ (اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکمت موہوبہ) کے ساتھ لوگوں کو راہ پر لاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرز کی ہدایت فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن

یعنی آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلایئے اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

پس اسی حکمت کا یہاں استعمال کیا گیا کہ چونکہ آپ کی اطاعت بھی طبعاً گراں تھی۔ اس لئے امر بالاطاعت کے قبل اسباب میسرہ اطاعت کو جمع فرما دیا۔ اور یہ گرانی کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ انسان کی طبعی بات ہے کہ اپنی ہی نوع کی اطاعت سے استکبار اور استنکاف ہوتا ہے۔ اسی سے انبیاء علیہم السلام کو لوگوں نے اپنے اوپر قیاس کیا تھا۔ چنانچہ کہا کرتے تھے **ماانتم الابشر مثلنا**۔ (تم تو ہم جیسے بشر ہو) مولانا فرماتے ہیں۔

ہمسری بانبیاء برداشتند　　اولیاء را ہم چو خود پنداشتند

حضرات انبیا علیہم السلام سے ہمسری کا دعویٰ کیا اور اولیائے کرام کو مثل اپنے سمجھا

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر　　ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

کہنے لگے کہ ہم بھی بشر ہیں اور یہ انبیاء بھی بشر ہیں۔ ہم اور یہ خواب وخورش کے مقید ہیں۔

مگر واقع میں کتنی بڑی غلطی کی بات ہے کہ محض بشریت کے تشارک سے اطاعت سے استنکاف ہو اور جو کمالات حقیقیہ مابہ الفرق ہیں ان پر نظر نہ ہو۔ آج کل بھی لوگوں کی یہی حالت ہے کہ ظاہری جاہ وجلال یا خوارق وتصرفات جس میں ہوں اس کو تو بزرگ سمجھتے ہیں اور جو کمالات باطنی رکھتا ہو اور سچا بزرگ ہو اس کو بزرگ نہیں سمجھتے غرض کوئی مابہ الفرق ظاہراً نظر آتا ہو تو معتقد ہوتے ہیں حالانکہ یہ کمالات ظاہرہ کمال اصلی کے سامنے محض گرد ہیں اور وہ کمال اصلی طاعت کے اندر استقامت ہے جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا اور دوسرے کمالات ظاہری سب عارض ہیں۔ اسی کمال اصلی کے عدم زوال کو کہتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

یعنی جس کو عشق حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں اس وجہ سے کہ اس کو لذت قرب کامل طور سے حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہئے۔

لیکن چونکہ وہ دولت عوام کو نظر نہیں آتی اس لئے ایسے شخص کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ اسی واسطے کفار نے حضور کی شان میں کہا تھا۔

لولانزل ھذا القران علی رجل من القریتین عظیم

یعنی یہ قرآن شریف طائف اور مکہ کے کسی بڑے آدمی (یعنی دولت مند) پر کیوں

نازل نہ ہوا۔ حالانکہ نبی اگر ہمیشہ صاحب سلطنت اور صاحب مال ہوا کرتے تو ان کا اتباع سلطنت اور مال کی وجہ سے ہوتا اور اس سے حق ظاہر نہ ہوتا۔ حق کا ظہور اسلام کا دین الٰہی ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ حضورؐ نہ صاحب سلطنت وحکومت تھے نہ پڑھے لکھے تھے نہ کوئی اور کمال عرفی رکھتے تھے۔ پھر دفعۃً بڑے بڑے سلاطین بڑے بڑے اہل کمال کی آپ کے سامنے گردنیں جھک گئیں۔ جس طرح خانہ کعبہ اگر وادی غیر ذی زرع میں نہ ہوتا اور کسی شاداب اور تروتازہ مقام پر ہوتا تو اس کی حقانیت ایسی ظاہر نہ ہوتی یہی وسوسہ ہوتا کہ ظاہری شادابی کے سبب لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ بخلاف اس وقت کے کہ سنگستان خشک میں ہے پھر اس کی طرف لوگ مشقتیں اٹھا اٹھا کر جاتے ہیں اور جو ایک مرتبہ ہو آیا اس کو پھر ہوس ہے۔ یہ کیا بات ہے۔ جس سے یہ کھلی دلیل ہے اس کی کہ اس میں غیبی کشش ہے۔

غرض کہ جس شخص کے اندر حقانیت ہوتی ہے وہ ظاہری بناؤ سنگار سے مستغنی ہے۔ اس کو ظاہری ٹیپ کی ضرورت نہیں۔ ظاہری رونق کی اسی کو ضرورت ہوگی جس کے پاس حقیقی نور نہ ہو۔

سنا ہے کہ کلکتہ میں ایک دکاندار پیر تھے جو شخص ان کے حلقے میں شامل ہو جاتا وہ دو روپے فی ماہ دیتا تھا۔ چونکہ کمال سے خود معرا تھے اس لئے لیپ پوت کرتے تھے اور اگر کچھ رکھتے ہوتے تو ان کو مخلوق سے نفرت ہوتی لوگ پیچھے پیچھے پھرتے اور وہ بھاگتے۔

غرض کمالات اصلیہ کے ہوتے ہوئے اس طمطراق کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی اس سے منزہ رکھا کہ جو آئے خلوص سے آئے اور وہاں پہلے سے تو کیا مال ومتاع ہوتا کہ کوئی اس کے لالچ میں آتا وہاں تو یہ کیفیت تھی کہ جو اہل مال آتا تھا وہ بھی مال سے متنفر ہو جاتا تھا تو مال بیچارہ کیا جالب اسلام ہوتا خود اسلام سالب مال ہو جاتا تھا۔

چنانچہ ایک یہودی کا کچھ قرض جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے ہو گیا تھا وہ ایک روز آ کر مانگنے لگا اور کہا کہ آج تو میں لئے بغیر آپ کو کہیں جانے نہ دوں گا۔ بعض صحابہ برہم ہوئے۔ حضور نے فرمایا خاموش رہو صاحب حق کو کہنے کا حق ہے۔ چنانچہ حضور تشریف نہ لے گئے اور رات بھر مسجد میں رہے جب صبح ہوئی تو وہ یہودی سامنے آ کر بیٹھا اور کہا

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ

میں اس بات کی گواہی دیتا کہ بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی عبادت کے لائق نہیں اور گواہی

دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔

یا رسول اللہ! میں تو آپ کا امتحان لیتا تھا۔ اس لئے کہ میں نے کتب سماویہ میں پڑھا تھا کہ نبی آخر الزماں کی یہ علامت ہے کہ وہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں اور میں مسلمان ہوتا ہوں اور مسلمان ہوتے ہی اس کو مال و دولت سے ایسی نفرت ہوئی کہ کل مال اپنا اللہ کی راہ میں دے دیا۔

آں را کہ ترا شناخت جاں راچہ کند   فرزند و عزیز و خانماں را چہ کند

جس نے آپ کو پہچان لیا وہ جان کی کیا پروا کرے گا اور بی بی بچوں مال و اسباب کو لے کر کیا کرے گا۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   وے طبیب جملہ علت ہائے ما

ان شعروں میں عشق کی تعریف ہے مجازاً اس کو مخاطب کرلیا ہے یعنی اے عشق! تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں۔ تجھ سے تمام بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے۔

اے دوائے نخوت و ناموس ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما

یعنی تجھ سے نخوت و ناموس کا دفعیہ ہو جاتا ہے تو ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس ہے۔

ہر کرا جامہ ز عشق چاک شد   اوز حرص و عیب کلی پاک شد

جس کا جامہ عشق سے چاک ہو گیا۔ یعنی جس کو عشق حاصل ہو گیا وہ حرص اور تمام نقائص و اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہو گیا۔

ظاہری و باطنی دولت

غرض وہاں تو یہ تھا کہ مسلمان ہو کر گھر سے اور دیتے تھے۔ حضرت ابوطلحہؓ نے اپنا باغ جو بڑے شوق سے لگایا تھا صرف اس وجہ سے کہ نماز میں ایک مرتبہ اس کا خیال آ گیا تھا حضورؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا باغ میرے لئے فتنہ ہو گیا ہے اس لئے میں اس کو فقراء میں وقف کرتا ہوں۔

بہر چہ از دوست دامانی چہ کفر آں حروف چہ ایماں
بہر چہ از یار دور آفتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

یعنی جو چیز دوست سے باز رکھے خواہ وہ ایمان کی بات ہو خواہ وہ کفر کی دونوں برابر

ہیں۔ جو چیز محبوب سے تم کو دور رکھے خواہ وہ نقش و نگار اچھا ہو خواہ برا دونوں برابر ہیں۔

حضرت غوث پاک قدس سرہ کی خدمت میں سنجر بادشاہ ملک نیمروز نے عریضہ لکھا کہ حضور کی خانقاہ کے لیے میں دو چار گاؤں وقف کر دوں حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد　　دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم

یعنی چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو۔ اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو۔

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب　　من ملک نیمروز بیک جو نے خرم

مجھے جب سے ملک نیم شب کی سلطنت حاصل ہے ملک نیمروز کی سلطنت میری نظر میں ایک جو کے برابر بھی نہیں۔

پس یہ تھی وہ دولت جو ان حضرات کو عطا ہوئی تھی کہ اس کے مقابلہ دنیا کی کوئی چیز نہ تھی۔ دنیا کے لوگ اس دولت پر ریجھتے ہیں اور وہ حضرات ان پر ہنستے ہیں غرض حضور کے یہاں اس دولت ظاہری اور حکومت نہ ہونے سے کفار کہتے تھے۔

لولا نزل ھذا القراٰن علی رجل من القریتین عظیم

یعنی یہ قرآن شریف طائف اور مکہ کے کسی بڑے شخص (دولتمند) پر کیوں نہ نازل ہوا۔

پس عام لوگوں کا یہ طبعی امر ہے کہ ظاہری حال پر نظر کر کے اطاعت سے استنکاف ہوتا ہے اور اس سے اطاعت دشوار ہو جاتی ہے اس لئے مقتضا حکمت کا ہے کہ اطاعت کو سہل کیا جائے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے حضور کی وہ صفات بیان فرمائیں کہ جو اطاعت کو آسان کریں۔ گویا یہ فرمایا کہ ہم ایسی ذات بابرکات کی اطاعت واجب کرتے ہیں کہ وہ تمہارا محسن ہے محب ہے عقلاً محبوب شے کا ذکر من دلیلہ (اسکی دلیل سے) عظیم الشان عظیم الجاہ ہے۔ اب ان صفات کو سن کر آپ سے طبعی محبت ہوگئی اور اطاعت سہل ہوگئی۔ اس لئے کہ محبت وہ شے ہے کہ سب کچھ آسان کرا دیتی ہے دیکھو اگر کسی چڑیل مردار سے محبت ہو جاتی ہے تو سب تلخیاں شیریں ہو جاتی ہیں چہ جائیکہ کوئی حقیقت میں بھی محبوب ہونے کے لائق ہو۔

اور حضور کیسے محبوب نہ ہوں گے۔ انہوں نے ہم نکموں کے واسطے کیسی کیسی مشقتیں برداشت کی ہیں کہ راتوں کو کھڑے کھڑے قدم مبارک ورم کر گئے ہیں اور امت کے لئے دعائیں فرما رہے ہیں۔ ایک بار پوری رات آیت۔

ان تعذبھم فانھم عبادک و ان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم

اگر آپ ان کو عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو بخش دیں تو بلاشک غالب اور حکمت والے ہیں۔

تکرار فرماتے فرماتے گزار دی اور تعب تمام امت کے لئے تھا کہ جن میں سے موجود تو کم تھے زیادہ وہ تھے جو ابھی تک پیدا بھی نہ ہوئے تھے جیسے کوئی شخص اپنے پوتوں پڑپوتوں کے لئے جائیداد پیدا کردے اور حضور کی شفقت کا کیا ٹھکانا ہمارے حال پر تو کیوں نہ ہوتی حضور کی عنایت تو اعداء پر بھی مبذول تھی۔

چنانچہ جب آپ تبلیغ کے لئے طائف تشریف لے گئے تو وہاں کفار حضورؐ کے ساتھ سخت بے ادبی اور استہزا سے پیش آئے۔ اس وقت ملک الجبال یعنی جو فرشتہ پہاڑوں پر مسلط ہے حاضر ہوا کہ اگر حکم ہو تو ان نالائقوں کو پہاڑوں کے درمیان کچل ڈالوں کہ ابھی پس جائیں فرمایا کہ مجھے اور میری قوم کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ شاید اللہ تعالیٰ ان کے اصلاب سے فرمانبرداروں کو پیدا فرمائیں جب کہ حضورؐ کے ہم پر اتنے احسانات ہیں تو بتایئے اب آپ کے محبوب و محسن ہونے میں کیا شک رہا۔ الحاصل فلا وربک سے مقصود اطاعت کی تسہیل ہے۔ اس لئے کہ محبوب و محسن و عظیم الشان کی اطاعت آسان ہوتی ہے۔

شرط ایمان

یعنی اب آگے مقصود ارشاد ہے لا یومنون الخ یعنی قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ مومن نہ ہوں گے جب تک کہ ان معاملات میں جو ان کے درمیان میں ہوتے ہیں آپ کو حکم نہ بنادیں گے۔ یعنی اپنی رائے پر جب تک آپ کے فیصلہ کو مقدم نہ رکھیں گے مسلمان نہ ہوں گے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا اس لئے کہ اتنی اطاعت تو حاکم ہونے کی حیثیت سے کفار بھی کرتے تھے کہ آپ کو حکم بناتے تھے لیکن اس کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ اس کے ساتھ دو شرطیں اور فرمائیں جو آگے آتی ہیں ان پر نظر کر کے ذرا ایسے لوگ اپنی حالت ایمان کی دیکھ لیں جو احکام شرعیہ کی تعمیل محض ضابطہ پورا کرنے کے لئے کرتے ہیں اور مابعد کی دو شرطوں سے عاری ہیں۔ صاحبو! اس ضابطہ کی اطاعت سے اگر آپ مخلوق کے سامنے

سرخرو ہو گئے تو کیا ہوتا ہے کام تو عالم الغیب والشہادۃ سے پڑے گا۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام
در غلط اندازی تا ہر خاص و عام

مخلوق کو پورے فریب و دھوکہ سے اپنی مٹھی میں لے لیا ہے ہر خاص و عام تک کو تم نے غلطی میں ڈال رکھا ہے۔

کارہا باخلق داری جملہ راست
باخدا تزویر و حیلہ کے رواست

یعنی مخلوق کے ساتھ تمہارے سب معاملات درست ہیں خدا تعالیٰ کے ساتھ یہ حیلہ وفریب کس لئے ہے۔

خدا تعالیٰ محض قانونی حاکم نہیں ہیں اگر ان کو دل کی بھی (نعوذ باللہ) خبر نہ ہوتی تب بھی محبوبیت کا مقتضیٰ یہ تھا کہ دل سے اطاعت ہوتی۔ بعض ایسے قانونی لوگ گناہ کرتے ہیں اور اس کی تاویل کرتے ہیں اس سے تو اگر کھلم کھلا گناہ کرے اور گناہ کو گناہ سمجھے تو اتنا برا نہیں جیسا گناہ کر کے قال اللہ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) اور قال رسول اللہ (رسول اللہ نے کہا) کہنے میں ہے۔

پنجاب کے بعض لوگوں کا حال معلوم ہوا کہ وہ اباحت سود کی کوشش دلائل شرعیہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے متعلق ایک مرتبہ انجمن نعمانیہ لاہور کے وعظ میں کہا کہ اگر تم کو سود کھانا ہی ہے تو کھاؤ لیکن اس کو حرام سمجھو۔ گناہ کو حلال سمجھنے سے تو یہ پھر بہتر ہے اور تم جو ایک فقہی روایت کے اتباع کا اس باب میں دعویٰ کرتے ہو تو یہ اتباع شریعت نہیں اتباع ہوائے نفسانی ہے۔ ہم تو متبع جب سمجھتے کہ تمام امور میں فقہ کا اتباع کامل ہوتا۔ کیا تمام فقہ میں سے آپ کو یہی مسئلہ عمل کرنے کے لئے ملا ہے۔

یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی نے کسی آزاد سے پوچھا تھا کہ میاں روزہ رکھو گے کہا بھائی ہمت نہیں ہے۔ جب دن ختم ہوا پوچھا کہ افطاری کھاؤ گے کہنے لگے کہ افطاری بھی نہ کھائیں تو کیا بالکل کافر ہی ہو جائیں۔ اور جیسے کسی طفیلی سے پوچھا تھا کہ قرآن مجید میں سے تم کو کون سی آیت پسند آئی ہے کہا کلوا واشربوا (کھاؤ اور پیو) پھر پوچھا دعاؤں میں کون سی دعا تم کو اچھی معلوم ہوتی ہے کہا ربنا انزل علینا مائدۃً من السماء (اے رب ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما) صاحبو! یہ فقہ پر عمل نہیں ہے یہ ہوائے نفسانی پر عمل ہے۔

ایک شخص ساس سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ ایک مولوی صاحب کو ایک ہزار روپیہ دیا

کہ کسی ترکیب سے اس نکاح کو جائز کر دیں۔ انہوں نے ایک ہزار روپیہ لے کر نکاح کر دیا اور تاویل یہ کی کہ بیوی شرک و بدعت میں مبتلا تھی اس لئے اس سے نکاح ہی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے یہ ساس نہیں ہوئی۔

سینکڑوں واقعات ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حق تعالیٰ کے ساتھ بھی دھوکہ کا معاملہ کرتے ہیں اسی واسطے حق تعالیٰ نے صرف **یحکموک** (یہ لوگ اپنے جھگڑے کا آپ تصفیہ کرائیں) پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک تو یہ فرمایا ثم **لایجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت** یعنی حضورؐ کے فیصلے کے بعد اپنے دلوں میں آپ کے فیصلے سے کوئی تنگی نہ پائیں اور پھر عدم وجدان حرج کا بڑا دعویٰ بھی کافی نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ دوسری بات **ویسلموا تسلیما** (اور پورے طور سے تسلیم کر لیں) بھی فرمائی۔ یعنی علامت تنگی قلب نہ ہونے کی یہ ہے کہ اس پر عمل بھی نہایت مضبوطی سے شروع کر دیں ورنہ نرے دعوے سے تو کوئی شخص بھی عاجز نہیں ہے اس لئے اس کی یہ علامت بیان فرمائی۔

یہ حاصل ہے آیت شریفہ کا اس آیت نے اس کا فیصلہ کر دیا کہ ایمان اس وقت تک میسر نہیں ہوتا جب تک کہ احکام شرعیہ کو دل سے نہ مانے اور کسی قسم کی دل میں تنگی نہ ہو۔ اور اس طرح دل سے ماننے کی علامت یہ ہے کہ عمل شروع کر دے اور اگر دل میں تنگی ہوئی یا تسلیم نہ کیا تو مومن نہیں ہے۔

آج کل کی حالت

دیکھئے خدا تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں اور آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے احکام شرعیہ کو صرف چھوڑا ہی نہیں بلکہ احکام سے مزاحمت کرتے ہیں۔ صدقہ فطر کے بارہ میں ایک لڑکے نے یہ کہا تھا کہ کیا اس گرانی میں بھی ڈیڑھ سیر ہی گیہوں واجب ہے۔ پہلے تو اناج ارزاں تھا اس وقت کم قیمت میں آتا تھا۔ اب اس قدر واجب ہونا چاہئے جتنا اس وقت میں آ جائے۔ غضب ہے احکام سلطنت میں کوئی شخص معارضہ نہیں کرتا اور احکام شرعیہ میں ہر شخص جسارت کرتا ہے۔

ایک مسئلہ فرائض کا میرے پاس آیا۔ اس میں ایک بیوی ایک بیٹی ایک عصبہ تھا۔ مسئلہ کا جواب سن کر بیوی اور بیٹی کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے (توبہ توبہ) یہ عصبہ کی کہاں شاخ لگا دی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ عصبہ نہ ہونا چاہئے میں نے ان سے پوچھا کہ اگر تم خود عصبہ ہو تو

اس وقت کیا رائے دو۔ اس وقت تو یہی کہیں کہ سبحان اللہ شریعت میں کیسا عدل اور حق رسانی ہے کہ دور دور کے رشتے کی بھی رعایت رکھی ہے۔

ایک اور قصبہ کا قصہ ہے کہ ایک شخص کی ہمشیرہ کا نکاح کسی شیعی سے ہوا وہ ہمشیرہ مرگئی اور اس نے خاوند اور دو بھائی وارث چھوڑے۔ بھائی نے چاہا کہ خاوند کو حصہ نہ دوں۔ چنانچہ ایک استفتاء تیار کیا کہ شیعہ مرد کا نکاح سنیہ عورت سے ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ مکر اس لئے کیا کہ نکاح جائز نہ ہوگا تو وہ شوہر نہ ہوگا تو تمام جائیداد میرے ہی پاس رہے گی اور اس کی کچھ پروا نہیں ہوئی اور نہ غیرت آئی کہ اتنے دنوں تک بہن بلا نکاح ایک غیر مرد کے پاس رہی۔

شریعت کو لوگوں نے موم کی ناک سمجھ رکھا ہے جس طرح چاہا توڑ لیا۔ غرض اخیر فیصلہ ہوائے نفسانی پر کرتے ہیں اور اگر شریعت سے ملے تو شریعت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اگر شریعت سے حصہ نہ ملے تو عدالت میں جاتے ہیں کہ بھائی ہم تو گنہگار ہیں بال بچے والے ہیں۔ ہم سے شریعت پر کیسے عمل ہوسکتا ہے۔ شریعت پر تو وہ عمل کرے جس کے نہ جورو ہو نہ اولاد دم نقد ہو جس طرح چاہے اور دنیادار کو تو ہر قسم کی ضرورتیں پیچھے لگی ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے تاجر اور امراء کا خیال ہے کہ شریعت پر عمل کرنے سے دنیا کے کام اٹکتے ہیں۔ مال جاتا رہتا ہے کمائی نہیں ہوسکتی ہے۔

میں اس کے جواب میں ایک موٹی سی مثال پیش کرتا ہوں وہ یہ کہ مثلاً ایک حاکم مالک خزانہ ہے اور اس خزانہ کی کنجیاں اس حاکم کے پاس ہیں تو اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ خزانے میں سے کچھ مل جائے تو اس کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے ظاہر ہے کہ ہر عاقل یہی تجویز کرے گا کہ اس حاکم کو خدمت و اطاعت کر کے راضی کرنا چاہئے اور اگر اس کو ناراض کر دیا تو ہرگز نہ ملے گا بلکہ جو دیا ہے وہ بھی چھن جائے گا اسی طرح حق تعالیٰ خزائن کے مالک ہیں اور ان کی کنجیاں اسی کے قبضہ میں ہیں پس اگر آپ اس میں سے کچھ لینا چاہتے ہیں تو اس کی اطاعت اختیار کیجئے۔ جب وہ نافرمانی کی حالت میں بھی دیتے ہیں تو فرمانبرداری کی حالت میں کیوں نہ دیں گے اور ان کی شان رزاقیت تو وہ ہے کہ اگر رو رو کر یہ دعا کرو کہ ہم کو رزق نہ دو تو ان کو تمہارے ساتھ اس قدر محبت ہے کہ وہ یہ دعائیں ہرگز نہ قبول فرمائیں گے تو یہ کہنا کہ اتباع شریعت سے دنیا نہ ملے گی اس کے تو یہی معنی ہیں کہ مالک خزائن کے راضی کرنے سے تو خزانہ نہ ملے گا اور ناراض کرنے سے ملے گا کیسی الٹی بات ہے۔

صورت و حقیقت کا فرق

اگر آپ کہیں کہ ہم تو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ فرمانبرداروں کے زیادہ کام اٹکتے ہیں کوئی تنگ دست ہے کوئی بیمار ہے غرض فرمانبرداروں پر زیادہ مصائب ہیں جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک اس کی حقیقت و روح ہوتی ہے مال اور صحت اور جاہ یہ کامیابی کی صورت ہے اور حقیقت و روح اس کی راحت و جمعیت قلب ہے۔ مال اور جاہ و صحت سب سے مقصود اطمینان اور راحت ہے اگر سب کچھ ہو لیکن قلب پریشان ہو تو اس کو اہل دنیا بھی کامیابی شمار نہیں کرتے۔

چنانچہ اگر ایک شخص کے یہاں مال و دولت حشمت و شوکت سب کچھ ہو اور اس کو پھانسی کا حکم ہو جائے اور اس کے مقابلے میں ایک شخص فرض کیا جائے کہ جس کے ایک پیسہ نہیں ہے اور مزدوری کر کے اطمینان کے ساتھ اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس سے اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص کی تمام دولت تم کو ملے گی۔ اگر بجائے اس کے تم پھانسی پر چڑھ جاؤ اور یہ اقرار کر لو کہ قاتل میں ہوں وہ ہرگز منظور نہ کرے گا اور کہے گا کہ میں دولت کو لے کر کیا چولہے میں ڈالوں گا جب میری جان ہی نہ ہوگی تو ایسی دولت کو کیا کروں گا اور اس دولت مند سے اگر پوچھا جائے کہ تم کو خلاصی ہو جائے گی مگر اس شرط سے کہ اس شخص کا فقر و فاقہ تم کو ملے گا تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گا معلوم ہوا کہ کامیابی کی حقیقت مال و جاہ و صحت نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کی اطمینان اور راحت قلب ہے۔

پس ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر اہل اللہ پر فقر و فاقہ اور مصائب خواہ کسی قدر ہوں ان کا قلب پریشان نہیں ہوتا اور نافرمان کو کتنی ہی عیش و عشرت ہو لیکن اس کا قلب ہمیشہ پریشان ہے۔ خاص کر مسلمان کو تو نافرمانی میں آرام ملتا ہی نہیں کیونکہ اس کو وہاں کا بھی کھٹکا لگا ہے تو اس کا گناہ تو اور بھی بے لذت ہے۔

اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ فرمانبرداری سے روح عیش میسر ہوتی ہے ظاہری ناداری اور تنگ دستی اس کو پریشان نہیں کرتی۔ کیمیاگر اگرچہ مفلس ہو لیکن وہ ہر وقت خوش ہے کہ جب چاہوں گا سونا بناؤں گا اسی واسطے بڑے بڑے والیان ملک اور حکام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ پس صاحبو! جب کہ وہ کیمیا جو تانبے کو سونا بنا دیتی ہے تو حقیقی کیمیا یعنی حق

تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں کیا یہ اثر نہ ہوگا پس یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی اور یہ ثابت ہوگیا کہ حقیقی کامیابی اتباع شریعت میں ہی منحصر ہے۔

فقدان عظمت شریعت

اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے **فلاو ربک** میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تین شانیں بیان فرمائی ہیں۔ عظمت وجلال محبوبیت محسنیت چنانچہ تفصیلاً اول گزر چکا ہے اور آگے مقصود کے اندر بھی تین امر کا بیان ہے۔

پہلا:۔ **یحکموک**

دوسرا:۔ **ثم لایجدوا فی انفسھم حرجاً**

(یعنی آپ کے فیصلے کے بعد دلوں میں تنگی نہ پائیں)

تیسرا:۔ **ویسلموا تسلیما** (پورے طور پر تسلیم کرلیں)

یہ تینوں امر حضورؐ کے اوصاف ثلثہ سابقہ پر مرتب معلوم ہوتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عظمت شان پر تو **یحکموک** (یہ لوگ آپ کو حکم بنالیں) بنی ہے۔ اس لئے کہ حاکم اسی کو بناتے ہیں جو عظیم الشان ہو اس مقام پر ایک امر قابل غور ہے کہ آج کل جو لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کیا ہے کہ احکام شریعہ کی علتیں دریافت کرتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے حالانکہ احکام سلطنت کی وجوہ دریافت نہیں کرتے سو اس کی وجہ یہی ہے کہ احکام کی عظمت قلب میں ہے اور حضور کی عظمت نہیں ہے۔ عظمت وہ شے ہے کہ علت کا سوال تو کیا معنی خطرہ بھی نہیں آتا۔ کبھی کسی نے اس کی وجہ دریافت نہیں کی کہ رسیدی ٹکٹ اگر خط پر لگا کر ڈاک میں چھوڑ دیا جائے تو خط بیرنگ کیوں ہو جاتا ہے حالانکہ محصول پورے سے بھی زیادہ دیا ہے اگر کوئی پوچھے بھی تو یہی جواب ملتا ہے کہ سرکاری حکم ہے۔ بخلاف احکام شرعیہ کے کہ اس میں ہر مسئلے کی علت پوچھتے ہیں یہ صاف دلیل ہے کہ حاکم شرع کی دل میں عظمت نہیں ہے۔ صاحبو! افسوس ہے کہ مسلمان ہوکر احکام میں چوں وچرا کرو۔

لایجدوا فی انفسھم حرجاً

(اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں) محبوبیت کا مقتضا ہے کہ محبوب محب کو اگر یہ کہے کہ اپنے سر میں جوتیاں مارتے ہوئے بازار کو نکل جاؤ تو اگر محبؐ صادق ہے تو اس سے عار و

تنگ نہ کرے گا اس لئے کہ محبت کا یہ خاصہ ہے کہ عار و ننگ نہیں رہا کرتی بلکہ اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ یہ امر عقل کے خلاف ہے تب بھی اس کے امتثال (فرمانبرداری) میں کوئی تنگی نہ ہوگی۔ بلکہ تنگی تو کیا اس کے امر کو اپنا فخر سمجھتا ہے۔

یسلموا تسلیما (پورے طور پر تسلیم کرلیں) محسنیت پر متفرع ہے کہ طبع سلیم کا مقتضی محسن کے امر کو تسلیم کرنا اور اس میں چوں و چرا نہ کرنا ہے۔

اس مقام پر ایک طالب علمی شبہ یہ ہے کہ کیا اگر ان امور ثلثہ میں سے کوئی امر کسی کے اندر مفقود ہوگا تو وہ مومن نہ ہوگا؟

بات یہ ہے کہ تحکیم اور عدم وجدان حرج اور تسلیم کے مراتب مختلف ہیں جس مرتبے کی تحکیم اور عدم وجدان حرج اور تسلیم ہوگی اسی مرتبے کا مومن ہوگا اور مراتب تین ہیں۔

ایک مرتبہ اعتقاد کا ہے الحمدللہ کہ سب مسلمانوں میں یہ مرتبہ امور ثلثہ (تینوں باتوں کا) موجود ہے اور یہ ادنی ایمان ہے اگر کسی کے اندر مرتبہ اعتقادی میں بھی یہ امور نہ ہوں تو وہ واقعی مومن نہیں ہے۔

دوسرا مرتبہ عمل کا ہے کہ امور ثلثہ پر عمل بھی ہو یعنی اپنے مقدمات اور منازعات میں شریعت کی طرف رجوع ہو عقلاً تنگی نہ ہو اور اس پر عمل ہو اگرچہ طبعاً تنگی ہو اور یہ اوسط درجہ ایمان کا ہے۔

تیسرا مرتبہ طبیعت کا ہے یعنی امور ثلثہ طبعی ہو جائیں یہ اعلی درجہ ایمان کا ہے اور ایسا شخص مومن اکمل ہے۔

ایمان کے درجات

بہرحال جیسے ایمان کے درجات ہیں ایسے ہی ان امور کے بھی درجے ہیں۔ اب ہر شخص کو اپنے اندر غور کر لینا چاہئے کہ میں کس درجہ کا مومن ہوں اور کس درجہ کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ ضرورت تو ہر مطلوب میں کمال ہی کی ہے۔ اب اپنی حالت دیکھ لے کہ اگر صرف درجہ اعتقاد کا ہی ہے تو اس کو مومن کہا جائے گا لیکن کمال ایمان کے اعتبار سے وہ مومن نہ کہلائے گا اور عرفاً بھی وہ مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

دیکھو اگر کسی کے پاس ایک روپیہ ہو تو اس کو مالدار نہیں کہتے مالدار اسی کو کہتے ہیں

جس کے پاس بہت سا مال ہو۔ پس ایسے شخص کو کمال کی طرف ترقی کرنا چاہئے صاحبو! غضب کی بات ہے کہ اگر مال دنیا اگر قلیل ہو تو اس پر تو قناعت نہیں اور ہر وقت یہی فکر ہے کہ یہ بڑھ جائے اور دین کی ترقی کی فکر نہیں۔

اری الملوک بادنی الدین قد قنعوا وما اراھم رضوا فی العیش بالدون

بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ ادنیٰ و قلیل دین پر قانع ہیں اور میں نے ان کو نہیں دیکھا کہ قلیل دنیا پر انہوں نے اکتفا کیا ہو۔

فاستغن بالدین عن دنیا الملوک کما استغنی الملوک بدنیاھم عن الدین

سو تم دین کی وجہ سے بادشاہوں کی دنیا سے مستغنی رہو جیسا کہ بادشاہ اپنی دنیا کی وجہ سے دین سے مستغنی ہیں۔

حالانکہ دین کا کمال تو اس سے زیادہ اہتمام کے قابل ہے۔ غرض ایمان جب ہی کامل ہوگا کہ تحکیم اور عدم وجدان حرج اور تسلیم کا درجہ کامل ہو۔

اب کمال ایمان کی تحصیل کا طریقہ اور دستور العمل مختصراً معلوم کر لینا چاہئے تاکہ اس پر عمل کرنے سے یہ درجہ ایمان کا میسر ہو۔ وہ طریقہ مرکب ہے تین اجزا سے اول تو علم دین خواہ کتب درسیہ کی تحصیل سے ہو یا اردو رسائل سے یا علماء سے سن کر دوسرے صحبت اہل اللہ کی تیسرے یہ کہ چوبیس گھنٹہ میں سے ایک گھنٹہ نکال کر اس میں بیٹھ کر یہ سوچا کرو کہ ہم کو ایک روز یہ دنیا چھوڑنا ہے اور قبر میں جانا ہے اور وہاں دو فرشتے آئیں گے اور سوال کریں گے پھر قبر سے اٹھ کر حساب و کتاب ہوگا۔ غرض مرنے سے لے کر دخول جنت یا جہنم تک جو جو واقعات پیش آنے والے ہیں سب کو مفصلاً سوچو۔ اسی طرح ایک گھنٹہ روزانہ مراقبہ کر لیا کرو۔ حق تعالیٰ سے امید ہے کہ دین و دنیا دونوں کی درستی اس دستور العمل پر عمل کرنے سے ہوگی۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے آمین۔

یارب العالمین وصلے اللہ تعالیٰ علے خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

شعب الایمان

یہ وعظ تاج محمد خان صاحب کے مکان واقع جلال آباد میں ۵ ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ
بروز جمعرات ہوا مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمد و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ و حدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمد اعبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علی الہ واصحابہ و بارک وسلم۔ اما بعدفقد قال اللہ تعالیٰ ان المسلمین والمسلمٰت والمؤمنین والمؤمنٰت والقٰنتین والقٰنتٰت والصادقین والصٰدقٰت والصابرین والصابرٰت والخاشعین والخاشعت والمتصدقین والمتصدقٰت والصآئمین والصآئمٰت والحٰفظین فروجھم والحٰفظٰت والذاکرین اللہ کثیراً والذاکرات اعداللہ لھم مغفرۃ واجراً عظیما۔

تحقیق اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں راستباز مرد اور راستباز، عورتیں صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، کثرت سے خدا کی یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

مسئلہ مساوات نساء

قرآن شریف کے درمیان تین قسم کی آیتیں ہیں یوں تو آیات قرآنی کے بہت سے

اقسام ہیں کوئی مکی، کوئی مدنی، کوئی لیلی کوئی نہاری، کوئی ناسخ، کوئی منسوخ مگر یہ تقسیم ایک خاص اعتبار سے ہے کہ اس کے لحاظ سے آیات قرآنی کی تین ہی اقسام ہیں۔

ایک وہ ہیں جن میں خطاب صرف مردوں ہی کو کیا گیا ہے گو عورتیں بھی تبعاً اس میں شامل ہیں اور چونکہ عورتیں محکوم ہیں اس لئے ان کو جداگانہ خطاب نہیں کیا گیا نیز چونکہ مرد حاکم ہیں وہ اپنے زور حکومت سے خود کام لے لیں گے جیسے بڑے چھوٹے سے کام لیتے ہیں پس جب مرد حاکم ہیں تو ہمارے عرف وعادت کے موافق جو حکم حاکم کے لئے ہوتا ہے محکوم کے لئے بھی ہوتا ہے محکوم پر جداگانہ حکم کی ضرورت نہیں ہوتی اسی عادت کے موافق قرآن میں خطاب کیا گیا ہے تو تمام معاملات میں مردوں کو خطاب کافی ہے عورتوں کو الگ خطاب کرنے کی ضرورت نہیں اور یہاں سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ عورتوں کا کیا درجہ ہے کہ ان کے لئے علیحدہ حکم کی ضرورت نہیں جو حکم مردوں کو دیا جائے گا عورتیں بھی اس کی مکلف ضرور ہوں گی قرآن کے اس طرز خطاب سے بھی عورتوں کا محکوم ہونا بخوبی معلوم ہے تو مسئلہ مساوات نساء میں جو نزاع ہو رہا ہے اس کا فیصلہ یہاں سے ہوسکتا ہے۔

آج کل کے نوجوانوں کا یہ دعویٰ مساوات محض زبان سے ہی ہے عمل میں وہ بھی برابری نہیں کر سکتے۔ ایک متمدن قوم کو دیکھ لیا کہ وہ عورتوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں تو خود بھی اس کا اتباع کرنے لگے مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں ایسے لوگوں کی تقلید پابند مذہب قوم کیسے کر سکتی ہے پھر ان کے اس طرز و انداز کے نتائج پر نظر نہ کی کہ اس مساوات کا اثر ان کے حق میں مفید ہو یا مضر غرض بالکل کورانہ تقلید کر کے مساوات نساء کے قائل ہونے لگے مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ متمدن قوم جس کی تقلید آج کل ہمارے نوجوان کر رہے ہیں خود اس مساوات کو نباہ نہ سکی۔ چنانچہ عورتیں پارلیمنٹ کی ممبری چاہتی ہیں مگر یہ درخواست منظور نہیں کی جاتی جس کی وجہ سے ان عورتوں نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے غرض اہل یورپ بھی مساوات نہ کر سکے اور کیونکر کریں جب خدا ہی نے عورت کو تشریعاً و تکویناً محکوم بنایا ہے تو اس کو برابر کون کر سکتا ہے کیونکہ خدا کا عورتوں کو محکوم بنانا جب کہ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے دلیل عقلی سے بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس بات پر سارا عالم متفق ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں بہت سی باتوں میں اس کا کسی کو انکار نہیں یہاں تک کہ مدعیان

مساوات اہل یورپ بھی آخر کار اس کو مان گئے کہ بعض عہدوں کے لائق عورتیں ہرگز نہیں اور جن پر ساری دنیا کا اجماع ہو وہ غیبی تقاضا اور فطری قانون ہوتا ہے۔

عقلی دلیل کے علاوہ حسی دلیل بھی اس بات پر قائم ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں چنانچہ مشاہدہ ہے کہ خدا نے عورت و مرد کی خلقت میں کتنا فرق رکھا ہے مرد جسمانی قوت میں عورت سے زیادہ ہے۔ عقل مرد کی زیادہ ہوتی ہے آواز مرد کی بلند ہوتی ہے مرد عورت سے رائے میں زیادہ پختہ ہوتا ہے اور عورت کو دیکھا جائے تو اس کی ہر چیز مرد سے کم نظر آتی ہے ظاہری اعضاء کی بناوٹ میں بھی اور عقل و رائے میں بھی۔ قرآن میں حق تعالیٰ کفار کی خرابی عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ام اتخذ مما یخلق بنٰت و اصفکم بالبنین

یعنی کیا خدا تعالیٰ اپنے لئے مخلوقات میں سے لڑکیاں تجویز کی ہیں اور تم کو لڑکوں کے ساتھ منتخب کیا ہے۔

فرماتے ہیں۔

او من ینشؤا فی الحلیة و ھو فی الخصام غیر مبین

کہ خدا تعالیٰ کے لئے تجویز بھی کیں تو لڑکیاں جو ابتداء سے زیور اور گہنے میں پرورش پاتی ہیں۔

اور دوسرے یہ کہ قوت بیانیہ میں نہایت ضعیف ہیں یہ دو چیزیں عورتوں میں نقص کی ایسی ہیں کہ آنکھوں سے دیکھ لو واقعی لڑکیوں میں ابتداء ہی سے زیور کا شوق ہوتا ہے اور یہ دلیل ہے ان کی محدودیت نظر کی چنانچہ خود مردوں ہی میں دیکھ لو جس کو زینت کا شوق ہوگا اس کے خیالات پست اور محدود ہوں گے اور جو سادہ ہوگا اس کے خیالات عالی ہوں گے اور اس کا راز یہ ہے کہ لباس وغیرہ ضرورت کی چیزیں ہیں اصل مقصود نہیں اب سمجھ لینا چاہئے ظاہر ہے کہ ہر عاقل ضرورت کی چیز سے بقدر ضرورت تعلق رکھے گا اور زیادہ کوشش اصل مقصود میں کرے گا وہ شخص نہایت پست خیال ہے جو غیر مقصود چیزوں کی دھن میں لگا رہتا ہے پس لڑکیوں کو زیور اور زینت سے رغبت ہونا ان کی پستی خیالات کی دلیل ہے مرد اکثر سادہ ہوتے ہیں ہاں جن مردوں پر زنانہ پن غالب ہو یہاں ان کا ذکر نہیں تعلیم یافتہ قوموں

کو بھی دیکھ لیجئے تجربہ کار لوگوں کا بیان ہے کہ ان کی عورتیں باوجود تعلیم حاصل کر لینے کے پھر مردوں سے بہت کم ہیں۔

ایک شخص کہتے تھے کہ اگر ان میں کسی عورت کو کچھ بیان کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ چند جملے کہہ کر بیٹھ جاتی ہے مردوں کی طرح اس کی گفتگو میں کبھی سپیٹ نہیں ہوتی تو یورپ کی عورتیں بھی لیاقت علمی میں مردوں کے برابر ہرگز نہیں یہ دوسری بات ہے کہ وہ دستکاری میں یا کسی خاص سلیقہ میں برابر یا زیادہ ہوں غرض جس کو قدرت نے محکوم بنایا ہوا اس کو مساوی کون کر سکتا ہے۔

عورت کی حکومت کے نتائج

یہ محکومیت عورتوں کے لئے خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور یہ اس لئے کہا گیا تا کہ عورتیں دلگیر نہ ہوں نعمت اس لئے کہ اگر دنیا میں سب برابر درجہ کے ہوتے تو انتظام قائم نہ رہ سکتا تو یہ ضروری بات تھی کہ ایک گھٹا ہوا ہو اور دوسرا بڑھا ہوا۔ اگر سارے حاکم ہی ہوتے تو کاشتکاری کون کرتا عمارت کون بناتا آٹا کون پیستا غرض دنیا کا انتظام اس کو چاہتا ہے کہ سب ایک درجہ کے نہ ہوں بلکہ ایک بادشاہ ہو اور ایک وزیر کوئی حاکم کوئی رعیت' کوئی تاجر کوئی مزدور' یہ فرق مراتب ضروری تھا ہاں اس فرق مراتب کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ عورتیں بڑھی ہوئی ہوتیں مرد گھٹے ہوئے مگر چونکہ ان کی عقل ورائے ضعیف ہے اس لئے تمدن خراب ہو جاتا وہ تو خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتیں دوسروں پر حاکم بن کر ان کی نگہبانی تو کیا کرتیں بیوقوف کے لئے یہی مصلحت ہے کہ کسی کے تابع ہو کر رہے اگر کسی بے وقوف کو حاکم بنا دیا جائے تو دیکھ لو کیا انجام ہوگا خود بھی ہلاک ہوگا دوسروں کو بھی تباہ کرے گا اگر چھوٹے بچے کو ماں باپ کے تابع نہ کیا جائے تو وہ یقیناً ہلاک ہوگا کیونکہ اس کو اپنے نفع اور نقصان کی کچھ خبر نہیں تو بے وقوف کے لئے کسی کا ماتحت ہونا ہی مصلحت ہے تا کہ دوسرا اس کی روک ٹوک کر سکے۔

یہی راز ہے اس حدیث کا جو حضورؐ سے مروی ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جس کی حاکم عورت ہو۔ کسری شاہ فارس کی بیٹی جب بادشاہ ہوئی تھی اس پر آپ نے یہ ارشاد

فرمایا تھا یہیں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج کل ہماری خرابی اور خستگی کا باعث ایک یہ امر بھی ہے کہ ہم نے عورتوں کو اپنے گھر کا حاکم بنا دیا ہے اگر چہ یہ چھوٹی سی حکومت ہے مگر اس کا بھی نتیجہ خراب ہی ہے مثلاً شادی بیاہ کی ساری رسمیں عورتوں ہی کی خواہش سے پوری کی جاتی ہیں جس کا انجام ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے کس قدر خاندان ان رسوم شادی میں تباہ ہو گئے اور یہ سارا فساد عورتوں کے حاکم بنانے کا ہے عورتوں کی دلجوئی کرنا ضروری ہے مگر ان کے تابع بننا برا ہے اس وقت سارا مال و اولاد عورتوں کے قبضہ میں ہم نے کر دیا ہے پھر دیکھ لیجئے کہ روپیہ کیسے بے جا مواضع میں صرف ہوتا ہے اور بچوں کی صحت خراب اخلاق تباہ ہو رہے ہیں عورتیں بچوں کو جو چاہیں کھلاتی پلاتی ہیں جس سے ان کی زندگی بیماری میں کٹتی ہے محبت و پیار حد سے زیادہ کرتی ہیں جس سے لڑکے شوخ ہو جاتے ہیں تو اپنے مال اور اولاد کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہئے عورتوں کو حاکم کر دینا سخت باعث تنزل ہے جس کو جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم پہلے سے فرما گئے ہیں۔

اس حدیث پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض متمدن قوموں میں عورتیں حاکم ہوتی ہیں اور بعض جگہ اب بھی ہیں اور پھر ان کو ترقی ہے۔ اول تو مال و مادیات کی ترقی فلاح نہیں فلاح قومی کی اصل ترقی اخلاقی و علمی و روحانی ہے تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جن قوموں میں عورت بادشاہ ہے ان کو یہ ترقی نصیب ہوئی دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان کی ترقی ترقی ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ اس کا اثر ہے کہ ان میں عورتیں خود مختار حاکم ہیں محض ضابطہ کی حاکم ہیں اصل بادشاہ پارلیمنٹ ہے تو ایسی کوئی حکومت نہیں نام کی بادشاہت ہے اس سے مضمون حدیث پر کوئی غبار نہیں آ سکتا۔

عورتوں کا عذر لنگ

میں نے اس وقت اس حدیث کو اسی لئے پڑھ دیا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ اس وقت جو ہم نے گھر باہر کا حاکم عورتوں کو بنا رکھا ہے اس کو بھی ہماری پستی اور تنزل میں دخل ہے اور آج کل ہم پر یہ ایسی تباہی آ رہی ہے کہ بجائے متبوع بننے کے عورتوں کے بالکل تابع ہو گئے اور غضب یہ ہے کہ عذر کے موقع میں کہا جاتا ہے کہ صاحب کیا کریں عورتیں نہیں مانتیں

سو یہ کہنا کتنی کم ہمتی کی بات ہے کہ اگرچہ یہ بھی ایک بہانہ ہے جس بات کو خود ان کا جی چاہتا ہے اسی میں عورتوں کے کہنے سے مجبور ہو جاتے ہیں ورنہ جس بات کو ان کا دل نہ چاہے مثلاً بعض لوگ اپنی عورتوں کو باپ کے گھر جانے نہیں دیتے۔ اس میں عورتیں لاکھ لاکھ تقاضا کریں کبھی نہیں مانتے۔ پس اول تو یہ عذر بالکل غلط ہے اور اگر سچ ہے تو اور بھی برا ہے کہ مرد ہو کر بیوی کے غلام بن گئے۔

غرض عورت کے لئے یہی مصلحت ہے کہ مرد کے تابع ہو کر رہے اور شریعت نے بھی عورتوں کو محکوم ہی بنایا ہے چنانچہ ارشاد ہے **الرجال قوامون علے النساء** (مرد حاکم ہیں عورتوں پر) اور یہی وجہ ہے کہ احکام میں اکثر مردوں کے خطاب پر اکتفا کیا گیا ہے اور بعض جگہ خاص عورتوں کو بھی خطاب کیا ہے کیونکہ یا تو ان کی دلجوئی مقصود تھی کہ عورتیں دلگیر نہ ہوں کہ ہمارا ذکر قرآن میں نہیں آتا چنانچہ بعض آیتوں میں اس وجہ سے صیغہ مونث استعمال کرنا احادیث سے مفہوم ہوتا ہے یا یہ وجہ ہوئی کہ واقعہ کو ان ہی سے تعلق تھا اور کہیں مخلوط طور پر خطاب ہے جیسا کہ یہ آیت جس کو میں نے ابھی تلاوت کی ہے اور ان آیتوں سے مساوات نساء کا ظاہر میں شبہ ہو سکتا ہے کیونکہ ایک ہی مادہ اور ایک ہی صفت دونوں کے لئے الگ الگ بیان کی گئی ہے مگر غور کے بعد یہ شبہ زائل ہو جاتا ہے کیونکہ صیغہ مذکر کو مقدم کیا گیا ہے تو امام و مقتدی اگرچہ ایک ہی جگہ برابر کھڑے ہوں مگر پھر بھی بڑا فرق ہوتا ہے کہ ایک امام ہے اور ایک امام نہیں چونکہ اس وقت مرد اور عورت دونوں وعظ سن رہے ہیں اس لئے ایسی ہی آیت کو پڑھنا مناسب سمجھا تا کہ عورتوں کا جی بھی خوش ہو جائے کہ ہمارا ذکر بھی مردوں کے ساتھ قرآن میں ہے اور نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہمارے ذمہ بھی کچھ احکام ہیں جیسے مردوں کے ذمہ ہیں یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے ذمہ تو بس مردوں کی خدمت ہے۔

چنانچہ بعض دفعہ جو ان کو نماز کے لئے تاکید کی جاتی ہے تو کہتی ہیں کہ ہم کو فرصت کہاں تم تو مرد ہو نہ بچوں کا ساتھ نہ برتن ہانڈی کا کام جھاڑے پونچھے بیٹھے رہے ہمارا تو بچوں کا ساتھ ہے برتن ہانڈی میں ہاتھ رہتے ہیں کپڑے ناپاک رہتے ہیں ہم نماز کیسے پڑھیں۔ ان باتوں سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ہانڈی چولہا کرنا بچوں کا پیشاب پاخانہ دھونا تو ان کے ذمہ ہے نماز ان کے سر سے معاف ہے۔ استغفر اللہ ان سے

کوئی پوچھے کہ جب چار عورتیں جمع ہو کر دنیا بھر کے قصے لے کر بیٹھتی ہیں اور باتوں میں پہروں مصروف رہتی ہیں اس وقت ان فضول قصوں کے لئے کہاں سے وقت نکل آتا ہے۔ باقی کپڑوں کے ناپاک رہنے کا عذر بھی بالکل بیہودہ ہے اگر ایک جوڑا نماز کے لئے الگ کر دیا جائے تو کچھ مشکل نہیں۔

اس وقت یہ آیت اختیار کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ عورتوں کے ان فاسد خیالات کی اصلاح ہو جائے یہ تمہید تھی اس آیت کی۔ اس میں اگر کوئی بات عورتوں کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو مضائقہ نہیں کیونکہ تمہید کا سہل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

مغفرت کی ضرورت وصورت

اب اصل مضمون کو سہل طریقہ سے بیان کروں گا تا کہ عورتوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ ہمارے ذمہ کیا کیا احکام ہیں۔ نیز اس آیت کے خاتمہ سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ جو لوگوں کا خیال ہے کہ جو کچھ چاہو کرو اللہ غفور رحیم ہیں تو اس وعدہ مغفرت میں خاص شرطیں ہیں۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ جو کچھ چاہو کرو پھر بھی اجر عظیم ہوگا بلکہ مغفرت کے لئے کچھ قیود ہیں اب سمجھو کہ وہ باتیں کیا ہیں جن پر مغفرت و اجر کا وعدہ ہے مگر پہلے یہ بات بھی معلوم کر لینی چاہئے کہ آیا مغفرت و اجر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں تو ایسا کوئی شخص نہیں ہو سکتا جس کو ان دونوں کی ضرورت نہ ہو۔ کیونکہ جملہ اشیاء دو قسم پر ہیں نافع مضر اور ہر شخص یا تو منفعت کا طالب ہوتا ہے یا مضرت کا دفع کرتا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ جنت سے بہتر کوئی نعمت نہیں اور عذاب دوزخ سے بڑھ کر کوئی عذاب اور مضرت نہیں اور جب چھوٹی سی نعمت کے لینے اور ہلکے سے عذاب سے بچنے کی بڑی کوشش کی جاتی ہے تو اس کے لئے کوشش کیونکر ضرور نہ ہوگی تو کوئی مسلمان بلکہ کوئی شخص ان دونوں سے مستغنی نہیں تو یہ دونوں چیزیں سب کے نزدیک مطلوب ہیں۔ جنت کا حاصل کرنا یہ اجر عظیم ہے اور دوزخ سے بچنا یہ مغفرت ہے کیونکہ جب گناہ معاف ہو گئے تو دوزخ سے نجات ہو جائے گی۔

حق تعالیٰ اس آیت میں ان ہی دونوں باتوں کی تحصیل کا طریقہ بیان فرماتے ہیں کہ اگر دوزخ سے بچنا اور جنت میں پہنچنا چاہتے ہو تو ہم بتلاتے ہیں کہ وہ کیا کیا کام

کرے۔ چونکہ ہر مسلمان پر ثابت ہوگیا کہ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں اس لئے لازم ہے کہ معلوم کریں کہ وہ کون سا طریقہ ہے جس سے جنت ومغفرت حاصل ہو کیونکہ خدا تعالیٰ کا کسی سے کچھ رشتہ تو ہے نہیں جو بدوں کچھ کئے جنت دے دیں جو قانون سے مستحق ہوگا اس کو دے دی جائے گی اور جو مستحق نہ ہوگا اس کو نہیں مل سکتی اگرچہ حق تعالیٰ قانون کے خلاف کرنے پر قادر ہیں مگر ایسا کرتے نہیں کیونکہ اس میں اول تو ساری مصالح فوت اور برباد ہوئی جاتی ہے کیونکہ قانون اسی لئے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور جو کچھ سزا یا انعام کا قانون بیان کیا گیا ہے اس سے مقصود یہی ہے کہ رغبت وخوف کی وجہ سے اچھی طرح احکام پر عمل ہو اب اگر حق تعالیٰ خلاف قاعدہ مستحق انعام کو سزا یا مستحق سزا کو انعام دینے لگیں تو قانون سزا وانعام بالکل رائیگاں اور جو مصلحت تھی وہ بالکل برباد ہوجائے گی اور سزا وانعام کا بیان کرنا بالکل لغو ہوجائے گا جس سے ذات خداوندی پاک ہے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدرت حق تعالیٰ کو ہر طرح ہے کہ چاہے مستحق انعام کو سزا دیں یا مستحق سزا کو انعام دیں مگر وہ ایسا نہیں کریں گے۔

مذہب اور تمدن

میں اس وقت ایسے مسلمانوں سے ملا ہوں جن کا خیال یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کوئی چیز نہیں محض تخویف اور ترغیب کے لئے یہ نام بیان کئے گئے ہیں نعوذ باللہ! ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں جتنی وعیدیں چوری اور زنا، ظلم وستم کفر ومعصیت پر ہیں یہ سب ایسے ہیں جیسے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ چپ رہو ہوا آجائے گا۔ ایسے ہی جتنے انعامات جنت وغیرہ بیان کئے گئے ہیں یہ بھی محض پھسلانا ہے جیسا کہ بچوں کو بہلایا کرتے ہیں۔

میں ان لوگوں سے جواب میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ بات ایک ادنیٰ حاکم کے کلام میں ہونا بھی سخت عیب ہے چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے کلام میں ہو کیونکہ اس کو تو جھوٹ موٹ بہکانا بولتے ہیں اور خدا جھوٹ سے بالکل بری ہے **تعالیٰ اللہ عن ذلک علوا کبیرا** (اللہ تعالیٰ اس سے بالکل بری اور برتر ہے **و من اصدق من اللہ حدیثا** (یعنی خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی) لیکن اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ جنت اور دوزخ محض

ترغیب وترہیب کے لئے ہے اور واقع میں کچھ نہیں تو رغبت ورہبت اسی وقت تک ہوسکتی جب تک کہ مخاطب کو یہ راز معلوم نہ ہو کیونکہ ظاہر ہے کہ بعد اصل حال معلوم ہو جانے کے یہ ترغیب ترہیب ایک غیر واقعی امر سے ہے رغبت اور رہبت بالکل نہیں رہ سکتی پھر ان لوگوں کا اس امر کے معلوم ہونے کا دعویٰ کرنا کہ جنت دوزخ کوئی چیز نہیں سراپا غلط ٹھہرا۔

غرض اول تو اس کے خلاف واقعہ ماننے سے معاذ اللہ کلام اللہ پر لغویت کا دھبہ آتا ہے جس کو کوئی مسلمان کلام الٰہی کے لئے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا پھر جو مقصود شارع کو ان وعیدوں اور انعاموں کے بیان کرنے سے ہے کہ لوگوں کو مکلف ومقید بنایا جائے اس صورت میں ہرگز نہیں حاصل ہو سکتا ایسا شخص جس کا ان وعیدوں کے بارے میں ایسا خیال ہے کہ یہ غیر واقعی ہیں یقیناً ارتکاب جرائم میں دلیر ہوگا اول تو سب کے سامنے جو چاہے کرے گا اور اگر سامنے کرنے میں کسی کا پاس ولحاظ ہوا تنہائی میں تو ہرگز نہ چوکے گا۔

مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص اس خیال کا جنگل میں ہے اور وہاں ایک دوسرا شخص بھی موجود ہے سوائے ان دو شخصوں کے وہاں کوئی نہیں نہ پولیس نہ چوکی کا پہرہ اب فرض کرلو کہ اتفاق سے اس دوسرے شخص کی موت آگئی اور اس کے پاس ایک لاکھ روپے کا نوٹ ہے اور اس کے کاغذات سے اس کا پتہ بھی معلوم ہو گیا کہ فلاں خندان کا اور فلاں شہر کا باشندہ ہے اور یہ بھی اسے خبر ہے کہ ایک اس کا وارث یتیم بچہ ہے یہ سب کچھ ہے مگر اس واقعہ کی کسی کو خبر نہیں کہ یہ شخص کہاں مرا اس کے پاس مرتے وقت کیا سامان تھا نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے نہ مقدمہ چل سکتا ہے بتلایئے ایسی حالت میں یتیم بچہ تک روپیہ پہنچا دینے پر کوئی قوت اس شخص کو بجز خوف خدا و عذاب آخرت کے مجبور کر سکتی ہے؟ اور کیا ایسا شخص جو وعید الٰہی کو محض تخویف سمجھتا ہے اس روپیہ کو اصل مالک وارث تک پہنچا دے گا؟ بالخصوص اس صورت میں کہ اس کو روپیہ کی حاجت بھی ہو۔ یہ اسی شخص کا کام ہے جو خدا کے تمام وعدہ و وعید کو حق سمجھتا ہے اور اس کے دل میں عذاب آخرت کا خوف ہے اس گندہ عقیدہ سے جہاں مصالح شرعیہ برباد ہوتی ہیں مصالح تمدنیہ بھی بالکل فوت ہو جاتی ہیں۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ تمدن کے لئے مذہب کی کس قدر ضرورت ہے صرف حکومت سے تمدن ہرگز نہیں قائم ہو سکتا کیونکہ حکومت کا زور ظاہر تک منحصر ہے دل میں

شائستہ اخلاق مذہب ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں مجھے سخت حیرت ہے کہ تمدن کے مدعی مذہب کی ضرورت سے کیوں ناواقف ہیں۔ اگر تمدن کوئی ضروری چیز ہے تو مذہب اس سے پہلے ضروری ہوگا مذہب کی ضرورت نہ مان کر کوئی تمدن قائم کرنا چاہے تو ناممکن ہے دعویٰ تمدن کے بعد مذہب سے لاپرواہی ایسا ہی ہے کہ۔

یکے بر سر شاخ و بن می برید   خداوند بستان نگہ کرد و دید

باغ کے مالک نے دیکھا کہ ایک شخص ٹہنی کے سرے پر بیٹھا ہوا اسی کی جڑ کاٹ رہا تھا۔

تو یہ لوگ جس تمدن کی شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں اسی کی جڑ کاٹ رہے ہیں پس عجیب بات ہے کہ قول سے تو ضرورت تمدن کی ثابت کی جاتی ہے اور فعل سے اس کی نفی کرتے ہیں۔

غرض آپ کو معلوم ہو گیا کہ جنت و دوزخ واقعی چیزیں ہیں اور یہ اسلام کا مسلمہ مسئلہ ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ مغفرت اور اجر کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔

شرائط مغفرت

اب اس مقام پر حق تعالیٰ نے مغفرت و اجر عظیم کے لئے کچھ شرطیں بیان فرمائی ہیں کہ جو کوئی عذاب سے بچنا چاہے اسے یہ تمام شرطیں پوری کرنی ہوں گی۔ ان میں سے بعض تو ایسی شرطیں ہیں کہ بدوں ان کے حاصل کئے کبھی نجات نہیں پا سکتا اور وہ اسلام و ایمان کی شرط ہے اور بعض ایسی ہیں کہ ان کی بدوں نجات ہو جائے گی مگر بدیر ہو گی اول اصولی شرائط ہیں دوسری فروعی۔ جیسے گورنمنٹ کے جرم دو قسم کے ہیں ایک تو باغی ہونا کہ بادشاہ کو بادشاہ ہی نہ سمجھا جائے یہ جرم اصولی ہے جب تک یہ جرم باقی ہے اس کا مرتکب کبھی قابل معافی نہیں اور ایک جرم فروعی ہے کہ بادشاہ کو بادشاہ مان کر پھر کبھی شرارت نفسانی سے کوئی کام خلاف مرضی شاہ کیا جائے جیسے چوری کی کسی کا مال چھین لیا' کسی کو ضرب شدید پہنچا دی یہاں تک کہ حاکم نے سزا کر دی۔ مگر حکام اس شخص سے ایسے ناراض نہیں ہوتے جیسے باغی سے ہوتے ہیں اور دونوں کے اثر میں بھی بڑا فرق ہوگا کہ جرم فروعی کے مرتکب کو معیاری سزا ہو گی مثلاً اگر دس سال کی قید ہوئی اور وہ زندہ رہا تو چھوڑ دیا جائے گا بخلاف باغی کے کہ اصولی جرم کبھی معاف نہیں ہو سکتا اور اگر وہ اپنی بغاوت سے باز نہ آئے گا تو اس کے لئے

حبس دائمی یا کالا پانی یا قتل تجویز کیا جائے گا دنیاوی قواعد میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عقلاً اصولی جرم قابل معافی نہیں ہوتا اور فروعی جرم اکثر معاف کر دیا جاتا ہے۔

پس اسی قاعدہ کے موافق قرآن شریف میں ارشاد ہوتا ہے۔

ان اللہ لا یغفران یشرک بہ و یغفرمادون ذٰلک لمن یشآء

خدا تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائیں گے اس کے سوا دوسرے گناہ جس کے لئے چاہیں معاف فرمائیں گے۔

اس آیت میں بھی حق تعالیٰ نے مغفرت واجر عظیم کا قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ کن کن شرطوں کے بعد یہ دونوں حاصل ہو سکتے ہیں سب نے پہلے ایمان واسلام کو بیان فرمایا ہے یہ اصل شرط ہے اس کا چھوڑنا اصولی جرم ہے یہ ہرگز معاف نہ ہوگا اور اس کے تارک کو بھی نجات حاصل نہ ہوگی اس کے بعد دیگر فروعی شرائط مذکور ہیں جن کے پورا نہ کرنے سے انسان عذاب کا تو مستحق ہوتا ہے مگر بعد چندے نجات پا جائے گا پس جو لوگ مغفرت واجر عظیم کے طالب ہیں وہ اس آیت کے مضمون کو بغور سن لیں کہ مغفرت کن اعمال سے حاصل ہوگی ہم لوگ صرف اسی پر اکتفا کئے بیٹھے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں ہم یقیناً مستحق مغفرت واجر عظیم ہو گئے یہ بڑا دھوکہ ہے کہ جس نے ہم کو اصلی کام سے روک رکھا ہے جو کہ شرائط کو بجالانا اور پورا کرنا ہے۔

صاحبو بتایئے کہ اگر کوئی باغی کسی شریف وفادار سلطنت کے گھر میں پیدا ہوا ہو تو یہ اس کو کچھ نفع بخش ہو سکتا ہے ہرگز نہیں! اس سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ زیادہ موجب عتاب ہوگا کیونکہ یہ شخص یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ مجھ کو حقوق سلطنت کا پورا علم نہیں تھا۔ ایک باغی کا لڑکا تو تھوڑی دیر کے لئے یہ کہہ سکتا ہے کہ میں بغاوت میں معذور تھ کیونکہ میرا سارا خاندان باغی ہے مجھے حقوق سلطنت کا علم کافی طور پر حاصل نہیں ہو سکا۔ پس معلوم ہوا کہ مسلمان کے گھر پیدا ہونا اس وقت تک کچھ بھی نفع نہیں دے سکتا جب تک کہ اپنے اندر اطاعت کا مادہ نہ ہو۔

البتہ اگر مسلمان کے گھر پیدا ہو کر ہم بھی اطاعت کریں اور احکام کے پابند ہوں تو اس وقت ہم کو اس سے کچھ نفع ہو سکتا ہے کہ ہم مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے تھے جیسے کہ گورنمنٹ کے نزدیک اس شخص کی قدر دوسروں سے زیادہ ہوگی جو خود بھی خیر خواہ سرکاری ہو اور اس کی کئی

پشتیں بھی سلطنت کی خیرخواہ رہ چکی ہوں اور بعض دفعہ اس شخص کی بھی زیادہ وقعت ہوتی ہے جس کے اسلاف باغی ہوں اور وہ اپنی ذات سے مطیع ہو۔ جب بادشاہ کو خبر ہوگی کہ باغی کا لڑکا مطیع ہوکر آیا ہے اس کے دل میں ضرور اس کی عزت وقدر ہوگی مگر شریف کا بیٹا ہوکر باغی ہو جائے تو تمام دنیا کے عقلاء و جہلا اس لڑکے کو بے قدری کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس وقت شرافت واطاعت اسلاف اس کے کچھ کام نہ آئے گی غرض بزرگوں کا مطیع وتابعدار ہونا خوردوں کے چھوٹ جانے کے لئے کافی نہیں ہوسکتا تو یہ جولوگ آج کل فخریہ کہتے ہیں کہ ہم تیرہ سو برس سے مسلمان ہیں بدوں اپنی کوشش کے کچھ مفید نہیں ہوسکتا۔

انضباط اوقات

اب تو یہ حالت ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ نماز کیا ہے اور روزہ کیا ہے بریلی میں ایک عورت نے کہا کہ رمضان میں روزہ رکھنا اختیاری ہے خواہ رکھو یا نہ رکھو کوئی ضروری فرض نہیں افسوس ہے کہ بریلی جیسا شہر اور اس میں ایک عورت کو خبر نہیں کہ روزہ کیا چیز ہے حالانکہ اس وقت تو غیر مذہب والوں کو بھی بہت سی باتیں معلوم ہوگئی ہیں۔

مجھے ایک جنٹ کے اجلاس میں شہادت دینے کا اتفاق ہوا مجھ سے اس نے طلاق کے متعلق ایسے سوالات کئے کہ میں دنگ رہ گیا تو وہ لوگ کھود کرید کرتے ہیں اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ مسلمان آج کل اپنے مذہب کو ایسے بھولے ہیں کہ بعضی باتیں جو اسلام کی تعلیم کردہ ہیں دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

مثلاً انضباط اوقات کا وصف ہمارے اندر بالکل نہیں انگریزوں کا بڑا اہتمام ہے مسلمان اس کو ایسے بھولے کہ اب یوں سمجھتے ہیں کہ یہ انہی کی بات ہے اب اگر کوئی مسلمان اپنے اوقات کو منضبط کرے تو اس پر لعن طعن کرتے ہیں۔ حالانکہ انضباط اوقات شریعت کا مسئلہ ہے۔

شمائل ترمذی میں حضورؐ کی تقسیم اوقات کے متعلق ایک حدیث مشرح مذکور ہے کہ آنحضرتؐ جب گھر میں جاتے تھے تو اپنے وقت کے تین حصے کرتے تھے ایک حصہ خدا کی عبادت کے لئے ایک حصہ گھر والوں کے لئے ایک حصہ خاص اصحاب کے لئے۔ اس وقت خاص اصحاب آکر عام معاملات کی اطلاع حضورؐ کو کرتے تھے کسی کی سفارش پہنچا دی کسی کی

حاجت کی خبر دی وعلیٰ ہٰذا۔ مگر اب مسلمان اس طریقہ سے ایسے غیر مانوس ہیں کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ مسئلہ اسلام کا ہے یا انگریزوں کا ایجاد کیا ہوا۔

مسئلہ استیذان

دوسرا ایک مسئلہ اور ہے جو اس کی فرع ہے اور وہ استیذان کا مسئلہ ہے کہ جب کسی کے پاس جاؤ تو اس سے اجازت لو کہ اگر اجازت دے تب جاؤ ورنہ واپس آ جاؤ۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مجلسیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک تو وہ کہ عام ملاقات کے لئے ہو جس میں تخلی منظور نہ ہو اس میں استیذان کی ضرورت نہیں بلکہ وہاں پہرہ کھڑا کرنا بھی جائز نہیں ہاں اگر اندیشہ ہو تو جائز ہے مجلس قضا و مجلس وعظ وغیرہ فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کو الگ مکان نہ بنانا چاہئے جامع مسجد میں بیٹھ کر فیصلہ کرنا چاہئے اگر کوئی شبہ کرے کہ مسجد میں غیر مسلم کیونکہ جا سکیں گے تو جواب یہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں جائز ہے البتہ غیر مسلم کو پاک صاف ہونا ضروری ہے بحالت جنابت مسجد میں نہیں آ سکے گا غرض قاضی کو حکم ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر فیصلے کرو۔ اسی میں اجلاس قائم کرو اور گواہ بھی وہاں ہی آئیں البتہ سزا وغیرہ فرش مسجد سے جدا ہونی چاہئے مسجد میں کسی کو سزا نہ دی جائے شریعت نے اس کو دین کا کام قرار دیا ہے اور واقعی یہ دین کا بڑا کام ہے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ خلقت کو نفع پہنچایا جائے۔

اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حکومت دین کا کام ہے جب تو اس کے لئے جامع مسجد تجویز کی گئی ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کرنا کھیل نہیں ہے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے کہ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور حکومت کا شوق میں نے ایک نواب زادے کو دیکھا کہ وہ پانچ سو روپیہ ماہوار گھر سے منگواتے تھے اور بے تنخواہ کے ڈپٹی تھے۔

تو اجلاس پر پہرہ چوکی بٹھلانا حاکم کو اس لئے جائز نہیں کہ اس کی مجلس عام ہونی چاہئے تاکہ تمام مخلوق اپنی مصیبت بیان کر سکے ایک قسم کی تو یہ مجلس ہے اس میں استیذان کی ضرورت نہیں۔

ایک مجلس تنہائی کی ہوتی ہے جو ذاتی کام پورے کرنے کے لئے ہوتی ہے جیسے امیروں کی آرام گاہ کہنی چاہئے اور غریبوں کا گھر اس میں جانے کے لئے استیذان کی ضرورت ہے بلا

اجازت کے جانا جائز نہیں البتہ اگر قرائن سے اجازت معلوم ہو جائے تب بھی جانا جائز ہے اس صورت میں صاحب مکان کو پورا اختیار ہے کہ جس کو چاہے آنے دے اور جس کو چاہے روک دے اور یہ حکم ہے کہ اگر اجازت نہ دے تو بلا ملے ہوئے واپس ہو جائے۔

تو یہ مسئلہ شریعت کا ہے مگر مسلمان اس سے بالکل واقف نہیں اور اس کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور اگر کوئی اس پر عمل کرے اس کو صاحب بہادر سمجھا جاتا ہے ہم لوگوں کی بے توجہی کی یہ حالت ہے کہ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونا ہی اسلام ہے اور یہی کافی ہے کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں اور یہ مرض عورتوں میں زیادہ ہے کیونکہ مرد تو کچھ لکھتے پڑھتے بھی ہیں بہت سی باتیں معلوم کر لیتے ہیں نیز اکثر علماء سے ملتے رہتے ہیں بہت سی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی ہیں مگر عورتوں کو سوائے کھانے پکانے کے کسی چیز کی خبر نہیں۔ اگر ہے تو صرف نماز کی ہے۔ جو نماز پڑھتی ہے وہ سب کچھ ہے جو حج بھی کر لے وہ اپنے وقت کی رابعہ بصریہ ہے اور جو زیور کی زکوٰۃ بھی دینے لگے تو اس کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں غرض ان کو بجز معدودے چند باتوں کے اور کسی چیز کی خبر نہیں۔

ایک اہم کوتاہی

حق تعالیٰ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں کہ دین کیا چیز ہے آیا مسلمان کہلانا یا مسلمان کہلا کر چند اعمال کر لینا ہی اسلام ہے یا اور بھی ضروری ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

ان المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات والقٰنتین
والقٰنتٰت والصّٰدقین والصّٰدقٰت والصّٰبرین والصّٰبرٰت والخٰشعین
والخٰشعٰت والمتصدقین والمتصدقٰت والصائمین والصآئمٰت
والحٰفظین فروجھم والحٰفظٰت والذاکرین اللہ کثیراً والذاکرات
اعداللہ لھم مغفرۃ واجراً عظیماً

میں اس کا ترجمہ کیے دیتا ہوں کہ

اسلام والے مرد اور اسلام والی عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی

عورتیں اور روزہ دار والے مرد اور روزہ دار عورتیں اور تھامنے والے مرد اپنی شہوت کی جگہ اور تھامنے والی عورتیں اور یاد کرنے والے مرد اللہ کو بہت اور یاد کرنے والی عورتیں تیار کی ہے خداوند تعالیٰ نے ان سب مرد و عورتوں کے لئے مغفرت اور اجر بڑا۔

اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے مگر ہر عمل کے دو درجے ہوتے ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ اسی طرح اسلام زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے اور اس کا دل سے ماننا یہ ایمان ہے تو اسلام اقرار ہوا اور ایمان تصدیق قلبی یہ تو سب سے مقدم شرط ہے کہ اقرار توحید و رسالت زبان سے کرے اور دل میں اس کی تصدیق ہو کیونکہ یہ اصول میں سے ہے اس کو تو سب جانتے ہیں اس لئے اس کے متعلق اس وقت زیادہ بیان کی ضرورت نہیں البتہ اعمال میں آج کل کوتاہیاں کی جا رہی ہیں ان کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

بہت سے لوگوں نے یہ یاد کر لیا ہے کہ **من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ** کہ جو کوئی **لا الٰہ الا اللہ** کہہ لے وہ جنتی ہو گیا بس اس کو کسی کام کی ضرورت نہیں بعض تو یہاں تک گمراہ ہوئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کہنے کی بھی ضرورت نہیں جانتے دھوکہ اس سے ہوا کہ اس مقام پر صرف **لا الٰہ الا اللہ** مذکور ہے لوگ یہ سمجھے کہ اتنا ہی کہنا مقصود ہے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ایک خواندہ شخص کو میں نے پانچ سو مرتبہ لاحول پڑھنے کو خط میں بتلایا اور اتفاق سے میں رام پور گیا کہ وہ وہاں ہی رہتے تھے تو اس نے کہا کہ میں بتلایا ہوا پڑھتا ہوں مگر ابھی میرا کام نہیں ہوا میں نے پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو تو آپ کہتے ہیں لاحول لاحول پڑھا کرتا ہوں میں نے اس پر کہا کہ بندہ خدا لاحول سے مراد کیا فقط لاحول تھی تو جیسے یہ شخص لاحول سے صرف لاحول پڑھنا سمجھا ایسے ہی بعض بے وقوف لا الٰہ الا اللہ سے صرف اتنا ہی پڑھنا سمجھے حالانکہ مقصود اتنا نہیں ہے کہ بلکہ پورا کلمہ ہے مع دیگر شرائط کے۔

اور لیجئے اگر کوئی کہے کہ سورۃ یٰسین پڑھنے سے دس قرآن کا ثواب ملتا ہے کیا اس کے یہ معنی کئے جائیں گے کہ صرف لفظ یاسین سے اتنا ثواب ملتا ہے میں نے حکیم عبدالمجید صاحب کو دیکھا ہے کہ نسخہ لکھوانے کے وقت شاگردوں کو صرف ایک دو جزو بتلا دیتے تھے اور مراد پورا نسخہ ہوتا۔

تو یہ تو رات دن کا ہی محاورہ ہے کہ بولنے میں اختصار کر کے پوری مراد ہوتی ہے پھر

نہ معلوم اس محاورہ سے دین میں کیوں کام نہیں لیا جاتا اور من قال لا الٰہ الا اللہ سے محمد رسول اللہ کو کس طرح خارج سمجھ لیا گیا ہے اور جو لوگ پورا کلمہ مراد بھی لیتے ہیں ان سے یہ شکایت ہے کہ وہ عمل کو ضروری نہیں سمجھتے جس کا اثر ہے کہ صرف کلمہ پڑھ یہ لوگ کسی چیز سے نہیں رکتے نہ چوری سے نہ زنا سے کیونکہ گمان یہ ہے کہ محض کلمہ پڑھ لینا مغفرت اولیہ کے لئے کافی ہے اس خیال کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے ایک بڑی فہرست ہم کو بتلائی ہے اس کو کہاں حذف کر دیا گیا۔ مجھے اس وقت اسی کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے۔

اشاعت اسلام کا سبب

دین کے بہت سے اجزاء ہیں لوگوں نے جو اس کا اختصار کر لیا ہے یہ ان کی غلطی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان زیادہ بدنام ہیں کیونکہ ناواقف غیر مذہب والا یہ سمجھتا ہے کہ جیسے ان کے اعمال ہیں شاید یہی مذہب اسلام کی تعلیم بھی ہے ہماری وہ حالت ہے کہ اس کو دیکھ کر غیر مذہب والے اسلام سے نفرت کرنے لگے۔ کیونکہ ہر مذہب کے لوگ اس مذہب کے معبر ہیں۔ دیکھنے والا آدمیوں کے افعال سے مذہب کی عمدگی یا خرابی پر استدلال کیا کرتا ہے۔

چنانچہ اہل یورپ نے بہت سے دھبے اسلام پر لگائے ہیں جس کا سبب یا عناد ہے یا ناواقفی ہے کہ انہوں نے ظالم سلاطین کے طرز و عمل کو یا ہمارے افعال و اخلاص کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ اسلام کی یہ تعیم ہے صاحبو! کوئی ہمارے خلفائے راشدین کو دیکھے اور آج کسی جگہ ہمیں ان کی نظیر دکھا دے۔ اخلاق میں سیاست میں عدل و انصاف میں ان شاء اللہ تعالیٰ مخالف اگر انصاف سے بتلائے تو ہرگز ان کی نظیر نہیں دکھا سکتا اور ہماری صفات کا جیسے یہ اثر ہے کہ اسلام پر الزام لگتا ہے ان حضرات کی صفات کا یہ اثر تھا کہ اسلام محبوب ہو کر پھیلتا جاتا تھا۔ اور یہی اصل سبب ہے اشاعت اسلام کا۔

اہل یورپ کا یہ خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کے زور سے کام لیا گیا ہے اور اس کے لئے دلیل میں واقعات جنگ وہ پیش کرتے ہیں کہ سلاطین اسلام نے کس قدر خونریزیاں کی ہیں۔ میں ن سے پوچھتا ہوں کہ یہ تو کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ جنگ مطلقاً تمدن کے خلاف ہے آج متمدن قومیں بھی ضرورت کے وقت جنگ کرتی ہیں معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت لڑائی کرنا تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جائز ہے پس اب میں ظالم سلاطین کی طرف

داری تو نہیں کرتا البتہ خلفائے راشدین کی بابت دعوی سے کہتا ہوں کہ انہوں نے بناء ضعیف پر کبھی جنگ نہیں کی کسی قوی سبب کی بناء پر وہ لڑائی کرتے تھے اور لڑائی کے متعلق اسلامی قانون اگر مخالفین کی نظر سے گزرا ہوتا تو کبھی یہ لفظ زبان سے نہ نکالتے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔

قوانین جنگ اسلام نے بہت سے بتلائے ہیں مگر میں اس وقت ایک مختصر قانون بیان کرتا ہوں اسلام کا مسئلہ ہے اور خلفائے راشدین کا ہمیشہ اسی پر عملدرآمد رہا ہے کہ اگر کوئی شخص مقابلہ کے وقت تمہارے باپ کو تمہارے بیٹے کو تمہارے بھائی کو غرض سب متعلقین کو قتل کر ڈالے اور عرصہ تک خونریزی کرتا رہے پھر کسی وقت قابو میں آ جائے اور تم اس سے بدلہ لینا چاہو اور وہ زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دے تو حکم ہوتا ہے کہ اس کو فوراً چھوڑ دو اگرچہ تم کو یقین کامل ہو کہ اس نے جان کے خوف سے کہا ہے اور دل سے اسلام نہیں لایا تب بھی فوراً تلوار اٹھا لو ورنہ اگر اس کو مارا گیا تو تم جہنم میں جاؤ گے اگرچہ یہ بھی خطرہ ہو کہ یہ اس وقت جان بچا کر پھر تم کو قتل کر دے گا جو کچھ چاہتے ہو اب اس کا مارنا ہرگز جائز نہیں۔

تو جس مذہب نے اتنی بڑی سپر دوسروں کے ہاتھوں میں دے دی ہے اب بھی اس کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ بزور شمشیر پھیلا ہے اور اس قانون پر ہمارے سلف صالحین پوری طرح عمل کرتے ہیں۔

ہرمزان نے مسلمانوں کو بہت سی ایذائیں پہنچائی تھیں۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گرفتار کر کے لایا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر اسلام پیش کیا مگر اس نے نہ مانا۔ آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ اس نے ایک چال چلی کہ حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ آپ مجھے قتل تو کرتے ہی ہیں تھوڑا پانی منگا دیجئے آپ نے پانی منگایا اس نے پانی گرا دیا اور کہا کہ میں کیا خاک پانی پیوں۔ سر پر تو تلوار تنی ہوئی ہے آپ نے تسلی کے لئے فرمایا **لاباس علیک** (کچھ خوف نہ کرو) کہ تم اطمینان سے پیو ڈرو نہیں۔ اس کے بعد جو پانی آیا تو اس نے اس کو اطمینان سے پیا اور کہا کہ امیر المومنین! اب آپ مجھ کو قتل نہیں کر سکتے۔ آپ مجھ کو امن دے چکے ہیں۔ آپ مجھ سے فرما چکے ہیں کہ لاباس علیک کہ کچھ خوف نہ کرو اور یہ کلمہ امن کا ہے اور میں نے آپ کا پانی پیا ہے تو میں آپ کا مہمان ہو چکا ہوں۔ آپ نے انکار فرمایا کہ نہیں میں نے تم کو امن نہیں دیا۔ صرف پانی پینے کی اجازت دی تھی۔ مگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ہرمزان

کی تائید کی کہ واقعی آپ نے اس کلمہ سے امن دے دیا ہے اگرچہ نیت نہ ہو۔ چنانچہ پھر حضرت عمرؓ اس کو قتل نہیں کر سکے اور فرمایا کہ مجھ کو ایک فارسی نے آج دھوکہ دے دیا۔

ہرمزان کو اپنی چال پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ حضرت عمر امن کا کلمہ کہہ کر پھر ہرگز قتل نہ کریں گے۔ آخر حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا کہ جاؤ تم آزاد ہو۔ یہ واقعہ دیکھ کر ہرمزان فوراً اسلام لے آیا کہ واقعی یہ دین برحق ہے جس میں مخالف کے ساتھ بھی اتنا سلوک کیا جاتا ہے کہ بلا قصد بھی کلمہ امن کہہ دینے سے اس کی جان بچ جاتی ہے اور اس کو پھر کوئی قتل نہیں کر سکتا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے اور اس پر خلفاء نے اس طرح پابندی کی ہے کہ ان کی نظیر آج کوئی دکھا نہیں سکتا ہاں پچھلے بادشاہوں کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں اگر انہوں نے ظلم کیا ہے بھگتیں گے ہمارے اسلاف نے ان قوانین پر پورا عمل کیا اور ان کو ترقی وعروج بھی ایسا نصیب ہوا کہ جو کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا صحابہ کے طرز عمل کا دوسری قوموں پر ایسا اثر تھا کہ بہت لوگ جاسوس بن کر آئے مگر ان حضرات کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ ایک یہودی نے چرا لی تھی۔ آپ نے اپنے قاضی شریح کے یہاں اس پر دعویٰ کیا قاضی نے گواہ طلب کیے تو حضرت علی نے اپنے آزاد کردہ غلام اور امام حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کیا شریح نے حضرت حسنؓ کی گواہی قبول نہ کی کیونکہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول نہیں ہوتی اور مقدمہ یہودی کے موافق فیصل ہوا۔

اس پر یہودی فوراً اسلام لے آیا کہ واقعی یہ دین برحق ہے جس میں خلیفہ کے مقابلہ میں ایک رعیت کا یہودی مقدمہ جیت سکتا ہے۔ اس پر میں کہتا ہوں کہ ہمارے اسلاف تو ایسے تھے کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام کی طرف رغبت ہوتی تھی۔

اسلام سے نفرت کا سبب

ہم ایسے ہیں کہ دیکھ کر نفرت ہوتی ہے اور وجہ اس کی احکام سے بے خبری ہے اور عمل میں کوتاہی کہ سوائے نماز روزہ کے اور کسی چیز کو جزو اسلام نہیں سمجھتے۔ جب نماز پڑھ لی تو سمجھتے ہیں کہ بزرگ ہو گئے ہیں میں تو اکثر کہا کرتا ہوں کہ آج کل محکمہ کیمیائی کو ترقی ہے ہر چیز کی روح اور ست نکالا جا رہا ہے۔ ہمارے بھائیوں نے دین کا ست نکالا۔ گورنمنٹ نے آزادی دے رکھی

ہے۔ ہر ایک کی ہمت بڑھ گئی ہے جو چاہے کرتا ہے حالانکہ مناسب تو یہ تھا کہ اس آزادی سے نفع حاصل کرتے مگر یہ الٹا اپنا گھر ڈھاتے ہیں۔ گورنمنٹ تو کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیتی اور یہی وجہ کہ گورنمنٹ اسکولوں کے لڑکے زیادہ بے دین نہیں ہوتے جتنے مسلمانوں کے کالجوں کے لڑکے بے دین ہوتے ہیں کیونکہ گورنمنٹ اسکول میں مذہبی گفتگو نہیں ہوتی اور کالجوں میں تو ہر شخص نماز روزہ میں عیب نکالتا ہے ایک خبیث نے نماز کے ترک پر لوگوں کو ترغیب دی تھی اگرچہ بعد میں سیکرٹری نے اس کو نکال دیا مگر بعض سرزمین میں اثر ہے کہ مذہب سے لاپرواہی ہوجاتی ہے اسی لئے میں یہ رائے دیا کرتا ہوں کہ ایسے کالجوں میں لڑکوں کو نہ بھیجا جائے۔

تو آج کل مسلمانوں نے مذہب کا بھی ست نکال لیا ہے کہ نماز روزہ تسبیح کا نام اسلام ہے میں نے بہت لوگ دیکھے ہیں کہ لمبی تسبیح ہاتھ میں رکھتے ہیں اور سود لیتے ہیں اور دو دو مرتبہ مال گزاری وصول کرتے ہیں اور پھر اچھے خاصے مسلمان کے مسلمان ہیں۔ تو آج کل ثقاہت تسبیح کا نام ہے جھوٹ بولتے ہیں اور رشوت لیتے ہیں زمین دوسروں کی دبا لیتے ہیں لڑکیوں کا حق نہیں دیتے بہن پھوپھی کا حق لے کر ادا نہیں کرتے اور پھر نیک کے نیک ہیں۔ آج کل نیکی بڑی سستی چیز ہوگئی ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگوں نے واقعی دین کا بھی ست اور خلاصہ نکال لیا ہے۔ بہت سی چیزوں کو دین سے نکال دیا ہے اس آیت میں اسی کا حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ دین کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے فرماتے ہیں۔

ان المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات والقٰنتین والقٰنتٰت

یعنی اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنیوالی عورتیں۔

معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان کے بعد صفت قنوت بھی ضروری ہے جس کے معنی ہیں اطاعت یا عاجزی کے اگر پہلے معنی ہیں تو مراد یہ ہے کہ تمام احکام میں اطاعت کرتے ہیں اور اگر اس کے معنی عجز کے ہیں تو یہ قلب کی اطاعت کا بیان ہوگا۔ جس میں ایک بڑے بھاری گناہ کا علاج ہے جو تمام کبائر کی جڑ ہے یعنی تکبر تمام مفاسد دینی اور تمدنی کی جڑ یہی کبر ہے غصہ اور غیبت اور حسد غرض تمام برے اخلاق اسی سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً کسی بیمار کو

بادشاہ سے حسد کرتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا ہوگا کیونکہ وہ غریب اپنے کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ بادشاہی کی آرزو کرے۔ جو اپنے آپ کو بادشاہی کے لائق اور قابل سمجھتے ہیں وہی بادشاہوں سے حسد کرسکتے ہیں اسی کا نام تکبر ہے کہ اپنی طرف کسی کمال کو منسوب سمجھے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے ان تمام مفاسد دینی اور تمدنی کی اصلاح کے لئے تواضع اور عاجزی کی تعلیم دی ہے اور تواضع صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ زبان سے اپنے آپ کو برا بھلا کہہ لے بلکہ تواضع تو یہ ہے کہ دل میں اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھتے۔

ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں قحط سالی ہوئی لوگ دعا کے لئے حاضر خدمت ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ ذوالنون کو شہر سے باہر نکال دو بارش ہو جائے گی۔ اس کے گناہوں کی وجہ سے یہ وبال لوگوں پر آیا ہے اور رونے لگے۔

آج کل اول تو اس طرف کسی کا ذہن ہی نہیں جاتا کہ قحط گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر جاتا بھی ہے تو دوسروں کے گناہوں پر نظر کرکے اور اگر کوئی اللہ اللہ کرتا ہو تو خدا جانے اس کا تو کہاں دماغ ہوگا۔ جہاں کسی نے اس کی مخالفت کی تو کہتا ہے کہ دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ خدا کا غضب نازل ہوگا ارے بھائی! انبیاء کو تکلیف پہنچ کر فوراً عذاب ہوا ہی نہیں تم ذرا سے نماز روزہ کرکے کیا لوگوں کو دھمکاتے ہو۔ اپنی خبر لو۔

اصلاح نفس کی تدابیر

اپنے نفس کی اصلاح کرو۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ تواضع پیدا کرو اور جی چاہتا ہے کہ تواضع حاصل کرنے کی تدابیر بھی بتلادوں اس کی دو تدبیریں ہیں۔ ایک تو آسان ہے ایک مشکل۔ آسان تو یہ ہے کہ کسی وقت بیٹھ کر اپنے عیوب اور دوسرے کے کمالات کو سوچا کرے۔ اور دوسرا اس سے مشکل ہے وہ یہ ہے کہ جس کو اپنے سے کم سمجھتا ہے اس کی تعظیم کر لے اس کی جوتیاں سیدھی کرلے اور اصل بات تو یہ ہے کہ تواضع پوری طرح اس دوسرے طریق سے حاصل ہوگی۔

قدم باید اندر طریقت نہ دم   کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(عمل کی راہ چلنا چاہئے نہ دعوی کی کہ دعویٰ بغیر ثبوت کے کچھ حقیقت نہیں رکھتا)

کارکن کار بگذار از گفتار　　　　کاندریں راہ کار دارد کار

(یعنی باتیں بنانی چھوڑو کام میں لگو۔ اس لئے کہ اس راہ سلوک میں کام ہی مقصود ہے۔

ہم کو باتیں بنانی تو بہت آتی ہیں مگر صرف باتوں سے کام نہیں چلتا کچھ کرنا بھی چاہئے اپنے سے چھوٹے کی تعظیم کرو تب یہ خناس دل سے نکلے گا۔ اور عورتوں میں تو یہ مرض تکبر کا مردوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے مگر یہ کچھ نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ ان کی حکومت کچھ نہیں ہے مگر جب کہیں جائیں گی زیور کو ظاہر کریں گی یہاں تک کہ اگر جھومکوں پر کسی کی نگاہ نہ پہنچی ہو تو کان کھجلانے کے بہانہ سے دوپٹہ کانوں پر سے ہٹادیں گی اور سب کی سب ایک ہی مذاق کی ہیں۔ زیور کی کپڑوں کی فہرست سب کو زبانی یاد ہے۔ غرض ہر چیز پر ان کی نظر ہوتی ہے اور یہ سب تکبر ہے جو خدا کو ناپسند ہے اس لئے عورتوں کو بھی فرماتے ہیں **والقنتت** (اور تواضع کرنے والی عورتیں) عورتوں کو تواضع حاصل کرنے میں زیادہ کوشش کرنی چاہئے کیونکہ کمزور کا تکبر اور بھی زیادہ برا ہے۔

آگے فرماتے ہیں **والصدقین والصدقات** اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں۔ یہ بھی آج کل بہت بڑا مرض لوگوں میں ہوگیا ہے کہ بات بات میں جھوٹ بولتے ہیں اور اگر کبھی سچ بھی کہیں گے تو کسی قدر نمک مرچ لگا کر خصوصاً اگر کوئی عجیب مضمون ہو تو اس پر تو جب تک حاشیہ نہ لگادیں اس وقت تک چین نہیں آتا۔ مگر یہ بہت بڑا مرض ہے اس سے دل سیاہ ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے انسان خدا کے یہاں کذابین میں شمار ہوجاتا ہے۔

والخشعین والخشعت (اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں) خشوع کہتے ہیں سکون کو۔ یہ شامل ہے قلب کو اور جوارح دونوں کو اس کو جمعیت قلب وجوارح کہتے ہیں۔ مثلاً نماز میں خشوع ضروری ہے یعنی دل ساکن ہو کہ خیالات ادھر ادھر پریشان نہ ہوں۔ اور اعضاء بھی ساکن اور پست ہوں اور دوسرے اوقات میں خشوع اس طرح ہوتا ہے کہ تواضع کے ساتھ سکون اور وقار ملا ہو چھچھوراپن نہ ہو۔ بعض لوگ تواضع کے چھچھورے ہوجاتے ہیں۔ حق تعالیٰ اس کو منع فرماتے ہیں کہ تواضع کے ساتھ سکون اور وقار بھی چاہئے۔

والصابرین والصابرات اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔ اس میں

صبر کی تعلیم ہے صبر اس کو نہیں کہتے کہ کوئی مرجائے تو روئے نہیں۔ رونا تو جائز ہے۔ صبر کہتے ہیں نفس کو اس کی ناگواری پر مستقل رکھنے کو مثلاً کسی نے بری بات کہی تو ہم اس کا انتقام نہ لیں۔ سخت وست نہ کہیں۔ تو یہ صبر ہے عادات میں اور تکوینیات میں صبر اس کا نام ہے کہ اگر کوئی مرجائے یا مال چوری ہو جائے یا بیماری پیدا ہو جائے تو جزع وفزع نہ کریں اور عبادات میں صبر یہ ہے کہ عبادت میں حظ اور مزہ نہ آئے مگر عبادت کرتے رہیں اس وقت لوگ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں کہ مزہ کے طالب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نہیں۔ اگر عاشق ہوتے تو ان کو لذت عشق ہی کافی ہوتی۔ کسی مزہ کے طالب نہ ہوتے۔ بعض دفعہ لذت عشق ایسی بڑھ جاتی ہے کہ عاشق کو محبوب کے وصال کی بھی پرواہ نہیں رہتی۔

ایک عاشق کا قصہ ہے کہ آخر میں جب اس کا محبوب اس پر رحم کر کے ملنے گیا تو عاشق نے اس سے کہا (الیک عنی فان حبک قد شغلنی عنک، بس اب دور رہ مجھے تیری محبت نے تجھ سے مشغول کر دیا ہے۔ مگر یہ حال عاشق مجازی میں ہو سکتا ہے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ خدا کی محبت بھی کبھی نعوذ باللہ (ایسی ہو سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ سے بے پرواہ کر دے)

اس کا راز یہ ہے کہ محبوب حادث سبب حدوث محبت کا ہے نہ کہ بقاء محبت کا۔ تو محبوب حادث کی محبت بدوں اس کے باقی رہ سکتی ہے کیونکہ بقاء میں اس کو دخل نہیں اور محبوب قدیم خداوند جل جلالہٗ وعم نوالہٗ کی ذات جیسے سبب حدوث محبت ہے سبب بقائے محبت بھی ہے اس لئے محبِ خدا کبھی اس سے بے پرواہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس سے یہ راز بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ غیر اللہ کے عشق کو عشق مجازی اور خدا تعالیٰ کی محبت کو عشق حقیقی کیوں کہتے ہیں۔ حقیقی اور اصلی محبت وہی ہے جس میں کسی وقت محبوب سے استغناء نہ ہو سکے اور یہ محبت نام کی محبت ہے جس میں محبوب سے استغناء ہو سکتا ہے۔

مگر اس سے کوئی یہ قیاس فاسد نہ کرے کہ عشق مجازی میں تو لذت چونکہ بہت ہوتی ہے یہاں تک کہ کبھی محبوب سے بھی بے پروائی ہو جاتی ہے اس لئے صاحب عشق مجازی کو کسی دوسرے مزہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ صرف عشق کا مزہ کافی ہو جاتا ہے اور عشق حقیقی میں

چونکہ کبھی محبوب سے استغناء ممکن نہیں' یہ علامت اس کی ہے کہ اس میں لذت کم ہے۔ اس لئے صاحب عشق حقیقی علاوہ لذت عشق کے دوسرے لذات کو طلب کرسکتا ہے تو عاشق حقیقی کو یہ رائے دینا صحیح نہ ہوا کہ اور لذات کا طالب نہ ہو؟

سو یہ خیال اس لئے غلط ہے کہ جب یہ بات مسلم ہے کہ عشق حقیقی تمام چیزوں سے مستغنی کر دیتا ہے بجز محبوب جل وعلا کے تو جب لذات معاذ اللہ غیر خدا ہیں تو ان کے مطلوب ہونے کی گنجائش کہاں رہی۔ ان کے درپے ہونا یقیناً غیر اللہ کی طرف توجہ کرنا ہے جو علامت ہے نقصان محبت کی جو لذت کا طالب ہے وہ خدا کا طالب نہیں۔ اسی کو کہتے ہیں۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست   تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

(یعنی ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے۔ اگر گئے بلا سے گئے۔ عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے۔

بس زبون وسوسہ باشی دلا   گر طرب را باز دانی از بلا

(تم بالکل مغلوب وساوس سمجھے جاؤ گے اگر محبوب کے طرب وبلا میں فرق سمجھو گے۔)

حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

(وصل وفراق کوئی چیز نہیں۔ محبوب کی رضا طلب کرو اس لئے کہ محبوب سے اس کی رضا کے سوا دوسری چیز طلب کرنا افسوس کی بات ہے۔)

غرض مزے کا طالب نہ ہو۔ کام کئے جاؤ مزہ حاصل ہو یا نہ ہو اپنے معمولات کا پابند رہے تو صبر کی ہر جگہ ضرورت ہے بلکہ ہر بات میں ضرورت ہے کیونکہ طبیعت کے خلاف بہت باتیں پیش آتی ہیں جن پر تحمل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً کھانا سامنے آیا اور نمک ٹھیک نہیں تو اب گھر والوں پر تشدد نہ کرنا چاہئے صبر وتحمل سے کام لینا چاہئے۔ کوئی ملاقات کے لئے آیا ہے اور اس سے کوئی ناگوار بات صادر ہوئی۔ یہ بھی صبر کا موقع ہے۔

والمتصدقین والمتصدقات اور صدقہ دینے والے مرد اور عورتیں صدقہ کا حکم اس لئے فرمایا بعض لوگوں کی نسبت ومحبت زبانی ہوتی ہے۔

گر جان طلبی مضائقہ نیست　　　و رزر طلبی سخن درین ست

(یعنی اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں ہے اور اگر مال مانگو تو اس میں کلام ہے۔

زبان سے بہت دعوے کرتے ہیں مگر محبوب کے نام پر خرچ کرتے ہوئے جان نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا سے محبت ہی نہیں ہے۔ اگر محبوب مجازی گھر مانگتا ہے تو دے دیتے ہیں اور کچھ بھی گھر باہر کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ کیسی خدا کی محبت ہے کہ خدا کے نام پر خرچ کرنے میں باوجود وسعت کے سوچتا اور تامل کرتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں خیر خیرات بھی کرتے رہا کرو تا کہ دنیا کی محبت دل سے کم ہو۔ آج کل ہماری تو یہ کیفیت ہے کہ اگر خرچ کرتے ہیں تو ناموری کی جگہ پر نیک مصرف میں شاید ہی کسی کا پیسہ خرچ ہوتا ہوگا اور جو نیک مصرف میں خرچ بھی کرتے ہیں تو بہت سے مصارف میں سے ایسا مصرف اختیار کریں گے جس میں فخر و مباہات ہو۔ یہ آج کل کے دینداروں کی کیفیت ہے۔ اخلاص تو آج کل بالکل ہی نہیں رہا الا ماشاءاللہ۔

میں نے ایک مخلص کی حکایت سنی ہے کہ وہ ایک عالم کے وعظ میں آئے اور ایک ہزار روپیہ کا توڑا ان کی خدمت میں پیش کیا۔ لوگوں نے ہر طرف سے تعریف کرنی شروع کی۔ اس نے جو دیکھا کہ ہر طرف سے تعریف ہونے لگی اور دل میں اخلاص نہیں رہا تو تھوڑی دیر میں پھر آیا اور کہا کہ مولانا وہ روپے میری والدہ کے تھے واپس کر دیجئے۔ اب تو لوگوں نے اسے بہت ہی برا بھلا کہا کہ علماء سے تمسخر کرتا ہے۔ مولوی صاحب نے روپے واپس کر دیئے۔ جب وعظ کی مجلس ختم ہو چکی اور مولوی صاحب اپنے گھر پہنچے تو وہ شخص ان کے مکان پر پہنچا اور عرض کیا کہ مولانا میں نے آپ کو بہت ستایا ہے اور بہت تکلیف دی۔ وہ ہزار روپے میرے ہی تھے میں اس وقت پیش خدمت کرتا ہوں۔

اس وقت چونکہ لوگوں کی تعریف کی وجہ سے اخلاص میں کمی ہوتی تھی اس لئے میں نے واپس کر لئے جس پر لوگوں نے مجھے خوب برا بھلا کہہ لیا اور نفس کی اصلاح ہو گئی اب تنہائی میں یہ روپیہ لے کر حاضر ہوا ہوں ان کو قبول کیجئے۔ خلوص اس کا نام ہے تو صاحبو! صدقات میں اخلاص ضروری ہے۔

آگے فرماتے ہیں **والصائمین والصائمات الایۃ** اور روزہ رکھنے والے مرد اور عورتیں۔ یعنی اسلام کے لئے ایک اور بھی جزو ہے روزہ رکھنا۔ عورتوں کے اندر یہ تو کمال

ہے کہ وہ روزہ بہت شوق سے رکھتی ہیں اور کچھ بہت کمال بھی نہیں کیونکہ ان میں رطوبت زیادہ ہوتی ہے اس لئے بھوک پیاس کم لگتی ہے اس بارہ میں مرد زیادہ ہیٹی ہیں بہت لوگ روزہ نہیں رکھتے اور بعض تو ایسے بے حیا ہوتے ہیں کہ کھلم کھلا سب کے سامنے حقہ اور پان کھاتے پھرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ جب خدا کی چوری نہیں تو مخلوق کی کیا چوری۔ میں کہتا ہوں کہ پھر بیوی کے ساتھ بھی سب کے سامنے ملا کرو کہ جب خدا کی چوری نہیں تو مخلوق کی کیا چوری۔ ان لوگوں کی شرم جاتی رہی خدا کا خوف نہیں رہا۔ روزہ کا توڑنا تو گناہ تھا سب کے سامنے توڑنا بہت ہی بڑا گناہ ہے اس سے کھلم کھلا خدا کی مخالفت ہوتی ہے دوسروں کی جرات بڑھتی ہے تو پہلے مرض لازم تھا اب مرض متعدی ہوگیا۔

آگے ارشاد ہے **والحفظین فروجھم والحفظت** اور اپنے شرم گاہوں کو حرام سے بچانے والے مرد اور عورتیں شرم گاہوں کا حرام سے بچانا تو عقلاً بھی ہر شخص ضروری سمجھتا ہے اور شریعت نے بھی اس کو فرض کیا ہے اور زنا کو سب برا جانتے ہیں اور شریعت نے بھی اس کو حرام کیا ہے۔ مگر لوگوں نے زنا اسی کو سمجھ رکھا ہے جو مباشرت کے ساتھ ہو۔ حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ سے بھی زنا ہوتا ہے ہاتھ سے بھی زنا ہوتا ہے۔ قلب سے بھی ہوتا ہے کان اور پیر سے بھی ہوتا ہے آنکھ کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کو بری نیت سے دیکھے ہاتھ کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کو ہاتھ لگائے۔ کان کا زنا یہ ہے کہ اجنبی عورت کی باتیں سنے۔ اس کی طرف چل کر جانا یہ پیر کا زنا ہے۔ دل میں کسی اجنبی عورت کی محبت اور تصور سے مزہ لینا یہ دل کا گناہ ہے۔ مسلمان شخص کو ان تمام گناہوں سے بچنا چاہئے کیونکہ یہ بھی اسی زنا کے مثل ہیں اور اس کی حفاظت پوری طرح پردہ سے ہوتی ہے مگر سخت افسوس ہے کہ آج کل کا نوجوان اس کو بھی اٹھا دینا چاہتا ہے مگر یہ ان کی بڑی بھاری غلطی ہے اگر خدانخواستہ ایسا ہوگیا تو بڑی سخت دشواری پیش آئے گی۔

ذکر اللہ کی اہمیت

ان سب کے بعد ارشاد فرماتے ہیں **والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات** یعنی اور وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کو بہت یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو خدا کو بہت یاد کرتی ہیں گویا اب تک جتنی باتوں کا بیان تھا۔ وہ سب بمنزلہ درختوں کے ہیں اور یہ ان کے لئے پانی ہے کہ یہ سب درخت ایمان واسلام وقنوت وخشوع وصدقہ وعفت کب بارآور ہوسکتے ہیں جبکہ

ان کو خدا تعالیٰ کی یاد کا پانی پلایا جائے اور یہ تجربہ ہے کہ آدمی کتنا ہی بڑا نیک کیوں نہ ہو مگر اس میں پختگی اسی وقت آتی ہے جب ذکر اللہ بھی کرتا ہو۔ اور اس کے بغیر ایسی مثال ہے جیسے بے جڑ کا پھول کہ اس وقت تو تر و تازہ ہے مگر تھوڑی ہی دیر میں کملا جائے گا۔

اس لئے ذکر اللہ کا اہتمام مرد عورتیں سب کریں چوبیس گھنٹہ میں ایک ہی دفعہ کچھ کر لیا کریں اس سے خدا کا قرب ہوگا اور خدا کے قرب کی ایسی مثال ہے جیسے بجلی کا قرب کہ جہاں گرتی ہے مکان کو منور کر دیتی ہے اور اپنی کڑک سے تمام خس و خاشاک کو جلا دیتی ہے۔ اسی طرح ذکر اللہ سے جب قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے تو دل منور ہو جاتا ہے اور تمام فاسد خیالات دل سے نکل جاتے ہیں اور انسان بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہ خالی ذکر اللہ ہی کیا کرے اور سب اعمال چھوڑ بیٹھے کیونکہ خالی پانی بھی کچھ کام کا نہیں ہوتا جب تخم ہو اور اس کو پانی پہنچایا جائے اسی وقت کچھ کام چل سکتا ہے تو اعمال حسنہ کی تخم پاشی کرو اور ذکر اللہ کا اسے پانی دو۔

اس کے بعد فرماتے ہیں **اعد اللہ لھم مغفرۃ و اجرا عظیما** کہ ان لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ نے مغفرت و اجر عظیم تیار کر رکھا ہے حاصل یہ ہے کہ اپنے دین کو جو درست کرنا چاہے وہ ان باتوں کو حاصل کرلے اس کے بعد مستحق اجر و مغفرت ہوگا ہمیں چاہئے کہ ان سب باتوں پر عمل کریں اور اپنی حالت کو درست کریں اور وعظ اسی لئے ہوا کرتا ہے کہ اپنی اصلاح کی جائے یہ نہیں کہ سن کر رو پیٹ لئے اور بس۔ تو اس پر عمل کرو اور جو کوتاہی رہے اس کا علاج دریافت کر لو کیونکہ اس میں بھی ترمیم و تبدیل کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسے بعض نسخوں میں ترمیم و تبدیل ہوا کرتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ طبیب اپنی رائے سے بھی ترمیم و تبدیل کر سکتا ہے اور عالم جو کچھ ترمیم بھی کرے گا وہ بھی شریعت ہی کی طرف سے ہوگی اس کے موافق ہوگی۔

غرض اپنی اصلاح کی دھن میں لگ جاؤ۔ یہ ایک دن کا کام نہیں ساری عمر کا کام ہے چاہے تھوڑا ہی کرو مگر ہمیشہ کرو اور ساری عمر کرو۔ انشاء اللہ محرومی نہ ہوگی۔ اب یہ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ توفیق عطا فرمائے آمین۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین و صلے اللہ تعالی علے خیر خلقہ سیدنا محمد و علی الہ و اصحابہ اجمعین.

الغالب للطالب

اتباع سنت کے متعلق یہ وعظ ۲۶ محرم ۱۳۴۷ھ بروز یکشنبہ تھانہ بھون میں حافظ ظریف احمد صاحب کے مکان پر کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو دو گھنٹے اور ۲۵ گھنٹے منٹ میں ختم ہوا جہاں ۴۰ کے قریب زن و مرد جمع تھے یہ وعظ کاندھلہ کی ایک صاحب علم واعظہ کی درخواست پر ہوا جسے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمد و نستعینه و نستغفره و نؤمن به و نتوکل علیه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یهده الله فلا مضل له و من یضلله فلا هادی له و نشهد ان لا اله الا الله و حده لا شریک له و نشهد ان سیدنا و مولانا محمد اعبده و رسوله صلی الله تعالیٰ علیه و علی اله واصحابه و بارک وسلم۔ اما بعدفعن ابی هریرة مرفوعالما قضی الله الخلق کتب کتاباً فهو عنده فوق عرشه ان رحمتی سبقت غضبی و فی روایته غلبت غضبی۔ (متفق علیه)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت مرفوعاً نقل ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا مقدار کیا تو اپنے پاس عرش پر ایک کتاب میں یہ مضمون لکھ لیا کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے۔

اہمیت حدیث

یہ ایک حدیث ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں حضورؐ سے ان کو خاص خصوصیت تھی، ہروقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، اور کوئی کام زراعت تجارت وغیرہ کا نہ کرتے تھے بلکہ متوکلانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پڑے رہتے تھے اور احادیث نبویہ کو ہر وقت سنتے اور یاد کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحابہ میں سب سے زیادہ حافظ حدیث ہیں۔ ان کے برابر کسی نے احادیث کی روایت نہیں کی۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس وقت اپنی چادر میرے سامنے پھیلا دے اور جب میں کچھ اس میں دم کردوں تو چادر کو اپنے سینے سے لگالے۔ تو کوئی بات کبھی بھولے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی چادر پھیلا دی اور جو حضور نے اس میں کچھ پڑھ کر دم کر دیا تو انہوں نے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات کبھی نہ بھولا۔

یہ چند جملے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی تعریف میں اس لیے کہہ دیے تا کہ ان کی روایت کی وقعت و عظمت ہو۔

وسعت رحمت

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاملہ کی ہم کو اطلاع دی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے ساتھ کیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد بھی مذکور ہے۔ ترجمہ حدیث کا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو مقدر کیا قضی کے معنی لغت میں فیصلہ کرنے کے ہیں مگر فیصلہ کی دو قسمیں ہیں ایک عملی ایک تجویزی۔ اگر عملی فیصلہ مراد ہو تو اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا خلق مقدر کیا کیونکہ تقدیر تجویز ہی تو ہے۔ غرض یہ تو خلق تجویزی ہوا تھا یا عملی اجمالی ہوا تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ ابھی تک مخلوق سے اعمال صادر نہ ہوئے تھے۔ اور اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک موجب رحمت، ایک موجب غضب، تو اس وقت کسی قسم کے اعمال مخلوق سے صادر نہ ہوئے تھے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ایک معاملہ ایسا فرمایا کہ اپنے پاس عرش پر ایک کتاب میں یہ مضمون لکھ کر رکھا۔ **ان رحمتی سبقت غضبی** (الاسماء والصفات للبیہقی: ۳۱۹، الدر المنثور للسیوطی ۶:۳) بیشک میری رحمت غضب پر غالب ہے۔

تو یہ مضمون بڑا معظم ہے جو عرش پر لکھ کر رکھا گیا ہے۔ عرش کو اللہ تعالیٰ سے خاص قرب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو عرش سے خاص تعلق ہے، اسی تعلق کو استویٰ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے یہ معنی نہیں کہ جس طرح ہم تم بیٹھے ہیں اسی طرح معاذ اللہ وہ بھی بیٹھے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس سے منزہ ہونے پر دلائل عقلیہ اور نقلیہ قائم ہیں دلیل نقلی تو **لیس کمثلہ شئی** اس جیسا کوئی نہیں) اور دلائل عقلیہ سے علماء واقف ہیں۔

حضرات صوفیہ نے اس مسئلہ کو بہت سہولت سے حل کر دیا ہے۔ واقعی یہ حضرات سچے وارث ہیں انبیاء علیہم السلام کے جس طرح حضرات انبیاء سہل عنوان سے مشکل مسائل کو تعبیر کر دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مکان کو متمکن سے کچھ مناسبت وقرب مقدار تو ہونا چاہیے۔ اول تو عادۃً مکان مکین سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر زیادہ نہ بھی ہو تو مساوات تو ہے اور کم از کم کسی قدر مناسبت ونسبت تو ہونا چاہیے اور عرش کو حق تعالیٰ سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ اگر حالت موجودہ سے کروڑوں گن بھی بڑا ہو جب بھی اس کو حق تعالیٰ سے کچھ مناسبت نہ ہوگی۔ کیونکہ عرش محدود ہے اور ذات حق غیر محدود ہے۔ اور محدود کو غیر محدود سے کیا مناسبت؟ کچھ بھی نہیں۔ پھر وہ اس کے لیے مکان کیسے ہو سکتا ہے البتہ حق تعالیٰ کا عرش سے خاص تعلق ہے، اور

حق تعالیٰ کو اس سے تعلق ہے مگر تحیز کا تعلق نہیں ہے بس وہ صدر مقام ہے نزول احکام و تجلیات کا۔ اللہ تعالیٰ کی تجلیات سب سے زیادہ عرش پر ہیں (یعنی امکنہ جو چیز لکھ کر رکھی جائے گی وہ بڑی عظمت کی ہوگی۔ پس عقیدۃً بھی اس کا حق عظمت ادا کرنا چاہیے اور عملاً بھی۔ وہ مضمون یہ ہے۔ ان رحمتی سبقت غضبی (بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے) (الأسماء والصفات للبیہقی: ۳۱۹)

اس مقام پر ایک بات اور بھی سمجھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت وغضب کو اپنے رحم وغضب پر قیاس نہ کرلے۔ یہ سخت غلطی ہے۔ کیونکہ جس طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ معلوم معلوم نہیں اسی طرح صفات کی کنہ بھی معلوم نہیں۔ حضرات علماء نے اس مقام پر بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صفات واسماء الٰہیہ توقیفی ہیں جن میں قیاس جائز نہیں۔

مقام ادب

علماء نے اس قدر ادب کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو طبیب کہنا جائز نہیں ہاں شافی کہنا جائز ہے۔ یہاں رائے وعقل سے کام لینا جائز نہیں کیونکہ۔

دور بیناں بارگاہ الست غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

حالانکہ بظاہر طبیب میں کچھ خرابی نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ طب کہتے ہیں تدبیر شفاء کو اور اللہ تعالیٰ کے لیے تدبیر ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ: **ثم استویٰ علی العرش یدبر الامر۔** پھر عرش پر قائم ہوا۔ وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ مگر چونکہ نصوص میں اللہ تعالیٰ پر طبیب کا اطلاق وارد نہیں اس لیے علماء اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ ممکن ہے کہ طب میں کوئی بات ایسی ہو جو کہ عظمت کے منافی ہو۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے وائسرائے میں اگرچہ کانسٹیبل کے اختیارات بھی ہیں کیونکہ کانسٹیبل کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ اسی کے دیئے ہوئے ہیں مگر وائسرائے کو کانسٹیبل کہنا جائز نہیں۔ اور اگر کوئی وائسرائے کو کانسٹیبل کہنے لگے تو مجرم قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔

پس جو حالت ہمارے رحم کی ہے کہ وہ ہمارا دل کڑھتا ہے اس پر حق تعالیٰ کے رحم کو قیاس نہ کرو کہ معاذ اللہ ان کا دل بھی کڑھتا ہوگا۔ یہ اعتقاد باطل اور حرام ہے۔ اسی طرح اسوی علی استوئی میں حق تعالیٰ کے استوئی کو اپنے استوئی پر قیاس نہ کرو۔

ایک محقق کا ارشاد کہ استویٰ کے معنی استقرار ہیں مگر ہر شے کا استقرار جدا ہے جیسے بات کا دل میں جمنا اور ہے اور مکین کا مکان میں جمنا اور ہے پس استویٰ کی حقیقت کا ادراک مستویٰ کی حقیقت معلوم ہونے پر موقوف ہے اور کنہ باری معلوم نہیں تو حقیقت استویٰ پر گفتگو عبث ہے۔ واقعی اس اُمت کے علماء ورثۃ الانبیاء ہیں۔ مگر ایسے جیسے یہ حضرات محققین تھے نہ ہم جیسے علماء۔

اسی طرح غضب کی حقیقت ہمارے اندر جوش کا پیدا ہونا اور بے قابو ہو جانا ہے جس میں بعض اوقات منہ سے کف بھی نکلتا ہے اس پر حق تعالیٰ کے غضب کو قیاس نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے غالب نہیں۔ **بل ھو القاھر فوق عبادہ** (بلکہ وہ غالب ہیں اپنے بندوں پر) اللہ تعالیٰ قاہر ہیں مقہور نہیں غالب ہیں مغلوب نہیں۔ ان کا غضب ورحم اختیاری ہے یعنی یہ صفات درجہ صفات میں قدیمہ ہیں اختیار نہیں اور قدم میں تغیر محال ہے ورنہ امکان خلوص عن الصفات لازم آئے گا اور یہ محال ہے مگر ان صفات کا نفاذ اختیاری ہے کوئی صفت قدیمہ بدون ارادہ حق کے نافذ نہیں ہو سکتی تو جس پر قدم بھی غالب نہیں اس پر حادث کیسے غالب ہوگا۔

رہا یہ کہ پھر حق تعالیٰ کے غضب ورحمت کے کیا معنی ہیں؟ سو علماء نے رحمت کی تفسیر ارادۃ الثواب اور غضب کی ارادۃ العقاب کی ہے اور میرے نزدیک یہ بھی محض تفہیم کے لیے ایک عنوان ہے یہ بھی حقیقت نہیں میرے نزدیک صفات تو کیا افعال الہیہ کی بھی کنہ کسی کو معلوم نہیں۔ اسی لیے حضرات انبیاء علیہم السلام نے کیفیت افعال سے تو سوال کیا ہے۔

رب ارنی کیف تحی الموتی ، و انی یحی ھذہ اللہ بعد موتھا۔

اے میرے پروردگار مجھ کو دکھا دیجئے کہ آپ مردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے۔ مگر حقیقت افعال سے کہیں سوال وارد نہیں حضرات انبیاء علیہم السلام بڑے مؤدب تھے کہ جس بات کے سمجھنے کی توقع نہیں ہوتی اس کو پوچھتے بھی نہیں تھے اسی لیے سوال عن کیفیتہ الافعال کے بعد دوبارہ سوال حقیقت سے نہیں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت کو بھی یہی طریقہ سلامتی کا تعلیم کیا ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ جو امور فہم میں نہ آسکیں ان میں غور وخوض نہ کیا جائے یہ بڑا ادب ہے اور واللہ اسی میں سلامتی ہے اور سکون واطمینان قلب بھی اسی میں ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ قدر میں غور کرنے سے منع فرمایا کیونکہ اس کا تعلق افعال وصفات باری تعالیٰ سے ہے جن کی کنہ کا علم تو محال ہے اور اگر وجہ معلوم ہو بھی گئی تو ایک وجہ

کے لیے پھر دوسری وجہ ہوگی۔ پھر اس سلسلہ وجوہ سے وہ حالت ہوگئی کہ

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

(میرا خواب کثرت تعبیر کی بناء پر خراب ہوگیا)

مگر آج کل بعض لوگ ایسے بد دماغ ہیں کہ اس ادب کی قدر نہیں کرتے بلکہ متشابہات اور مسئلہ قدر میں گفتگو کرتے ہیں مگر ان سے کوئی قسم دے کر پوچھے کہ کیا تم کو گفتگو اور غور و خوض سے سکون و اطمینان حاصل ہوا ہرگز نہیں! واللہ ایک جاہل مسلمان کو قدر میں جتنا اطمینان ہے۔ ان گفتگو کرنے والوں کو اس کا دسواں حصہ بھی مشکل سے ہوتا ہے۔

حضرات صحابہؓ کا ادب دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر ضحک فرماتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف لائے جاتے ہیں (یعنی جہاد میں بعض کافر زنجیروں میں قید ہو کر آتے ہیں پھر اہل اسلام کی صحبت سے مسلمان ہو جاتے ہیں تو گویا یہ لوگ زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف لائے گئے) اس پر صحابہؓ نے یہ سوال نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح ضحک فرماتے ہیں بلکہ یہ حدیث سنتے ہی خوش ہوئے اور کہا یا رسول اللہ جب اللہ تعالیٰ ضحک بھی فراتے ہیں تو ایسے خدا سے تو ہم کو بڑی امیدیں ہیں واقعی خدا ہمارا ایسا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مہربان جنہوں نے ہم کو یہ باتیں بے تکلف بتلا دیں ورنہ دوسرا مصلح تو اسی سوچ میں رہتا کہ اس بات کو بیان کروں یا نہ کروں۔ کہیں مصلحت کے خلاف تو نہیں۔ کبھی لوگ خدا تعالیٰ کی ایسی رحمت و مہربانی کو سن کر دلیر نہ ہو جائیں۔

جیسے حضرت غوث اعظم نے چالیس سال تک رحمت الٰہیہ کا بیان فرمایا پھر خیال ہوا کہ شاید لوگ دلیر ہو گئے ہوں گے۔ تو ایک دن غضب الٰہی کا بیان فرمایا۔ وہ ایسا غضب کا بیان تھا کہ مجلس میں سے چند جنازے اٹھے۔ کئی آدمی خوف سے مر گئے تو آپ پر بذریعہ الہام کے عتاب ہوا کہ تم نے ہمارے بندوں کا دل توڑ دیا۔ کیا ہماری رحمت اتنی ہی ذرا سی تھی کہ تمہارے چالیس سال کے بیان میں ختم ہوگئی۔

میں کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خیال ہوتا جو حضرت غوث اعظم کو ہوا تو ہم کو حق تعالیٰ کی رحمت و لطف و ضحک کی خبر کیونکر ہوتی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بیان میں ذرا پس و پیش نہیں ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ ایسے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے

ایسے۔ پس یہ شعر پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

یا رب تو کریمی و رسولؐ تو کریم — صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

اے رب! تو کریم اور تیرا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سو شکر ہے کہ میں دو کریموں کے درمیان ہوں اور سعدی فرماتے ہیں۔

نماند بعصیاں کسے در گرد — کہ دارد چنیں سید پیش رو

(وہ شخص گناہوں کے باعث رہن نہیں رہے گا جو ایسا پیش رو سردار رکھتا ہو۔)

غرض اللہ تعالیٰ کی صفات وافعال میں قیاس سے کام نہ لو۔ اللہ تعالیٰ صاحب رحمت بھی ہیں، صاحب غضب بھی ہیں۔ وہ ضحک بھی فرماتے ہیں صاحب ید و وجہ بھی ہیں۔ صاحب قدم وساق بھی ہیں مگر اپنے ید و قدم وساق پر قیاس نہ کرو اور ہاں اللہ تعالیٰ صاحب فخذ نہیں ہیں کیونکہ نصوص میں اس کا ذکر نہیں اور قیاس جائز نہیں۔ یہ اس لیے میں نے کہہ دیا کہ شاید کوئی عقل کا پورا قیاس سے یوں کہنے لگے کہ جب وجہ وید وقدم وساق ہے تو ان کے درمیان کی چیزیں فخذ وغیرہ بھی ہوں گی اس کا یہ جواب دیا جائے گا۔

تو نہ دیدی گہے سلیماں را — چہ شناسی زبان مرغاں را

تم نے کبھی سلیمان کو آنکھ سے تو دیکھا نہیں پھر تم پرندوں کی بولی کب سمجھ سکتے ہو۔ جیسے ایک بزرگ نے فرمایا تھا اس شخص کے جواب میں جس نے دریافت کیا شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا باتیں کی ہیں۔ فرمایا:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغبان — بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(کوئی اتنا دماغ کہاں سے لائے کہ باغباں سے پوچھے بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کہا)

لوگ اولیاء اللہ کو خدا کا راز دار سمجھتے ہیں کہ ان سے ایسے سوالات کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے کسی مجذوب سے پوچھا کہ یہ بادشاہت کب تک رہے گی۔ مجذوب نے دھمکا کر جواب دیا کہ کیا میں خدا کا رشتہ دار یا سررشتہ دار ہوں جو ان باتوں کی مجھے خبر ہو۔ مجھے غیب کی کیا خبر۔

حالانکہ مجاذیب اکثر امور تکوینیہ کو ظاہر کر دیا کرتے ہیں۔ مگر بعض مجذوب مؤدب بھی ہوتے ہیں۔ جیسے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی تعریف میں نے حضرت حاجی صاحب سے سنی ہے سالکین کی زبان سے مجذوبوں کی تعریف کم سنی جاتی ہے۔ ہمارے حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی

تعریف حضرت نے بہت کی ہے اور یہ حافظ صاحب صرف ایک کمبل میں رہتے تھے مگر کبھی برہنہ نہیں دیکھے گئے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک بار جلال آباد تشریف لے گئے وہاں کے پٹھانوں نے کہا، حضور نے قدم رنجہ فرمایا۔ تو ان کو ادب سکھلایا کہ بزرگوں سے یوں نہیں کہا کرتے کہ قدم رنجہ فرمایا۔ کیا ہم کسی کے نوکر ہیں کہ قدم رنجہ فرماتے بلکہ یوں کہا کرتے ہیں کہ حضور نے کرم فرمایا۔

تو وہ مجذوب بھی مؤدب تھے جنہوں نے یہ فرمایا کہ میں خدا کا رشتہ دار یا سر رشتہ دار ہوں۔ اس لیے یہ سوال ان کو ناگوار ہوا جس میں غیب سے استفسار تھا۔ یہ ایک ضروری مضمون تھا سبقت رحمتی علے غضبی کے متعلق کہ حق تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔

معرفت حق

اب میں مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب میں جو عرش پر ہے قبل ہمارے وجود کے اور قبل وجود ان افعال کے جو موجب رحمت وغضب ہیں اپنے پاس یہ لکھ لیا ہے کہ میری رحمت غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔ یعنی میری رحمت غضب پر غالب ہے بس بلا تکلف یہ حالت ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود　　لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

یعنی حق تعالیٰ کا لطف اس وقت ہمارے شامل حال تھا جب کہ نہ ہمارا وجود تھا نہ ہماری طرف سے کچھ تقاضا تھا۔

یہاں ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی یہ ہے کہ سبقت رحمتی غضبی پر بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ صفات قدیمہ میں سبقت وغلبہ کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہاں صفات قدیمہ میں سبقت وغلبہ مراد نہیں بلکہ ان کے تعلق میں سبقت وغلبہ مراد ہے اور تعلق حادث ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شخص میں اسباب غضب و اسباب رحمت دونوں مجتمع ہوں تو اس پر رحم ہی ہو جاتا ہے اب اشکال کچھ نہیں۔ یہ تو حدیث کے متعلق لفظی تحقیق تھی۔ اب میں اس سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف ابھی تک ذہن نہ گیا ہوگا اور اس کی ضرورت عوام کو نہیں کیونکہ جس غلطی کا ازالہ اس وقت کیا جائے گا وہ عوام کو پیش نہیں آتی وہ ان امراض سے بری ہیں جیسے وہ بدہضمی کے مرض سے بری ہوتے ہیں۔

چنانچہ ایک دیہاتی کو کسی حکیم نے دیکھا کہ اس نے روٹی کھا کر اوپر سے چھاچھ کا بدھنا

بھرا ہوا پی لیا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ کھانے کے بعد چھاچھ پینا مضر ہے اس کو درمیان میں پینا چاہیے۔ تو اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ ارے فلانے چار ٹکڑ (موٹی روٹیاں) اور لے آ، اس چھاچھ کو بیچ کرلوں۔ یہ حکیم کہہ رہا ہے کہ اسے بیچ میں کرلے چنانچہ وہ چار چنگ اور لایا اور چوہدری صاحب وہ بھی کھا گئے پھر حکیم سے کہا کہ حکیم جی اب تو نقصان نہ ہوگا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ بھائی تو قواعد طب سے مستثنیٰ ہے تجھے کسی طرح مضر نہیں۔

تو جیسے عوام بہت سے ظاہری امراض وخطرات سے بری ہیں ایسے ہی بہت سے باطنی امراض وخطرت سے بھی بری ہیں کبھی خواص سے مل کر ان میں بھی یہ امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر دیہاتی ہونا ہی بہتر ہے۔ نہیں ہرگز نہیں کیونکہ دیہاتی گو بعض امراض سے محفوظ ہیں مگر بہت سے لطفوں سے محروم ہیں۔ شہر والوں کو لطف بہت حاصل ہیں۔ اسی طرح خواص کو لطف بہت ہے کہ ان کو عوام سے زیادہ اللہ اور رسولؐ کی معرفت ہے۔ اور معرفت وہ چیز ہے کہ جنت بھی اسی کی ایک فرع ہے۔

چنانچہ حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کو بچپن میں مرجانا اور خطرات سے محفوظ ہونا پسند ہے یا بالغ ہوکر خطرہ میں پڑنا پسند ہے۔ فرمایا کہ مجھے بالغ ہوکر خطرہ میں پڑنا زیادہ پسند ہے بچپن کی موت پسند نہیں کیونکہ بلوغ کے بعض معرفت حق عزوجل زیادہ ہوتی ہے جو بچپن میں نہیں ہوتی۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ اسی معرفت پر خوش ہوکر فرماتے ہیں۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست   آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردان پر آفرین ہے)

میں نے حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ بھائی جنت کا مزہ برحق، کوثر کا مزہ برحق، مگر نماز میں جو مزہ ہے وہ کسی چیز میں نہیں۔ جب ہم سجدہ میں جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے پیار کرلیا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ جب ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں آئیں گی تو ہم ان سے کہہ دیں گے کہ بی اگر قرآن سناؤ بیٹھو ورنہ چلتی۔

تو حضرت معرفت ایسی لذیذ شے ہے کہ عارفین کے نزدیک جنت اور حوروں میں بھی وہ مزہ نہیں جو اس میں ہے۔ اور اس سے نعمائے دنیا کا کہ ان میں معرفت بھی ہے نعمائے جنت سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ جنت میں یہ معرفت ایسی ہوگی کہ وہاں کی نعمت

سے زیادہ لذیذ ہوگی۔ تو خود جنت کی بعض نعمتیں بعض سے افضل ہوئیں۔ باقی ہم جیسوں سے کوئی پوچھے ہم تو یوں کہیں کہ روٹیوں میں زیادہ مزہ ہے نماز میں کیا مزہ ہے! اور فقہاء نے ہم جیسے ضعفاء کے لیے وسعت بھی دے دی ہے کہ اگر کھانا سامنے ہو نماز ہونے لگے تو روٹی پہلے کھالو نماز بعد میں پڑھ لینا تاکہ نماز فراغت سے پڑھی جائے ورنہ ساری نماز میں روٹی ہی کا خیال رہے گا کیونکہ تمہارے نزدیک روٹی میں مزہ زیادہ ہے۔ اور اسی لیے شریعت سے تعجیل افطار کا حکم دیا ہے کہ نماز مغرب سے پہلے افطار کر لینا چاہیے اور حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

للصائم فرحتان فرحته عند فطره و فرحته عندلقاء الرحمن (الصحیح البخاری ۱۷۵۹)

کہ روزہ دار کو دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت ہوتی ہے دوسری اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت ہوگی۔ ہم لوگوں کو افطار کے وقت خوشی اس کی ہوتی ہے کہ کھانے کو ملا، منہ کا تالا کھل گیا مگر حضرت ابوبکر عمر رضی اللہ عنہما کو جو مسرت تھی وہ اس بات پر تھی کہ منزل پوری ہوگئی۔ خدا کا حکم ادا ہو گیا۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردان پر آفرین ہے)

ہجوم خطرات

بہرحال خواص کے مراتب زیادہ ہیں گو ان کو خطرات بھی بہت ہیں ایک بار مجھ پر ایک سخت حالت تھی۔ اس وقت تمنا کرتا تھا کہ کاش میں قرآن کا ترجمہ نہ سمجھتا کیونکہ وہ حالت ترجمہ سمجھنے ہی کی تھی بعد میں ہوش آیا کہ یہ تمنا "ناشکری" کی ہے بلکہ ہم لوگوں کو خطرات سے بچنے کی ہمت کرنا چاہیے۔ اور ان لذتوں سے خوش ہونا چاہیے خواص کو خطرہ بے شک بہت ہے مگر اسی وجہ سے تو ان کے مراتب زیادہ ہیں ملائکہ سے نوع بشر اسی لیے افضل ہے کہ ملائکہ کو خطرہ نہیں اور انسان کو خطرہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی ذرت کو پیدا کیا، تو ملائکہ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔

یا رب خلقهم یا کلون ویشربون و ینکحون ویر کبون واجعل لهم الدنیا ولنا الاخرة. (لم أجد هذا الحدیث فی سوعة أطراف الحدیث) (کہ اے اللہ! انسان کو دنیا دیجئے اور ہم کو آخرت دے دیجئے ارشاد ہوا۔

لاجعل من خلقته بیدی و نفخت فیه من روحی کمن قلت کن فکان۔
(کذا فی المشکوٰۃ عن البیہقی ۱۲)

کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ کیا میں ایسی مخلوق کو جسے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے اس کے برابر کردوں جس کو کن کہہ کر پیدا کردیا۔

تو یہ فضیلت انسان کی ان خطرات ہی کی وجہ سے تو ہے جو ملائکہ کو درپیش نہیں۔ بعض لوگ ذکر میں لذت اور مزہ کے طالب ہیں۔ ارے بس رہنے دو یہ مزا نہ آنا بھی رحمت ہے کیونکہ مزہ کے بعد ثواب کم ہوجاتا ہے۔ دیکھو ملائکہ کو عبادت میں لذت حاصل ہے اور انسان عام طور پر طاعات میں لذت سے خالی ہیں مگر ثواب زیادہ انسان ہی کو ہے۔ بس تمہارا تو یہ مذاق ہونا چاہیے۔

ناخوش تو خوش بود برجان من   دل فدائے یار دل رنجان من

پھر بعض دفعہ لذت سے انبساط بڑھ جاتا اور ادلال ہوجاتا ہے جو کبھی گستاخی کی حد سے قریب ہوجاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک دعا کی۔ اس کا جواب الہام سے عطا ہوا۔ اس کے جواب میں آپ نے ایک کلمہ ایسا فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب یا مولانا گنگوہی اس کو۔ سن کر کانپ گئے اور فرمایا کہ یہ انہی کا مرتبہ ہے جو ایسی بات کہہ گئے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو کان پکڑ کر باہر نکال دیا جاتا۔

بہرحال خواص کو خطرات سے نہ گھبرانا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ وارود دیکھ کر مرض دیتے ہیں خواص کو جس طرح خطرات بہت ہیں اسی طرح ان میں تحمل کی طاقت بھی زیادہ ہے۔ اگر عوام میں یہ امراض و خطرات ہوتے جو خواص کو درپیش ہوتے ہیں تو وہ ان کا تحمل بھی نہ کرسکتے۔ جیسا کہ بچوں کو خطرات بہت پیش آتے ہیں۔ مگر ان کی تائید بھی بالغوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بچے بہت گرتے پڑتے ہیں۔ بعض دفعہ بہت اونچے سے گر جاتے ہیں مگر ان کو زیادہ چوٹ نہیں آتی۔ بڑا آدمی تو مر ہی جائے۔ میاں جی ظالموں کی طرف سے بچوں پر بہت زیادتی ہوتی ہے۔ اگر میاں جی کو اتنا پیٹا جائے تو وہ بستر ہی سے نہ اٹھ سکیں مگر بچے اگلے ہی دن آجاتے۔

بچوں کی حفاظت پر ایک یہ حکایت یاد آئی کہ ایک عورت ریل میں سفر کررہی تھی اور اس کے ایام وضع قریب تھے۔ وہ جو ضرورت سے ریل کے پاخانہ میں گئی اس وقت اس کے درد شروع ہوا اور بچہ نکل کر لیٹرین کے سوراخ سے نیچے گر پڑا ماں یہ ماجرا دیکھ کر تڑپ گئی اور

سخت بے چین ہو کر باہر آئی اور ریل کے روکنے کے لیے زنجیر کو کھینچ لیا۔ ریل رکی اور گارڈ وغیرہ کو یہ قصہ معلوم ہوا تو فوراً ڈرائیور انجن کو اکیلا لے کر پیچھے لوٹا۔ دور جا کر بچہ پر نظر پڑی کہ دونوں پٹڑیوں کے درمیان پڑا ہاتھ پیر چلا رہا تھا اور ساتھ انگوٹھہ چوس رہا تھا اور اس کے بدن پر کسی جگہ بھی چوٹ نہ آئی تھی۔ ڈرائیور نے دوڑ کر اس کو اٹھایا اور خوشی خوشی واپس لوٹا اور ماں کو لا کر دے دیا۔ وہ گویا مر کر زندہ ہو گئی اور پھر ریل روانہ ہو گئی۔

تو جیسے بچوں کی خطرات میں امداد و تائید ہوتی ہے اسی طرح خواص کی تائید ہوتی ہے اس لیے ان کو گھبرانا نہ چاہیے۔

مقام دوست

اب میں اس مضمون کو بیان کرتا ہوں جو اس حدیث سے مستنبط کرنا مقصود ہے گو وہ مضمون دقیق ہے مگر زیادہ دقیق نہیں ہاں عوام اور مستورات کے سامنے بیان کرنے کا نہیں تھا اسی لیے مجھے تردد تھا کہ اس کو عورتوں کے مجمع میں بیان کروں یا نہ کروں۔ مگر بعض دفعہ دقیق مضامین بیان کر کے جو مستورات سے پوچھا گیا کہ تم نے کیا خاک سمجھا ہوگا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو سمجھ گئے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے اس لیے ہمت کرتا ہوں میرا ارادہ اس مضمون کے بیان کرنے کا پہلے ہوا تھا مگر یہ خیال تھا کہ مجمع خواص میں بیان کروں گا۔ جب مستورات کی طرف سے درخواست بیان کی ہوئی تو دوسری آیت کے بیان کا ارادہ ہوا یعنی

یایتھا النفس المطمئنه ارجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

مگر پھر رائے بدل گئی لیکن اس آیت کا ترجمہ تو کر دوں تا کہ اس آیت کا کچھ بیان بھی ہو جائے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ مسلمان کو مرتے وقت ملائکہ اس طرح بشارت دیں گے کہ نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف واپس چل اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہیں پس تو میرے خاص بندوں (کی جماعت) میں داخل ہو جاؤ اور میری جنت میں پہنچ جاؤ یہ تو ترجمہ ہوا۔

اب ایک نکتہ بھی بیان کر دوں وہ یہ کہ آیت میں ادخلی فی عبادی (میرے خاص بندوں میں داخل ہو جاؤ) کو ادخلی جنتی (جنت میں پہنچ جاؤ) پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ

ہے۔ سو اس کی توجیہ حضرت امام شافعی کے قول سے سمجھ میں آئی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ جنت میں دوستوں کی زیارت اور ملاقات ہوگی اس وقت سے مجھے جنت کا اشتیاق ہوگیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں کی ملاقات میں جنت سے بھی زیادہ لذت ہے مگر شطرنج باز گنجفہ باز دوست نہیں بلکہ امام شافعی جیسے دوست جو شافعی ہوں یا شافع ہوں۔ اور یاء و عین دونوں جمع ہو جائیں تو نور علی نور ہے اور گر ایسے دوست نہ ہوں بلکہ محض دنیوی دوستی ہو تو وہ آخرت میں مبدل بعداوت ہو جائے گی۔

الاخلاء یومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقین

تمام دنیاوی دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے خدا سے ڈرنے والوں کے۔

وہاں وہی دوستی باقی رہے گی جس کا منشاء دین اور تقویٰ ہو۔ بہر حال دوستوں کی ملاقات میں ایسی لذت ہے کہ اس کے بغیر جنت بھی خار ہے مولانا فرماتے ہیں۔

با تو دوزخ جنت است اے جانفزا　　　بے تو جنت دوزخ ست اے دلربا

اے محبوب تیری ہمنشینی میں میرے لئے دوزخ بھی جنت ہے اور تیرے بغیر اے جگری دوست جنت بھی میرے لئے دوزخ ہے۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ　　　جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں　　　فوق گردوں ست نے قعر زمیں

(جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگر چہ کنواں ہی کیوں نہ ہو جس جگہ محبوب خوش وخرم بیٹھا ہو وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند تر ہے نہ کہ پست زمین)

ایک صحابی کو یہ خیال ہوا کہ اگر جنت میں ہم نیچے کے درجے میں ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اوپر کے درجوں میں اور اس لیے آپ کی زیارت نہ ہوئی تو جنت کو لے کر کیا کریں گے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ومن یطع الله والرسول فاولئک مع الذین انعم الله علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصلحین وحسن اولئک رفیقاً۔

(اور جو شخص اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان

حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ یعنی انبیاء وصدیقین شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔)

کہ جو لوگ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کیساتھ رہیں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ (جنت میں ہوں گے۔ اور یہ لوگ اچھے رفیق (اور اچھے دوست) ہیں۔ ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سب کے سب ان کے درجہ میں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے قریب ہوں گے اور ان سے زیارت وملاقات کیا کریں گے۔ کبھی ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت و ملاقات کو جایا کریں گے۔ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان شاء اللہ ہمارے پاس تشریف لایا کریں گے۔ اس وقت ہم خوش ہو کر یہ کہیں گے۔

امروز شاہ شاہان مہمان شدست مارا
جبریل باملائک درباں شدست مارا

(آج بادشاہوں کے بادشاہ ہمارے مہمان ہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام فرشتوں کے ہمراہ ہمارے مہمان ہیں)

آگے ناز کو قطع کرتے ہیں کہ اپنے عمل پر ناز نہ کرنا۔ ذالک الفضل من اللہ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض فضل ہوگا۔ اس کے بعد فضل پر تکیہ کو توڑا و کفیٰ باللہ علیما کہ فضل پر تکیہ کر کے بے فکر نہ ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ فضل کس پر ہوگا کس پر نہیں ہوگا۔ جس کو دوسرے مقام پر صراحت کے ساتھ بتلا دیا گیا ہے۔

(ان رحمت اللہ قریب من المحسنین) کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل نیکوکار بندوں سے قریب ہے۔

اہتمام صحبت

تو مستورات کی درخواست کے بعد اول اس مضمون کے بیان کا ارادہ تھا۔ جس کا ذکر بھی اجمالا کچھ ہو گیا۔ پھر دوسرے مضمون کا قصد ہوا مگر اس کا منتظر تھا کہ مجمع سمجھنے والا قدر دان ہو۔ تو بیان کروں پھر اتفاق سے ایسا مجمع بھی ہو گیا مگر مجھے تردد تھا کہ مستورات کے سامنے اسے بیان کروں یا نہیں مگر ایک تو یہ مستورات کے اس قول سے کہ ہم تو دقیق مضامین بھی سمجھ لیتے ہیں کچھ ہمت ہوئی پھر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے بیان کا ارادہ کر ہی لیا اور اس مرض کے متعلق بیان

کرنا ہی تجویز کرلیا جو کہ اکثر خواص سے مل کر یہ امراض لگ جاتے ہیں اس پر ایک علمی تحقیق یاد آ گئی۔ میں پہلے اس کو بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ امراض جسمانی میں تو تعدیہ نہیں ہوتا جس کے ڈاکٹر قائل ہیں گو شرعی حد میں رہ کر کوئی اس کا بھی قائل ہو تو گنجائش ہے۔ مثلاً کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مرض لگ جاتا ہے۔ اگر حکم الٰہی نہ ہو تو نہیں لگ سکتا۔ اس میں زیادہ محذور نہیں۔ مگر بعض تو اس کے قائل ہیں کہ بدون مشیت حق کے مرض لگ جاتا ہے یہ لوگ دہریہ ہیں۔ یورپ کے ڈاکٹروں کا یہی عقیدہ ہے۔ اور انہی کے اثر سے بعض مسلمانوں میں یہ عقیدہ آیا ہے مگر چونکہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمان بھی ایسے جن کے نام پر سر ہے جیسے سرکنڈے کا سر اور اگر شر کہو تو اور بھی اچھا کہ سر سے زیادہ شرف ہو جائے گا۔ تین نقطے تو بڑھ جائیں گے۔ اس لیے یہ لوگ اسلام کے نام کا لحاظ کر کے یوں کہتے ہیں کہ مرض لگتا تو ہے خدا ہی کے حکم سے مگر اللہ تعالیٰ نے جن امراض کو متعدی کیا ہے ان میں تعدیہ ضرور ہوگا۔ کیونکہ خدا نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ فلاں مرض ضرور ہی آ لگے گا اور قانون فطرت بدل نہیں سکتا اس لیے مشیت بھی ضرور ہوگی اور تعدیہ بھی ضرور ہوگا۔ اور ان لوگوں نے استدلال کیا ہے اس آیت سے۔

فلن تجد لسنة الله تبديلاً ولن تجد لسنة الله تحويلاً۔ آپ خدا کے اس دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے اور خدا کے دستور کو کبھی منتقل ہوتا ہوا نہ پائیں گے۔

مگر یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عادت یا قانون کو کوئی دوسرا نہیں بدل سکتا نہ یہ کہ وہ خود بھی نہ بدل سکیں پس یہ کہنا غلط ہے کہ مشیت بھی ضرور ہوگی اور تعدیہ بھی ضرور ہوگا۔ پس تعدیہ میں تین قول ہوئے۔

ایک یہ کہ بدون مشیت حق کے مرض لگتا ہے یہ تو کفر و زندقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ مشیت حق سے لگتا ہے مگر مشیت تو ضرور ہوتی ہے۔ یہ قول غلط و باطل ہے گو کفر نہیں۔

تیسرے یہ کہ مشیت سے لگتا ہے اور مشیت ضرور نہیں۔ اگر مشیت ہوگی تو مرض نہیں لگے گا۔ اس میں زیادہ محذور نہیں اگر کوئی اس کا قائل ہو جائے تو گنجائش ہے۔

مگر احادیث صحیحہ سے ظاہراً ترجیح اسی کو ہے کہ تعدیہ کوئی شے نہیں اور ایک کا مرض دوسرے کو نہیں لگتا **لا عدوى ولا طيرة** (اصحیح لمسلم ۴: ۱۷۴۲، المسند للامام احمد ۱: ۱۷۴، ۲: ۱۵) (مرض کے متعدی ہونے اور شگوہ لینے کی کوئی حقیقت نہیں) حدیث مشہور ہے اسی طرح

حدیث اعرابی میں فمن اعدی الاول (یعنی پہلے میں کس سے تعدی ہوگی) سے صاف عدوی کی نفی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔

غرض امراض جسمانی میں تو صحیح قول یہ ہے کہ تعدیہ نہیں ہے مگر امراض باطنیہ میں تعدیہ ضرور ہوتا ہے صوفیہ نے اس کو مسارقہ سے تعبیر کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہر جلیس اپنے جلیس کے اخلاق وغیرہ کا اثر اس طرح قبول کرتا ہے کہ نہ اس کو خبر ہوتی ہے نہ دوسرے کو صحبت بد کا بھی اثر ہوتا ہے اور صحبت نیک کا بھی۔ اسی لیے صوفیہ کو صحبت کا اہتمام سب سے زیادہ ہوتا ہے چنانچہ صحبت بد کے بارہ میں ان کا ارشاد ہے۔

تا توانی دور شو از یار بد   یار بد بدتر بود از مار بد

(جہاں تک ممکن ہو برے دوستوں سے بچو' برا دوست سانپ سے زیادہ برا ہے۔ ایک لمحہ اولیاء اللہ کی صحبت سوسولہ بے ریا عبادت سے افضل ہے)

اور صحبت نیک کے بارے میں فرماتے ہیں۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صحبت صالح کا اثر تو یہ ہے کہ مسارقت کے بعد مشارقت ہوئی ہے دونوں انوار سے منور ہو جاتے ہیں اور صحبت بد کے اثر کا کچھ نام صوفیہ نے لکھا مگر میں کہتا ہوں کہ وہاں مسارقت کے بعد مبارقت ہوتی ہے کہ دونوں طرف سے بجلی چمکتی ہے۔ اور سوختن وافروختن کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ دونوں کا دین جل کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ایک عارف صحبت صالح کی تاکید میں فرماتے ہیں۔

جہد کن و با مردم دانا نشین با صدق و صفا   یا با صنم لطیف رعنا نشین با شرم و حیاء
زیں ہر دو گرت یکے میسر نشود از طالع خویش   اوقات مکن ضائع و تنہا بنشین در یاد خدا

(کوشش کر اور صدق و صفا کے ساتھ عقلمند انسان کی صحبت اختیار کر یا شرم و حیا ملحوظ رکھتے ہوئے خوبصورت اور لطیف محبوب کی صحبت میں بیٹھ اگر شومئی قسمت سے یہ دونوں میسر نہ ہو سکیں تو اپنا وقت ضائع نہ کرے بلکہ یاد خدا میں یہ دونوں میسر بلکہ (یاد خدا میں تنہائی اختیار کر)

مطلب یہ ہے کہ یا تو کسی عارف کے پاس صدق و خلوص سے رہو اگر یہ نہ ہو سکے تو اپنی بیوی کے پاس رہو۔ مگر آج کل نوجوان کو بیوی سے تو جاڑہ چڑھتا ہے اگر ماں باپ کی

لائی ہوئی دلہن ہے تو وہاں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صاحب پنچوں کی بلا سر دھر لی گئی۔ کیا کریں دولہا کو پسند نہیں۔ گو شرافت تو یہ ہے کہ ماں باپ کی لائی ہوئی کی قدر اپنی لائی ہوئی سے زیادہ کی جائے تا کہ ماں باپ کو شرمندگی نہ ہو) مگر زیادہ شکایت تو ان لوگوں کی ہے جو خود طلب و رغبت سے نکاح کرتے ہیں۔ اور پھر بھی بیوی کے حقوق ضائع کرتے ہیں۔ ان کی قدر نہیں کرتے۔ رات دن دوست احباب کی صحبت میں رہتے ہیں ان سے دل لگی مذاق اور فحش مذاق کیا جاتا ہے اور بیوی سے جس کے ساتھ ایسی باتیں کرنا جائز بھی ہے اور ثواب بھی سیدھے منہ بات بھی نہیں ہوتی وہاں منہ کو گوند لگ جاتا ہے اور کہنے کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم کو شرم آتی ہے ارے تم کو مردوں کو فحش مذاق کرتے ہوئے غیرت نہ آئی ڈوب مرد۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو نہ شیخ میسر ہو نہ دلبر رعنا یعنی بیوی بھی میسر نہ ہو خواہ اس واسطے کہ نکاح کا سامان نہیں یا اس واسطے کہ بیوی مر گئی ہے تو اس کو چاہیے کہ یاد خدا میں تنہا بیٹھے اور صحبت بد میں ہرگز نہ بیٹھے ورنہ دین کی خیر نہیں تو صوفیہ کے کلام سے معلوم ہوا کہ اخلاق باطنہ میں تعدیہ ہوتا ہے۔

درجات اتباع

اسی لیے میں نے کہا تھا کہ آج جس مرض پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں عوام اس سے بری ہیں۔ ہاں خواص سے مل کر کبھی ان میں بھی یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے اس لیے سب کے سامنے اس کے بیان کر دینے کا مضائقہ نہیں اور وہ مرض ایسا ہے جو ابھی پندرہ بیس دن ہوئے سمجھ میں آیا ہے۔ اس کی عمر بہت تھوڑی ہے اور جیسے اس کی سمجھ میں آنے سے مسرت ہوئی کہ ایک نیا علم حاصل ہوا ویسے ہی اس کا غم بھی ہوا کہ اب تک اتنے روز تک ہم جہل میں مبتلا رہے اور اس کے سمجھ میں آنے کے بعد میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں نے اپنی اصلاح کر لی ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ میں اپنی حالت کو نظر ثانی کا محتاج سمجھنے لگا۔ اور امید ہے کہ ان شاء اللہ دس پندرہ روز میں نظر ثانی ہو جائے گی۔

اور میں اپنے احباب کو بھی اسی کی وصیت کرتا ہوں کہ آپ بھی اس کو سن کر اپنی حالت پر نظر ثانی کیجئے۔

وہ مضمون یہ ہے کہ جس شخص کو طریق کی طلب ہے یہ چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا متبع ہو جاؤں پھر اتباع کے دو درجے ایک یہ کہ فتویٰ علماء پر عمل کرتا رہے۔ جس کو وہ جائز کہیں اس کو جائز جانے اور جس کو وہ ناجائز اور حرام کہیں اس سے بچے۔ یہ بھی ایک درجہ اتباع کا ہے کہ مباحات شرعیہ پر عمل کرے۔ گو حضورؐ نے ان مباحات کو نہ کیا ہو اور یہ بھی نجات کے لئے کافی ہے۔ میں غلو نہیں چاہتا گو یہ مضمون میری نظر میں بہت اہم ہے۔ جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور ایسا اہم ہے کہ میں اس کی بناء پر اپنی حالت کو نظر ثانی کا محتاج سمجھتا ہوں مگر میں حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہتا کہ مباحات پر عمل کرنے کو نا کافی کہہ دوں۔ ہرگز نہیں! بلکہ میں صاف کہتا ہوں کہ مباحات پر عمل کرنا بھی اتباع میں داخل اور نجات کے لئے کافی ہے۔

دوسرا درجہ اتباع کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات و افعال کا اتباع کیا جائے۔ یہ کامل اتباع ہے اور اس کے لئے ضرورت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و افعال و طریق عمل کے معلوم کرنے کی پھر اس میں بھی تین درجے ہیں ایک عبادات میں اتباع۔ دوسرے معاملات میں اتباع۔ ان میں تو جہاں تک ہو سکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا اتباع کرے اور حضورؐ کے طریق عمل کی تلاش کرے کیونکہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور مخلوق سے ہے اور ایک یہ کہ ماکولات و مشروبات میں اتباع کیا جائے کہ جو حضورؐ نے کھایا وہی کھائے۔ جو حضورؐ نے پیا وہی پئے جو آپ نے پہنا وہی پہنے۔ اس میں جس قدر سہولت ہو سکے اتباع کیا جائے مبالغہ نہ کیا جائے کیونکہ اس میں مبالغہ کرنا بعض اوقات ہم جیسے ضعفاء کے تحمل سے باہر ہوتا ہے اور یہ اقویاء کا کام ہے۔

جیسے حضرت خواجہ بہاء الدین کی یہی تحقیق ہے جس کا قصہ یہ ہے کہ آپ کی مجلس میں حدیث پڑھی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہ کھاتے تھے بلکہ آٹے کو پیس کو پھونک سے بھوسا اڑا دیا جاتا تھا جو اڑ گیا وہ اڑ گیا باقی کو گوندھ کر پکا لیا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آج سے ہمارے واسطے بھی اسی طرح آٹا گوندھا جائے اور چھلنی میں نہ چھانا جائے شام کو جو روٹی اس طرح کھائی گئی سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ ہم نے بڑی گستاخی کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا قصد کیا اور اپنے کو اس سنت پر عمل کرنے کا اہل سمجھا ہم اس کے اہل نہ تھے اس لئے تکلیف ہوئی۔ آئندہ سے ہمارے واسطے چھنا ہوا آٹا ہی بدستور پکایا جائے۔

سبحان اللہ کیسا ادب تھا کوئی بے ادب ہوتا تو سنت پر اعتراض کرتا کہ اچھا سنت پر عمل کیا تھا عمل بالسنّت سے یہ ضرر ہوا مگر حضرت شیخ نے ہم جیسوں کی تعلیم فرمادی کہ ہم اس سنت کے اہل نہ تھے کیونکہ ہمارے قوی ضعیف ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قوی ہم سے زیادہ قوی تھے اس لئے۔ یہ طریقہ حضورؐ ہی کے واسطے مناسب تھا۔

غرض ماکولات ومشروبات وملبوسات میں اگر ہو سکے تو جتنا بھی ہو سکے اتباع کرے جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کدو رغبت سے کھایا ہے اسی طرح آپ کو دست کا گوشت مرغوب تھا اور ٹھنڈا اور میٹھا پانی مرغوب تھا۔ وغیرہ وغیرہ لیکن اس میں اپنی ہمت سے آگے غلو نہ کیا جائے زیادہ اہتمام اور کاوش کی ضرورت ان امور میں ہے جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے یا مخلوق سے یعنی عبادات ومعاملات اور ماکول ومشروب کا تعلق تو اپنی ذات سے ہے اس میں بہت کاوش کی ضرورت نہیں ہاں سہولت سے جتنا ہو جائے یہ بھی دولت عظیمہ ہے۔ مگر آج کل برعکس معاملہ ہے کہ ماکول ومشروبات وملبوس میں تو اتباع نبوی کاوش کے ساتھ کیا جاتا ہے عبادات اور معاملات میں اتباع کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

اتباع سنت

تو اب میں اس مرض کے متعلق کہتا ہوں کہ ہم لوگ جو حضورؐ کا اتباع کرتے ہیں تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ اتباع تو کرتے ہیں اپنی طبیعت کا اور بوجہ علم کے اس کے دلائل احادیث سے تلاش کر لیتے ہیں یہ نہیں کہ اپنی طبیعت سے خالی الذہن ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز کو اصل بنائیں پھر اس کا اتباع کریں۔ میں دوسروں کو کیا کہوں خود اپنے کو کہتا ہوں مثلاً میرے اندر تیزی ہے تو میں عمل تو کرتا ہوں اپنی طبعی حدت پر مگر اس کی تائید میں حدیثیں میں نے وہ تلاش کر لی ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غصہ کرنا ثابت ہے۔ مثلاً حدیث لقطہ میں آپؐ نے سائل کے اس قول پر کہ لقطہ ابل کو کیا کیا جائے غصہ ظاہر فرمایا اسی طرح دیوار قبلہ پر نخامہ (رینٹ) دیکھ کر آپ کو غصہ آ گیا۔ نیز صحابہؓ نے مسئلہ قدر میں کلام کیا تو حضورؐ کو سخت ناگوار ہوا اور آپؐ بہت غصے ہوئے۔

میں ابھی آپ کو اپنے سے بدگمان نہیں کرتا کیونکہ بلاوجہ اپنے کو متہم کرنا بھی برا ہے

میں نے محض مثال دی ہے کہ ممکن ہے میری یہ تیزی اتباع سنت کی بناء پر نہ ہو بلکہ اتباع طبیعت پر مبنی ہو اور سنت کو محض آڑ بنالیا ہے اور ممکن ہے کہ اتباع سنت ہی کی وجہ سے ہو۔ کیا عجب ہے کہ نظر ثانی میں یہ حالت سنت کے موافق ہی نکلے مگر جس کو اتباع سنت کا قصد و اہتمام ہے اس کو احتمال ضرور ہونا چاہئے کہ میری حالت حقیقت میں اتباع سنت کے موافق ہے یا سنت کو محض آڑ بنایا گیا ہے کیونکہ آج کل زیادہ تر اتباع سنت اسی طرح ہو رہا ہے کہ اتباع تو کرتے ہیں اپنی طبیعت کے تقاضے کا۔ طبیعت کو بدلنا اور اس پر مشقت ڈالنا بالکل نہیں چاہتے اور اس کی تائید میں علم وحفظ کی مدد سے بہت سی احادیث چھانٹ لی ہیں۔

مثلاً کسی کو عمدہ غذا کا شوق ہے اس نے یہ حدیث چھانٹ لی کہ حضورؐ نے عمدہ کھانا کھایا ہے چنانچہ ایک فارسی نے آپ کی دعوت کی تھی اور عمدہ گوشت پکایا تھا۔ کسی کو عمدہ لباس کا شوق ہے اس نے وہ حدیث یاد کرلی کہ حضور کی خدمت میں کسی بادشاہ نے ایک جبہ ہدیہ کیا تھا جس کی آستین وغیرہ میں ریشم کی گوٹ تھی اور آپ نے وہ جبہ زیب تن فرمایا تھا کسی کو روسا کی خوشامد کی عادت ہے اس نے تالیف قلوب کے واقعات یاد کر لئے کسی میں بخل ہے اس نے یہ حدیث یاد کرلی کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ کچھ مال تقسیم فرمایا اور ایک شخص کو نہ دیا جس پر حضرت سعد بن ابی وقاص نے عرض کیا۔ **یا رسول اللہ انی اراہ مومنا فقال او مسلماً** اسی طرح ایک شخص لنگی پہنتا ہے وہ لبس ازار کی حدیث یاد کئے ہوئے دوسرا پاجامہ پہنتا ہے وہ احادیث ازار میں تاویل کرتا ہے اب یہ سب احادیث کتابوں میں موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ حضور سے یہ سب افعال صادر ہوئے ہیں مگر ان کو یاد کرلینے کا نام اتباع سنت نہیں۔

دیکھو ایک باغ میں پھل بہت قسم کے ہیں۔ ایک درخت انار کا بھی ہے ایک درخت امرود کا بھی ہے ایک دو ناشپاتی کے بھی ہیں مگر یہ بتاؤ کہ اس کو کس چیز کا باغ کہا جائے گا۔ یقیناً جس پھل کا غلبہ ہوگا اور جو پھل زیادہ ہوگا اسی کا باغ کہلائے گا اگر آم زیادہ ہیں تو اس کو آم کا باغ کہیں گے ایک امرود کے درخت سے اس کو امرود کا باغ کوئی نہ کہے گا۔

اسی طرح یہاں سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات تو بہت ہیں ہر قسم کے واقعات آپ کو احادیث میں مل جائیں گے مگر اس سے آپ کا طرز ثابت نہیں ہوسکتا۔ آپ کی طرز و عادت وہ ہے جو غالب و مستمر ہو پس غالب حالت اور دائمی حالت کو دیکھو اور اس کا

اتباع کرو یہ اتباع حقیقی ہوگا اتفاقی واقعات کے اتباع کا نام اتباع سنت نہیں پھر علماء کو تو علم سے اس کا پتہ چلے گا کہ غالب حالت حضورؐ کی کیا تھی اور عوام کو چاہیے کہ کتب واقعات و سیرت کا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ غالب واقعات کس قسم کے ہیں۔ جو غالب عادت ہو اس کو اصل قرار دو اور دوسرے کو عارض پر محمول کرو۔

عمل اور مقصودیت

مگر یہاں ایک بات اہل علم کے سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ صورۃً عمل قلیل ہوتا ہے مگر معناً کثیر و غالب ہوتا ہے جیسے تراویح میں عمل تین رات ہوا ہے اور خشیت افتراض کی وجہ سے ترک زیادہ ہوا لیکن یہ ترک عارض سے تھا اور عمل اصل پس اسی کو راجح کہیں گے اور تراویح کو سنت کہیں گے۔

یہاں سے غیر مقلدوں کا جواب ہو گیا جو کہ تراویح کی آٹھ رکعت پڑھتے ہیں اور بیس کو یہ دعویٰ کر کے بدعت کہتے ہیں کہ حضورؐ نے بیس نہیں پڑھیں سو اول تو یہی متکلم فیہ ہے کہ بیس کا ثبوت نہیں لیکن بعد تسلیم کے ہم کہتے ہیں کہ جس طرح حضورؐ نے بیس رکعت نہیں پڑھیں اسی طرح آپ نے تراویح تین دن سے زائد نہیں پڑھیں۔ پس تم بھی عمر بھر میں تین دن سے زائد نہ پڑھو کیونکہ حدیث میں زائد کا ثبوت نہیں۔ اس لئے یہ بدعت ہے پس جس دلیل سے تم استمرار عمل کا بدعت نہ ہونا ثابت کرو گے اور وہ عمل ہے صحابہ کا۔ اسی دلیل سے ہم بیس رکعت کا بھی بدعت نہ ہونا ثابت کر دیں گے۔

خلاصہ یہ کہ عادت غالبہ معلوم کرنے کا مدار صرف کثرت عمل پر نہیں ہے بلکہ کبھی عادت کا غالب ہونا کثرت وقوع عمل سے معلوم ہوتا ہے اور کبھی غلبہ مقصودیت سے معلوم ہوتا ہے اور اس کے لئے تراویح کی نظیر کافی ہے کیونکہ یہاں وقوع کے اعتبار سے تو عمل قلیل ہے مگر مقصودیت کے اعتبار سے غالب ہے پس یہاں عمل کی قلت و کثرت پر مدار نہ ہوگا۔

اسی طرح رفع یدین و عدم رفع میں فقہاء نے کثرت عمل و قلت عمل کو نہیں دیکھا بلکہ مقصودیت پر نظر کی ہے۔ بعض نے رفع کو مقصود سمجھا کیونکہ نماز فعل وجودی ہے اور رفع بھی وجودی ہے تو دونوں میں تناسب ہے اور بعض نے عدم رفع کو مقصود سمجھا کیونکہ نماز کا مبنیٰ سکون پر ہے۔ حدیث مسلم میں ہے اسکنوا فی الصلوة (الصحیح لمسلم کتاب الصلوة ۱۱۹:) (نماز میں سکون سے رہو) اور تکرار رفع سکون کے منافی ہے اور کہیں کثرت و مقصودیت دونوں جمع ہو جاتے ہیں

جیسے منبر سے نیچے نماز پڑھنا کہ **صلوۃ تحت المنبر** عملاً بھی کثیر ہے **صلوۃ فوق المنبر** کا وقوع قلیل ہے اور مقصودیت بھی تحت المنبر میں ہے اور زیادہ تر ایسا ہی ہے کہ جو عمل وقوع میں کثیر ہوتا ہے مقصودیت بھی اس میں غالب ہے مگر بعض دفعہ اس کے خلاف بھی ہوتا ہے اس لئے حضورؐ کے طرز عمل سے آپ کی عادت وسنت کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں بلکہ محقق کا کام ہے یہ بات قابل تحقیق وتدقیق ہے کہ مقصودیت کہاں ہے کہاں نہیں اس لئے کسی بزرگ کے عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کثیر کے خلاف اور عمل قلیل کے موافق دیکھ کر ان پر اعتراض نہ کرنا چاہئے بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ممکن ہے ان کے نزدیک عمل قلیل ہی میں مقصودیت ہو۔

مثلاً شاہ فضل الرحمٰن صاحب میں تیزی غالب تھی اور یہ بات حضور کی عادت غالبہ کے بظاہر خلاف ہے تو اپنے کو تو تم متہم سمجھو اگر تمہارے اندر ایسا ہو مگر بزرگوں پر اعتراض نہ کرو بلکہ یہ تاویل کرو کہ حضور کی تیزی مقتضی کی وجہ سے تھی یعنی معتوب کی بیہودگی کی وجہ سے اور اس وقت بوجہ سلامت طباع کے اس مقتضی کا وجود کم تھا۔ اس لئے تیزی کا وقوع بھی آپ سے کم ہوا۔ (اگر حضورؐ کے زمانہ میں بھی مقتضی کا وجود زیادہ ہوتا تو آپ کی تیزی کا وقوع بھی زیادہ ہوتا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام میں ہوا) اور اب مقتضی زیادہ ہے اس لئے شاہ صاحب میں اس کا ظہور زیادہ ہوا۔

غرض اس طریق میں چین واطمینان اور بے فکری جائز نہیں چنانچہ اتباع سنت کی حقیقت عادت غالبہ کا اتباع بتلایا گیا تھا اب عادت غالبہ کی تحقیق میں خدشہ پیدا ہوگیا کہ اس کا مدار بھی محض کثرت عمل پر نہیں رہا۔ اب قدم قدم پر غور وفکر کی ضرورت ہے کہ کہاں عمل غالب ہے مع مقصودیت کے اور کہاں مقصودیت غالب ہے بدوں عمل کے اور پھر چین اور بے فکری کہاں اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گہہ چنیں بنماید و گہہ ضد ایں   جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی ایسی حالت اور کبھی اس کے ضد بس دین کے کام سوائے حیرانی وپریشانی کے اور کچھ نہ ہو)

اور فرماتے ہیں۔

اندریں رہ می تراش و می خراش   تادم آخر دم فارغ مباش

راہ سلوک میں بہت تراش خراش ہیں لہذا آخر دم تک ایک دم کے لئے فارغ نہ ہو بلکہ کام میں لگے رہو۔

تادم آخر دمے آخر بود   کہ عنایت با تو صاحب سر بود

ضرورت طلب

پس یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ عمر بھر بے چین رہو اور فکر میں لگے رہو اپنی حالت کو اچھا نہ سمجھو بلکہ متہم سمجھو۔ حضرت حاجی صاحب کا الحزم مرسوء الظن کی تفسیر میں ارشاد ہے کہ ہوشیار وہ ہے جو کہ اپنے نفس سے بدگمان رہے۔

حضرت مولانا گنگوہی کا ارشاد ہے کہ جس کو تمام عمر کام کر کے ساری عمر میں یہ بات حاصل ہو جائے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا اس کو سب کچھ حاصل ہو گیا۔

مبارک ہے وہ شخص جو عمر بھر اسی ادھیڑبن میں لگا رہے کہ میری حالت اچھی ہے یا بری۔

صاحبو۔ طلب ہی مطلوب ہے۔ تمہارا یہی کام ہے پس تم عمر بھر طلب ہی میں رہو۔ یہ بات میں نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے سنی ہے کہ طلب مطلوب ہے وصول مطلوب نہیں کیونکہ وہ تمہارے قبضہ میں نہیں۔ پس تم کسی وقت اپنے کو فارغ نہ سمجھو۔ جس نے اپنے کو فارغ و کامل سمجھ لیا اور اپنی حالت پر مطمئن اور بے فکر ہو گیا وہ برباد ہو گیا۔ سن لو خوب غور سے سن لو۔ اطمینان تو اللہ نے چاہا جنت ہی میں ہو گا یہاں اطمینان کہاں؟ ہمیشہ اپنے کو متہم سمجھو۔ کبھی اپنی حالت پر اطمینان نہ کرو اور ہر وقت طلب میں لگے رہو۔ پھر کیا ہو گا۔

ہر کجا دردے دوا آنجا رود   ہر کجا رنجے شفاء آنجا رود

جہاں درد ہوتا ہے دوا کی وہیں ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں بیماری ہوتی ہے شفاء وہیں جاتی ہے۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود   ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

پانی ڈھلوان ہی کی طرف جاتا ہے۔ جب کوئی مشکل پیش آئی ہے تو حل کی وہیں ضرورت ہوتی ہے۔

اپنے اندر طلب کی پیاس پیدا کرو۔ ابر رحمت کی بارش ہونے لگے کی اپنے کو عاجز و فانی سمجھو۔ حق تعالیٰ تم کو قوت و ہمت عطا فرمائیں گے۔

سالہا تو سنگ بودی دلخراش   آزموں را یک زمانے خاک باش

برسوں تو سخت قسم کا پتھر بنا رہا۔ آزمائش کے لئے چند روز کے لئے خاک بن جا۔ خاک ہونے سے کیا ہو گا۔

در بہاراں کے شود سر سبز سنگ   خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتا ہے خاک ہو جاتا کہ رنگ برنگ کے پھول کھلیں۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ   جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

عقل اور سمجھ کو تیز کر لینا راہ سلوک نہیں حق تعالیٰ اس کی دست گیری کرتا ہے جو شکستگی اور بندگی وبیچارگی اختیار کرو۔ اپنے اعمال واحوال پر ناز نہ کرو۔

پیش یوسف نازش و خوبی مکن   جز نیاز و آہ یعقوبی مکن
ناز را روئے بباید ہمچو ورد   چوں نداری گرد بد خوئے مگرد
عیب باشد چشم نابینا و باز   زشت باشد روئے نازیبا و ناز
چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش   ہمچو او با گریہ و آشوب باش

یوسف کے سامنے ناز مت کر۔ سوائے آہ و نیاز یعقوب کے کچھ مت کر۔ ناز وادا کے لئے حسین چہرہ چاہیے۔ جب تم حسن نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس مت جاؤ۔ جس طرح نابینا آنکھ کے لئے کھلا ہوا ہونا برا ہے اسی طرح نازیبا شکل کے لئے ناز برا ہے۔ جب تم یوسف نہیں ہو۔ یعقوب ہی رہو اور ان کی طرح گریہ وآشوب میں رہو۔

مگر یہ جو میں نے کہا ہے کہ اپنے کو متہم نہ سمجھو کبھی اپنے حال پر اطمینان نہ کرو اس کی سرحد ناشکری سے ملی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ یہ بھی سمجھے کہ اس وقت جو کچھ بھی میری حالت ہے جیسی کچھ بھی ہے یہ سب خدا کا فضل ہے بودلے سے اگر اینہم نہ بودے (اگر اتنا بھی نہ ہوتا تو مصیبت ہو جاتی) اب بحمد اللہ تواضع وشکر دونوں جمع ہو گئے۔ اور ناشکری کی سرحد سے بچے رہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں کہ اس طریق میں بحر تلخ و بحر شیریں ساتھ ساتھ ہیں مگر محقق اس برزخ سے واقف ہوتا ہے جو دونوں کو کبھی ملنے نہیں دیتا۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں   درمیاں شاں برزخ لا یبغیان

(نمکین اور میٹھے پانی کے سمندر کے ساتھ چل رہے ہیں مگر ان کے درمیان ایک برزخ ہے جو ان کو ملنے نہیں دیتا)

پھر بتلایئے یہاں بے فکری اور اطمینان کہاں؟ یہاں تو بہت پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں جس معمر بی بی کی فرمائش پر اس وقت بیان کر رہا ہوں انہوں نے ایک رات

ہمارے یہاں بھی کرم فرمایا تھا۔ جب رات کے دو بجے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ادعیہ ماثورہ آواز کے ساتھ پڑھنے لگیں۔ میری آنکھ کھل گئی اور مجھ کو شرم آئی کہ ایک اللہ کی بندی تو ذکر اللہ میں مشغول ہے اور میں پڑا سو رہا ہوں مگر اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ بہت سویرا تھا۔ میرے نفس نے کہا ابھی سو رہو اور یہ تاویل کی کہ نوم العالم عبادۃ کہ عالم کا سونا عبادت ہے مگر ان کی برکت نے مجھے حرکت پر مجبور کیا اور دل نے کہا۔

خواب را بگذار امشب اے پسر
یک شبے در کوئے بیخواباں گزر

(اے بیٹے آج سونے کو رہنے دو آج رات جاگنے والوں کے کوچہ (عبادت گزار لوگ) سے گزر کر دیکھو)

ان بے خوابوں کی کیا حالت ہے؟ ان کی یہ حالت ہے۔

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیسا اچھا اس کا وقت ہے اور کیسی اچھی زندگی ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست کی ملاقات سے لذت حاصل کرے۔)

اور یہ حالت ہے۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

(ایک ساعت ایک لحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دارو گیر شاہی سے بہتر ہے)

اور یہ حالت ہے کہ

دل آرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس آرام دل یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

اور وہ اس وقت یوں کہتے ہیں۔

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدخو نکند بکس نگاہے

سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے مگر میں کہ ایک چاند کے خیال میں مست ہوں۔ کیا کروں کہ یہ آنکھ ایک کے سوا کسی کی طرف دیکھتی ہی نہیں ہے۔

نواب شیفتہ نے اس وقت کا فوٹو خوب کھینچا ہے فرماتے ہیں۔

چہ خوش ست با تو بزمے بنہفتہ ساز کردن
در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیسا لذیذ ہے تنہائی میں تیرے ساتھ رہنا تمام تعلقات سے ہو جانا اور تیری محبت میں سرشار ہونا)

اے اللہ! اے اللہ (بکی الشیخ وولول وصاح واضطراب۔ پھر کسی قدر توقف وسکوت کے فرمایا) پھر میں کھڑا ہو گیا اور کچھ کام کر لیا۔ پھر سو گیا مگر جب بھی آنکھ کھلی ان کو کام میں مشغول پایا اور ذکر کی آواز آتی رہی۔

شانِ محقق

اس وقت مجھے خیال ہوا کہ صبح کے وقت ان کو متنبہ کروں گا۔ کہ رات کے وقت جہر بالذکر مناسب نہیں کیونکہ اس میں نائم کی تشویش ہے اور فقہاء نے اس سے منع فرمایا ہے مگر اس خیال کے ساتھ ہی جواب ذہن میں آیا اور غالباً وہ بھی یہی جواب دیتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار تفقد احوال صحابہؓ کے لئے رات کو اٹھے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا کہ آہستہ آہستہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ زور زور سے بلند آواز کے ساتھ قرآن مجید پڑھ رہے ہیں۔ صبح ہوئی اور حضورؐ نے سب سے فرمایا کہ تم ایسا کیوں کر رہے تھے اور تم ایسا کیوں کر رہے تھے۔ سب نے کچھ وجوہات بیان فرمائے۔ پھر حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ اے ابوبکرؓ کسی قدر اپنی آواز کو اونچا کر دو اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم اپنی آواز کو ذرا پست کرو۔ نیز جماعت اشعریین کی حضورؐ نے تعریف فرمائی کہ مجھے ان کے منازل کا علم ان کی آواز سے ہو جاتا ہے جب کہ رات کو وہ قرآن پڑھتے ہیں اور آیت **وتقلبک فی السجدین** کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ آپ رات کو اپنے اصحاب کا تفقد فرماتے تھے اور اس وقت آپ صحابہؓ کی آواز سے ان کے عمل کو معلوم فرماتے تھے۔

اب بتلایئے میں اس ادھیڑ بن کو کیا کروں کہ پہلے ایک خیال آیا اور ساتھ ہی اس کا جواب بھی ذہن میں آ گیا۔ تو میں خاموش ہو گیا مگر چونکہ اس حدیث میں اور فقہاء کے فتوٰی میں بظاہر تعارض ہوا اس لئے پھر فکر میں لگ گیا چنانچہ پھر اس تعارض کو اس طرح رفع کیا کہ سونے والے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو تہجد کے لئے جاگنا چاہیں دوسرے وہ جو جاگنا نہ چاہیں جو جاگنا چاہیں ان کے پاس ذکر بالجہر کی اجازت ہے چنانچہ ہم نے خانقاہ میں رات کو دو بجے کے بعد ذکر بالجہر کی اجازت دے رکھی ہے کیونکہ وہ سب جاگنا چاہتے ہیں اور جو جاگنا نہ چاہے اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ خانقاہ میں تمہاری رعایت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ سونے والوں کی جگہ نہیں اور جو لوگ سونا چاہیں ان کے پاس بیٹھ کر ذکر جہر ممنوع ہے تاکہ ان کی نیند میں خلل نہ آئے۔

اب اسی مسئلہ میں دیکھئے کہ فقہاء کا فتوٰی تو یہ تھا کہ سونے والوں کے پاس ذکر جہر مکروہ

ہے مگر احادیث میں ایسے واقعات ملے جن سے رات کے وقت ذکر جہر کا نائمین کے پاس ثبوت ہوتا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کا قول حضورؐ کے جواب میں یہ تھا کنت اطر و الشیطان واوقظ الوسنان کہ میں بلند آواز اس لئے کر رہا تھا کہ شیطان کو بھگاتا اور سونے والوں کو جگاتا تھا۔ ایسے موقعہ میں غلبہ مقصودیت سے فیصلہ کیا جائے گا اور دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ میں نائمین کے پاس رفع صوت بالذکر عارض عادی تھے اور اصل مقصود عدم رفع ہے۔

پس اب ان بڑی بی کے عمل کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ جہاں مہمان ہوا کریں گھر والوں سے پوچھ لیا کریں۔ اور عدم رفع صوت عند النائم کی مقصودیت کی دلیل میں حضرت عائشہ کی حدیث مجھے یاد آئی کہ باوجودیکہ حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق تھیں کہ حضورؐ کے کسی فعل سے ان کو تکلیف نہ ہوسکتی تھی مگر حضورؐ ان کے سوتے ہوئے ان کے پاس ہر کام آہستہ سے کرتے تھے حالانکہ وہ ایسی عاشق تھیں کہ فرماتی ہیں۔

لواحی زلیخا لورأین جبینہ　　لاثرن بالقطع القلوب علی الید

زلیخا کی ہمجولیاں اگر میرے محبوب کی پیشانی دیکھ لیتیں تو یہ ان کے دل وجگر کے ٹکڑے کر دیتی۔

کسی شاعر نے حضرت زلیخا کے قول ھذا الذی لمتننی فیہ (یہی ہیں وہ حضرت یوسف علیہ السلام جس کے بارے میں تم مجھ سے ملامت کرتی تھیں) کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

انیست کہ خوں خوردہ و دلبردہ بسے را　　بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

(یہی تو وہ ہے جس نے بہت لوگوں کا خون جگر پیا اور دل موہ لے لیا ایسے محبوب شخصیت کو اگر دیکھنے کی اگر تاب ہے تو بسم اللہ یہی ہیں وہ حضرت یوسف علیہ السلام جس کے بارے میں تم مجھ سے ملامت کرتی ہیں)

زلیخا نے زنان مصر سے ان کی ملامت کے جواب میں کہا تھا کہ لو دیکھ لو میر المحبوب یہ ہے جسے دیکھ کر تم نے مبہوت ہو کر بجائے نارنگی کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہ عورتیں اگر حضور کو دیکھ لیتیں تو اپنے دل وجگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتیں۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن میں فرق یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کے حسن کا رعب اول وہلہ میں زیادہ ہوتا تھا کہ تحمل نہ ہوسکتا تھا پھر رفتہ رفتہ تحمل ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت زلیخا کو تحمل ہو گیا تھا اور حضورؐ کے حسن کا اول وہلہ میں تحمل ہو جاتا تھا مگر

جوں جوں غور کیا جاتا دل قابو سے نکلا جاتا اور تحمل دشوار ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ پر مرد بھی عاشق تھے اور بچے بھی عاشق تھے اور حضرات صحابہؓ نے کیسی کیسی جانبازی اور جانثاری سے آپؐ کے عشق میں جان دی ہے۔ غرض حضرت عائشہ حضور کی بے انتہا عاشق تھیں۔ پھر ایسے عاشق کو آپ کی آواز یا آہٹ سے تکلیف کہاں ہو سکتی تھی اور ہوتی بھی تو یوں کہتیں۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

تیری وہ باتیں جو بظاہر ناگواری کی ہوتی ہیں میرے لئے وہ باعث راحت ہیں اور تجھ جیسے ستانے والے پر دل وجان سے قربان ہوں۔

مگر حدیث میں ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل بقیع کے واسطے دعا کا حکم ہوا تو آپ آدھی رات کے قریب اٹھے اور آہستہ سے جوتا پہنا اور آہستہ سے کواڑ کھولے اور آہستہ سے چلے۔ غرض ہر کام آہستہ سے کیا تا کہ حضرت عائشہؓ کی آنکھ نہ کھل جائے کہ آنکھ کھلنے سے خود بھی اذیت ہوتی ہے اور تنہائی سے بھی وحشت ہوتی ہے آپ کی روانگی کے بعد حضرت عائشہؓ کی آنکھ کھلی اور حضور کو بستر پر نہ پایا تو پریشان ہو گئیں۔

باسایہ ترا نمے پسندم عشق است و ہزار بدگمانی

(تمہارے سایہ کے ساتھ کسی کو دیکھنا پسند نہیں کیونکہ عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں)

یہ وسوسہ ہوا کہ شاید آپ کسی دوسری بیوی کے پاس تشریف لے گئے ہیں پھر عاشق کو یہ کہاں گوارا کہ محبوب رقیب کے پاس جائے۔ وہ تو رقیب کے لئے محبوب کے ہاتھ سے تکلیف کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ ایسی تکلیف بھی اپنے ہی لئے چاہتا ہے اور یوں کہتا ہے۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

آپ کی تلوار سے ہلاک ہونا خدا کرے دشمن کے نصیب میں نہ ہو دوستوں کا سر سلامت ہے جب چاہیں خنجر آزمائی کر لیں۔

اور حضور کی محبوبیت تو ایسی تھی کہ جانور تک آپؐ کے عاشق تھے حدیث میں ہے کہ جس وقت حضورؐ نے حج وداع کیا ہے تو اپنی طرف سے سو اونٹوں کی قربانی کی۔ جن میں تریسٹھ اونٹ خود اپنے دست مبارک سے نحر فرمائے۔ حدیث میں ہے طفقن یزدلفن الیہ کہ سب کے سب حضورؐ کے برچھے کی طرف بڑھتے اور گردن آگے کرتے تھے کہ پہلے مجھے نحر

کیجئے اس وقت یہ شعر صادق آ رہا تھا۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

جنگل کے تمام ہرن اپنے سر ہتھیلی پر رکھے اس امید میں کھڑے ہیں کہ شاید تم کسی روز شکار کے لئے آجاو۔

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے حضور مفلس نہ تھے۔ کہیں مفلس بھی سو اونٹ کی قربانی کر سکتا ہے ہمارے حضور بادشاہ تھے اور بڑے بادشاہ تھے کیونکہ بادشاہوں سے بھی ایسا کم سنا گیا ہے کہ کسی نے سو اونٹ کی قربانی کی ہو۔ اور حضورؐ کا جو فقر تھا وہ اختیاری تھا کیونکہ آپ مال جمع نہ کرتے تھے غرض آپ تارک الدنیا تھے متروک الدنیا نہ تھے۔

بہر حال حضرت عائشہؓ بھی حضورؐ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئیں دیکھا کہ آپ بقیع میں مردوں کے لئے دعا کر رہے ہیں۔ اب چاہیے تھا کہ حضرت عائشہ فوراً لوٹ آتیں مگر شاید خیال ہوا ہو کہ شاید آپؐ مردوں سے فارغ ہو کر زندوں کے پاس جائیں۔ اس لئے ٹھہر گئیں۔ اب آپؐ دعا سے فارغ ہو کر واپس ہوئے تو حضرت عائشہ بھی واپس ہوئیں مگر بقیع کو جاتے ہوئے تو یہ پیچھے تھیں اب حضور سے آگے ہو گئیں۔ حضور کو شبہ ہوا یہ آگے آگے کون ہے آپؐ تیزی کے ساتھ چلے حضرت عائشہ بھی دوڑیں چونکہ اس وقت یہ ہلکی پھلکی تھیں اس لئے دوڑ کر آپ سے پہلے گھر پہنچ گئیں مگر دوڑنے کی وجہ سے سانس پھول گئی۔

حضورؐ جو تشریف لائے اور ان کی سانس پھولی ہوئی دیکھی تو فرمایا **یاعائشه مالک حشیا رائته** (لم أجد الحديث في موسوعة اطراف الحديث) کہ اے عائشہ! تمہاری سانس کیوں پھولی ہوئی ہے کہا کچھ نہیں فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بقیع سے لوٹتے ہوئے میرے آگے تم ہی تھیں۔ انہوں نے اقرار کیا۔ فرمایا **اخشیت ان یحیف الله علیک و رسوله**۔ کیا تم کو یہ اندیشہ ہوا کہ اللہ اور رسول تمہاری حق تلفی کریں گے؟ ہرگز نہیں۔

تو حضورؐ نے اس واقعہ میں اس قدر احتیاط کی۔ حالانکہ حضرت عائشہؓ کی اذیت کا کوئی احتمال نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ حکم مقصود وہی ہے جو فقہاء نے فرمایا ہے اور جن واقعات میں جہر بالقراءۃ صحابہؓ سے رات کے وقت ثابت ہے وہ عارض پر محمول ہے کہ وہاں سب لوگ رات کو اٹھنے والے تھے۔

مگر اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ کیا حضرت عائشہؓ رات کو اٹھنا نہ چاہتی تھیں اگر وہ بھی

نہ چاہتی تھیں تو پھر دوسری عورتوں کا کیا ٹھکانہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ اٹھنا چاہتی تھیں مگر اخیر شب کو اور اس واقعہ میں حضورؐ سویرے اٹھے تھے اس لئے ان کو جگانا نہیں چاہا بخاری میں حضرت عائشہؓ کا قول مذکور ہے۔ **فاذا اوتر ایقظنی** کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے جگا دیتے) یا یہ کہ حضور نے ان سے زیادہ محنت لینا گوارا نہ کی ان کو تھوڑی سی محنت میں کامیاب کر دیا ہو۔

جیسے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ آپ نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے محنت کم لی تھی۔ ایک بار یہ سب حضرات خانقاہ تھانہ بھون میں مجتمع تھے۔ مولانا رشید احمد صاحب وغیرہ تو دو بجے اٹھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے بھی دو بجے اٹھنے کا قصد کیا۔ حاجی صاحب نے منع فرمایا کہ ابھی نہیں ابھی رات بہت ہے سو جاؤ جب ایک گھنٹہ رات رہ گئی اس وقت جگا دیا کہ اب اٹھو۔ کیونکہ مولانا بہت نازک مزاج تھے۔ اگر زیادہ محنت کرتے تو دماغ پر تعب ہوتا۔

اسی طرح اگر حضورؐ نے بھی ایسا ہی کیا عجب ہے کہ حضرت عائشہؓ سے محنت کم لی ہو محقق وہی ہے جو ہر شخص سے اس کے مناسب کام لے۔ یہ نہیں کہ سب کو چوبیس ہزار ہی اسم ذات بتلایا کرے ہمارے حاجی صاحب نے بعض لوگوں سے صرف اتنا کام لیا کہ تم خانقاہ والوں کی کچھ خدمت کر دیا کرو اور کسی کو ایک ہزار دو ہزار اسم ذات بتلایا اور کمال یہ ہے کہ ہر شخص کامیاب تھا۔ تھوڑی محنت کرنے والا بھی۔ تھوڑی محنت کرنے والے کو منزل پر اس طرح پہنچاتے تھے کہ اسے خبر بھی نہ ہوتی تھی اسی کو فرماتے ہیں۔

نقشبند یہ عجب قافلہ سالار اند   کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

نقشبندیہ حضرات بھی عجب سالار قافلہ ہیں کہ پوشیدہ راستے سے قافلہ کو حرم تک پہنچا دیتے ہیں۔

محقق کی یہی شان ہے خواہ نقشبندی ہو یا چشتی ہو۔ پس اتباع سنت کی حقیقت یہ نہیں کہ اپنی طبیعت کے تقاضے پر عمل کیا جائے اور اس کی تائید میں ایک دو حدیث ڈھونڈھ لی جائیں۔

تقاضائے اتباع سنت

بلکہ اتباع سنت یہ ہے کہ حضور کی عادت غالبہ کا اتباع کیا جائے اور اس کے لئے مطالعہ سیرت نبویہ کی بھی ضرورت ہوگی۔ سیرت نبویہ میں میرا رسالہ نشر الطیب مفصل ہے۔ اگر اتنی فرصت نہ ہو تو حیوۃ المسلمین کا مطالعہ کر لیا جائے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا خلاصہ ہے۔ اس لئے جوش محبت میں یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ ختم ماہ ربیع الاول تک جس کی فرمائش آئے گی اس سے

محصول ڈاک بھی نہ لیا جائے گا۔ اور یہ سخاوت میں اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے اطمینان ہے کہ درخواستیں آئیں گی ہی نہیں۔ مسلمان کچھ ایسے بے فکرے ہیں کہ ہر شخص اپنے کو بنا بنایا کامل سمجھتا ہے۔ اصلاح حال کی فکر ہی نہیں۔ حیات المسلمین کا نسخہ اگر لیں گے بھی تو عمل کے لئے نہیں بلکہ محض برکت کے لئے۔ جیسے شجرہ پڑھا کرتے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب کا شجرہ تو عمدہ ہے مگر اکثر شجرے تو محض فضول ہیں جن میں بے تکے اشعار ہیں۔ وہ تو بقول علی حزین کے محض تذکرۃ الاولیا ہی ہیں اور صاحبو! آپ کو ثمرہ کے ہوتے ہوئے شجرہ کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں اگر ثمرہ ایسا ہوتا جس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا تو شجرہ کی بھی ضرورت ہو سکتی تھی مگر یہ ثمرہ تو ایسا ہے۔

خود قوی تر می شود خمر کہن خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

پرانی شراب زیادہ تیز ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ کی طرف سے ہو۔ اور اس میں وہ قوت ہے کہ۔

ہر چند پیر وخستہ وبس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروے تو کردم جواں شدم

ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں مگر جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں۔

اس ثمرہ میں فساد کا اندیشہ ہی نہیں اس میں تو اصلاح ہی اصلاح ہے۔ بہر حال حضور کی سیرت کا مطالعہ کرو جس کو میں نے مختصراً حیوۃ المسلمین میں جمع کر دیا ہے میں نے اس کے اول میں یہ شعر لکھا ہے۔

فتوح فی فتوح فی فتوح و روح فوق روح فوق روح

اور اخیر میں یہ لکھ دیا ہے کہ اس مضمون کو روزانہ بلا ناغہ پڑھتے رہیں میں سچ کہتا ہوں کہ اس دو ورقہ کو آپ روزانہ پڑھتے رہے تو ضرور نفع ہوگا ضرور نفع ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ مسئلہ کا بیان تو ہو گیا۔

اب یہ سوال ہوگا کہ حدیث سے اس کو کیا مناسبت و ربط ہے جو شروع میں تلاوت کی گئی ہے سو میں اس کو بھی بتلاؤں گا زیادہ ربط نہ ہو مگر مولاء ما میں تو اس سے بھی بڑھ کر بے ربطی گوارا کر لی جاتی ہے جیسے ایک واعظ نے قل ھو اللہ احد کی تفسیر میں شہادت نامہ بیان کیا تھا کہ یہ سورت اس رسولؐ پر نازل ہوئی ہے کہ جن کے نواسے میدان کربلا میں شہید ہوئے تھے بس اسی ربط سے آپ نے قل ھو اللہ کے تحت میں شہادت کا قصہ بیان کر دیا۔

سو میرے بیان میں ایسا مہمل ربط تو ان شاء اللہ تعالیٰ نہ ہوگا۔ اس سے تو میں آپ کو

مطمئن کرتا ہوں۔ ہاں ضعف ربط شاید ہو۔ میرے نزدیک تو ضعف بھی نہیں۔ مگر سامعین کو میں اجازت دیتا ہوں کہ وہ اس ربط کو اگر ضعیف سمجھیں تو مضائقہ نہیں۔

ربط یہ ہے کہ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ میری رحمت غضب پر غالب ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھئے کہ غضب بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے مگر چونکہ اس کا وقوع کم ہوتا ہے اس لئے اسماء الٰہیہ میں کوئی نام ایسا نہیں جو صفت غضب پر دال ہو۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا نام رحمان ہے رحیم ہے ودود ہے منتقم ہے مگر غضبان یا غضوب خدا کا نام نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعتبار صفت غالبہ کا ہے اور موصوف کو ہمیشہ صفت غالبہ ہی کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے نہ صفت غیر غالبہ کے ساتھ۔

چنانچہ ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں نزع روح کا بیان ہے کہ ملائکہ جب مسلمان کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو اس کو بشارت دیتے ہیں۔

ایها النفس المطمئنه ارجعی الی روح وریحان و رب غیر غضبان

کہ اے نفس مطمئنہ راحت اور نعمت اور اپنے رب کے پاس چل جو غصہ والا نہیں ہے۔

اس کے بعد نزع روح کافر کا بیان ہے مگر وہاں یہ نہیں کہ اخرجی الی رب غضبان غیر رحمان بلکہ صرف عذاب کا ذکر ہے۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اصل صفت تو رحمت ہی ہے اور اصلی کے یہ معنی ہیں کہ جس کا ظہور مقتضی کے ساتھ بھی ہو اور بلا مقتضی کے بھی ہو یہ خاص اصطلاح کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اصلی صفت تو وہ ہے جو بلا مقتضی بھی ظاہر ہو اور غیر اصلی وہ ہے جو بلا مقتضی ظاہر نہ ہو پس سبقت رحمت کے معنی یہ ہیں کہ رحمت کا ظہور تو مقتضی سے بھی ہوتا ہے اور بدوں مقتضی کے بھی اور غضب کا ظہور ہمیشہ مقتضی ہی سے ہوتا ہے بدوں مقتضی کے نہیں ہوتا۔ اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظہر اتم صفات باری ہیں اس لئے حضور کی بھی یہی شان ہے کہ آپ میں رحمت کا غلبہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو رؤف رحیم فرمایا ہے اور سخت کلامی و سنگ دلی سے آپ کی برات کی ہے۔

فبمارحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظاغليظ القلب لانفضوا من حولك

پس خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

یہ حضور کی اصلی صفت ہے اور غضب۔ حدت آپ کی اصلی صفت نہیں بلکہ کسی عارض

و مقتضی کی وجہ سے اس کا ظہور ہوا ہے۔ اب بتلایئے کہ حضورؐ کا اتباع آپ کی صفات اصلیہ کا اتباع ہے یا صفات عارضیہ کا۔ یقیناً ہر شخص یہی کہے گا کہ حضورؐ کا اتباع یہی ہے کہ صفت اصلیہ میں آپ کا اتباع کیا جائے ورنہ حضورؐ سے بعض دفعہ نماز فجر بھی قضا ہوئی ہے تو کیا تم بھی اس عارض کا اتباع کر کے ہر روز نماز فجر قضا کیا کرو گے ہرگز نہیں!

یہ مثال عجیب ذہن میں آئی کہ جس نے راستہ کو واضح کر دیا پھر دوسری صفات میں بھی یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ان کا ظہور عارض کی وجہ سے ہوا ہے پس حضورؐ کا اتباع یہ ہے کہ جو افعال و صفات آپ کے اصلی ہیں وہ تمہارے اندر بھی اصلی ہوں کہ زیادہ غلبہ اور ظہور انہی کا ہو اور جو صفات اور افعال حضورؐ کے لئے عارضی ہیں وہ تمہارے اندر بھی عارضی ہوں اور یہ اتباع نہیں کہ تم حضورؐ کے عارضی افعال و صفات کو جن کا ظہور کسی مقتضی کی وجہ سے نادراً حضورؐ سے ہوا تھا اپنے لئے اصلی صفات بنا لو کہ اس سے زیادہ توضیح میں نہیں کر سکتا۔

ہاں شاہ فضل الرحمان صاحب جیسے بزرگوں کی طرف سے ہم یہ تاویل کر سکتے کہ جس عارض و مقتضی کی وجہ سے کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کیا ہے مولانا کے نزدیک وہ مقتضی آج کل زیادہ ہے اس لئے مولانا سے ظہور غضب زیادہ ہو رہا ہے۔ ایسے بزرگوں کو بھی مریدوں کی اس تاویل سے بے فکر نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ اپنی حالت پر نظر ثانی و نظر ثالث کرتے رہنا چاہئے۔

اندریں راہ می تراش و می خراش تا دم آخر دمے فارغ مباش

بحمد اللہ! اس حدیث سے جس مسئلہ کا استنباط ہوا تھا اس کا ربط بھی حدیث کے ساتھ واضح ہو گیا۔ اب ختم کرتا ہوں اور جو مضمون اس حدیث کا مدلول مقصود ہے اس کا ذکر واعظ کا غیر مقصود ہو کر پہلے ہو چکا ہے پس یہ بھی ایک لطیفہ ہو گیا کہ غیر مقصود کا ذکر مقصود ہو کر ہو گیا اور مقصود کا غیر مقصود ہو کر آخر میں تنبیہ کرتا ہوں کہ جو مضمون حدیث کا اصل مقصود ہے اس سے دلیر نہ ہوں بلکہ شرافت کا مقتضی یہ ہے کہ ایسے رحیم و کریم آقا کی اور زیادہ اطاعت کی جائے اور جو مضمون حدیث سے اشارۃً مستنبط کیا گیا ہے اس کو سمجھیں اور اس کے موافق عمل کی کوشش کریں۔

اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔

و صلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی الہ و اصحابہ اجمعین و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

الاعتصام بحبل اللہ

نہی عن التفرق کے متعلق یہ وعظ صبح کے وقت ۱۲ جمادی الاول ۱۳۳۶ھ بروز یکشنبہ مطابق ۲۴ فروری ۱۹۱۸ء مظفر نگر میں مدرسہ کے جلسہ کے ڈیڑھ ہزار کے مجمع میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا جسے اسعد اللہ نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ و نستعینه و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیه و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یهدہ اللّٰہ فلا مضل له و من یضلله فلا هادی له و نشهد ان لا الٰه الا اللّٰہ و حدہ لا شریک له و نشهد ان سیدنا و مولانا محمد اعبدہ و رسوله صلی اللہ تعالیٰ علیه و علی اله واصحابه و بارک وسلم. اما بعدفاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم. واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا و اذکرو انعمة اللہ علیکم اذکنتم اعدآءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخواناً و کنتم علیٰ شفا حفرة من النار فانقذکم منها کذٰلک یبین اللہ لکم اٰیاته لعلکم تهتدون ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینهون عن المنکر واولئک هم المفلحون ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجآء هم البینات واولئک لهم عذاب عظیم یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ فاماالذین اسودت وجوههم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون وامالذین ابیضت وجوههم ففی رحمة اللہ هم فیها خالدون. (آل عمران:۱۰۳تا۱۰۷)

اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے رسہ کو اس طور پر کہ باہم سب مشفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی پس تم اللہ تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے پس اس سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اس طرح اللہ تعالیٰ تم کو احکام بیان کر کے بتاتے رہے ہیں تا کہ تم لوگ راہ پر رہو اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے جو خیر کی طرف بلایا کرے۔

اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہیں اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا ان کے پاس واضح احکام پہنچنے کے بعد اور ان لوگوں کیلئے سزائے عظیم ہوگی اس روز بعضے چہرے سفید

ہو جائیں گے اور بعضے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کیا تم لوگ کافر ہوئے تھے اپنے ایمان لانے کے بعد تو سزا چکھو بہ سبب اپنے کفر کے اور جن کے چہرے سفید ہو گئے ہونگے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

تمہید: جس تقریب کے متعلق یہ جلسہ ہے اس کے متعلق سب سے اول یہ امر ہے کہ ہم غرض جلسہ کے مقابل سے بالکل خالی الذہن تھے اس جانب مخالف کا ہم کو کچھ وہم و گمان نہ تھا واقعات مسموعہ سابقہ ذہن نشین تھے۔ یک طرفہ حالات ذہن میں متمکن تھے۔ اس کے بعد روایات سے دگرگوں حالات معلوم ہوئے اور پہلے فوائد میں مفسد کی جھلک نظر آنے لگی جس سے تردد پیدا ہوا۔ یعنی مخالفت کا قصہ سنا جس سے علم بدلا اور چونکہ مشورہ علم پر مرتب ہوتا ہے اس لئے پہلے اور مشورہ تھا اور اب دوسرا مشورہ ہوا البتہ تحقیق واقعات سے ایک شق کو ترجیح ہو سکتی تھی۔ سو میں نے واقعات کی تحقیق نہیں کی اور حالات کے انکشاف میں سعی سے کام نہیں لیا۔ کیونکہ اس کا کوئی وسیلہ اور ذریعہ نہ تھا۔ نیز مجھ کو اس کی کچھ احتیاج بھی نہیں تھی۔ لیکن محض اسلام کی خیر خواہی سے میں نے اپنی رائے کی حالت ظاہر کر دی کیونکہ مقصود تو فقط دین کی خدمت ہے جس طرح ہو سکے۔ باقی سب امور نا قابل التفات ہیں میرا مضمون اس رائے بدلنے سے پہلے اور تھا۔ اس میں اور قسم کے مصالح تھے اور اسی کے متعلق ذہن میں ایک خاص مضمون تھا۔ اب تبدیل رائے سے مضمون بھی متبدل ہوا۔ جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے اس کا مضمون تبدیل رائے سے مضمون بھی متبدل ہوا۔ جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے اس کا مضمون تبدیل رائے کے بعد کا ہے۔ مضمون اول بھی بالکل حق تھا اور یہ مضمون بھی بالکل صادق و مطابق واقع کے ہے۔ کیونکہ دونوں مضمون قرآن پاک ہی کے مدلول ہیں۔ اسی لئے دونوں کے دونوں اپنے اپنے محل میں صادق و حق ہیں کیونکہ قضایائے شرطیہ کے تحت میں مندرج ہیں کہ اگر اس شرط کا تحقق ہوا تو یہ جزا مرتب ہوگی اور اس مقدم کا تحقق ہوا تو یہ تالی مرتب ہوگی اور ان دونوں شرطوں میں کچھ تضاد و تنافی نہیں ہے بلکہ اپنی اپنی شرط کے اعتبار سے دونوں صادق ہیں۔

تبدل واقعہ سے تبدل مضمون کی مثال حضور علیہ الصلوۃ والتسلیم کے فتوے کا قصہ ہے کہ ایک شخص حضور پر نور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور صوم میں قبلہ کی اجازت مانگی۔

جناب رسالت مآب ؐ نے اس کو ممانعت فرما دی اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے بھی روزہ کی حالت میں بوسہ کی اجازت طلب کی تو آنجناب ؐ نے اجازت دے دی۔

اب بظاہر یہ دونوں حکم متعارض و متناقض معلوم ہوتے ہیں لیکن صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بڑے نکتہ سنج نکتہ رس دقیقہ شناس اور باریک بین تھے۔ انہوں نے اس ظاہری تعارض کے دفع کرنے کے واسطے ان دونوں حکموں کے اصلی محل تلاش کر لئے۔ اور سمجھ گئے کہ دونوں حکم علیحدہ علیحدہ محل کے واسطے ہیں۔ ممانعت کا حکم اس واسطے تھا کہ سائل ایک نوجوان قوی شخص تھا۔ جس سے تحمل و اجتناب عن الجماع کی امید نہ تھی۔ اس لئے آنحضور ؐ نے منع فرما دیا تا کہ جماع میں مبتلا ہو کر صوم کی اضاعت نہ کرے اور جس شخص کے سوال پر جناب نے اجازت فرما دی۔ وہ شخص ایک کمزور اور بوڑھا تھا۔ اس کے قوی مضمحل تھے اس سے وقوع فی الجماع کا خوف نہ تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اجازت کی علت محض بڑھاپا نہ تھا بلکہ علت فتنہ کا نہ ہونا ہے اور خوف فتنہ ہی پر اجازت و ممانعت کا مدار ہے۔ کہ جس مقام پر اندیشہ فساد صوم ہو وہاں ممانعت ہے گو بوڑھا ہی ہو اور جہاں فتنہ کا خوف نہ ہو وہاں اجازت ہے گو جوان ہی ہو۔

بس جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں ارشاد اختلاف واقعہ کی وجہ سے متعارض نہیں اسی طرح میرے دونوں مضمون بھی بوجہ اختلاف واقعہ مسموع کے متناقض نہیں رہے۔ یہ بات کہ واقعہ میں کون سی حالت صحیح ہے۔ آیا یہ فریق حق پر ہے یا وہ فریق حق پر ہے۔ تو اس کی حاجت اسی شخص کو ہے جس کو اس سے دلچسپی ہو اور اس کے پاس اس کی تحقیق کے ذرائع و وسائل بھی موجود ہوں اور اس کی ضرورت اور احتیاج بھی سمجھتا ہو۔ ہماری شرطیات کے واسطے کسی واقعہ کی تحقیق کی حاجت نہیں۔ ہم تو دونوں مضمون بیان کئے دیتے ہیں اور دونوں مضمون حق ہیں۔ ہر شخص اپنی حالت کو جس مضمون کے مطابق سمجھے منطبق کر لے۔

تعدد۔ تبدد تردد کی صورت

جو مضمون ذہن میں سابق تھا اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک مطلوب کام میں اس کے طریق کی دو شاخیں ہوں یا ایک درخت کی دو ڈالیاں ہوں یا ایک لشکر کے دو حصے ہوں۔ غرض کہ ایک شے میں بوجہ انشعاب کے دو یا زیادہ شعبے ہو جاویں۔ تو اس انشعاب کے دو مرتبے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ تعدد کا ہے جس کی مثال ایک شہر کی مساجد ہیں اور دو شہروں

کے مساجد وخانقاہ اور ایک مرتبہ تبدد کا ہے میں لفظ تفریق کا استعمال کرتا لیکن چونکہ طالب علم ہوں اس لئے قافیہ کے لحاظ کی وجہ سے یہ غیر مانوس لفظ اختیار کیا۔ اس کے معنی بھی تشتت و تفرق کے ہیں۔ کہ تعدد کے ساتھ اس میں تفرق وتزاحم کا بھی پہلو ہو۔

اب سمجھئے کہ مطلوب کے طریق میں مرتبہ تعدد تو مرغوب ومطلوب ومستحسن ہے **وفیہ فلیتنافس المتسنافسون** اور حرص کرنے والوں کو ایسی حرص کرنی چاہئے) بخلاف تبدد کے کہ وہ موجب فساد ہے اور مہیج فتنہ ہے **وعنہ فلیتنافس المتنافسون**۔ تعدد کی مثال مساجد ہیں کہ ایک دینی خدمت کی چند شاخیں ہیں۔ اپنی خدمت یہ تھی کہ ایک ایسا مکان تیار ہو جس میں فریضہ صلوٰۃ سے سبکدوش ہوں اور اب اس میں کثرت مصلین وضیق مکان اور دو راستے آمد ورفت کی تکلیف کی وجہ سے ایک مکان کافی نہیں تھا لہذا مختلف مقامات پر چند مسجدیں تیار کرائی جاتی ہیں۔ سو یہ تو تعدد ہے کہ ایک دینی خدمت کے ادا کے لئے متعدد مقامات تجویز ہو گئے لیکن تبدد نہیں۔ جو کہ مذموم ہے کیونکہ تبدد کا مدار ضرورت پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا مبنی داعیہ نفسانی اور غرض فاسد ہوتی ہے تو تعدد مساجد اگر نمازیوں کی کثرت اور تنگی مکان وغیرہ سے ہو تب تو تعدد ہے ورنہ پھر تعدد نہیں بلکہ یہ بھی تبدد ہو جائے گا اور تعدد بعض مرتبہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ بغیر تعدد کے اہم دینی خدمت سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔

یہاں مثلاً مظفر نگر میں تعدد مساجد ہے کہ باشد درجہ ضروری ہے کیونکہ اگر تمام مظفر نگر میں صرف ایک ہی مسجد ہو تو اکثر لوگ مسجد و جماعت اور اس کے ثواب جزیل سے محروم رہیں گے۔ لہذا لامحالہ تعدد ضروری ہوا اور تبدد ہوتا ہے باہمی نزاع ومخالفت کی وجہ سے اس کا مبنی جھگڑا اور فساد ہوتا ہے وہ کسی ضرورت دینی کی انجام دہی کے واسطے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا مدار صرف آتش حسد وفساد پر ہوتا ہے لیکن اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ فریق اول یقیناً حق پر نہیں ہے وہ قطعاً خطاء فاحش میں مبتلا ہے اور غلطی کا مرتکب ہے اس لئے دوسرے فریق نے اس کے مقابل دوسرا انتظام کیا سو یہ تو مذموم نہیں۔ مثلاً کسی شخص نے مال حرام سے مسجد تیار کرائی یا ارض مغصوبہ میں مسجد بنائی تو اس کے مصلی قبل از علم تو معذور ہیں اور بعد از علم دوسری مسجد بنانے میں کچھ حرج نہیں بلکہ واجب ہے کہ مسجد سابق میں نماز نہ ادا کریں اور اس جدید مسجد کے بنانے میں اگر کچھ منازعت پیش آئے اس کو حدود شرعیہ ملحوظ رکھ کر گوارا کریں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فریق اول یقیناً حق پر ہے اس میں کسی قسم کا نقص نہیں یا اس کے حق پر ہونے نہ ہونے میں مساوی درجہ میں تردد ہے۔ مثلاً پہلی مسجد کوئی شخص اپنی ارض مملوکہ میں مال طیب سے بنوائے اور وہ اپنی وسعت مکانی سے سب اہل محلہ کو کافی ہو۔ غرض کہ اس میں کسی قسم کی خرابی نہ ہو۔ اب اس مسجد کے مقابلہ میں جو مسجد تیار کرائی جائے گی اس کا مدار صرف باہمی اختلاف ومنازعت ہوگا کہ دوسری پارٹی ہو جائے یہ صورت تبدد مذموم کی ہے اور ایسی جگہ مسجد بنانا ناجائز ہے۔

اسی طرح تردد کی صورت کو سمجھئے کہ بانی اول کا خطا پر ہونا نہ ہونا یقیناً معلوم نہیں۔ صرف بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو بعض امارات وعلامت کی وجہ سے ناشی ہوا ہے کہ بانی اول خطا پر ہے تو اس کے واسطے الیقین لا یزول بالشک کافی ہے کہ محض شک کی بنیاد پر دوسرے شخص کی مخالفت نہیں چاہئے مصلحت دینیہ کا مقتضا یہ ہے کہ اول تو ہر زمانہ میں عموماً اور اس زمانہ میں خصوصاً تذبذب وتردد کو چھوڑ دے اور بانی اول پر بنابر استصحاب حال کے بدگمانی نہ کرے۔ البتہ اس کے اغراض ومقاصد دینی تکمیل میں جو کچھ نقص ہو اس کی اصلاح میں سعی جمیل کرے۔ اب اس مسجد کی مثال کے ذہن نشین ہونے کے بعد سمجھنا چاہئے کہ دین کے صرف دو شعبے ہیں ایک علم اور دوسرا عمل اور جس طرح کہ مسجد دار العمل ہے۔ اسی طرح مکاتیب ومدارس دار العلم ہیں۔ یعنی دو قسم کے امکنہ تیار ہونا مطلوب ہے۔ ایک تو فریضہ عمل سے سبکدوش ہونے کے لئے جن کو مساجد کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے اور دوسرے فریضہ علم سے سبکسار ہونے کے لئے جن کو مدارس کے نام سے پکارا جاتا ہے اب مسجد اور مدرسہ میں اس اعتبار سے کچھ فرق نہیں کہ دونوں کے دونوں دینی خدمات کی انجام دہی کے واسطے مہیا ہوتے ہیں۔ لہٰذا مدرسہ تعدد وتبدد میں بھی وہی تفصیل ہوگی جو مسجد کے تعدد وتبدد میں ہے کہ اگر پہلا مدرسہ بالکل حق پر ہے اور اس میں کسی اعتبار سے کسی قسم کی منقصت نہیں جس کی تکمیل کے واسطے دوسرے مدرسہ کا افتتاح ہو تب تو اس مدرسہ موجودہ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا مدرسہ بنانا ناجائز ہے کیونکہ یہ تبدد مذموم کے افراد میں سے ہے یا یہ کہ پہلے مدرسہ کے حق پر ہونے نہ ہونے میں تردد ہے تب بھی بمقتضائے مصلحت تعدد کو اختیار نہ کرے۔ اگر ممکن ہو اس کی شکایت کی اصلاح کر دے۔ اور اگر مدرسہ سابقہ یقیناً خطا

پر ہے یعنی وہ دینی خدمت انجام دہی سے مجتنب وگریزاں ہے تب دوسرا مدرسہ قائم کرنا ضروری ہے اور جس طرح کہ مساجد میں ایک درجہ ضرورت تعدد کا ہے اسی طرح مدارس میں بھی بعض اوقات بوجوہ مذکورہ تعدد لازمی ہے اور جہاں صرف تعدد ہوتا ہے وہاں کچھ منازعت وفساد نہیں ہوتا بلکہ سب لوگ ایک ہی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔

چنانچہ بخارا میں تین سو اکسٹھ مدرسے ہیں اور کبھی کچھ شوروغوغا بلند نہیں ہوتا اور دیکھئے سرکاری مدارس میں بھی اختلاف نہیں ہوتا کیونکہ سب ایک محکمہ کے ماتحت ہو کر اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتے ہیں انگریزی سکولوں کالجوں میں بھی جھگڑا نہیں ہوتا کیونکہ ان مقامات پر صرف تعدد ہی ہوتا ہے ان میں تبدد کی شان نہیں ہوتی ورنہ وہ بھی تو آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ کی اولاد ہیں۔ ان میں بھی تو منازعت ومشاجرت کا مادہ ہے۔

غرض تعدد تو قرین مصلحت ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے ورنہ سخت سے سخت مشقوں کا سامنا کرنا پڑ جائے اور تبدد بالکل مذموم اور واجب الترک ہے اب جو شخص مدرسہ سابقہ کے حال سے ناواقف ہو اس کو چاہئے کہ وہ دونوں مدرسوں کی اتحاد کی کوشش کرے کیونکہ تردد کی صورت میں جو تعدد ہوتا ہے وہ حکماً تبدد ہی کا فرد ہے اس لئے بمقتضائے مصلحت دینی اس سے اجتناب کیا جائے اور جو شخص حقیقت حال سے واقف اور اس کو اصل حالت معلوم ہو وہ اپنے علم کے موافق فیصلہ کرلے چونکہ مجھے بھی معلوم نہیں کہ یہاں کون حق پر ہے اور کون غلطی پر ہے اور نہ مجھے اس کی کچھ احتیاج

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار
کار ملکست آنکہ تدبیر وتحمل بایدش

اس لئے محض اسلام کی خیرخواہی اور دینی خدمت کی انجام دہی کے واسطے میں نے بانیان جلسہ کو یہ رائے دی ہے کہ وہ اس انشعاب وتفرق کو دور کریں اور باہم متحد ہو جائیں اور اپنی متفقہ قوت سے اسلام کے اغراض کو علی وجہ الکمال پورا کریں۔ آئندہ امتثال وعدم امتثال میرے نزدیک دونوں مساوی ہیں۔

بقائے دین کی صورت

اب میں دوسری جانب بھی مدرسہ سابقہ والوں کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس

منازعت کی مدافعت کی کوشش کریں اور اس کی صورت یہ ہے کہ جو شبہ منشاء ہوا ہے مخالفت کا اس کو رفع کر دیں کیونکہ بدوں کسی منشاء مخالفت کے مشکل ہے کہ لوگ مخالفت پر آمادہ ہوں۔

تانباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

(لوگ دراصل معمولی مخالفت کو مرچ نمک لگا کر عظیم عداوت ظاہر کرتے ہیں)

اکثر تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ منشا مخالفت کی کچھ نہ کچھ اصل ہوتی ہے۔ جس کو مخالفین اور نمک مرچ لگا دیتے ہیں۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بدوں کسی منشاء و اصلیت کے مخالفین طومار باندھ دیتے ہیں۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اور دوسرے حضرات گو واقع میں کسی شرعی خرابی میں مبتلا نہ ہوں اور نہ عنداللہ ان سے کچھ مواخذہ ہو لیکن موجودہ حیثیت سے ضرورت ہے کہ وہ ان شبہات کو جو ان پر عائد کئے جاتے ہیں۔ دور کر دیں کیونکہ اس امر کی خود مدرسہ کو بھی احتیاج ہے۔ اس لئے کہ آج کل قریب قریب سب مدارس کا دارومدار چندہ پر ہے شخصی مدارس بہت نادر الوجود ہیں عوام الناس بدظن ہو جائیں گے تو چندہ کون دے گا اور پھر مدرسہ کس کے بازوں کی طاقت سے چلے گا۔ لہٰذا عوام الناس کی جمعیت خاطر اور تسلی تشفی کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ شبہات کو رفع کیا جائے اور باہمی اتحاد سے دینی خدمت کو انجام دیا جائے۔

نیز جناب رسول مقبول علیہ الصلوۃ والسلام کے ارشاد اتقوا مواضع التھم (متہم مقام سے بچو) کا مقتضا بھی یہی ہے۔ البتہ جو شخص چندہ وغیرہ سے آزاد ہو کسی اور قسم کی پرواہ نہ رکھتا ہو اس کو رفع شبہات کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ عوام اگر اس سے بدظن ہوں گے تو چندہ بند کر لیں گے۔ تو اس کو کچھ ضرورت ہی نہیں۔ اس کو نہ اشتہار بازی کی حاجت ہے نہ جلسوں کی ضرورت ہے بلکہ وہ تو عیش و عشرت کے ساتھ اپنی زندگی کے ایام بسر کرے گا۔

مثلاً حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تھے کہ تعلیم و تدریس کا کام تو وہاں مدرسوں سے زیادہ ہوتا تھا خورد و نوش کا انتظام بھی خوب اچھی طرح تھا لیکن مولانا کو کسی کی اعانت کی پرواہ نہ تھی۔ اہل خیر بطور طلبہ کی خدمت کرتے تھے لیکن مولانا نے کبھی صراحتہً یا کنایتہً طلب نہیں فرمایا۔ اب کوئی شخص مثلاً یہ مشہور کر دیتے کہ مولانا ایک ہزار روپیہ کھا گئے یا مولانا نے فلاں مال نعوذ باللہ غبن کر لیا تو مولانا کو اس دفعیہ کی ضرورت نہ تھی طبعی کلفت ضرور ہوتی۔ لیکن کسی مصلحت کا بھی یہ اقتضا نہ ہوتا کہ کسی جلسہ سے یا کسی اشتہار سے اپنی برات ظاہر فرماتے کیونکہ آپ کسی ضابطہ کے

پابند نہ تھے بلکہ خرچ کے خود مختار تھے جس طرح چاہا خرچ کر دیا۔ اگر تحریک چندہ کرتے لوگوں کے سامنے دست طلب دراز فرماتے تب تو حضرت کو ان قیود کا لحاظ ضروری تھا اور جب بالکل استغناء سے کام لیا جائے تو کیا وجہ کہ اس معاملہ میں اظہار صورت حاجت کیا جائے۔ یہی حضرت کا احساس تھا کہ جو لوگ حسبۃ للہ طلبہ کی خدمت کرتے تھے حضرت اس کے بذل و حفاظت کی مشقت اٹھاتے تھے۔ اب جس کو شبہ ہو مت دو کوئی مانگنے نہیں آتا اپنے گھر جاؤ آرام کرو۔

باقی رہا وہ شخص جس کی طرز وروش ایسی نہ ہو۔ بلکہ وہ ضوابط و قواعد کا پابند ہو اشتہار و جلسہ سے کام لیتا ہو اس کو بحیثیت اجتماع و مصلحت دینی بے شک ضرورت ہے کہ اپنی صفائی کی تدبیر کرے اور اس کی ایک اچھی صورت یہ ہے کہ ایک ذی اثر لوگوں کی جماعت جو عمائد شہر سمجھے جاتے ہوں اور جن میں علماء بھی ہوں طرفین کو جمع کریں۔ یعنی وہ لوگ بھی ہوں جنہوں نے اختلاف کیا ہے اور وہ بھی ہوں جن سے اختلاف کیا ہے اور علماء سے مراد یہ نہیں ہے کہ میں بھی اس کمیٹی میں شامل ہوں کیونکہ نہ تو میں عالم ہوں اور نہ میں اپنے واسطے اس قسم کے فیصلے پسند کرتا ہوں۔

و للناس فی مایعشقون مذاهب

اور اس مجمع میں یہ کوشش نہ ہو کہ ہماری برات ہی ہو جائے بلکہ اصلی بیان کو من و عن بیان کر دینا چاہئے اس کے بعد اگر اس جماعت کی نظر میں شبہات دور ہو جائیں فبہا ورنہ کام سب ان ہی کے سپرد کر دیا جائے اور خود دست بردار ہو جائیں کہ لو تم جانو تمہارا کام جس کو چاہو سپرد کر دو کیونکہ دین کا کام کسی شخص خاص کی ذات پر موقوف نہیں ہے۔ مہتمم مدرسہ مسلمانوں کا وکیل ہوتا ہے اور وکالت کی وجہ سے مسلمانوں کی دینی خدمات کو انجام دیتا ہے اور چونکہ موکل کو عزل وکیل کا اختیار ہوتا ہے اس لئے عامہ مسلمین کو کہ جن کا یہ وکیل ہے اس کے عزل کا اختیار ہے۔ اس میں وکیل کا کچھ زور نہیں جیسے مقدمہ کی پیروی کے واسطے وکیل و بیرسٹر مقرر کئے جاتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں اس کو معزول کر دیتے ہیں اور دوسرا وکیل بنا لیتے ہیں تو کیا کسی عدالت کے وکیل کو اس امر پر حق ہے کہ وہ سر ہو جائے اور کہے میں ہی وکیل ہوں گا ہر گز نہیں! بلکہ وہ حساب صاف کر کے کہے گا کہ جہاں تمہارا جی چاہے جاؤ اسی طرح مہتمم مدرسہ عامہ مسلمین کا وکیل اور جناب اگر انسان اتنی ہمت کرے تو خود بخود شبہات سے برات ہو جاتی ہے پھر لوگ اس کو نہیں چھوڑتے۔

چنانچہ جس زمانہ میں میں کانپور میں مدرس تھا وہاں کے لوگوں نے اہل مدرسہ پر کچھ اعتراضات شروع کیے۔ میں نے جواب میں نہ وعظ کہا نہ اشتہار بازی کی نہ جلسہ کیا بلکہ عمائد مدرسہ کو بلا کے کہا کہ صاحبو! معترضین کے اتفاق سے معلوم ہوا کہ ہم لوگ خدمت مدرسہ کے اہل نہیں ہیں اور خدمت ہمارے حال کے مناسب نہیں۔ اس لئے ہم مدرسہ سے جاتے ہیں اب جو انتظام چاہیں کریں۔ مدرسہ کا مکان و موجودات و تحویل وغیرہ سب دیکھ لیجئے جناب اسی جلسہ میں سب اعتراضات وغیرہ رخصت ہو گئے مگر یہ کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ دل میں بھی یہی ہونا چاہئے کہ اگر کام ہم سے لے لیا جائے گا تو ہم دل سے راضی رہیں گے۔

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ نیا مدرسہ کرنا چاہتے ہیں ان کے واسطے تو یہ رائے ہے کہ وہ تبدد و تفریق سے کام نہ لیں اور قدیم مدرسہ والوں کی بابت یہ رائے ہے کہ وہ اپنے اوپر سے شکوک و شبہات کو رفع کر دیں اور اس میں حکم ذی اثر روساء اور علماء ہوں اس کا فیصلہ عوام سے متعلق نہ ہونا چاہئے البتہ میں اس خدمت سے معذور ہوں کیونکہ میں نے اسی جھگڑے وغیرہ سے بچنے کے لئے کانپور کو چھوڑ دیا۔

ایک مرتبہ تھانہ بھون میں بعض روساء کی یہ رائے ہوئی کہ ایک جدید مدرسہ امداد العلوم کے مقابلہ میں قائم کیا جائے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب چاہو نیا مدرسہ کر لو۔ میں پرانے مدرسے کو بند کر دوں گا۔ مقصود نشر ہے دین کا جس کے ہاتھ سے بھی ہو۔ ایسی حالت میں ایک مدرسہ کیا سو مدرسے بھی ہو جائیں تو کچھ حرج نہیں کیونکہ ہم کو جلب مال مقصود نہیں تا کہ یہ مدرسے اس میں مخل ہوں۔ سو دوسرے مدرسے والوں کا مقصود یہ تھا کہ پہلا مدرسہ نیست و نابود ہو جائے لیکن میرے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ وہی لوگ بیٹھ رہے اور اپنے قصد سے باز رہے۔

ایک مرتبہ مجھے ایک شخص نے پانچ روپے بھیجے تھے کہ طلباء سے دعا کراؤ۔ میں نے روپے واپس کر دیئے کہ مدرسہ دعا کی دکان نہیں ہے اور اس طرز میں عزت دین کی ہے اور عزت دین ہی کی مقصود بالذات ہے اور یہی مدرسہ کی روح ہے پس اصل بقاء دین کا چاہیے خواہ مدرسہ رہے یا نہ رہے۔

دین کی مقصودیت

ایک مرتبہ ایک رئیس نے میرے پاس مدرسہ کے لئے دو سو روپیہ بھیجے اور لکھا تھا کہ

میں جناب کو لینے آؤں گا۔ میں نے لکھا کہ میں یہ روپیہ اس وجہ سے نہیں لینا چاہتا کہ مجھ کو اس مضمون سے شبہ پڑ گیا کہ روپیہ بھیج کر مجھ پر شاید اثر ڈالا جاتا ہو تو اس میں ایک گونہ رشوت کا شائبہ ہے اگر بلانا ہے تو بلانے کے بارہ میں مستقل گفتگو کیجئے اور روپیہ وصول نہیں کئے تو اس کا جواب معذرت سے بھرا آیا کہ آپ مدرسہ کے لئے روپیہ لے لیں اور میں نہیں بلاتا۔ پھر مدت کے بعد مستقلاً انہوں نے بلایا۔

ایسے ہی ایک شخص پانی پت سے آئے اور انہوں نے پندرہ روپیہ مدرسہ میں داخل کرنا چاہا ان سے سوال کیا تم نے پانی پت کے مدرسہ میں یہ روپیہ کیوں داخل نہیں کیا معلوم ہوتا ہے تم نے یہ سمجھا کہ ثواب کا ثواب ہوگا اور وہ شخص بھی یعنی احقر خوش ہوگا کہنے لگے جی ہاں بات تو یہی تھی۔

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

(کتنا اچھا ہے کہ ایک ساتھ دو کام سرانجام پائے)

ایک پنتھ دو کاج۔ میں نے روپے واپس کر دیئے اور کہا کہ میں شرک کی رقم نہیں لیتا جس میں ارضاء حق کے ساتھ ارضاء خلق بھی مقصود ہو۔ دوسرے دن انہوں نے کہا اب وہ نیت نہیں ہے۔ اب صرف ثواب محض کی نیت ہے لے لیجئے میں نے لے لئے۔

غرض جو شخص آزاد ہو وہ کسی کے جھگڑے میں کیوں پڑے گا اس لئے ایسے شخص کو چھوڑ کر دوسرے اہل اثر اہل علم جمع ہو کر باہم گفتگو کر لیں اور اس میں بڑی ضروری بات یہ ہے کہ اہل معاملہ کی دونوں جماعتیں فیصل کنندوں کے سامنے روبرو گفتگو کریں۔ ورنہ روایتوں حکایتوں میں اور قصہ بڑھ جاتا ہے فیصلہ تو کیا ہوتا اور مخالفت زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے ایسے قصوں میں ایک ثالث کی ضروری احتیاج ہوتی ہے کیونکہ فریقین خود شبہات رفع نہیں کر سکتے اور نہ خود متفق الرائے ہو سکتے ہیں۔ اول تو لوگوں کو اپنی غلطی معلوم نہیں ہوتی۔ دوسرے ہر شخص کی فطرۃً ایک آن ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی غلطی سے واقف ہو جاتا ہے لیکن نفس پروری اقرار حق میں آڑ بن جاتی ہے لہذا ایک ثالث جماعت فیصلہ کر دے اور طرفین اس کو مسلم سمجھیں اور اس سے اچھی صورت میرے ذہن میں نہیں ہے ممکن ہے اور کوئی صاحب اس سے بہتر تجویز کر دیں۔

تو پہلا مضمون ذہن میں تعدد کا تھا جس کی مثال مساجد سے واضح ہوگئی مگر صورت واقعہ سے ممکن ہے کہ اس وقت تعدد کا نتیجہ اچھا نہ ہو لہذا اب پہلے مضمون کی جگہ دوسرا مضمون شروع کیا گیا کیونکہ واقعات سے رائے بدل گئی ہے۔

اتفاق کی صورت وحقیقت

حق تعالیٰ فرماتے ہیں **واعتصموا بحبل الله جميعا** ترجمہ اس کا یہ ہے کہ تم سب لوگ مل کر دین اللہ کے ساتھ تمسک کرو۔ اور سب کے سب دین پر قائم رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود دین ہے۔ اتفاق بھی وہی مطلوب ہے جو تمسک بالدین کے ساتھ ہو۔

آج کل کے عقلاء نے صرف اتفاق کا نام سن لیا ہے اور اسی کی رٹ میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ تو ان کے نزدیک اتفاق کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک شخص دوسرے کا ہم خیال ہو جائے کہ جو شخص حق کو چھوڑ کر باطل پرست کے ساتھ ہو جائے وہ بھی اتفاق سمجھا جاتا ہے حالانکہ کوئی صحیح العقل اس کا طالب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کا اتفاق برادری کا اتفاق ہے۔ مثلاً ناچ برابر کیے جاتے ہیں اگرچہ برا بھی سمجھتے ہیں اگر منع کرو تو کہتے ہیں کیا کریں برادری تو نہیں بگاڑی جاتی۔ خلاف وضع کیسے کریں بزرگوں کا طریقہ چلا آ رہا ہے تو ایک اتفاق یہ بھی ہے۔

قرآن پاک نے فیصلہ کر دیا کہ اتفاق مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ اتفاق کے خاص فرد کی طلب ہے یعنی باطل کے ساتھ نہ ہو اور عکس کی صورت مطرود ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ عز اسمہ نے اجتمعوا نہیں فرمایا بلکہ **واعتصموا بحبل الله جميعاً** (تم سب مل کر اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو) فرمایا کہ وہ اتفاق مطلوب ہے جس میں زمام دین ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اس کی پوری توضیح مثالوں سے ہو جاتی ہے۔

مثلاً دو سلطنتوں میں جنگ ہو اور بازار گرم ہو۔ اب بھی خواہان قوم کیا اتفاق اتفاق وہاں بھی پکاریں گے اور اتفاق کی صورت یہ تجویز کریں گے کہ ایک سلطنت بلا کسی ترجیح کے اپنی حکومت سے دست بردار ہو جائے اور دوسری سلطنت بانیل مرام واپس پھرے تو کیا یہ اتفاق ہے؟

یا ایک ظالم شخص ایک مظلوم سے لڑنے لگے۔ اب یہاں اتفاق کی صورت ایک یہ بھی ہے کہ مظلوم محض ساکت کھڑا پٹتا رہے تاکہ اتفاق ہاتھ سے نہ جائے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ اتفاق مطلوب کے معنی یہ ہیں کہ ظالم اس فعل شنیع سے باز رہے اور مظلوم کے ساتھ

اتفاق کرے نہ کہ مظلوم بیچارہ مصیبت میں مبتلا رہے۔

ان سب باتوں سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ مطلق اتفاق مطلوب نہیں بلکہ مطلوب و مرغوب فیہ وہی اتفاق ہے جس میں ناحق کو حق کے تابع کیا جائے نہ کہ بالعکس۔ لہذا یہ عنوان کہ آپس میں اتفاق سے رہو نہایت ہی مہمل عنوان ہے۔ اول تعیین حق کی ضرورت ہے اس کے بعد جو ناحق پر ہو اس سے فہمائش کی جائے کہ اہل حق کے ساتھ متفق ہو کر رہے نہ کہ علی الاٹکل اتفاق اتفاق پکارنا شروع کر دیا۔

مثلاً ایک ڈپٹی مقدمہ پیش ہونے کے وقت کسی بے جرم کو کسی مجرم کے ساتھ متفق ہونے کا حکم دے تو یہ اتفاق کس درجہ تک صحیح ہوگا۔ یا ایک شخص نے ایک لاکھ روپیہ کا دعویٰ کیا اور روداد سے حاکم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مدعا علیہ جھوٹا ہے اور اس کے ذمہ ایک لاکھ روپے واجب الادا ہیں لیکن وہ فدائے قوم اپنے اتفاق کی دھن میں مدعی کو ڈگری دلانے کی بجائے یہ کہے کہ تم ایک لاکھ چھوڑ دو اور آپس میں مخالفت نہ کرو۔ اتفاق سے رہو تو کیا یہ اتفاق ہے۔ ہرگز نہیں۔ جہاں قانون میں اور جرائم ہیں کیا مطلق نااتفاقی بھی کہیں جرم ہے اگر نااتفاقی جرم ہے تو خاص نااتفاقی ہے جہاں ناحق حق سے نااتفاقی کرے اور باطل حق کے مقابلہ میں اپنی بے جا کارروائی سے باز نہ رہے بلکہ اس قسم کے اتفاق سے فیصلہ کرنا خود بہت بڑا جرم ہے کیونکہ مغلوب کا دبانا اور مظلوم کو ستانا عدالت میں بہت سنگین جرم ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مطلق اتفاق محمود نہیں بلکہ بعض افراد اتفاق کے ناجائز ہیں اور ہمارے عقلاء اس سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ مثلاً دو مولوی آپس میں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کا ترکی بترکی جواب دیتے ہیں۔ اب اس میں کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک من ایک سوا من۔ اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک بالکل خاموش ہے لیکن دوسرا اشتہار بازی کرتا ہے اور اخباروں میں بیہودہ اور غیر موزوں مضامین شائع کراتا ہے وعظ وغیرہ کے جلسوں میں لاف اور گزاف سے کام لیتا ہے اب حیرت ہے عقلاء سے کہ دونوں کو برا کہتے ہیں نااتفاقی کا الزام دونوں پر عائد کرتے ہیں حالانکہ ایک بالکل ساکت ہے اب یہ کیا کر سکتا ہے اپنا بولنا اس کے قبضہ میں تھا اس کو چھوڑ دیا۔ اب دوسرے کو تو بند نہیں کر سکتا۔ اس پر الزام لگانے کے کیا معنی اول ناحق اور حق کی تحقیق کرو پھر جو حق پر نہ ہو اس کو دباؤ۔

دیکھو ایک شخص عدالت میں مقدمہ دائر کرے اور خیر سے جج صاحب مصلح قوم اور لیڈر بھی ہوں اور اتفاق سے لیکچرار بھی ہوں لیکن بحیثیت جج کے مدعی سے کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں تیرا دعویٰ نہیں سنتا۔ جاؤ مخالفت نہ کرو متفق ہو کر رہو۔ میرا دماغ پریشان کرنے کیوں آئے ہو۔ میں تمہارا مقدمہ خارج کرتا ہوں کیونکہ تم نااتفاقی کے مرتکب ہو۔ اگر وہ ایسا کرے تو دیکھئے حکام بالا کی طرف سے ایسی صلح کی کیسی گت بنتی ہے سو مصلح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مطلق اتفاق پر عمل کرو بلکہ یہاں پر اصلاح یہی ہے کہ تحقیق کر کے حق دار کا حق ادا کرو یعنی حکومت سے کام لو کاذب کو سزا دو۔ اس سے ڈگری دلاؤ۔ ترقی وغیرہ کراؤ تاکہ آئندہ وہ اس نااتفاقی کا مرتکب نہ ہو کیا کوئی ایسا شخص ہے جو ایسے مصلح کو یہ کہہ سکے کہ وہ صحیح الدماغ نہیں کیونکہ اس نے نااتفاقی کی معاونت کی ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ شخص اگرچہ اتفاق کو زبان سے نہیں نکالتا لیکن عملاً اتفاق کر رہا ہے۔

مجھ کو آج کل کے بھی خواہان قوم کے اتفاق پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک صاحب پٹ رہے تھے لیکن کبھی کبھی قابو پا کر ایک آدھ دھول مار بھی دیتے تھے۔ ان کے دوست رفیق تشریف لائے اور دوست صاحب کا دست مبارک پکڑ لیا کہ اب اچھی طرح سے مرمت ہو جائے کسی نے پوچھا یہ کیا حرکت تھی کہنے لگے۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست

دوست وہ ہے جو مصیبت کے وقت دوست کے کام آئے

تو جس طرح انہوں نے دست گیری کے معنی سمجھے تھے ایسے ہی اتفاق کے معنی سمجھے جاتے ہیں۔ کیوں صاحب کیا اس دست گیر کو بھی حامی اتفاق سمجھا جائے گا کیونکہ اختلاف رفع کرنے کی ایک صورت تو یہ بھی تھی تو جناب اگر یہی اتفاق ہے تو خدا خیر کرے اور ہمارا تو ایسا اتفاق کو سلام ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصہ میں ابراہیم نے اپنی قوم کو خطاب کیا ہے۔

قال انما اتخذتم من دون الله اوثاناً مودة بينكم فى الحيوٰة الدنيا ثم يوم القيامة يكفر بعضكم ببعض و يلعن بعضكم بعضاً

اور ابراہیم نے فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو تجویز کر رکھا ہے پس یہ تمہارے

باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے۔ پھر قیامت میں تم میں ہر ایک دوسرے کا مخالف ہو جائے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا۔

دیکھئے **مودۃ بینکم** سے معلوم ہوا کہ بت پرستوں میں اتفاق تھا مگر انجام اس کا دیکھئے کیا ہے کہ وہاں پر ایک کو دوسرے کی طرف سے لعنت اور پھٹکار ہوگی۔ تو کیا ابراہیم علیہ السلام نے ان میں نا اتفاقی ڈالنے کی کوشش کی تھی کیا مصلحان قوم کے پاس اس کا کچھ جواب ہے؟ اصول جدیدہ کے موافق تو کامل اتفاق چوروں اور ڈاکوؤں میں ہے یا اور جو بدمعاش طائفے ہیں کہ جان مال دین آبرو گنوا کے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں لیکن آج تک کسی مصلح نے نہ تو کسی چور کو انعام دیا نہ کسی ڈاکو کو اتفاق کی وجہ سے رہا کیا۔ ہمارے مصلحان قوم کو ضرورت ہے کہ وہ اتفاق کی تقسیم کریں اور ایک قسم کی تو رغبت دلا دیں اور دوسری قسم کے قلوب میں نفرت بٹھا دیں۔ جس اتفاق سے اصلاح ہوتی ہے وہی اتفاق ہے جس میں باطل کو حق کے تابع کیا جائے ورنہ وہ اتفاق نا اتفاقی سے بھی زیادہ برا ہو جائے گا۔

مثلاً کوئی مسلمان کسی کافر کے اسلام میں کوشش کرے لیکن مشیت ایزدی کامیاب نہ ہو سکے۔ تو کیا اتفاق کی وجہ سے یہ مسلمان ترک اسلام کر کر کافر ہو سکتا ہے ہرگز نہیں۔ اس اتفاق سے تو نا اتفاقی اچھی ہے کہ مسلمان مسلمان تو رہے گا دوستی اور اتفاق چاہے رہے یا نہ رہے کہ کوئی عاقل مسلمان ایسے اتفاق کو تجویز نہیں کر سکتا۔

مقام ازالہ وامالہ

دیکھئے بخل مذموم ہے لیکن مطلقاً نہیں بلکہ بعض افراد بخل کے مستحسن و محمود بھی ہیں۔ مثلاً معاصی میں خرچ کرنے سے بخل کرنا اچھا ہے بس نہ سخاوت بجمیع افرادہ مستحسن ہے نہ **بخل بجمیع افرادہ مستقبح** بلکہ ہر شے اپنے اپنے موقعہ اور اپنے اپنے محل میں اچھی ہے جیسے جراح ہوتا ہے۔

درشتی و نرمی بہم و ربہ است چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

(سختی اور نرمی دونوں اپنے اپنے موقع پر درست ہیں جیسے کوئی شخص جراح سے یہ کہیں کہہ سکتا کہ آخر میں شگاف نہ کر صرف مرہم رکھ دے)

جراح کے دونوں فعل اصلاح ہی ہیں۔ کوئی شخص جراح سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو

پھوڑے میں شگاف مت لگا۔ اور مرہم ہی مرہم رکھے جا۔ مثلاً کسی کے ناسور ہو جائے اور بغیر شگاف کے اچھا نہ ہو سکتا ہو لیکن کوئی رحم دل مصلح قوم جراح کو شگاف نہ لگانے دیں کیونکہ بے رحمی ہے تو جراح اس کا جواب یہی دے گا کہ ہر رحم دلی ہر سختی سے اچھی نہیں بلکہ بعض مقامات پر رحم دلی اچھی ہے اور بعض مواقع پر سختی اچھی ہے تو اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ بعض افراد رحم دلی کے مستحسن ہیں تو ناسور کو شگاف نہ دینا ان بعض میں سے نہیں ہے یا کوئی رحم دل کہنے لگے کہ سانپ کو نہ ستاؤ۔ اللہ کی بے زبان مخلوق پر رحم کرو۔ بچھوؤں کو نہ مارو۔ شیر بھیڑیے تیندوے کو کچھ نہ کہو اگر چہ ہزاروں انسان ان ناگہانی بلاؤں سے فنا ہو جائیں لیکن تم بوجہ رحم کے ان پر بندوق نہ داغو۔ کیا اس کو کوئی شخص رحم کہہ سکتا ہے اس نے بظاہر تو سانپ وغیرہ پر رحم کیا لیکن اصل یہ ہے کہ اس نے اس قوم پر جو ان سے بدرجہا افضل ہیں بڑا ظلم کیا۔ یعنی انسانوں کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر شے میں مختلف مراتب ہیں اور ہر شے اپنے محل میں مستحسن اور غیر محل میں قبیح ہے۔ **و من ثم قیل وضع الشی فے غیر محلہ ظلم ١٢ جامع)**

مرشدنا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ رذائل کا ازالہ نہیں کرتا بلکہ ان کا امالہ کرتا ہے۔ مثلاً بخل ایک بڑی صفت ہے تو وہ اس کو ان مواقع کی جانب منصرف کر دے گا۔ جہاں پر بخل کرنا مستحسن ہے مثلاً قمار سے شراب سے بخل ہونے لگے گا اور جو مواقع حسنہ ہیں جیسے مدرسہ میں دینا' سائل کو دینا' مسجد وغیرہ میں دینا' یہاں پر بخل نہ ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ سالک ہر شے کو اس کے محل میں استعمال کرنے لگے گا۔ سو بخل سے بچنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ اس کو اس کے مواقع کی جانب مائل کر دیا جائے اور یہی صورت سہل العمل ہے۔

دیکھو ایک انجن ہو اور اس کی اسٹیم خوب گرم ہو رہی ہو۔ پوری رفتار کی اس میں بھاپ موجود ہو اور وہ اتفاق سے سب گاڑیوں کو لے کر دوسری جانب کو چل دے تو اس کے روکنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اس کی آتش بجھا دی جائے اس کی بھاپ کو نکالا جائے اور یہ بہت مشکل ہے کیونکہ بھاپ ہی ایسی چیز ہے جس سے شہور کی مسافت ایام میں طے ہو جاتی ہے۔ یہ بیش بہا شے ہے اس کی تضیع ہرگز گوارا نہیں ہونا چاہئے اور نیز اس وقت بھی زیادہ خرچ ہوگا دوسری صورت اس انجن کی اصلاح کی یہ ہے کہ دوسری طرف اس کی کل پھیر دے

اس سے امالہ کی ترجیح ازالہ پر بخوبی واضح ہوگئی۔

بس جس طرح انجن کی بھاپ قابل قدر تھی اسی طرح انسان کے تمام اوصاف بھی قابل قدر ہیں کیونکہ حکمت سے پیدا ہوئے ہیں۔

لان اللّٰہ تعالیٰ حکیم و فعل الحکیم لایخلو عن الحکمۃ

اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

اس لئے ان کا ازالہ نہ کرے بلکہ مصارف صحیحہ کی طرف منصرف کر دے۔

مثلاً کسی شخص کو عورت وغیرہ سے محبت ہو جائے اس کے غم فراق میں گلنا گھلنا پگھلنا رات دن گریہ و بکا نے کام ہو۔ اب اس کی دو تدبیریں ہیں ایک تو ازالہ جس کا حال ابھی معلوم ہو گیا دوسرا امالہ جس کو شیخ کامل تجویز کرے گا اس محبت کو محبوب حقیقی کی جانب منصرف کر دے گا اور وہ گریہ و بکا اور ہموم و غموم سب خالق جل جلالہ کی یاد میں ہونے لگے گا۔

عاشقی گرزیں سرو گرزاں سراست　　　عاقبت مارا بداں شہ رہبراست

(عاشقی اگر اس طرف سے ہو تب بھی اور اگر اس طرف سے ہو تب بھی انجام کار بادشاہ حقیقی کی طرف رہبر ہے)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ خوب نظر بازی ہوا کرے اور بالقصد اس حرام فعل کا ارتکاب کیا جائے۔ پھر بھی موصل الی اللہ ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ اگر اتفاقاً اس درد بے درماں میں مبتلا ہو جائے تو شیخ اس کو حق تعالیٰ کی ذات والاصفات کے ساتھ متعلق کر دے اور اسی واسطے مولانا جامی فرماتے ہیں۔

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست　　　کہ آں بہر حقیقت کارسازی است

یعنی ازالہ کی حاجت نہیں بلکہ اس کو محبوب حقیقی کی جانب مائل کر دینا چاہئے پس حاصل یہ ہے کہ جیسے ہر رحمدلی اچھی نہیں بلکہ بعض بے رحمیاں بھی اچھی ہیں اسی طرح مطلق اتفاق بھی محمود نہیں بلکہ بعض افراد نااتفاقی کے بھی پسندیدہ ہیں بعض افراد بخل و امساک کے مستحسن ہیں۔

شرک باللہ

دیکھو جب ہمارے سردار کامگار آقائے نامدار تشریف لائے تمام عالم پر کفر کی گھنگور گھٹا میں چھائی ہوئی تھیں سب لوگ کافر تھے کیا آج روئے زمین پر کوئی ریفارمر کوئی لیکچرار کوئی مصلح قوم کوئی بھی خواہ قوم ہے جو یہ کہہ دے کہ جناب رسالت مآب نے نااتفاقی کی۔

کیونکہ ساری دنیا کے مقابلے میں آنحضورؐ نے لا الٰہ الا اللہ کا باواز بلند نعرہ لگا کر زمین و آسمان کو گونجا دیا۔ ابھی اور احکام کے اظہار کی نوبت نہیں آئی تھی۔ صرف توحید ہی سے دنیا میں وحشت کے آثار پیدا ہونے لگے تھے مشرکین مکہ کہتے تھے۔

اجعل الالھۃ الھا واحدا

کیا انہوں نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔

مشرک رحمدل بہت تھے۔ اللہ تعالیٰ پر رحم کھاتے تھے کہ ایک خدا کہاں کہاں کی خبر گیری کرے گا۔ اور کیا کیا کام کرے گا۔ نعوذ باللہ تھک جائے گا اس وجہ سے اس کے لئے خلیفہ اور نائب بنانا چاہئے کہ ایک کام کرے اور دوسرا آرام کرے۔ بیچاروں نے سلاطین دنیا پر قیاس کیا کہ جیسے یہ لوگ مقصد مملکت میں بغیر اعانت غیر کے کامیاب نہیں ہو سکتے اسی طرح خدا بھی اور چھوٹے خداؤں کا محتاج ہے۔

جیسے مثلاً جارج پنجم ہیں۔ ان کو پارلیمنٹ کمشنر' کلکٹر' مجسٹریٹ' جج انسپکٹر وغیرہ کی ضرورت ہے۔ بیچاروں نے یہی سمجھ کہ علی ہذا القیاس خدا بھی ماتحت حکام کا محتاج ہے۔ لیکن یہ خیال ان کا قیاس مع الفارق تھا اور خیر مشرکین تو کہا ہی کرتے تھے کہ بڑے بڑے کام تو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے کام اور دیوتا کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ بعض مسلمانوں میں اب تک ان مشرکین کے عقیدہ کا اثر چلا آتا ہے چنانچہ اولیاء اللہ کو سمجھتے ہیں کہ خدمت تکوینیہ میں ان کا دخل ہے اور یہ بالکل شرک ہے۔

کانپور میں ایک نو عمر احمد جان شخص تھے۔ محرم کے مہینے میں مسجد میں آرہے تھے راستہ میں ایک بوڑھی عورت ملی اور کہا بیٹا اس کھانے پر نیاز دے دو۔ انہوں نے پوچھا بڑی بی کس کی نیاز دے دوں تو بڑی بی نے فرمایا کہ ہائیں! یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا عشرہ میں سوا امام حسین رضی اللہ عنہ کے اور کسی کی نیاز بھی ہوتی ہے۔ ان دنوں میں تو اللہ میاں نے اپنی نیاز سے بھی منع کر دیا ہے۔

یہ مسئلہ بڑی بی نے ہی گھڑا۔ یہ لوگ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر کارکن۔ تو صرف صابر صاحب خواجہ صاحب معین الدین اجمیری ہیں اور اللہ تعالیٰ برائے نام۔ تو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ یہ شرک ہے اور اس کی اصل وہی مشرکین کا عقیدہ ہے۔

چنانچہ ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مشرکین عرب سے دریافت فرمایا

کہ تمہارے کتنے معبود ہیں کہا سات ایک نہ دو اکٹھے سات آپ نے فرمایا وہ کہاں ہیں؟ تو کہا ایک آسمان میں ہے اور چھ زمین میں ہیں۔ مہتم بالشان امور تو آسمان والے خدا کے متعلق ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام زمین والے خدا کرتے ہیں۔

چنانچہ باری تعالیٰ مشرکین کے اس عقیدہ کو اس واقعہ میں نقل فرماتے ہیں۔

حتیٰ اذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین

جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارتے ہیں۔

یعنی جب دریا میں سوار ہوتے تھے اور وہاں تلاطم امواج اور مدو جزر سے غرق کا خوف ہوتا تھا تب تو خوب گڑگڑا کے دعا مانگتے تھے کہ۔

لئن انجیتنا من ھذہ لنکونن من الشاکرین

اے خدا اگر تم نے ہمیں اس مصیبت سے بچالیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔

کہ اے اللہ! اگر تو ہم کو اس بلا سے نجات دے اور ہم صحیح سالم منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے تو شکر گزاری کریں گے۔

فلمآ انجاھم اذا ھم یبغون فی الارض بغیر الحق

پھر جب خدا ان کو بچا لیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔

اور جب حق تعالیٰ نے ان کو نجات دے دی تو پھر ملک میں بلا کسی استحقاق کے سرکشی کرنے لگے۔

ایک بہت ہی تعجب ہے کہ وہ لوگ مخاوف میں تو اللہ ہی کو پکارتے تھے لیکن ہمارے بعض مسلمان ان سے بھی زیادہ بہادر ہیں۔ وہ ایسی حالت میں بھی غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔ چنانچہ میں نے خود سنا کہ جہاز کی حرکت کے وقت بعضے یا علیؓ کہتے تھے بعض خواجہ صاحب کو بلاتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ مشرکین تو ایسے وقت میں خدا کو پکارتے تھے لیکن یہ موحدین بزرگان دین کو پکارتے ہیں۔ بھلا یہ حضرات کیا کر سکتے ہیں وہ تو خود حق تعالیٰ کے محتاج بندے ہیں۔

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ مداری فقیروں کی ایک مجلس میں تذکرہ ہوا کہ دنیا کے کام کون کرتا ہے۔ تو یہ رائے پاس ہوئی کہ پہلے تو خداوند تعالیٰ کرتے تھے لیکن جب سے مدار صاحب ہوئے ہیں اب تمام دارومدار مدار صاحب پر ہے وہ دنیا کے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ آج کل کی کمیٹیوں میں ایسے ریزولیشن پاس ہوتے ہیں یہ تو

حالت ہے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی۔

ایک دوسرے شخص بیان کرتے تھے کہ ایک شخص سے پوچھا گیا تم کون لوگ ہو۔ کہا مسلمان۔ پھر دریافت کیا کس کی امت میں کہاں پچھان میں ایک راجہ گجرا ہے (گزرا ہے)۔

اب دیکھئے یہ بیچارہ جناب حضورؐ سے اس قدر ہی تعلق رکھتا تھا کہ پچھان کا راجہ سمجھا تھا۔ پچھان مدینہ کو اس وجہ سے کہا کہ ہندوستان سے حجاز مغرب کی سمت واقع ہے ایسے لوگوں کی حالت سن سن کر بہت رحم آتا ہے کہ بیچارے کیسے دام جہالت میں گرفتار ہیں۔ بادیہ ضلالت میں گمراہ ہیں۔ حق تعالیٰ ان کی رہبری فرمائیں اور صراط مستقیم پر لائیں۔

مگر اس سے زیادہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے واعظین و علماء میں سے کوئی حضرت بھی ایسے اطراف جوانب میں نہیں پھرتے جہاں ضرورت نہیں وہاں تو رات دن علماء کا گزر رہتا ہے اور جس جگہ واقعی احتیاج ہے وہاں ہو کا عالم ہے جو کچھ قوت اور طاقت ہے آپس کی لڑائیوں میں صرف کرتے ہیں سب سامان خانہ جنگیوں میں ختم ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ اپنی متفقہ طاقت سے اہل اسلام سے جہل دور کریں آفتاب اسلام کو عروج دیں۔ حضیض ذلت سے نکل کر اوج عزت پر پہنچیں۔ نہ یہ کہ اور پستی کے اسباب پیدا کئے جائیں اور جہلا کی اصلاح تو درکنار علماء کو بھی اپنی غیبت اور بے جا اور ناشائستہ بداخلاقیوں کا ہدف بنایا جائے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ

شنیدم کہ مردان راہ خدا دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ

میں نے سنا کہ خدا کی راہ پر چلنے والے مرد دشمنوں کے دلوں کو بھی تنگ نہیں کرتے۔

مگر ہماری یہ حالت ہے کہ۔

ترا کے میسر شود ایں مقام کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

تجھے یہ مقام کب حاصل ہوسکتا ہے کہ تو دوستوں کے خلاف لڑائی کرتا ہے۔

خیر یہ جملہ تو بطور تفریح کے تھا لیکن اتنی بات اور سمجھنے کے قابل ہے کہ جہل عذر و حجت نہیں ہوسکتا۔ اس سے قبل میں حضورؐ کا قصہ بیان کر رہا تھا کہ آپؐ نے جب توحید کا دعویٰ کیا تو تمام آپؐ کے مخالف تھے کیونکہ نصاریٰ تثلیث کے قائل تھے۔ اقانیم ثلثہ مانتے تھے حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے تھے یہود عزیر علیہ السلام کو

ابن اللہ کہتے تھے مجوس لوگ اہرمن و یزداں کے قائل تھے خالق شر اہرمن ہے اور خالق خیر یزداں ہے فارس میں آتش پرستی کا غلغلہ بلند تھا۔ ہندوستان میں وثن پرستی کا بازار گرم تھا۔ بعض شمس و قمر کو معبود حقیقی سمجھتے تھے بعض خدا ہی کے منکر تھے اور اس سلسلہ میں عالم کو موجد کے قیام پذیر بتاتے تھے یعنی جو لوگ دہریہ کہلاتے ہیں جیسے فرعون بھی دہری تھا بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی موجود تھے۔ غرضیکہ تمام دنیا پر شش جہت سے بحر کفر کی طغیانی تھی اور کوئی ناخدا نہ تھا جو گرداب ہلاکت سے کشتی کو کنارہ پر پہنچاتا سب لوگ منجدھار میں پھنسے ہوئے تھے کہ حضورؐ پر اقرا باسم کی تین ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں پھر تین سال تک متواتر وحی کا سلسلہ منقطع رہا جس سے حضورؐ پر قبض احوال طاری رہا اور آپؐ نے بہت کوفت اٹھائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ خودکشی کا قصد فرمالیا تھا بحکم خداوندی جبرئیل علیہ السلام سدراہ ہوئے۔

کفار کا توکل

غرضیکہ تین سال بعد اور قرآن شریف نازل ہوا چونکہ پہلی وحی میں تبلیغ کا حکم نہ تھا اور خدا کا نام لیتا تو ہمیشہ سے حضورؐ کے لئے لابدی امر تھا تو اب تک یہ کیفیت تھی کیا جناب فخر عالمؐ کا کوئی منکر نہ تھا بلکہ سب لوگ آپؐ کے تقدس اور کریم النفس ہونے کے قائل تھے۔ آپ ان لوگوں کے مقدمات میں حکم بن کر فیصلہ فرماتے تھے سب آپ کی امانت داری کی صفت کے معتقد تھے چنانچہ آپ کو محمدؐ الامین کہا کرتے تھے۔

ارہاس کے زمانہ کا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے کہ قبائل عرب نے جب خانہ کعبہ کی مرمت کی تو حجر اسود کے اٹھانے کے وقت بہت جھگڑا ہوا کہ اس کو اس کے محل میں کون چسپاں کرے۔ سب لوگ رئیس و عمائد تھے اور ہر شخص کا قصد یہ تھا کہ اس سرخروئی سے مشرف ہوں۔ قریب تھا کہ آپس میں کشت و خون ہو جائے اور شمشیر بے نیام ہو جائے کیونکہ قبائل عرب میں بوجہ جہالت و ضلالت کے قتال کوئی بڑا کام نہ تھا ان کے ہاں تو موروثی جنگیں چلی آتی تھیں خیر ان کو ایسے جوش و خروش کے وقت یہ سوجھی کہ آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کر لو۔ تعجب ہے کہ ایسی جنگجو قوم کو ایسے موقعہ پر کیسے اتفاق ہوا۔

غرض کہ وہ لوگ حجر اسود کو چھوڑ کر ایک علیحدہ مقام پر مجتمع ہوئے اور یہ بات قرار پائی

کہ مسجد حرام میں جو شخص سب سے اول داخل ہو وہی ہمارا اس قضیہ میں حکم ہے اور اسی کے فیصلہ کے موافق ہم لوگ عمل کریں گے۔ جس فریق کو تجویز کر دے گا وہی اس کو اٹھائے گا اور فریق ثانی کو کچھ چون و چرا کا حق حاصل نہ ہوگا۔

اس سے ان لوگوں کا باوجود کفر کے توکل معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ پر کیسے معتقد تھے کہ اول جو شخص داخل ہوگا وہ حکم بننے کے بھی قابل ہوگا۔ ایک آج کل ہمارا زمانہ ہے کہ باوجود اسلام کے توکل تو مقصود ہے لیکن اس کی جگہ تاکل موجود ہے چنانچہ ہر بات میں پالیسی حکمت عملی تلاش کی جاتی ہے سادگی بھولا پن' خلوص' اخلاص ناپید ہو گئے۔ یہ اوصاف حسنہ تو قدیم ہی لوگوں میں تھے۔ اب تو ایسے لوگوں کو احمق و بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ مگر خوب سمجھ لو آج کل کے لوگ عاقل نہیں آکل ہیں بلکہ باقل ہیں۔

اب تو صرف ظاہری نمائش و تزئین رہ گئی ہے غرض کہ قدیم زمانے میں کفار و مشرکین تک بھی متوکل تھے۔

خیر سب سے اول مسجد حرام میں جناب رسول مقبولؐ ہی رونق افروز ہوئے سب لوگ چلا اٹھے کہ

جاء محمد الامین۔ جاء محمدٌ الامین صلی اللہ علیہ وسلم

کہ محمدؐ الامین تشریف لے آئے۔ حضور کو دیکھ کر سب لوگوں نے خوشی کی کہ اب انصاف خوب ہوگا اور سب لوگ آپ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو گئے کہ ہمارا قلب بھی یہی چاہتا تھا کہ جناب تشریف لائیں اور آپ ہی ہمارے اس قضیہ کے حکم ہوں۔

یہ ایک ایسا عجیب واقعہ تھا کہ جس کے فیصلہ کرنے میں بڑے بڑے عقلاء بھی چکرا جاتے کیونکہ جس فریق سے اٹھوائیں دوسرا فریق مد مقابل ہو جائے اور کہنے لگے اس فریق کی طرف داری کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایک چادر لاؤ اور چادر میں حجر اسود کو رکھ لو۔ پھر سب لوگ مل کے چادر کے کونے پکڑ کے خانہ کعبہ تک لے چلو اور میں تمہارا سب کا وکیل ہو جاؤں۔ میں چادر میں سے اٹھا کر خانہ کعبہ میں رکھ دوں گا۔ اور چونکہ وکیل کا فعل موکل کا فعل ہوتا ہے اس لئے وہ تم سب کا فعل ہو جائے گا۔ چنانچہ سب راضی ہو گئے اور آپؐ نے اس طرح حجر اسود خانہ کعبہ میں رکھ دیا اور سب نزاع و فساد رفع ہو گیا۔

تو دیکھو کفار کے قلوب میں حضورؐ کی یہ عقیدت وعظمت تھی لیکن جب آپؐ نے لا الٰہ الا اللہ فرمایا اور ساتھ ہی نبوت کا دعویٰ کیا۔ اغیار تو اغیار اعزہ واقارب عقارب بن گئے سب لوگ جان کے دشمن ہو گئے۔ ہر جگہ دو مذہب ہو گئے تو کیا کوئی متنفس یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ نے نااتفاقی کی بلکہ آپ تو عین اتفاق کے واسطے تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے اتفاق ہی کی جانب ان کو مدعو کیا تو حاصل یہ ہے کہ جو باطل پر ہو اس کو حق والے کے ساتھ متفق کرو اور بالعکس معاملہ سے تحرز کرو۔

قیام علی الحق

جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مکہ کے چند عمائد مجتمع ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہم لوگ قوم کی جانب سے ایک وفد ہیں اور جناب والا کی خدمت میں ایک درخواست ہے وہ یہ کہ آپ خطہ حجاز میں شورش نہ پھیلائیں اور جو مقصود ہو اس کو بیان فرمائیں ہم آپ کے مطلب کو پورا کر دیں گے اگر جناب مال و دولت کے متمنی ہوں تو ہم ایک بڑا خزانہ جمع کر دیں گے۔ اپنے سب اموال سے دست بردار ہو جائیں اور آپ کے سپرد کر دیں اپنے اوپر قیاس کیا۔ جیسے خود مال کے حریص ولالچی تھے اسی طرح خساست نفس سے حضورؐ کو بھی تصور کیا۔ بھلا حضورؐ کے سامنے مال کی کیا پرواہ تھی آپؐ سے تو کوہ التجا کرتے تھے کہ ہم سونے کے ہو جائیں اور آپ ہمیشہ انکار فرماتے تھے آپؐ تو سلطان دو جہاں تھے۔

خیر پھر عمائد نے کہا اور آپؐ کو عورتوں کی حاجت ہو تو قریش کی سب کنواری لڑکیاں حاضر کر دی جائیں جتنی آپؐ چاہیں پسند فرما لیں۔ چونکہ حضور سرور کائنات بہت عالی نسب تھے اس لئے ان کو اپنی لڑکیاں دینا عار نہ تھا بلکہ اور باعث فخر تھا۔ یا آپؐ ہم پر حکومت کرنا چاہتے ہوں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں لیکن خدارا ان باتوں سے دست بردار ہو جایئے۔

آپؐ نے ان سب باتوں کے جواب میں فرمایا مجھ کو کسی شے کی حاجت نہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا بجز اعلاء کلمۃ اللہ کے فقط ایک ہلکی سی بات کہہ لو کہ لا الٰہ الا اللہ اس پر مشرکین نے کہنا شروع کیا۔

اجعل لاالھۃ الھاواحدا ان ھذا لشیء عجاب

کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔

اور یہی کہا

ماسمعنا بھذا فی الملة الآخرة

ہم نے تو یہ بات پہلے مذہب میں نہیں سنی۔

اور یہ بھی کہا

اء نزل علیه الذکر من بیننا

کیا ہم سب میں سے اس شخص پر احکام الٰہی نازل کیا گیا۔

یعنی آپ تو مالدار ہیں نہ حاکم ہیں نہ پڑھے لکھے ہیں۔ آپؐ پر وحی کیسے نازل ہوئی۔ اس کے مستحق تو ہم تھے۔ ہم پر کیوں نازل نہیں ہوئی۔ تو یہ یہ مخالفتیں پیش آئیں اور پھر بھی حضورؐ کا اتفاق کے واسطے تشریف لانا مسلم ہے تو معلوم ہوا مطلق اتفاق محمود نہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم نے اتفاق سیکھا کس سے صرف حضورؐ سے کیونکہ کسی غیر کا اتفاق تو معتبر نہیں تو بس حضورؐ کا عملی اتفاق دیکھ لو اور اسی کے موافق تم بھی عمل کرو تمام فرق باطلہ دہریہ ملحدین صائبین، گبر، مجوس، یہود، نصاریٰ، مشرکین آپ سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ سب مخالفت پر کمربستہ تھے اگر حضورؐ استقلال سے کام نہ لیتے تو بہت سخت مشکل کا سامنا تھا۔ ہزاروں لوگ قتل کے درپے تھے۔ ایک یکہ و تنہا ذات پر اتنا ہجوم! خدا کی پناہ نہ اتنی قوت تھی نہ مال تھا نہ اس قدر صحابہ اور رفقاء تھے ادھر ارشاد تھا۔

یایھا الرسول بلغ مآانزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالته و اللّٰه یعصمک من الناس

اے رسولؐ! جو کچھ آپؐ کے رب کی جانب سے آپؐ پر نازل کیا گیا آپ سب پہنچا دیجئے۔ اگر آپؐ ایسا نہ کریں گے تو آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا۔ اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

آپؐ اس وحی کے بعد صحابہؓ میں تشریف لائے اس زمانے میں صحابہ جناب کی حفاظت کیا کرتے تھے آپؐ نے فرمایا جاؤ اب کسی کی حاجت نہیں اب حافظ حقیقی میرا نگہبان ہے میں تنہا کام کروں گا۔ ایک بے سامان شخص کے واسطے ایسی اولوالعزمی بہت مشکل کام ہے۔ پھر دیکھئے قدرت حق کا نمونہ کہ سب لوگ آپؐ کے ساتھ ہوئے اور سب متفق ہو کر بود و باش کرنے لگے۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اتفاق مطلق مطلوب نہیں۔ ورنہ ایسا اتفاق تو حضور کو قبل از ادعائے نبوت حاصل ہی تھا بلکہ اتفاق وہی معتبر ہے جس میں اہل باطل کو اہل حق کے ساتھ متفق کیا جائے جیسے کہ اس مقصد میں حضور کو بعد از تبلیغ کامیابی ہوئی۔ اسی واسطے آیت میں اجتمعوا کا لفظ نہیں فرمایا بلکہ واعتصموا بحبل اللہ (اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھامو) فرمایا جیسے کے پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مطلق اجتماع مراد نہیں بلکہ وہ اجتماع جس میں دین اللہ فوت ہوتا ہو اس کو دور ہی سے سلام کرنا چاہئے اگرچہ ساری قوم کے خلاف وضع اختیار کرنی پڑے مگر دین اللہ سے ہرگز منہ نہ موڑے۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو شخص حق پر ہو اس کو اتفاق کی کوشش کی ضرورت نہیں بلکہ بس حق پر قائم رہنے کی ضرورت ہے دیکھو مقناطیس کو جذب حدید میں کسی عملی تدبیر کی ضرورت نہیں بلکہ قدرۃً اس میں کشش آہن کا مادہ موجود ہے اسی طرح حق میں فطری تاثیر ہے کہ باطل کو اپنی جانب جذب کر لیتا ہے کسی سعی و تدبیر کی ضرورت نہیں بجز قیام علی الحق کے اس سے باطل یا تو منعدم ہو جائے گا یا حق میں منجذب ہو جائے گا۔

اصلاح کی صورت

ایک مرتبہ تھانہ بھون میں میرے ایک عزیز نے ترک رسوم کے بارہ میں ایک مجمع کیا اور کہا صاحب مصلحت شرعی و عرفی کا مقتضا یہ ہے کہ ان رسومات جہل کو اٹھا دینا چاہئے اور آپس میں معاہدہ کر لینا چاہئے کہ آئندہ نہ رسومات خود کریں گے نہ اور جگہ شریک ہوں گے۔ ایک صاحب نے اس وعظ و نصیحت کے بعد اٹھ کر یہ کہہ دیا اجی کیا ہمارے بزرگ بیوقوف تھے جو یہ رسومات کرتے تھے ان کو اتنی عقل نہ تھی بس سب پر پانی پھیر دیا اور سب مجمع منتشر ہو گیا میں بھی اس مجمع میں تھا۔ میں نے کہا اس طرح تو کامیابی مشکل معلوم ہوتی ہے ایک عملی اور شرعی تدبیر کرو۔ چنانچہ ایک تو میں نے رسوم کے بارہ میں اصلاح الرسوم ایک کتاب لکھی دوسرے یہ کیا کہ کسی کو کچھ مت کہو عمل شروع کر دو سب درست ہو جاویں گے۔ ہم نے اپنے گھر میں عمل شروع کیا۔ رفتہ رفتہ سب قصبہ نے عمل شروع کر دیا اور بفضلہ اس بلاء سے تمام قصبہ مامون ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو شاذ و نادر بلکہ خود رسوم کے کرنے والے

بھی متاثر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں نامعلوم وہ پہلی سی رونق کہاں گئی۔

قل جآء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً

"آپ کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل گیا گزرا ہوا۔ واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے۔"

اگر تم کسی کو راہ پر لانا چاہتے ہو تو اپنی اصلاح کرلو وہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا اس کی پرواہ نہ کریں اور اگر ہم اپنی اصلاح نہ کریں تو لوگ طعن تشنیع کریں گے اور کہیں گے بڑے بزرگ بنے بڑے مولوی صاحب ہیں بلکہ لایخافون لومة لائم (وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہیں کریں گے) کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ سے جو اسلام پھیلا وہ ان کی اصلاح نفوس کی وجہ سے پھیلا۔ یہ جو لوگ مشہور کرتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے ذریعہ سے پھیلا بالکل غلط ہے۔ شمشیر کا اسلام قلب میں نہیں اترتا وہ تو لسان ہی پر مقصود رہتا ہے یہ بات کہ صمیم قلب میں گھس جائے ادیان باطلہ سے نفرت ہو جائے صرف اصلاح باطن سے ہوتی ہے۔

اسلام اور تلوار

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں فارس کا ہرمزان شہزادہ گرفتار ہو کر آیا۔ اسلام کے قاعدہ کے موافق اس پر اسلام پیش کیا گیا اس نے قبول کرنے سے انکار کیا اور مطیع ہو کر رہنے سے بھی۔ حضرت عمرؓ نے قتل کا حکم دیا۔ اس نے درخواست کی کہ مجھ کو تھوڑا سا پانی پلا دیجئے تو چونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔

اذاقتلتم فاحسنو القتلة (الصحیح لمسلم کتاب الذبائح: ۵۷)

جب تم قتل کرو تو اچھی طرح کیا کرو۔

کہ آسانی اور سہولت سے قتل کیا کرو۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے پانی پینے کی اجازت دی۔ اس نے گلاس منہ سے لگا کر علیحدہ کرلیا اور کانپنے لگا سبب پوچھا کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ پانی پیتے ہوئے میری گردن پر تلوار نہ چلے۔ آپ نے فرمایا نہیں ایسا ہوگا۔ اس نے کہا اچھا وعدہ کرلیجئے کہ جب تک میں پانی نہ پیوں قتل نہ ہوں۔ آپ نے سادگی سے وعدہ کرلیا آپ کو اس کی کید مضمر کی کچھ خبر نہ تھی۔ اس نے عہد لیتے ہی پانی زمین پر پھینک دیا کہ نہ

قیامت تک پانی ہوگا نہ میں پیوں گا۔ اور نہ قتل ہوں گا۔ حضرت عمرؓ بہت حیران ہوئے اور فرمایا کہ جاؤ بے فکر رہو ہم وعدہ خلافی نہیں کریں گے۔ اس نے فوراً ہی خلوص دل سے کہا۔

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمداً رسول الله

(میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں)

اور یہ کہا کہ میں نے یہ حرکت اس وجہ سے کی تاکہ یہ معلوم ہو جائے میں نے شمشیر کے خوف سے اسلام قبول نہیں کیا اور نہ مجھ پر اسلام قبول کرنے میں کچھ دباؤ ہوا۔ ورنہ مسلمان تو میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کفار نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ شمشیر سے کام نہیں لیتے کیونکہ جنگ سے دوسروں کے اخلاق پر کیسے اثر ہو سکتا ہے یہ لوگ اخلاق ہی سے اسلام پھیلاتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں آپ کی ایک زرہ گم ہوگئی۔ آپ نے اس کو ایک یہودی کے پاس دیکھا جو ہر اعتبار سے ذلیل تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ زرہ میری ہے۔ اس نے کہا ہماری ہے۔ اور دینے سے انکار کر دیا دیکھئے آزادی قابل غور ہے۔ جانتا تھا کہ یہ لوگ عادل ہیں بغیر حجت کے کبھی دارو گیر نہ کریں گے اسی وجہ سے اس قدر گستاخی سے پیش آیا اور کہا جائیے نالش کیجئے حضرت شریح تابعی قاضی تھے اور حضرت علیؓ کے ماتحت حضرت علیؓ ان کے دار القضاء میں گئے۔ دیکھئے حضرت علیؓ کی تواضع کہ خود باوجود خلیفۃ المسلمین ہونے کے دار القضاء میں تشریف لے گئے یہ نہیں کیا کہ قاضی صاحب کو بلوا لیتے۔ باقاعدہ دعویٰ کیا۔ حضرت شریح نے بمقتضائے البینۃ علی المدعی حضرت علیؓ سے گواہ طلب کئے دیکھئے اسلام کی آزادی اسلام کا عدل وانصاف کے خود ملازم نے بادشاہ سے اس طور پر ثبوت مانگا جیسا کہ ایک ادنیٰ سے آدمی سے مانگا جاتا ہے۔ حضرت شریح نے فرمایا کہ غلام کی شہادت تو مقبول ہے کیونکہ آزاد کردہ ہے البتہ آپ کے لئے حضرت حسنؓ کی شہادت حجت نہیں ہے لہذا دعویٰ خارج کیا گیا یہ مسئلہ اجتہادی ہے حضرت علیؓ بیٹے کی شہادت باپ کے لئے حجت مانتے تھے اسی لئے ان کو پیش کیا حضرت شریح نہ مانتے تھے (اس لئے قبول نہ کیا) حضرت علیؓ ہنسی خوشی دار القضاء سے باہر تشریف لے آئے۔ یہودی بھی آپ کے پاس آیا اور کہا۔

اشهد ان لا اله الله و اشهد ان محمد رسول الله

کہا مجھ کو مذہب اسلام کی حقانیت ثابت ہوگئی کہ آپ نے اپنی زرہ پہچانی آپ نے مجھ سے زبردستی نہ لی۔ قاضی نے ڈگری مجھے دی اور آپ چیں بجبیں نہ ہوئے اس کے بعد زرہ واپس کر دی اور خدام میں داخل ہوگیا۔

اس طرز عمل سے لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔ اس واقعہ میں انہوں نے کونسی شمشیر زنی کی تھی۔ دیکھئے ایک زمانہ تو وہ تھا کہ کفار مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام کی رغبت کرتے تھے ایک آج کل کا زمانہ ہے کہ ہم کو دیکھ کر مسلمین بھی نفرت کرتے ہیں۔

چنانچہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں کسی نے ایک مجوسی سے کہا کہ تو مسلمان ہو جا۔ اس نے جواب میں کہا کہ اگر بایزید جیسا مسلمان ہونا مراد ہے تو یہ مجھے مشکل ہے اور اگر تم جیسا ہونا مراد ہے تو تم سے تو میں ہی اچھا ہوں۔ خیر یہ تو اس کی حماقت تھی کہ مجوسیت کو اسلام پر ترجیح دیتا تھا خواہ وہ کسی درجہ کا اسلام ہو لیکن مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ بعض لوگوں کے اسلام کو کفار بھی پسند نہیں کرتے۔

حاصل یہ ہے کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا دیکھو ہم لوگوں میں لوگ وہ بات نہیں ہے اور اسلام کے ویسے محاسن ہم میں نہیں تاہم ہمیں دیکھ دیکھ کر سینکڑوں مسلمان ہوتے ہیں تو اب ان کی گردن پر کون تلوار رکھتا ہے یہ صرف اسلام کی حقانیت ہے البتہ آج کل اہل اسلام ضرور ضعیف ہیں باقی اسلام میں وہی قوت ہے وہی کشش ہے یہ اسی کا اثر ہے جن لوگوں نے ابتداء اسلام میں اسلام قبول کیا تھا ان میں کیا کیا آفتیں نہ آئیں تلواریں چلیں خاندان چھوٹے مال و دولت ہاتھ سے گئی۔ لیکن سب کو گوارا کیا۔ ان پر کون سی تلوار چلی تھی البتہ جن لوگوں نے جان کر شرارت سے اس میں مزاحمت کی ان کے لئے یہ قانون مقرر کرنا ضروری تھا کہ اسلام ہو یا استلام ہو کہ باج گزار خراج گزار ہو کر رہو حلقہ اطاعت و انقیاد اپنے گوش میں آویزاں کر دیا مسلمان ہو کر لذت دارین حاصل کرو ورنہ تلوار کے گھاٹ اترو۔ دیکھئے سب سے پہلے اسلام کی ایک جڑ تھی یعنی فخر عالم کی ذات بابرکات تو کیا وہ ایک ذات تلوار سے سب کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اصل سبب اس ذات کی برکت تھی جس نے تمام عرب و عجم فارس و روم یورپ و ہند میں اسلام کے پرچم اڑائے جس کے نشانات اب تک ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست
خم و خمخانہ با مہر و نشانست

ابھی وہ ابر رحمت موتی بکھیر رہا ہے۔ خم اور خم خانہ بارونق ہے۔

اب تک وہی آب وتاب ہے اس لئے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ اسلام ضعیف نہیں بلکہ اہل اسلام ضعیف ہیں اسلام کے اندر جو کسی کو ضعف معلوم ہوتا ہے وہ فی الحقیقت اپنا ضعف ہے۔

ہمارے قصبہ میں ایک گنوار عورت اپنے بچہ کو پاخانہ کرا کر چاند دیکھنے کو اٹھی اتفاق سے ناخن میں کچھ پاخانہ لگا رہ گیا تھا۔ انگلی کو ناک پر رکھا جیسے کہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے تو ناخن میں سے پاخانہ کی بدبو آئی کہنے لگی اوئی اب کے کیسا سڑا چاند نکلا ہے۔

سو ایسے ہی ضعف اپنے اندر ہیں مگر اسلام کے سر چپکتے ہیں اسلام کی حقیقت تو عقائد اور دیانات، معاملات، معاشرت اعمال ہے ان احکام میں کیا ضعف آ گیا۔ اس میں ضعف خلط مبحث سے ہوتا ہے سو اسلام اس سے بالکل محفوظ ہے۔ حق و باطل تمام تر متمیز ہے۔ اسلام آئینہ کی طرح صاف ہے اس میں میل کا نام نہیں۔ دیکھئے جتنی کتابیں ہیں سب میں تحریف ہے لیکن قرآن پاک ہے کہ اس میں ایک نقطہ کا بھی رد و بدل نہیں ہوا اور نہ ہو سکے گا **انا له لحافظون** (اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) ارشاد ہے اور دیکھو کہ قرآن پاک کے لاکھوں کروڑوں حافظ ہیں۔ اگر ایک بڑے سے بڑا مولوی غلطی کرے تو ایک بچہ روک سکتا ہے۔ یہ کیفیت ہے کتاب اللہ کی۔ اور ہر دین کی خدمت کتابوں اور ان کتابوں کی حاملین سے ہوتی ہے اسلام کی تمام تعلیمی مدون ہیں اور اہل حق ہمیشہ رہیں گے۔

روحی طاقت

چنانچہ حضورؐ کا وعدہ ہے: **لایزال طائفة من امتی منصورین علی الحق لایضرهم من خذلهم** (سنن ابن ماجۃ: ۱۰ بلفظ ظاہرین)

(میری امت میں سے ہمیشہ ایک جماعت دین حق کی نصرت کرنے والی رہے جو ان کی مخالفت کرے گا ان کو نقصان نہ پہنچا سکے گا)

اب اس کے بعد بتاؤ کہ اسلام میں ضعف کہاں ہے۔ البتہ اہل اسلام میں بے شک ضعف ہے جس کی مثال بعینہ یہ ہے کہ کھانا اچھا عمدہ موجود ہے لیکن کھانے والا بیمار ہے کہ برا معلوم ہوتا ہے یا کھانے والے کو صفرا ہوا ہے کہ کڑوا معلوم ہوتا ہے تو اب شرابی کھانے میں ہے یا کھانے والے میں؟ اسی طرح مسلمان ضعیف ہے یا اسلام ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست　　　خم وخم خانہ با مہر و نشانست

ابھی وہ ابر رحمت موتی بکھیر رہا ہے خم وخم خانہ بارونق ہے۔

یہ تو قوت اسلام کی لمی دلیل تھی اور اسلام کے مضبوط ہونے کی دلیل انی یہ ہے کہ جو شخص اس کو اختیار کرے وہ کمزور نہیں رہتا۔ تو اگر دین میں یہ اثر نہیں تو یہ قوت کہاں سے آئی۔ اگر لاٹھی مضبوط نہ ہو انسان بے خوف نہیں چل سکتا اور اگر لاٹھی مضبوط ہو تو انسان بے خوف وخطر چلا جاتا ہے اسلام میں اگر طاقت نہ ہو تو انسان خوف کرے لیکن اسلام کی طاقت تو روز بروز ترقی پر رہتی ہے۔ اس لئے معلم کامل کی حالت پیرانہ سالی میں یہ رہتی ہے۔

خود قوی تر مے شود خمر کہن　　　خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

پرانی شراب تیز ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور فرماتے ہیں۔

ہر چند پیر وخستہ وبس ناتواں شدم　　　ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ باوجود ضعف کے جب کچھ بیان فرماتے تھے تو بہت بلند آواز سے فرماتے تھے اور گھنٹوں بیان کرتے تھے حالانکہ بعد میں آہ آہ کرنے لگتے تھے میری موجودگی میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی عمر سو سال سے زیادہ تھی۔ ایک مرتبہ فجر کے وقت خوب سردی کے زمانہ میں خادم سے کہا کہ غسل خانہ میں گھڑا رکھ دے مجھے کچھ شبہ معلوم ہوتا ہے پھر کھلے غسل خانہ میں کھڑے ہو کر نہائے اور خود آ کر امامت کی تو اس عمر میں اول تو شبہ ہی مستبعد ہے دوسرے ایسا موقع میں نہانا پھر امامت کرنا سب باتیں طاقت کی علامت ہیں۔ گو یہ ضروری نہیں کہ جسمی قوت بھی ہو مگر روحی طاقت تو ضرور ہوتی ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ روحی اثر جسمی طاقت کو بھی تا دیر قائم رکھتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے بزرگ باہمت ہوتے ہیں ان میں ضعف اور بودا پن نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق میں بڑی قوت ہے۔

چراغ خداوندی

بعض لوگ اسلام کی مثال بیوہ عورت سے دیتے ہیں کہ اس وقت اس کا کوئی اعانت کرنے والا نہیں ہے بالکل غریب ومحتاج ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم اسلام محتاج

نہیں اور نہ کسی شخص کا اسلام کی خدمت سے اسلام پر احسان ہے۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشت

اگر تم سلطان کی خدمت کرتے ہو تو تم کو احسان نہ رکھنا چاہئے بلکہ خود سلطان کا احسان ماننا چاہئے کہ تم کو خدمت میں رکھا۔

اسلام کا احسان ہے کہ تم کو خادم بنایا۔ اسلام کسی ذات کے وجود و عدم پر موقوف نہیں۔ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا۔ حضورؐ کے تشریف لے جانے سے اسلام کا نشان تک نہ رہتا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور برکات حضور کی اب تک موجود ہیں تو معلوم ہوا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف بری سے اسلام میں کچھ تذبذب نہ آیا تو اور کسی شخص کے معدوم ہو جانے سے اسلام پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور جس کو زعم ہو وہ چھوڑ کر دیکھ لے۔

بعض لوگ چندہ دے کر احسان رکھا کرتے ہیں وہ چندہ موقوف کر کے دیکھ لیں کہ خدا کا کام انجام پذیر ہوتا ہے یا نہیں ہاں ہم اس کے ذمہ دار نہیں کہ وہ کام اسی جگہ انجام پذیر ہو۔ یہاں نہیں اور جگہ ہوگا مگر ہوگا ضرور دیکھو گورنمنٹ کے محکمے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ بالکلیہ ہی معدوم ہو جائیں دوسری جگہ قائم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پولیس کا محکمہ کہ ایک گاؤں سے توڑا جاتا ہے مگر دوسری پولیس سے اس گاؤں کا انتظام متعلق ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ بستی کا مدرسہ تو ٹوٹ گیا تو بھائی دوسری جگہ کے مدرسہ سے اس بستی کی تعلیم کا انتظام ہو گیا۔ انعدام نہیں ہوا۔ انتقال ہوا ہے جیسے سرکاری محکمہ جات منتقل ہوتے رہتے ہیں اسی طرح خداوندی محکمے بھی منتقل ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ دین کا چراغ بجھ نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ روشن رہتا ہے۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

اگر ساری زمین میں آندھیاں آ جائیں تو بھی اہل اللہ کا چراغ گل نہیں ہو سکتا۔

البتہ ایسا ہوتا ہے کہ باد مخالف کے جھونکے کی وجہ سے یا کسی ناقدری کی وجہ سے کہ اس کے گل کرنے کی فکر میں لگ گئے اس طاق میں سے دوسرے طاق میں رکھ دیا جاتا ہے اور تبدیل طاق میں چراغ کی کوئی مصلحت نہیں اسی جگہ کے لوگوں کی مصلحت سے ایسا کیا گیا یہ روشنی سے محروم نہ ہوں یا اس وجہ سے کہ مبادا یہ نادان اپنے ہاتھ پیر نہ جلالیں۔

ایک مرتبہ بچپن میں میں اور میرے ایک عزیز کہ وہ بھی بچے تھے گھر میں شرارت

کرنے لگے۔ اور چراغ کو پھونک مار کر گل کرنے لگے گھر والوں نے اس کو ایسی جگہ رکھ دیا کہ پھونک نہ پہنچ سکے ہم نے ٹوپی اچھالنا شروع کر دی انہوں نے اور اونچا رکھ دیا۔

تو مقصود یہ ہے کہ بے قدری کرنے کی بدولت ان سرکشی کرنے والوں سے چراغ دور ہو جاتا ہے بجھتا نہیں بعض بزرگوں کی کرامت منقول ہے کہ آندھی سے ان کا چراغ نہیں بجھتا تو اللہ تعالیٰ کے چراغ کو کون بجھا سکتا ہے۔

چراغے را کہ ایزد برفروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

جس چراغ کو اللہ تعالیٰ نے روشن کیا اس کو گل کرنے کے لئے جو پھونک مارے گا اس کی ڈاڑھی جل جائے گی۔

اس ریشش بسوزد (اس کی ڈاڑھی جل جائیگی) پر مجھ کو لطیفہ کے طور پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک احمق نے کسی کتاب میں دیکھا کہ جس شخص کی ڈاڑھی لمبی اور سر چھوٹا ہو وہ بیوقوف ہوتا ہے آپ کو شبہ ہوا آئینہ میں چہرہ مبارک ملاحظہ فرمایا اپنی صورت پر حماقت کی علامت کو منطبق پایا۔ آپ کو درستی کی فکر ہوئی قینچی وغیرہ تلاش کی کچھ نہ ملا۔ مجبور ہو کر ڈاڑھی کو چراغ کے سامنے کر دیا کیونکہ سر کو بڑا کر نہیں سکتے تھے ڈاڑھی کو چھوٹا کرنے لگے جتنی ڈاڑھی باقی رکھنی تھی اس کو مٹھی میں لے لیا باقی کو جلانے کے واسطے چراغ پر رکھنا چاہا تھا کہ آگ کی لپیٹ سے ہاتھ علیحدہ ہو گیا اور ڈاڑھی کا صفایا ہو گیا۔

احمق تھا نا علامت کو علت سمجھا کہ رفع علت مستلزم ہے رفع معلول کو دوسری بے عقلی یہ کی کہ اس قدر عجلت سے کام لیا خیر بعد میں مقر ہوئے کہ واقعی کتاب میں سچ لکھا ہے میں ضرور احمق ہوں۔ ہاں اس ڈاڑھی کے جلنے کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ اتنی سمجھ فوراً آ گئی کہ میں احمق ہوں۔ علامت کے دفع ہوتے ہی حماقت معلوم ہو گئی اسی طرح چراغ خداوندی کو بجھانے والے کی ریش جل جاتی ہے۔

تو مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی مصلحت کی وجہ سے مقام تبدیل فرماتے ہیں اسی راز کو محقق مشائخ کسی خلیفہ کو سجادہ نشین نہیں بناتے بلکہ جو شخص کسی جگہ ہو اس مقام کو حاصل کر لے وہی سجادہ نشین ہے اور اس سجادہ پر بیٹھنے سے صاحب مقام تھوڑا ہی بنتا ہے وہ تو مقام باطن ہے خواہ ہرات میں ہو خواہ کوفہ بصرہ میں۔

حقیقی مقام

ایک خوب لطیفہ یاد آیا ایک صاحب علم کو حضرت حاجی صاحب نے اپنے پاس بیٹھنے کو فرمایا وہ تواضع کرنے لگے کہنے لگے

ولاتا بزرگی نیاری بدست   بجائے بزرگاں بناید نشست
(جب تک بزرگی نہ آجائے بزرگوں کی جگہ بیٹھنا چاہئے)

فرمایا جائے بزرگاں سے مراد یہ حسی جگہ نہیں اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ان سے مساوات کا دعویٰ نہ کرے اور جگہ میں کیا رکھا ہے اور اگر جائے بزرگاں سے یہی مقام مراد ہے تو پھر اس میں تفصیل ہے کسی ظریف نے تو بلا تفصیل اس کی جگہ یہ کہا ہے۔

بجائے بزرگاں بباید نشست   کہ شاید بزرگی بیاید بدست
(بزرگوں کی جگہ پر ضرور بیٹھنا چاہئے کہ شاید بزرگی مل جائے)

خیر یہ تو شاعری ہے مگر اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بزرگ کہیں تو بیٹھ جائے ورنہ نہ بیٹھے کیونکہ بے ادبی ہے جب کہ وہ جگہ انہی کے ساتھ مخصوص ہو جیسے تکیہ مسند ورنہ بغیر کہے بھی کچھ حرج نہیں۔

مولانا رفیع الدین صاحب دیوبند میں چارپائی پر پائنتی کی جانب بیٹھے تھے میں حاضر ہوا تو سرہانے بٹھانے لگے میں نے عذر کیا تو مولانا نے فرمایا کہ کہنے کے بعد انکار نہیں کرنا چاہئے اور اس کی تائید میں یہ حکایت بیان فرمائی (یا شاید میں نے کسی اور سے سنی ہے کچھ شک ہو گیا ہے) کہ دارا شکوہ اور عالمگیر میں اختلاف تھا اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ تخت وتاج میرے قبضہ میں ہو اور اس کی مختلف تدابیر میں مصروف رہتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ دارا شکوہ کو ایک صاحب حال درویش کا پتہ لگا۔ اس کی خدمت میں جا کر مؤدب کھڑا ہو گیا اس نے اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں بیٹھنے کو کہا دارا شکوہ نے ادب کے سبب عذر کر دیا کیونکہ یہ درویشوں کے بے حد معتقد تھے خیر وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے پھر دارا شکوہ نے تخت کے واسطے کہا درویش صاحب نے فرمایا میں تو تخت پر بٹھلاتا تھا مگر تو نے انکار ہی کر دیا بہت افسوس ہوا اور اس نے کسی سے نہیں کہا کہیں عالمگیر کو خبر نہ ہو جائے۔

پھران صاحب حال کا عالمگیر کو پتہ چلا دارا شکوہ تو جاہل تھے اور عالمگیر عالم تھے گو دارا شکوہ کتابی علم رکھتا تھا مگر اس کی حقیقت صرف زبان دانی ہے زبان دانی دوسری چیز ہے اور علم دوسری چیز زبان دان تو سب سے زیادہ عرب میں ابو جہل تھا (ابن جہل بھی نہیں) غرض جب عالمگیر ان کے پاس پہنچے تو وہ تعظیم کو کھڑے ہو گئے اور اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں سے بھی بیٹھنے کو کہا یہ بے تکلف جا کر بیٹھ گئے اور کہا کہ تخت وتاج دلوایئے فرمایا تخت پر تو تم بیٹھے ہی ہو اور تاج میرے قبضہ میں نہیں ہے پوچھا وہ کس کے متعلق ہے کہا وہ تمہارے فلاں خدمت گار کے قبضہ میں ہے وہ اگر تمہارے سر پر ٹوپی یا عمامہ رکھ دے تو بس تاج مل گیا دیکھئے ایک خدمتگار کو تاج بخشی کی طاقت حاصل تھی۔

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم　　شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند
گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم
خاکساران جہاں را بحقارت منگر　　تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

گدایان عشق کو حقیر نہ سمجھو کہ یہ لوگ بے تاج و تخت اور پٹکے کے بادشاہ ہیں۔ میں عشق ومعرفت کے کوچہ کا گدا ہوں لیکن مستی کے وقت دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں۔ خاکسار لوگوں کو حقارت کی نظر سے مت دیکھو کہ ان میں کوئی اہل دل صاحب حال ہو۔

انہوں نے اس خدمت گار کا نام وغیرہ پورا پتہ بتا دیا۔ پھر مکان پر واپس آ کر اس خدمت گار کو بلایا اسی آن بان سے اور اسی صولت وشکوت سے جب وہ آیا کہا وضو کے واسطے پانی لاؤ زبردستی وضو کرنا شروع کر دیا نہ وقت تھا نہ ضرورت تھی عمامہ اتار کر علیحدہ کر دیا پھر تولیہ منگایا اس کے بعد کہا ہمارے سر پر یہ عمامہ رکھ دو اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا میری کیا مجال عمامہ کو ہاتھ لگاؤں اس نے ڈانٹ پلائی کہ نہیں جو ہم حکم دیتے ہیں کرنا پڑے گا۔ جناب زبردستی اس سے تاج لے لیا اور بیچارہ عمامہ رکھ کر اس فقیر کو کوستا ہوا چلا گیا کہ خدا اس فقیر کا ناس کرے جس نے مجھے رسوا کیا۔

یہ مضمون استطرادا اس شعر کی تفسیر پر آ گیا تھا۔

بجائے بزرگاں بناید نشست

اصل مضمون یہ تھا کہ جو شخص خدمت دین میں خلیفہ ہوتا ہے وہ حقیقی مقام نشین ہوتا ہے اس کو گدی سے بلکہ گدھے سے تعلق نہیں ہوتا۔ آج کل تو سجادہ نشینی کی محض رسم رہ گئی ہے بزرگی

وغیرہ سب رخصت ہوگئی فقط دو کا ندار باقی ہے بعض نابالغ بچے بھی سجادہ نشین کیے جاتے ہیں اور سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ مریدین (دس تار) دستار باندھ کر سجادنشین بناتے ہیں حالانکہ وہاں ایک تار بھی نہیں ہوتا مگر ہے یہ اچھی بزرگی کہ مریدین سے حاصل ہوتی ہے۔

ضرورت توکل

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے دین کو کسی خادم کی ضرورت نہیں۔ جس خادم کو شرف حاصل کرنا ہو وہ اپنی غرض سے اس کی خدمت کرے۔ اب وہی ظاہری اعانت اور اس کا دخل اس کے بقاء میں تو اس کا امتحان کرلو اور دنیا بند کر کے دیکھو۔ معلوم ہو جائے گا کہ کسی پر تو دارومدار نہیں ہے۔ تو اہل مدرسہ کو بھی چاہیے کہ استغناء سے کام لیں۔

اجملوا فی الطلب و توکلوا علیه (الدرالمنثور للسیوطی ۳ ۳۵۱)

(طلب میں کوشش کرو اور اللہ پر توکل کرو)

بڑے پیانہ پر کام نہ سہی مختصر ہی تجویز کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مدرسہ وطلبہ اہل دنیا کی نظروں میں حقیر نہ ہوں گے۔ جیسے آج کل حقارت کا مرض وباء عام کی طرح پھیل رہا ہے۔

ایک تحصیلدار صاحب کے یہاں ایک طالب علم مدرسہ کا کھانا لینے جایا کرتے اور انتظار میں بہت بیٹھنا پڑتا ایک دفعہ انہوں نے تحصیلدار صاحب سے کہا کہ آپ کا لڑکا بہت کھیلا کرتا ہے۔ کہئے تو میں یہاں بیٹھنے کے وقت اس کو کچھ عربی پڑھا دیا کروں۔ فرمایا مولانا عربی پڑھنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ تو آپ نے عربی پڑھی تو میرے دروازہ پر روٹی مانگنے آئے یہ عربی پڑھے گا تو آپ کے دروازہ پر مانگنے جائے گا۔

دیکھئے یہ نتیجہ ہوتا ہے امراء کے دروازہ پر جانے کا۔ دین کی عظمت کا مقتضاء تو یہ تھا کہ اس کے بعد سے وہاں نہ جاتے اور انکار کردیتے اور خدا پر توکل کر کے بیٹھ رہتے۔

ہیں توکل کن ملرزاں پاؤ دست   رزق تو زتو عاشق تراست

(بغیر مکھی کے ہرگز مکڑی نہیں رہتی رزق کیلئے روزی دینے والا پر بھی دیتا ہے)

کسی حکیم نے کہا ہے

بے مگس ہرگز نماند عنکبوت   رزق را روزی رساں پر می دہد

(عقلمند شخص کے دل پر افسوس ہے کہ وہ رزق کے معاملہ میں تشویش رکھتا ہے)

کہ رزق کے پر لگا دیئے جاتے ہیں اور بغیر طلب کے ملتا ہے۔

حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

افسوس ایک دو نان کے واسطے دو نان کی طرح ذلت اٹھائی جائے۔

بئس المطاعم حین الذل تکسبها فالقدر منتصب و القدر مخفوض

قدر کے معنی ہانڈی کے ہیں اور قدر آبرو کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے مطاعم سے ہانڈی تو بلند ہوتی ہے لیکن آبرو گھٹ جاتی ہے۔ تو چندہ کے لئے کسی کے درپے مت ہو۔ خطاب خصوصیت سے بالکل دست بردار ہو جاؤ۔ ضروریات مدرسہ کا صرف اعلان کر دو۔ چلنا پھرنا چھوڑ دو۔ ایک جگہ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ بس اگر چندہ زیادہ ہو کام زیادہ کرو۔ اگر چندہ کم ہو کام کم کرو چندہ ختم ہو جائے کام ختم کرو ذرا ہمت کر کے تھوڑے دنوں اس پر عمل کرو۔ دیکھو تو خود بخود چندہ آنے لگے گا۔ جیسا مستغنی عن الدنیا کے لئے وعدہ نبویؐ ہے اتته الدنیا و هی راغمة (ان کے پاس دنیا خود خواہشمند بن کر آتی ہے)

مولانا محمد یعقوب صاحب اس پر فرماتے تھے کہ ہم نے اس کا منظر حضرت مولانا قاسم صاحب کے یہاں دیکھا ہے کہ بڑے بڑے امراء وعہدہ دار ڈپٹی کلکٹر وغیرہ خدمت میں آیا کرتے تھے اور مولانا حجرہ میں ہوتے تو ان کے انتظار میں حجرہ کے باہر ٹوٹے پھوٹے گرد آلود بوریہ پر بیٹھے رہتے۔ تو اہل استغناء کی حالت ہے اور جو لوگ مانگا کرتے ہیں لوگ ان کے آنے سے گھبراتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ بس اب چندہ مانگیں گے۔ ان سے پوشیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ جس قدر کام اغراض دین کی حفاظت رکھتے ہوئے کر سکتے ہو وہ کام کرو۔ زیادہ فکر میں مبتلا نہ ہو۔ کیونکہ یہ تو سرکاری محکمہ ہے اس میں تبدل اور عزل سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ اس کو روزی کا وسیلہ سمجھنا خواہ مخواہ موجب شبہ ہوتا ہے اگر تم حق پر ہو تو خود سب کو جذب کرے گا۔ تم کو کسی کے در پر جانے کی حاجت نہ ہوگی اور یہی ہے حبل اللہ یعنی دین کی قوت جو سب کو اپنی جانب کھینچتی ہے بس اب تم خدا کے ہو جاؤ خدا خود سامان کر لے گا اور اسی پر توکل کرو۔ ورنہ سمجھا جائے گا کہ تم خدا کے معتقد نہیں اور تمہاری مثال اس حکایت کی طرح ہو جائے گی۔

ایک مولوی صاحب بسم اللہ کے فضائل بیان کر رہے تھے کہ جو کام بسم اللہ پڑھ کے کیا

جائے اس میں ایسی برکت ہوتی ہے وہ خوب اچھا ہوتا ہے ایک گھسیارہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اچھا ہوا یہ نسخہ ہاتھ لگا روز دریا سے پار اترنے کا پیسہ دینا پڑتا ہے اب پیسہ روز بچے گا۔ چنانچہ وہ پانی میں سے بسم اللہ پڑھ کے پار ہو جاتا تھا اور کسی قسم کا خطرہ نہ ہوتا تھا۔ اس نے ان مولوی صاحب کی دعوت کی کہ جن کی بدولت یہ دولت ملی ان کی دعوت تو کرنا چاہیے۔ جب مکان کی طرف لے چلا تو راستہ میں دریا آیا۔ مولوی صاحب رک گئے۔ اس نے کہا مولوی صاحب چلو۔ مولوی صاحب نے فرمایا کشتی تو ہے نہیں کیسے چلوں۔ اس نے کہا جی بسم اللہ پڑھ کر چلئے اس دن آپ ہی نے تو وعظ میں مجھے نسخہ بتایا تھا۔ جب اس پر بھی مولوی صاحب کی ہمت نہ ہوئی تو اس نے کہا چلئے میں آپ کو لے چلوں۔ چنانچہ مولوی صاحب کا بھی اس نے ہاتھ پکڑ کر پار کر دیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا بھائی تو عامل ہے اور میں صرف عالم ہوں۔

تو ایسے ہی ہم لوگ بتلاتے تو ہیں مگر ہمارے قلوب میں عظمت نہیں ہے جب تم ہی اپنے عقائد پر مستقیم نہ رہو گے تو دوسرے کو کیا بلاؤ گے مگر خیر پھر بھی نہ بلانے سے بلانا اچھا ہے۔

حبل اللہ

یہ وہ حبل اللہ ہے کہ جو شخص اس حبل اللہ کے ساتھ تمسک کرتا ہے اس کے بارہ میں ارشاد ہے۔

فقد استمسک بالعروة الوثقیٰ لاانفصام لها

پس اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا۔

کہ اس کا تعلق قرب قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد بھی منقطع نہیں ہوتا بہر حال ضعف اسلام میں نہیں۔ صرف اہل اسلام میں ہے۔ ان اہل اسلام کی تقویت کے واسطے یہ ارشاد فرمایا ہے ولا تفرقوا کہ آپس میں تفرقہ اندازی نہ کرو اور اب دیر ہو جانے کے سبب میں ترجمہ کر کے اس مضمون کو ختم کئے دیتا ہوں۔

واذکروا نعمة اللہ علیکم اور تم حق تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ **اذ کنتم اعداء** جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ **فالف بین قلوبکم** تو تمہارے قلوب میں حق تعالیٰ نے محبت والفت کا تخم بو دیا۔ **فاصبحتم بنعمته اخوانا**۔ تو تم اس کے احسان سے بھائیوں جیسی محبت کرنے لگے **وکنتم علی شفا حفرة من النار**۔ تو تم قعر جہنم کے کنارہ پر پہنچ چکے تھے فقط اس میں گرنے کی دیر تھی۔ **فانقذکم منها** تم کو حق تعالیٰ نے اس سے نجات

دی۔ **کذالک یبین اللہ لکم آیاتہ لعلکم تھتدون**۔ حق تعالیٰ تم کو کھلی کھلی علامتیں دکھاتا ہے تاکہ تم راہ راست پر آ جاؤ **ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر** یعنی ایک جماعت تم میں سے ایسی ہونا چاہئے جو داعی الی الخیر ہو۔ یعنی جو دین کی بقاء میں کوشاں ہو اور شرعی امور اور دینی معاملات کا انتظام کرے۔ اور **امۃ منکم** اس لئے فرمایا کہ اگر سب یہی کرنے لگیں تو کھیتی کون کرے گا اور نوکری تجارت وغیرہ کون کرے گا۔ یہ شریعت کا انتظام ہے کہ زراعت تجارت وغیرہ تو فرض کفایہ کیا ہے۔ اگر سب چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں کیونکہ مجموعہ کو اسباب معیشت کی بھی حاجت ہے ورنہ سب ہلاک ہو جائیں اور نہ دنیا رہے نہ دین اور جو لوگ تارک اسباب ہیں ان کی جمعیت و توکل بھی مباشرین اسباب ہی کی بدولت ہے گو ان کے احاد کی تعیین نہیں مگر مجموعہ میں ایسے احاد کا ہونا ضروری ہے خصوص ہم جیسے ضعفاء کے لئے تو اگر ظاہری سامان نہ ہو تو تشویش سے دین ہی میں خلل پڑنے لگے۔

ایک ظریف درویش کی مجلس میں کسی نے دعا دی کہ ایمان کی سلامتی اور عاقبت بخیر نصیب ہو۔ درویش کہنے لگے اس کے معنی بھی جانتے ہو لوگوں نے کہا ترجمہ سے زیادہ تو معلوم نہیں۔ انہوں نے ظرافت سے کہا کہ سلامتی تو یہ ہے کہ روٹی اچھی مل جائے اور عاقبت بخیر یہ ہے کہ پاخانہ کھل کے ہو جائے۔

جب تک آرام سے بسر ہوتی ہے تب ہی تک ہمارا سب دینداری تقویٰ طہارت ہے۔ جو لوگ کماتے ہیں ان ہی کی برکت سے یہ رتبہ حاصل ہے جن کو تم تحقیراً سگان دنیا کہا کرتے ہو حالانکہ تم سوتیلان دنیا ہو۔ یعنی وہ دنیا کے سگے ہیں اور تم سوتیلے ہو۔

اس پر حکایت یاد آئی کہ چھوٹے بچے سے کسی نے پوچھا کہ فلاں شخص تمہارے سگے بھائی ہیں کہا سگے نہ کہیے سگ تو کتے کو کہتے ہیں۔ حقیقی بھائی کہیے۔

حاصل یہ ہے کہ دنیا سے سب کو تعلق ہے کوئی سگا ہے کوئی سوتیلا اور مطلق مذموم بھی نہیں کیونکہ دنیا مطلقاً بری نہیں ہے بلکہ دنیا جو معصیت ہے صرف وہ بری ہے اس لئے باری تعالیٰ نے **ولتکن** فرمایا **کونوا** نہیں فرمایا۔ جیسا کہ اوپر **واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً** فرمایا۔ اس لئے مقصود تو یہ ہے کہ دین تو سب میں ہو لیکن ایک ایسی ہی جماعت ہو جو مولویت ہی کا کام کریں اور کچھ دوسرا کام نہ کریں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا جو لوگ مولوی لوگوں کو الزام دیتے ہیں کہ یہ لوگ ترقی نہیں کرتے غلط ہے کیونکہ اہل علم کی ترقی یہ ہے کہ علم میں کمال پیدا کریں اگر وہ تجارت میں مشغول ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ علم ضائع ہو جائے گا جس کی بقاء کی ضرورت آیت ولتکن منکم بتلا رہی ہے۔ جیسے کہ اہل تجارت اگر تبحر علمی میں مشغول ہوں تو تجارت ضائع ہو جائے۔

اب رہا مولویوں کے کھانے کا سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب فرماتے ہیں۔

وامر اهلک بالصلوٰة واصطبر علیها لانسالک رزقا نحن نرزقک والعاقبة للتقویٰ

غرض ایک جماعت وعظ وتدریس وغیرہ کے واسطے ضرور وقف ہونی چاہئے اور اس کو رزق حق تعالیٰ دیں گے۔

مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ میرا ایک بھتیجا جو بہت ذکی ہے بالکل بچہ تھا۔ میں نے اسکو بلایا اور پوچھا کہ بتلاؤ عربی اچھی ہے یا انگریزی۔ کہنے لگا عربی اچھی میں نے کہا کہ عربی کیوں اچھی۔ کہا کیونکہ قرآن شریف عربی میں ہے۔ میں نے پوچھا لیکن عربی پڑھ کے کھائے کہاں سے اسے سن کر نہایت سنبھل کر جواب دیا جو میں اسی کے لفظوں میں نقل کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور جب خدا تعالیٰ کا ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالتا ہے کہ اسے دو۔ وہ دیتے ہیں اور کھاتے ہیں میں نے کہا یہ بھی ٹھیک ہے لیکن لوگ ایسے شخص کو ذلیل سمجھتے ہیں کہنے لگا ذلت تو جب ہوتی ہے کہ وہ کسی سے مانگتا۔ وہ مانگتا کب ہے لوگ تو ہاتھ جوڑ کر دیتے ہیں میں اس کا حیرت سے منہ تکتا تھا کہ اس عمر میں اور یہ سمجھ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ سعادت بازو کی طاقت سے حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک اللہ تعالیٰ نہ بخشے بخشنے والا

وہ اگرچہ آج کل انگریزی پڑھتا ہے لیکن اس میں اب تک دین کا غلبہ ہے۔ چنانچہ کبھی وہ پاس ہوتا ہے تو سکول سے آ کر مجھ سے دین کی باتیں پوچھا کرتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ ایسے لوگ دین کا کام کریں لیکن آج کل انتخاب غلط ہے جو فہم و ذکا کے سبب عربی کے قابل ہوتا ہے اسے انگریزی پڑھواتے ہیں اور جو احمق سمجھا جاتا ہے اس کو عربی پڑھاتے ہیں غرض ہر کام الٹا۔

میں نے یہ حکایت اس سوال کے جواب میں بیان کی ہے کہ کھائیں گے کہاں سے اور یہ امور صرف دلائل ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں غور کر کے دیکھو کہ کیسی سہولتیں ہوتی ہیں اور کسی کا احسان نہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ ہاتھ جوڑتے ہیں اور نہیں لیتے تو دل شکنی ہوتی ہے۔

مولانا فتح محمد صاحب کیرانہ میں تھے۔ ایک طالب علم مثنوی شریف پڑھنے آیا۔ آپ نے پوچھا کہ روٹی کہاں سے کھائے گا۔ اس نے کہا اللہ تعالیٰ روٹی دے گا ورنہ جان لے لے گا۔ آپ نے فرمایا بیشک بھائی تو پڑھ لے گا چنانچہ اسی وقت پڑھانا شروع کردیا اور اس کی اسی روز سے دعوتیں ہونا شروع ہوگئیں۔ کئی مہینے کیرانہ میں رہا برابر دعوتیں کھاتا رہا اور اگر کوئی خوشی سے اہل دین کی خدمت نہ کرے تو مالک الملک اسباب ایسے مسلط کردیتے ہیں کہ جھک مار کر خدمت کرنی پڑتی ہے۔

چنانچہ مولانا فتح محمد صاحب ہی نے حکایت بیان کی کہ پانی پت میں ایک طالب علم قاری عبدالرحمٰن صاحب کے پاس قرات سیکھنے گئے وہاں اہل محلہ نے کھانے کا انتظام نہیں کیا۔ اتفاقاً ایک آدمی مرگیا اور وہاں قاعدہ تھا کہ مردہ کے گھر سے چالیس دن تک کسی محتاج کو کھانا کھلایا جاتا تھا بس ان کا کھانا مقرر ہوگیا۔ چالیس دن پورے نہ ہوئے تھے کہ دوسرا مرگیا اور اس کے چلہ کے بعد تیسرا کھسکا۔ قاری صاحب نے فرمایا یہ سب محلّہ کو کھا جائے گا ورنہ اس کا کھانا مقرر کردو۔ چنانچہ کھانا مقرر کردیا گیا۔

حاصل یہ کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم سے ایک ایسی جماعت ہو اور پھر اس سے دوسری شاخیں پھیلیں۔ وعظ کی شاخ درس کی شاخ تصنیف کی شاخ تربیت باطن کی شاخ وغیرہ وغیرہ آگے اس جماعت کی اور صفات ارشاد ہیں **ویامرون بالمعروف** کہ اچھے کاموں کا حکم بتائیں **وینھون عن المنکر** اور برے کاموں سے روکیں۔ **واولیک ھم المفلحون** یہی لوگ سعادت اور فلاح حاصل کرتے ہیں۔ **ولاتکونوا کالذین تفرقوا**۔ سبحان اللہ کیا قرآن پاک کی بلاغت ہے اوپر تو خود تفرق سے نفی فرمائی اب یہاں ارشاد ہے کہ تفرق کی مشابہت بھی نہ کرو کیونکہ مشابہت کرنے سے تم متفرقین کی طرح بن جاؤ گے چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے

من تشبه بقوم فهو منهم (سنن ابی داؤد ۴۰۳۱، مسند احمد ۲ ۵۰، ۹۲)

(جس شخص نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان میں سے ہے)

گو بعض لوگوں نے اس حدیث کی تضعیف کی ہے لیکن آیت تو ضعیف نہیں۔ خوب سمجھ لو آیت کے معنی یہ ہوگئے کہ **لاتکونوا کالکفار** کیونکہ **الذین تفرقوا** کا مصداق کفار ہی ہیں اور یہ ممانعت اعمال میں تھی جو ہر وقت مشاہد بھی نہیں اور جو امور ہر وقت مشاہد بھی ہیں (اور جو امور ہر وقت ظاہر رہتے ہیں) جیسے لباس وغیرہ تو ان میں مشابہت کیسے جائز ہو سکتی ہے۔

اب میں پھر ترجمہ شروع کرتا ہوں **واختلفوا من بعد ماجاء ھم البینات** اور انہوں نے کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد باہم اختلاف کیا تھا **واولئک لھم عذاب عظیم** اور یہ ایسے لوگوں کے واسطے بہت بڑا عذاب ہے **یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ** یہ عذاب اس دن ہوگا جس میں بہت سے چہرے سیاہ ہو جاویں گے بہت سے سپید ہو جاویں گے۔ **فاما الذین اسودت وجوھھم اکفرتم بعد ایمانکم**۔ سیاہ چہرہ والوں سے خطاب ہوگا۔ کیا تم ایمان کے بعد کافر ہوگئے اور ایمان سے مراد ایمان فطری ہے جس کی بابت ارشاد ہے (کل مولود یولد علی الفطرۃ) **فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون**۔ تو اب تم اپنے کفر کے عوض میں عذاب بھگتو۔ **واما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمۃ اللہ ھم فیھا خالدون**۔ اور سپید چہرے والے اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوں گے اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان آیات میں مسلمانوں کے واسطے اتفاق کی تعلیم ہے کہ دین کے واسطے ہو اور علماء کی اتباع کے ساتھ ہو کیونکہ اگر عوام علماء کا اتباع نہ کریں تو پھر کوئی دوسری صورت ہی نہیں۔ پس مسلمانوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک خواص اور ایک عوام دین پر قائم رہنا واجب مشترک ہے اس کے بعد عوام کے ذمہ یہ ہے کہ علماء کی تعلیم کے موافق عمل کریں اور خواص کی خدمت یہ ہے کہ ان کو بتائیں۔

اب بفضلہ سب ضروری اجزاء بیان ہوگئے میں نے کلی مضامین بیان کر دیئے تاکہ جزئیت پر منطبق کر لیا جائے ورنہ جزئیات تو کتابوں میں موجود ہیں نیز کلیات کے بعد جزئیت کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے اب میں دعا کرتا ہوں سب صاحب دعا فرمایئے۔

الیسر مع العسر

ضد نے بھی ضد میں مدد ملنے کے متعلق یہ وعظ ۱۱ شعبان ۱۳۴۱ھ کو بعد نماز جمعہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو اڑھائی گھنٹوں میں ختم ہوا حاضرین ۵۰/۶۰ کے قریب تھے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمد و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمد اعبدہ و رسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ و علی الہ واصحابہ و بارک وسلم۔ اما بعدفاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم فان مع العسر یسراً (الانشراح۰۵-۶) ان مع العسر یسراً وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نتصف شعبان فلا صوم الاعن رمضان (سنن ابی دائود، ۲۳۳۷، مشکوۃ المصابیح: ۱۹۷۴) و قلت اخرجہ فی المقاصد الحسنۃ بلفظ فلاصوم حتی رمضان واعزہ الی احمد والدارمی والاربعۃ وقال صححہ ابن حبان وابوعنتہ وغیرھا والد نیوری فی المحاسبتہ کلھم من حدیث العلاء بن عبدالرحمٰن ابیہ عن ابی ھریرۃ مرفوعاً۔

ترجمہ آیت وحدیث

بیشک دشواری کے ساتھ آسانی ہے بیشک دشواری کے ساتھ آسانی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب نصف شعبان گزرجائے پھر نہ روزہ رکھے مگر رمضان ہی کا۔

تمہید

آج میں نے خلاف معمول آیت وحدیث دونوں کی تلاوت کی ہے۔ حالانکہ میرا ہمیشہ کا معمول یہ ہے کہ بیان کے لئے یا صرف آیت قرآن کی تلاوت کرتا ہوں یا صرف حدیث کی۔ مگر آج ایک ضرورت کی وجہ سے میں نے ایسا کیا ہے۔ وہ یہ کہ اول میرے ذہن میں ایک مضمون جزئی آیا تھا۔ اس کے مناسب یہ حدیث ذہن میں آئی پھر مضمون اول سے ایک دوسرے مضمون کلی کی طرف ذہن منتقل ہوا اس کے مناسب یہ آیت ذہن میں آئی پھر گو یہ ممکن تھا کہ میں صرف آیت پر اکتفا کرتا حدیث کی تلاوت نہ کرتا لیکن اس کو جی نہ چاہا کہ جو

چیز اولاً ذہن میں آئی تھی اس کو ترک کروں کیونکہ اس میں فی الجملہ اعراض کی سی صورت تھی۔ علاوہ ازیں احادیث نبویہ قرآن کے لئے بمنزلہ شرح کے ہیں۔ اس لئے حدیث کے ترک کو جی نہ چاہا بلکہ یہی صورت اچھی معلوم ہوئی کہ دونوں کی تلاوت کر دی جائے تاکہ حدیث سے آیت کی شرح ہو جائے لیکن تلاوت میں آیت کو مقدم رکھا گو اس کی طرف ذہن بعد میں منتقل ہوا تھا کیونکہ آیات قرآنیہ کا رتبہ احادیث سے بڑھا ہوا ہے۔ دوسرے وہ بمنزلہ متن کے ہیں اور احادیث بمنزلہ شرح کے اور متن شرح سے پہلے ہی ہوا کرتا ہے۔

الفاظ حدیث سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس وقت جو مضمون بیان ہو گا اس کا تعلق ماہ شعبان سے ہے لیکن آیت کا تعلق غالباً ابھی سمجھ میں نہ آیا ہو گا تو بات یہ ہے کہ اس وقت شعبان کے متعلق جو مضمون بیان کرنا ہے اس میں دو پہلو ہیں۔ ایک جزئیت کا دوسرا کلیت کا تو جزئیت کے طور پر اس مضمون کو حدیث سے تعلق ہے اور کلیت کے طور پر آیت سے تعلق ہے اس وقت اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے آگے تفصیل بھی معلوم ہو جائے گی۔ اب اس مضمون کو سمجھنا چاہئے اور مناسب یہ ہے کہ پہلے مضمون کلی کو بیان کر دیا جائے۔ کیونکہ اول تو کلی مقدم ہوتا ہے جزئی سے جزئیات کلی کے اندر مندرج ہوتی ہیں تو کلی کو معلوم کر لینے سے فی الجملہ جزئیات کا علم ہو جاتا ہے دوسرے وہ مضمون کلی آیت سے مستنبط ہے جس کو میں نے تلاوت میں مقدم کیا ہے اس لئے پہلے مضمون کلی ہی کا بیان مناسب ہے۔

بشریت وملکیت

تو سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا** جس کا ترجمہ یہ ہے کہ بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔ آگے مکرر تاکید ہے کہ بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے یہ سورہ الم نشرح کی آیت ہے اور وہ مکی سورت ہے اور مکہ میں حضور کو قسم قسم کی تکلیفیں پیش آتی تھیں جن کے متعلق حق تعالیٰ نے جابجا مکی سورتوں میں آپ کی تسلی فرمائی ہے منجملہ ان کے ایک سورت یہ بھی ہے جس میں آپ کی تسلی کی گئی ہے اور تکلیفوں کے بعد آسانی کی بشارت دی گئی ہے۔

ظاہر نظر میں تو مکہ میں آپ کو ایک تکلیف تھی وہ یہ کہ کفار کو آپؐ سے عداوت تھی وہ آپ کو زبانی اور جسمانی اذیتیں پہنچاتے تھے مگر نظر غائر میں آپ کی اصلی تکلیف روحانی تھی اور راز ان

سب تکلیفوں کا یہ تھا کہ آپؐ دو شانوں کے جامع تھے۔ بشریت و ملکیت جس میں حق تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ اگر آپؐ میں بشریت کے آثار نہ ہوتے تو آثار ملکیت کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھتے کہ آپؐ ملک بصورت بشر ہیں اور جو لوگ شرک کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ تو آپ کو الٰہ بصورت بشر سمجھتے۔

چنانچہ مشرکین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق تعالیٰ کے لئے حلول فی الاجسام کو جائز رکھتی ہے۔ یہ لوگ جب کسی انسان میں بشریت سے زیادہ آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں اس کو اوتار کہنے لگتے ہیں کہ خدا نے اس میں حلول کر کے صورت انسانی میں ظہور کیا ہے۔ (نعوذ باللہ) یہ لوگ اگر حضورؐ کو دیکھتے تو آپ کو الٰہ بصورت بشر ہی کہتے۔ جیسا کہ نصاریٰ کا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہی عقیدہ ہے ان لوگوں کو عیسیٰ علیہ السلام میں آثار کے مشاہدہ ہی سے یہ دھوکا ہوا ہے۔ جو دوسرے انسانوں سے زیادہ ان میں تھے اور آج کل بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ایسا غلو کیا ہے چنانچہ استاد مولانا محمد یعقوب صاحب کے پاس ایک سوال آیا تھا کہ کیا حضورؐ بشر تھے؟ اس شخص کو حضورؐ کے بشر ہونے پر تعجب تھا اور اس تعجب کا منشاء یہی ہوا کہ آپؐ میں بشریت کے علاوہ بعض وہ کمالات بھی تھے جو دوسرے انسانوں میں نہیں جس سے ناواقف کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ آپؐ بشر نہیں ملک بصورت بشر ہیں۔ یا نعوذ باللہ الٰہ بصورت بشر ہیں۔

بعض لوگوں کو یہ جرات تو نہ ہوئی مگر انہوں نے آپ کی ولادت شریفہ کے متعلق ایک مضمون اختراع کیا ہے جس سے گویا آپ کو بشریت سے جدا کرنا چاہا ہے بلکہ آپؐ سے تجاوز کر کے اہل بیت و ائمہ اطہار کی نسبت بھی یہ اختراع کیا ہے کہ ان کی ولادت موقع معتاد سے نہیں ہوئی بلکہ حضورؐ اور ائمہ اطہار ان سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس اختراع کی طرف داعی یہ ہوا کہ ان لوگوں نے حضور کی ولادت کو موضع نجاست سے مستبعد سمجھا مگر ان کے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں سوائے گستاخی کے پھر حضورؐ کے متعلق تو علماء کا یہ قول بھی ہے کہ آپؐ کے تمام فضلات پاک ہیں۔ اس لئے آپؐ کے متعلق محل نجاست سے پیدا ہونے میں اگر کسی کو استبعاد بھی ہو تو کسی درجہ میں ایک وجہ استبعاد اس کے پاس موجود بھی ہے کہ جب علماء آپؐ کے فضلات تک کو پاک کہتے ہیں تو ایسے پاک صاف ذات کو محل نجاست سے نہ پیدا ہونا چاہئے بلکہ موضع طاہر سے پیدا ہونا چاہئے مگر ائمہ اطہار کی بابت تو کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کے فضلات بھی پاک ہیں۔ ان کے متعلق یہ اختراع کیوں کیا گیا۔

اب میں حضورؐ کے متعلق اس استبعاد کا جواب دیتا ہوں وہ یہ کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ رحم محل نجاست ہے۔ بلکہ رحم موضع بول و براز سے بالکل الگ ہے اور نجاست اصلیہ بول و براز میں ہے کہ یہ دونوں نجس العین ہیں۔ سو رحم کو ان سے کوئی تعلق نہیں پس موضع معتاد سے ولادت میں اشکال لازم نہیں آتا کہ اس میں محل نجاست سے خروج ہے کیونکہ وہ محل نجاست ہی نہیں بلکہ محل طاہر ہے۔ ولادت کے وقت جو رطوبت جسم جنین کے ساتھ لگی ہوتی ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ طاہر ہے۔

وقال فی الشامیة رطوبة الولد عندالولادة طاھرة وکذالاسخلته اذا خرجت من امھا وکذا البیضة فلا یتنجس بھا الثوب ولاالماء اذا وقعت فیه

رطوبت بچے کی پیدائش کے وقت پاک ہے۔

اور اگر کسی کے نزدیک وہ رطوبت ناپاک بھی ہو تو اس کی ناپاکی عارضی ہے جو دھونے سے زائل ہو جاتی ہے دھونے کے بعد جسم پاک ہو جاتا ہے اور ایسی عارضی ناپاکی کا جسم کو لگ جانا کچھ محل استبعاد نہیں حضورؐ کے جسم و لباس پر بعض دفعہ بچوں کا پیشاب کر دینا اور آپ کا اس کو دھلوانا ثابت ہے۔ بس اس سے زیادہ یہ رطوبت نہیں ہو سکتی وہ بھی عارضی طور پر جسم کو لگ گئی جو دھلنے سے پاک ہو گئی اور یہ بھی علی سبیل التنزل ہے اگر اس رطوبت کا ناپاک ہونا تسلیم کیا جائے ورنہ امام صاحبؒ کے نزدیک تو رطوبت ولد جو ولادت کے وقت جسم سے لگی ہوتی ہے پاک ہے اس قول پر تو کچھ اشکال ہی نہیں۔

مجھے اتنی تقریر اس مسئلہ میں محض ان گستاخ لوگوں کے اس اختراع کی وجہ سے کرنا پڑی تا کہ ان کے استبعاد کا جواب ہو جائے ورنہ اس مسئلہ میں گفتگو کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا میرے پاس خود ایک سوال آیا تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ حضورؐ معتاد پیدا ہوتے تھے میں نے بڑا تعجب کیا کہ یہ شخص اپنے کو حضورؐ کا محب کہتا ہے اور ایسی بحث لے کر بیٹھا ہے جس میں ولادت کے اترے پترے کھولتا ہے اس کو ایسی گفتگو کرتے ہوئے شرم نہیں آتی کیا اپنی ماں کے متعلق بھی وہ ایسی گفتگو کر سکتا ہے میرا دل نہ چاہتا تھا کہ اس کو جواب دوں مگر غلطی کی اصلاح ضروری تھی۔ اس لئے میں نے جواب دیا کہ احادیث میں وارد ہے ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلیة کذا کہ حضورؐ کی ولادت فلاں شب کو ہوئی اور ولادت کی حقیقت یہی

ہے کہ بطریق معتاد پیدائش ہو اور الفاظ میں اصل معنی حقیقی ہی ہوتے ہیں۔

فلا یصرف عنه الابدلیل

یعنی حقیقت سے بدوں دلیل کے عدول نہیں ہو سکتا۔

لہذا ہم کو دلیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں جو شخص حقیقت کو چھوڑ کر ولادت کے دوسرے معنی بیان کرتا ہے اس کو دلیل قائم کرنا چاہئے جواب تو میں نے لکھ دیا مگر میرا قلم کانپتا تھا۔

غرض یہ لوگ چاہتے ہیں کہ حضور کو بشریت سے بعید کر دیں حالانکہ آپ کا کمال یہی ہے کہ آپؐ بشر ہیں اور پھر ایسے کمالات سے متصف ہیں جو بشریت سے بعید ہیں کسی نے آپ کی شان میں خوب کہا ہے۔

بشر لا کالبشر بل کالیاقوت بین الحجر

یعنی آپؐ بشر تو ہیں مگر اور انسانوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ آپؐ ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یاقوت ہوتا ہے۔

حقیقت تو یاقوت کی بھی پتھر ہی ہے مگر اس میں اور دوسرے پتھروں میں ایسا زمین آسمان کا فرق ہے کہ اس فرق پر نظر کر کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر نہیں کچھ اور چیز ہے پس یاقوت کا کمال یہی ہے کہ وہ پتھر ہو کر ایسا قیمتی اور خوشنما ہے اگر حجر نہ ہوتا ذہب ہوتا تو کوئی عجیب بات نہ تھی اسی طرح حضورؐ کا کمال یہ ہے کہ آپؐ انسان ہو کر سب انسانوں سے بڑھے ہوئے ہیں اگر ملک ہوتے تو کچھ کمال نہ تھا۔ پس چونکہ حضورؐ میں بشریت بھی کامل تھی اس لئے آپ کو اذیت کی بات سے اذیت ہوتی تھی۔

شفقت نوح علیہ السلام

یہ تو بس اذیت کی علت تھی اور چونکہ آپ لطیف المزاج سب سے زیادہ تھے اس لئے بہ نسبت دوسروں کے آپ کو زیادہ اذیت ہوتی تھی کیونکہ جب مزاج میں لطافت زیدہ ہوتی ہے تو ناگوار امور سے تکلیف بھی دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے بھلا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لطافت مزاج کو ہم کیا ہی سمجھ سکتے ہیں۔ آپؐ کے غلاموں میں بعض حضرات ایسے لطیف المزاج ہوئے ہیں کہ ان کے قصے سن سن کر حیرت ہوتی ہے۔ اہل اللہ کی لطافت مزاج کی بادشاہوں کو ہوا بھی نہیں لگی۔

چنانچہ حضرت مرزا جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اس اخیر زمانے میں بہت ہی لطیف المزاج گزرے ہیں ان لوگوں کی ادنیٰ ادنیٰ بے عنوانی سے وہ تکلیف ہوتی تھی جو ہم کو گالی سننے سے بھی نہیں ہوتی۔

آج کل لوگ بزرگوں کو تیز مزاج کہتے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر ان کو غصہ آ جاتا ہے لوگ ان کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں کہ بس جتنی تکلیف ہم کو ہوتی ہے ناگوار بات سے اتنی ہی ان کو ہوتی ہوگی۔ حالانکہ یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے جس بات کو تم خفیف سمجھتے ہو ان کے نزدیک وہ پہاڑ سے زیادہ بھاری ہے اسی واسطے رسول اللہ فرماتے ہیں۔

اوذیت فی اللہ مالم یوذ احد (فتح الباری لابن حجر ۷: ۱۲۶)

"یعنی مجھ کو اللہ کے راستے میں اس قدر ایذا پہنچی ہے جو کسی کو نہیں پہنچی"

قلت اخرجه فی المقاصد الحسنة بلفظها ما اوزی احدما اوذیت فی اللہ عزوجل ابونعیم فی الحلیة عن انس مرفوعا و اصله فی البخاری.

بظاہر اس پر حیرت ہوتی ہے اور یوں شبہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کو نوح علیہ السلام کے برابر تو تکلیف نہیں پہنچی نوح علیہ السلام کا صرف زمانہ وعظ ساڑھے نو سو برس تھا۔ اتنی مدت تک وہ کفار کی تکلیفیں سہتے رہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف ۲۳ سال ہی تبلیغ فرمائی تو کیا ۲۳ سال میں حضورؐ کو اتنی تکلیف پہنچی جو نوح علیہ السلام کو ساڑھے نو سو برس میں بھی نہیں پہنچی پھر نوح علیہ السلام کو کفار نے بہت تنگ کیا تھا سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار وعظ کے وقت ان کو لہولہان کر دیتے تھے اللہ اکبر! پھر ان کو شفقت ورحمت کا یہ حال تھا کہ لہولہان ہو کر بھی تبلیغ سے نہ رکتے تھے ساڑھے نو سو برس تک یہی حال رہا۔

بعض ظالم مصنف نوح علیہ السلام کی بابت کہتے ہیں کہ ان میں شفقت ورحم نہ تھا۔ اور یہ دلیل لکھی کہ انہوں نے اپنی قوم کے لئے بہت ہی سخت بددعا کی ہے۔

یارب لاتذر علی الارض من الکفرین دیاراً

خداوند! کافروں میں سے زمین پر ایک بھی بسنے والا نہ رہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس شخص نے نوح علیہ السلام کی بددعا کو تو دیکھ لیا مگر اس کو نہ دیکھا کہ انہوں نے اس ظالم قوم کی تکلیفیں کتنی مدت تک برداشت کیں اس شخص کو بڑا ہمدردی قوم کا دعویٰ ہے ذرا وہ نو مہینے ہی ایسی تکالیف برداشت کر کے دکھلا دے نانی یاد آ جائے گی میں کہتا

ہوں کہ نوح علیہ السلام کا ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ کرتے رہنا اور قوم کی اصلاح میں سعی کرتے رہنا اور ان کی تکلیفوں کو سہتے رہنا جس کا ذکر اسی آیت میں ہے۔

قال رب انی دعوت قومی لیلاً ونهارا الی قوله ثم انی دعوتهم جهارا ثم انی اعلنت لهم و اسررت لهم اسراراً

اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دن کو بھی (دین حق کی طرف) بلایا پس میرے بلانے پر دین سے اور زیادہ بھاگتے رہے اور میں نے جب کبھی ان کو دین حق کی طرف بلایا تا کہ آپ ان کو بخش دیں تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے دیں اور اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹ لئے اور اصرار کیا اور غایت درجہ کا تکبر کیا پھر میں نے ان کو بہ آواز بلند بلایا پھر میں نے ان کو علانیہ بھی سمجھایا اور خفیہ بھی سمجھایا (سورہ نوح)

یہ ان کی غایت درجہ شفقت کی دلیل ہے جب اصلاح سے مایوس ہی ہو گئے اور مایوسی بھی وحی سے واقع ہوئی جیسا اس آیت میں ہے۔

واوحی الی نوح انه لن یؤمن من قومک الا من قدامن الی قوله ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انهم مغرقون.

(اور حضرت نوح علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی گئی کہ جو اس وقت تک ایمان لا چکے ہیں اور کوئی نیا شخص تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لائے گا اور مجھ سے کافروں کی نجات کے بارے میں گفتگو نہ کرنا کیونکہ وہ سب غرق کیے جائیں گے)

اور یہ سمجھا کہ اب ان سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا سخت اندیشہ ہے اور بظاہر نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ اس کی اولاد میں کسی کے مومن ہونے کی امید ہے اس وقت انہوں نے بددعا کی چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں۔

انک ان تذرهم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجراً کفارا

(اگر آپ ان کو روئے زمین پر رہنے دیں تو آپ کے بندہ کو گمراہ کریں گے)

جب تک ان کو اصلاح کی امید رہی اس وقت تک تبلیغ کرتے رہے مصائب جھیلتے رہے جو ایک سال دو سال کی مدت تھی بلکہ اکٹھے ساڑھے نو سو برس اسی حال میں گزر گئے جب ان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور مسلمانوں پر ان کے وجود سے خطرہ ہونے لگا اس

وقت مسلمانوں کے حال پر رحم کر کے کفار پر بددعا کی۔ تو یہ بددعا بھی حقیقت میں رحمت تھی اور اس کا منشاء بھی شفقت ہی تھی یعنی مسلمانوں کے حال پر مگر لوگوں میں مرض یہ ہے کہ وہ صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اعتراض کر دیتے ہیں دوسرے پہلو پر نظر نہیں کرتے بھلا ہمارا اور آپ کا کیا منہ ہے جو نوح علیہ السلام پر زبان کھولیں۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کی چیست　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

تیرے پیر میں کانٹا بھی نہیں چبھا تم کو ان شیروں کی حالت کی کیا خبر ہے جو تلوار کے زخم کھائے ہوئے ہیں۔

جس کے کبھی کانٹا بھی نہ لگا ہو اس کا کیا منہ ہے کہ نوح علیہ السلام پر اعتراض کرے۔ جو ہزار برس تک پتھر کھاتے رہے یہ بہت گستاخی کا حکم ہے کہ جو ان لوگوں کی زبان پر آتا ہے۔

کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذباً

غرض نوح علیہ السلام کی ان تکلیفوں کو دیکھ کر بعض لوگوں پر شبہ ہے کہ کیا حضور کو نوح علیہ السلام سے بھی زیادہ تکلیف پہنچی حالانکہ کماً کیفاً ان کی تکلیف بظاہر زیادہ معلوم ہوتی ہے حضور کو اتنی مدت تک نہ تو تکلیف پہنچی نہ ایسی شدید تکلیف ہوئی پھر آپ کیسے فرماتے ہیں کہ میرے برابر خدا کے راستہ میں کسی کو تکلیف نہیں ہوئی۔

تو سنئے ظاہر میں بے شک نوح علیہ السلام کی تکالیف بڑھی ہوئی ہیں مگر حقیقت میں آپ کی تکالیف ان سے زیادہ تھیں بات یہ ہے کہ موثر اور متاثر اور بناء تاثر کے تفاوت سے اثر میں تفاوت ہو جاتا ہے جیسے ایک دیہاتی کے پیر میں کانٹا لگ جائے دیہاتی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کیونکہ جنگل میں بکثرت چلنے پھرنے سے ان لوگوں کے پیر سخت ہو جاتے ہیں۔ ان کو کانٹے سے تو کیا پیر میں چاقو لگ جانے سے بھی تکلیف نہ ہو گی اور اس کے مقابل میں ایک نازک اندام لطیف المزاج شخص کے پیر میں ذرا سی پھانس لگ جائے تو اسے کیا کچھ نہ تکلیف ہو گی۔

لطافت مزاج عارفین

میں نے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے مرزا صاحب کی ایک حکایت سنی ہے تھانہ بھون کے ایک رئیس حضرت کی خدمت میں زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے ان کے ساتھ ان

کے مصاحب بھی تھے وہ جو کسی ضرورت سے اٹھ کر گئے اور ادھر پشت ہوئی مرزا صاحب نے اس وقت ان کے پاجامہ کے نیفے میں سلوٹیں بے ڈھنگی طرح پڑی ہوئی دیکھیں۔ مرزا صاحب نے ان رئیس سے فرمایا تمہارا ان کے ساتھ کیسے گزر ہوتا ہے جن کو پاجامہ پہننا بھی نہیں آتا دیکھو تو نیفے میں سلوٹیں کس طرح پڑی ہوئی ہیں کہ ایک طرف کم ایک طرف زیادہ۔

ایک مرتبہ مرزا صاحبؒ مرادآباد تشریف لے گئے تھے وہاں کا ایک قصہ ایک صاحب نے بیان کیا کہ ان کے واسطے ایک نواب صاحب کے یہاں سے چارپائی منگائی گئی مگر ان کو نیند نہیں آئی۔ پوچھنے پر آپ نے فرمایا چارپائی میں کان ہے اس کی ناگواری سے نیند نہیں آئی ناپ کر دیکھا تو واقعی تھی مگر بہت ہی خفیف کہ مشکل سے پتہ لگا۔

ایک بار اور بھی ایسا ہی ہوا کہ صبح کو خدام کے دریافت کرنے پر فرمایا ہاں کچھ خنکی کا اثر معلوم ہوا تھا اس لئے نیند نہیں آئی اس وقت مجلس میں ایک بڑی بی بی موجود تھیں انہوں نے حاضرین مجلس سے خطاب کر کے کہا کہ حضرت کے واسطے دلائی میں تیار کروں گی کوئی اور صاحب فکر نہ کریں چنانچہ اس نے دن بھر محنت کر کے دلائی تیار کی اور عشاء کے بعد جب آپ لیٹ گئے اس وقت لے کر حاضر ہوئی حضرت نے فرمایا کہ میرے اوپر ڈال دو وہ ڈال کر چلی گئی صبح کو اٹھے تو آنکھوں میں پھر بھی جاگنے کی سرخی موجود تھی۔ خدام نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ دلائی اوڑھنے سے خنکی تو معلوم نہیں ہوئی مگر اس میں نگندے ٹیڑھے پڑے ہوئے تھے اس سے ایسی الجھن ہوئی کہ نیند پھر بھی نہ آئی بھلا لحاف میں منہ لپیٹ کر نگندوں کا ٹیڑھا پن محسوس ہو جائے یہ عجائبات میں سے ہے مگر اس واقعہ کے راوی بڑے بڑے ثقات ہیں اس لئے انکار نہیں ہو سکتا پھر نگندوں کے ٹیڑھے ہونے سے نیند نہ آنا غایت لطافت مزاج ہے۔

نیز مرزا صاحب کے لئے لکڑیوں کی آگ میں کھانا پکتا تھا ایک دن غلطی سے ایک کوئلہ کچا رہ گیا جس نے دھواں دیا مرزا صاحب نے کھاتے ہی فرمایا کہ کھانے میں دھوئیں کی تلخی ہے۔

اس حالت میں اگر مرزا صاحب یہ فرمائیں کہ مجھ کو مخلوق سے اس قدر تکلیف ہوتی ہے جو کسی مربی یا مصلح کو نہ ہوئی ہوگی تو یقیناً ان کی تصدیق کی جائے گی مرزا صاحب کے واقعات سے اس حدیث کی شرح ہوتی ہے۔

اوذیت فی اللہ مالم یوذ احد (فتح الباری لابن حجر ١٦٦:٧)

یعنی مجھ کو اللہ کے راستہ میں اس قدر تکلیف پہنچی جو کسی کو نہیں پہنچی ہے۔

جب حضورؐ کے خدام میں ایسے ایسے لطیف المزاج گزرے ہیں تو پھر حضورؐ کی لطافت کا تو کیا پوچھنا۔

میں نے حضرت حاجی صاحب سے یہ حکایت سنی ہے کہ ایک شخص نے دہلی میں چار حضرات کی دعوت کی تھی جس سے مقصود امتحان تھا اس وقت دہلی میں چار بزرگ موجود تھے ایک حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ایک خواجہ میر درد صاحب ایک مرزا صاحب ایک مولانا فخر نظامی صاحب یہ بزرگ عجیب تھے ان کی وضع حقیقت میں تو شرع کے خلاف نہ تھی مگر ظاہری حالت ان یک ایسی تھی جو لوگوں کو خلاف معلوم ہوتی تھی اہل اللہ میں ایک جماعت ایسی بھی ہوتی ہے جو ظاہری وضع سے ناواقفوں کو خلاف شرع معلوم ہوتے ہیں ان کو آج کل فرقہ ملامتیہ کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں کیونکہ ایک باغ کے پھول مختلف ہوتے ہیں پھل بھی مختلف ہوتے ہیں درخت بھی مختلف ہوتے ہیں بلکہ بعض دفعہ خود ایک ہی درخت کے پھل مختلف ہوتے ہیں ایک شاخ کا پھل شیریں ہے اور دوسری شاخ کا ترش ہے یہی حال خدا تعالیٰ کے باغ کا ہے کہ اس میں بھی مختلف درخت اور مختلف پھل ہیں بلکہ حق تعالیٰ کے باغ کی ایک عجیب شان یہ ہے کہ ایک ہی درخت مختلف موسموں میں مختلف قسم کے پھل لاتا ہے عارفین پر مختلف حالات گزرتے ہیں اور یہ تلوین ناقصین ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تلوین کاملین کو بھی پیش آتی ہے یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آتی ہے۔

شان کیفیات انبیاء

حضرت یعقوب علیہ السلام کی شیخ شیرازی نے یہ حالت لکھی ہے۔

گہے برطارم اعلیٰ نشینم گہے برپشت پائے خود نہ بینم

(کبھی تو میں اعلیٰ مقام پر اڑتا ہوں اور کبھی اپنی پیٹھ کے پیچھے نہیں دیکھ سکتا)

ایک تو وہ وقت تھا کہ مصر سے قاصد پیراہن یوسفی لے کر چلا اور کنعان میں آپ کو اس کی خوشبو پہنچ گئی اور حاضرین مجلس سے فرمادیا انی لاجد ریح یوسف لولا ان تفنلون (یعنی اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے سے حواس میں فتور آ گیا ہے تو میں ایک بات کہوں وہ یہ کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے) یہاں تو مصر سے پیراہن کی خوشبو کا احساس ہو گیا اور ایک وہ وقت تھا کہ

خود یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنعان کے جنگل میں ایک کنویں کے اندر قید کر دیا اور چند روز تک وہ اسی میں رہے مگر یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی یہ بھی خبر نہ تھی کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں یا نہیں۔ صدمہ فراق میں اتنا روئے کہ آنکھیں جاتی رہنے کے قریب ہو گئیں۔

اس کے متعلق کوئی روایت تو نہیں ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں رونے سے نابینا نہ ہوئی تھیں بلکہ صرف کمزور ہو گئی تھیں مگر بعض مفسرین نے **وبیضت عیناه** (اور دونوں آنکھیں ان کی سفید ہو گئیں) کی یہی تفسیر کی ہے اور روایت سے راجح یہی ہے روایت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ایسے عیوب سے منزہ ہوتے ہیں جو عرفاً عیب شمار ہوں کیونکہ یہ امر متکبرین کی اتباع سے مانع ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت اسی غرض کے ئے ہوتی ہے کہ لوگ ان کا اتباع کریں چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله

اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی ان کی اطاعت کی جائے۔

جس کے لوازم میں سے ہے موانع اتباع کو مرتفع کر دینا اس لئے انبیاء علیہم السلام میں کسی ایسے عیب کا ہونا جو عرفاً متکبرین کو اتباع سے مانع ہو اس آیت کے خلاف ہے مگر بعض مفسرین نے آیت کو ظاہر پر رکھا ہے کہ بیاض عین سے متبادر یہ ہے کہ بینائی بالکل زائل ہو گئی تھی اور اس کے بعد **فارتد بصیرا** سے بھی بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے اور اس آیت کا جواب یہ ہے کہ عرفاً نابینائی سبب عار وہ ہے جو خلقی ہو اور کسی عارض سے نابینا ہو جانا سبب عار نہیں جیسے پیدائشی لنجا ہونا عیب ہے اور لڑائی وغیرہ میں ہاتھ کٹنے سے لنجا ہو جائے تو عرفاً یہ عیب نہیں۔

اسی واسطے یحییٰ علیہ السلام کے بارہ میں جو حصور آیا ہے اس کی تفسیر بعضوں نے عنین سے کی ہے محققین نے اس کو غلط بتایا اور دلیل یہی بیان کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام ایسے عیوب سے منزہ ہوتے ہیں بلکہ حصور کے معنی ہیں نفس کو روکنے والا یعنی یحییٰ علیہ السلام اپنی نفسانی خواہشوں کو دبانے والے ہوں گے اس لئے وہ کسی عورت سے نکاح نہ کریں گے اور لغت سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ حصر کے معنی روکنے کے ہیں حصور سے مبالغہ کا صیغہ ہے اس کے معنی میں عنین کہنا صحیح نہیں باقی ان کے نکاح نہ کرنے سے اس پر استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ

عیسیٰ علیہ السلام بھی اس صفت میں مثل یحییٰ علیہ السلام کے تھے کہ انہوں نے بھی عمر بھر نکاح نہیں کیا اور ان کی شریعت میں قادر علی النفس کے لئے اشتغال بالطاعات اشتغال بالنکاح سے افضل تھا جیسا کہ ہماری شریعت میں بھی امام شافعیؒ کے نزدیک یہی افضل ہے مگر امام ابوحنیفہؒ نے اس کی مخالفت کی ہے ان کے نزدیک اشتغال بالنکاح افضل ہے بشرطیکہ مہر و نفقہ پر حلال طریقہ سے قادر ہو مگر حدیث میں ہے کہ نزول من السماء کے بعد وہ نکاح کریں گے۔

اتباعا نبینا لسنته صلى الله عليه وسلم و فيه تائيد لقول ابى حنيفة رحمه الله ان فى شرعنا الاشتغال بالنكاح افضل

پیروی کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی اور اس میں امام ابوحنیفہ کی تائید ہوتی ہے کہ ہماری شریعت میں مشغول ہونا ساتھ نکاح کے افضل ہے۔

اور اس کے ساتھ یہ لفظ بھی ہے ویولد لہ یعنی نکاح کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے اولاد بھی ہوگی معلوم ہوا کہ قوت رجولیت ان میں موجود تھی مگر پہلے کام نہ لیا اب کام لیں گے بوجہ اتباع شریعت محمدیہؐ کے کہ اس شریعت میں اشتغال بالطاعات سے اشتغال بالنکاح افضل ہے پس یحییٰ علیہ السلام کا نکاح نہ کرنا دلیل عنت نہیں ہو سکتا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق بھی سیر میں ہے وہ نابینا تھے مگر سوائے روایت کے سیر کے اس پر کوئی دلیل نہیں اس لئے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے متکبرین کے لئے اتباع سے ایک مانع ہوگا اور اسی لئے حق تعالیٰ نے تمام انبیاء کو اعلیٰ نسب اور اعلیٰ خاندان میں مبعوث فرمایا ہے تاکہ کسی کو اتباع سے عذر کرنے کا موقعہ نہ رہے اولیاء تو چھوٹی قوموں میں ہو سکتے ہیں بلکہ زیادہ ہوتے ہیں مگر انبیاء چھوٹی قوموں میں کبھی نہیں ہوئے اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ چھوٹی قوموں میں جو اولیاء ہوئے ہیں وہ زیادہ تر وہی ہیں جن کے متعلق ارشاد و تبلیغ کا زیادہ کام نہیں ہوتا اور جن اولیاء کے متعلق زیادہ تر ارشاد و تبلیغ کا کام ہوتا ہے وہ چھوٹی قوموں میں نہیں ہوتے بلکہ اکثر خاندانی لوگ ہوتے ہیں جو نسب میں ممتاز ہوں۔

اس نکتہ پر مجھے ایک بزرگ نے متنبہ کیا جن کا نام حاجی عبداللہ تھا وہ کیرانہ کے رہنے والے تھے اور قوم کے گوجر تھے بہت نیک آدمی تھے اور بالکل ان پڑھ۔ میں ایک مرتبہ ان کے سامنے اپنی قوم کی یعنی شیخ زادوں کی مذمت کر رہا تھا کہ اس قوم میں ہوشیاری چالاکی اور

تکبر بہت ہے اسی قسم کی باتیں میں کر رہا تھا وہ بزرگ کہنے لگے کہ تم نے اس قوم کے عیوب تو گنا دیئے خوبیاں بھی تو گناؤ میں نے کہا حضرت وہ آپ بیان کر کہنے لگے کہ میں جاہل آدمی ہوں اور کچھ تو جانتا نہیں مگر اتنی بات تو میں دیکھتا ہوں کہ اس زمانہ میں جن بزرگوں کے ہاتھ سے دین کی خدمت واشاعت ہوئی ہے اور جن کے فیض سے مخلوق کی اصلاح زیادہ ہوئی ہے وہ اکثر اسی قوم میں سے ہیں پھر چند بزرگ کے نام گنوائے جو سب شیخ زادے ہی تھے۔ پھر جو میں نے غور کیا تو یہ بات صحیح معلوم ہوئی اور راز اس میں یہ ہے کہ جو حضرات خدمت ارشاد پر ہوتے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام کی طرح مقتداء ہوتے ہیں اس لئے انبیاء کی طرح ایسے اولیاء بھی اکثر خاندانی اور شریف النسب ہوئے ہیں تاکہ ان کی اقتداء سے متکبرین کو عار نہ ہو بخلاف ان اولیاء کے جن میں مقتدائیت کی شان نہیں ہوتی تو وہ چھوٹی قوموں میں ہوتے ہیں بلکہ زیادہ ہوتے ہیں۔

الغرض یعقوب علیہ السلام کے متعلق بعض محققین کی رائے یہی ہے کہ وہ نابینا نہ ہوئے تھے بلکہ روتے روتے بینائی کمزور ہوگئی تھی انہوں نے ابیضت عیناه کو ضعف بصر پر محمول کیا ہے اور فارتد بصیرا سے اسی ضعف کا زوال مراد لیا ہے ولا یبعد ارادته للحکمته التی ذکرناها پس بعید نہیں لوٹ آنا بینائی کا بوجہ حکمت کے جو ہم نے ذکر کی تو دیکھئے یعقوب علیہ السلام کو ابتداء میں یوسف علیہ السلام کی اطلاع نہ ہوئی کہ وہ کس حال میں ہیں حالانکہ وہ اس وقت کنعان ہی کے کنوئیں میں تھے پھر اس کے بعد عرصہ تک معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں کس حال میں ہیں اور بعد میں مصر سے قمیص کے روانہ ہوتے ہی خوشبو پہنچ گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی ایک وقت میں اور شان تھی اور ایک وقت میں اور شان تھی۔ یہی میں کہہ رہا تھا کہ تکوین انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آئی ہے ایک نبی کو مختلف اوقات میں مختلف حالات پیش آتے تھے اور بہت سے سالکین کو بھی پیش آتی ہے۔

رہا چند انبیاء کے حالات میں اختلاف ہونا۔ تو یہ مشاہد ہے کہ کسی میں کوئی رنگ غالب تھا کسی میں کوئی رنگ غالب تھا سب کے الوان متحد نہ تھے پس اسی طرح اولیاء میں بھی مختلف شانیں ہوتی ہیں۔

اقتضاءات بشریہ کا کمال

ان میں ایک شان وہ بھی ہے جو مولانا فخر نظامیؒ کی تھی کہ وہ ایسی وضع سے رہتے تھے جس پر عوام کو خلاف شرع ہونے کا وہم ہوتا تھا مگر واقع میں وہ خلاف نہ تھے۔ اس لئے کسی پر اعتراض کا حق نہیں سب باغ الٰہی کے درخت ہیں کوئی کسی قسم کا کوئی کسی قسم کا۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے ہاں اعتراض جب ہو سکتا ہے جب حقیقت میں شرع کی مخالفت ہو مولانا فخر نظامیؒ ایسے نہ تھے وہ صرف وضع سوز تھے عزت و ناموس کو پھونکنے والے تھے شرع سوز نہ تھے۔

غرض اس شخص نے ان چار حضرات کو دعوت میں جمع کیا جب سب حضرات اس کے گھر میں تشریف لے گئے تو اس نے یہ حرکت کی کہ ان صاحبوں کو بہت دیر تک بٹھلایا پان وغیرہ سے خاطر تواضع کرتا رہا جب بہت دیر تک بٹھلایا تو آخر میں سب کو ایک ایک آنہ دے دیا اور کہا کہ حضرت کھانے کا انتظام نہیں ہو سکا یہ ایک آنہ لیجئے اور بازار سے کچھ لے کر کھا لیجئے خواجہ فخر نظامی نے تو ایک آنہ کے پیسے سر پر رکھے اور داعی کو بہت دعائیں دیں اور خواجہ میر دردؒ اور شاہ صاحبؒ نے نہ دعائیں دیں نہ برا بھلا کہا نہ پیسوں کو سر پر رکھا دونوں خاموش گئے خواجہ میر درد محض شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ بڑے کامل ولی ہیں ان کی کتاب علم الکتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑے عارف ہیں اس کتاب میں انہوں نے معارف منازل بہت تفصیل سے بیان کئے ہیں اور مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بیہودہ حرکت سے سخت تکلیف پہنچی مگر بہت تحمل سے کام لیا عارفین لطافت مزاجی کے ساتھ متحمل بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا جو مرزا صاحب کے برابر نازک مزاج ہوتا تو نہ معلوم کیا آفت برپا کرتا مگر آپ کے چہرہ پر بل بھی نہ پڑا پیسے لے کر اتنا فرمایا کہ میاں بزرگوں کا امتحان نہیں لیا کرتے۔ نہ معلوم کس وقت کیسا وقت ہے۔

اس واقعہ میں ظاہر بینوں کو خواجہ فخر نظامی کی حالت رفیع معلوم ہوتی ہوگی کہ ان کو ناگوار واقعہ سے تکلیف ہی نہ ہوئی بلکہ فرحت و مسرت ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ وہ اس واقعہ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے تھے اور ہر چہ از دوست میرسد نیکوست کا ان کو مشاہدہ تھا اور ان کی یہ حالت تھی۔

چو گزندت رسد ز خلق مرنج　　کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج
از خداداں خلاف دشمن و دوست　　کہ دل ہر دو در تصرف اوست

اور اس کی نظیر یہ ہے کہ بعض عارفین کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا تو وہ ہنستے تھے اور بعض عارفین کو رنج و غم ہوا وہ روتے تھے تو ظاہر بین پہلے شخص کو دوسرے سے افضل سمجھتے ہیں۔ مگر واقع میں کمال یہ ہے کہ رنج کی بات سے رنج ہو پھر اس پر صبر و رضا حاصل ہو پس وہ عارف جس کو اپنے عزیز کے مرنے سے صدمہ ہوا اور وہ اس پر صبر کر کے راضی برضائے الٰہی رہا اس سے اکمل ہے جس کو رنج ہی نہ ہو بلکہ برعکس مسرت ہوئی۔ اسی طرح اس واقعہ میں کمال حضرت مرزا صاحب کا ظاہر ہوا کہ باوجود تکلیف شدید پہنچنے کے نہایت تحمل سے کام لیا چہرہ پر بل بھی نہیں پڑا اور محض اس شخص کی اصلاح کے لئے اتنی بات پر اکتفا کیا کہ بزرگوں کا امتحان نہیں کیا کرتے نہ معلوم کس وقت کیسا وقت ہے۔

یہ بات کہ تکلیف کی بات سے تکلیف ہی نہ ہو یہ غلبہ حال ہے جس نے اقتضات بشریہ کو زائل یا مضمحل کر دیا اور کمال مقصود یہ ہے کہ اقتضات بشریہ سب بدرجہ کمال موجود ہوں پھر مستقل رہے کہ شریعت سے تجاوز نہ ہو اور یہ بات مرزا صاحب کو حاصل تھی کہ ان میں اقتضاء بشری بھی بدرجہ کامل موجود تھا اور اتباع شرع بھی کامل تھا تکلیف کی بات سے ان کو کلفت ہوتی تھی اور پھر صبر فرماتے اور تحمل سے کام لیتے تھے تو اس واقعہ میں مولانا فخر نظامی صاحب حال تھے اور بقیہ حضرات صاحب مقام تھے اور ان میں چونکہ حضرت مرزا صاحب کو لطافت مزاجی کی وجہ سے تکلیف زیادہ پہنچی اس لئے ان کا تحمل سب کے تحمل سے بڑھا ہوا تھا یہ جو کہا گیا ہے۔

چو گزندت رسد ز خلق مرنج
(جب مجھے مخلوق سے ضرر پہنچے تو رنج نہ کر)

اس کا مطلب یہ ہے کہ عقلی رنج نہ ہونا چاہئے یہ مطلب نہیں کہ طبعی رنج بھی نہ ہونا چاہئے اسی طرح

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست
(جو دوست سے تجھے پہنچے اسی میں خیر ہے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیش آئے اس کو عقلاً بہتر سمجھ

چاہئے اور یہ سمجھ کر اس پر راضی رہنا چاہئے یہ مطلب نہیں کہ بیماری اور صحت کو یکساں سمجھا کرو دونوں میں کچھ فرق ہی نہ کرو۔

غرض آثار بشریہ کا زائل یا مضمحل ہو جانا کمال نہیں بلکہ ان کا بدرجہ کمال موجود ہونا اور پھر مستقل رہنا یہ کمال ہے چونکہ حضورؐ میں روحانی آثار کے ساتھ آثار بشریہ بھی بدرجہ کمال موجود تھے اس لئے آپ کو تکلیف کی بات سے تکلیف ہوتی تھی رنج کی بات سے رنج بھی ہوتا تھا پھر لطافت مزاج کی وجہ سے آپ کو دوسروں سے زیادہ رنج ہوتا تھا پھر سب باتوں پر صبر وتحمل فرمایا اور اخلاق میں تغیر نہ آنا یہ آپ کا غایت درجہ کمال تھا اگر آپ کو تکلیف اور رنج ہی نہ ہوتا تو پھر اخلاق میں تغیر نہ آنا بڑا کمال نہ تھا۔ کمال یہی ہے کہ تکلیف کا احساس کامل ہوا پھر بھی اخلاق کریمانہ میں ذرا تغیر نہ آیا۔

یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو اس کی تمنا کرتے ہیں کہ ہمارے نفس میں دنیا کی طرف میلان نہ رہے گناہ کا وسوسہ بھی نہ آئے بس بالکل پتھر بن جائیں کہ کسی حسین کو دیکھ کر میلان ہی نہ ہو سو یاد رکھو کہ یہ کمال نہیں کمال یہی ہے کہ آثار بشریت اور قوت میلان کے ہوتے ہوئے پھر مستقل رہو۔ مولانا فرماتے ہیں۔

شہوت دنیا مثال گلخن ست   کہ از و حمام تقوی روشن ست

یعنی شہوت دنیا کی ایسی مثال ہے جیسے حمام کے لئے ایندھن اور ظاہر ہے کہ حمام بدوں ایندھن کے گرم نہیں ہوسکتا اسی طرح تقویٰ کے حمام کی گرم بازاری اسی شہوت دنیا سے ہے تو یہ شہوات دنیا موجب نقص نہیں بلکہ یہی موجب کمال ہیں۔ ٹاٹ کا پردہ زانی نہ ہو تو کیا کمال ہے اندھا نظر بد نہ کرے تو کیا کمال ہے وہ دیکھنا بھی چاہے تو آنکھیں کہاں سے لائے لنگڑا آدمی ناچ میں نہ جائے تو کیا کمال ہے۔ کمال یہی ہے کہ خدا نے تم کو آنکھیں دی ہیں اور پھر تم ان کو غیر محل میں استعمال نہیں کرتے قوت رجولیت دی ہے اور محل حرام میں اس کو صرف نہیں کرتے چلنے کے لئے پیر دیئے ہیں پھر بھی ناچ میں نہیں جاتے حسن کا ادراک اور اس کی طرف میلان طبیعت میں ہے پھر بھی نامحرم کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے اور جس کو حسن کا ادراک ہی نہ ہو اس کا نہ دیکھنا کیا کمال ہے۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ میاں اشرف علیؒ پانی جب پیو ٹھنڈا پینا ہر بن مو سے الحمدللہ نکلے گا اور گرم پانی پی کر زبان تو الحمدللہ کہے گی مگر اندر سے دل

ساتھ نہ دے گا پھر فرمایا کہ جس طرح ٹھنڈا پانی نعمت ہے اسی طرح پیاس بھی نعمت ہے کیونکہ اس سے نعمت کی قدر ہوتی ہے سبحان اللہ! یہ ہیں علوم اس ارشاد سے پیاس کا نعمت ہونا معلوم ہوا حالانکہ وہ بھی آثار بشریت اور شہوات دنیا میں سے ہے۔

پس حضورؐ کے اندر آثار بشریت کا ہونا بھی موجب کمال تھا اگر آپ میں آثار بشریت نہ ہوتے تو پھر کفار کی تکلیفوں پر صبر کرنا زیادہ موجب کمال نہ ہوتا۔ اس مسئلہ میں زیادہ تفصیل میں نے اس لئے کی کہ شاید کسی کو بعض مغلوب الحال اولیاء کے واقعات سن کر اور یہ دیکھ کر کہ ان کو تکلیف رساں واقعات سے تکلیف ہی نہ ہوتی تھی یہ شبہ ہو جائے کہ حالت اکمل ہے تو وہ خوب سمجھ لیں کہ یہ حالت اکمل نہیں بلکہ اکمل یہی حالت ہے کہ آثار بشریہ موجود رہتے ہوئے پھر ان پر قابو یافتہ ہو اور ظاہر ہے کہ جس شخص میں بشریت کے ساتھ لطافت کامل ہو گئی اس کو ناگوار باتوں سے تکلیف زیادہ ہوگی چونکہ ہمارے حضورؐ میں کمالات نبوت کے ساتھ لطافت بھی سب انبیاء سے زیادہ کامل تھی اس لئے آپ کو سب سے زیادہ اذیت پہنچی۔

حقوق العباد کی اہمیت

ب دوسری علت آپ کی اذیت کی عرض کرتا ہوں جو نظر غائر سے معلوم ہوتی ہے گو وہ بھی نصوص ہی سے مفہوم ہے مگر قدرے استنباط کی حاجت ہے اور یہی وہ بات ہے جس کے متعلق شروع میں کہا گیا تھا کہ نظر غائر سے آپ کی اصلی تکلیف روحانی تھی اور وہ یہ ہے کہ آپ کو امت کے ساتھ شفقت بے حد تھی جو جابجا آیات سے بھی معلوم ہے اور پھر اس کے دو درجے ہیں ایک تو اپنی امت کے مطلق تکلیف سے قلق۔ یہ تو منصوص ہے اور دوسرا درجہ یہ کہ وہ تکلیف میرے سبب سے ہو کہ وہ میری تکذیب کریں اور معذب ہوں تو گویا میری وجہ سے ان کو عذاب ہوگا آپؐ پر پہاڑ سے زیادہ گراں تھا اور یہ درجہ محتاج استنباط ہے۔ حدیثوں میں یہ تو تصریح ہے۔

ماانتقم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لنفسہ فی شیء قط (متفق علیہ)
(أخرجه البخاری ومسلم' وابن عبدالبرفی التمهید ۲ : ۲۵۹)
حضورؐ نے اپنے نفس کا کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔

اور طائف کے واقعہ میں وارد ہے کہ جب وہاں آپ کو کفار نے تکلیف دی تو جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا ان اللہ قد سمع قول قومک وماردوا علیک اور یہ بھی

کہا کہ یہ پہاڑوں کا فرشتہ حاضر ہے آپ اس کو جو حکم دیں گے عمل کرے گا خود اس فرشتہ نے عرض کیا کہ میں ان کو پہاڑوں کے درمیان دبا دوں آپؐ نے فرمایا۔

بل ارجوان یخرج اللّٰہ من اصلابھم من یعبداللّٰہ (تفسیر ابن کثیر ۳: ۲۵۹، مشکوۃ المصابیح ۵۸۴۸)

بلکہ امید رکھتا ہوں میں کہ حق تعالیٰ ان کی اولادوں میں سے ایسی اولاد پیدا فرمادے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔

اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی وجہ سے بھی کسی کی تکلیف گوارا نہیں تھی اور بعض جگہ جو آپؐ سے بددعا منقول ہے وہ کسی عارض سے ہے۔ اصل و غالب مذاق حضور اقدس کا یہی تھا شاید کسی ذہن کو یہاں یہ شبہ ہو کہ اس میں غم کی بات تھی یہ تو حق العبد تھا آپ معاف فرما دیتے تو کچھ بھی مواخذہ نہ ہوتا۔

تو بات یہ ہے کہ اول تو آپ کی ایسی مخالفت درجہ کفر میں تھی آپ کافر کو کیسے معاف فرما دیتے دوسرے یہ کہ محبوبیت کے درجے ہوتے ہیں ایک درجہ محبوبیت کا یہ کہ محبوب کے ایذا دینے والے سے ہر حال میں مواخذہ ہوتا ہے محبوب معاف بھی کر دے جب بھی جرم معاف نہیں ہوتا علاوہ ازیں یہ کہ حق العبد میں حق اللہ بھی ہوتا ہے وہ عبد کے معف کرنے سے معاف نہیں ہوتا اس نکتہ سے اکثر لوگ غافل ہیں عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے حق العبد میں محض بندہ ہی کا حق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا حق نہیں ہوتا۔ یہ غلط ہے کیونکہ بندہ کا وہ حق اللہ تعالیٰ ہی نے تو مقرر فرمایا ہے۔

مثلاً حکم دیا ہے کہ مظلوم کی امداد کرو۔ مسلمان کی غیبت نہ کرو۔ کسی کو تکلیف نہ دو تو جب ان احکام کے خلاف کسی کو تکلیف دی جائے گی تو جیسے بندہ کا حق فوت کیا ہے ایسے ہی خدا تعالیٰ کا حق فوت کیا ہے کہ ان کے حق کی مخالفت کی اس لئے حقوق العبد تلف کرنے میں محض بندوں کی معافی کافی نہیں بلکہ حق تعالیٰ سے بھی توبہ استغفار کرنا چاہیے تو اگر حضور کی معافی سے آپ کا کوئی حق معافی کے قابل ہوتا معاف بھی ہو جاتا تو حق اللہ تو پھر بھی باقی تھا جس کی وجہ سے مواخذہ ہو سکتا تھا (اور گو عام حقوق العباد میں بندہ کی معافی کے بعد حق تعالیٰ اکثر اپنا حق معاف کر دیتے ہیں مگر بعض اوقات محبوبان خاص کی حق تلفی میں ان کی معافی کے بعد حق تعالیٰ اپنا حق معاف نہیں فرماتے بلکہ مواخذہ ضرور ہوتا ہے۔)

تو حضور کو ان لوگوں کی اس حالت سے رنج ہوتا تھا اور حضور کی تو بڑی شان ہے حضرات اولیاء اللہ میں بعض بزرگ ایسے محبوب ہوئے ہیں کہ ان کو تکلیف دینے والوں پر قہر حق متوجہ ہوتا تھا اور باوجودیکہ وہ سب معاف کر دیتے تھے اور حق تعالیٰ سے درخواست کرتے تھے کہ ہماری وجہ سے کسی پر مواخذہ نہ ہو مگر یہ درخواست قبول نہ ہوتی تھی۔

چنانچہ حضرت مرزا جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قصہ اور یاد آیا کہ آپ لوگوں سے بہت کم ملتے تھے کسی نے اس کی وجہ دریافت کی کہ حضرت آپ الگ الگ کیوں رہتے ہیں فرمایا کہ بھائی مجھے لوگوں کی بدتمیزیوں سے بہت تکلیف ہوتی ہے اور میری تکلیف کی وجہ سے حق تعالیٰ کا انتقام ان لوگوں پر متوجہ ہو جاتا ہے میں نے بہت دعا کی کہ میری وجہ سے کسی پر بلا نازل نہ ہو مگر یہ دعا منظور نہیں ہوتی۔ اس لئے اب میں نے ملنا ہی کم کر دیا کہ نہ ملوں گا نہ کوئی مجھے ایذا دے گا نہ میری وجہ سے کسی پر مواخذہ ہوگا۔

سبحان اللہ! کیا شان محبوبیت تھی اور مخلوق کے حال پر کس درجہ شفقت تھی۔ واقعی لوگوں کو قہر سے بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ آپ ہی ملنا ترک کر دیں کیونکہ آپ لطافت فطری اور لطافت ذکری کی وجہ سے اتنے نازک واقع ہوئے تھے کہ لوگوں سے آپ کے مزاج کی رعایت دشوار تھی۔

اس نزاکت کے متعلق ایک واقعہ اور یاد آیا۔ مرزا صاحب کے ایک مخلص مرید تھے وہ ہر سال میں دوبار حاضر ہوتے تھے اور کئی کئی دن تک قیام کرتے تھے ایک سال جو حاضر ہوئے تو ان کو محبت کا جوش ہوا مرزا صاحب سے عرض کیا کہ حضرت آپ مجھ سے کوئی فرمائش فرمائیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ بھائی کیا فرمائش کروں بس تم محبت سے ملنے آجاتے ہو یہی کافی ہے اس نے اصرار کیا تو فرمایا اچھا برا تو نہ مانو گے اس نے کہا حضرت بھلا آپ فرمائش فرمائیں اور میں برا مانوں کیا مجال فرمایا بھائی تمہارے اصرار پر یہ فرمائش کرتا ہوں کہ تم میرے پاس سال میں بجائے دو مرتبہ کے ایک مرتبہ آیا کرو۔ وہ بے چارا سہم گیا کہ شاید مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ فرمایا میں ناراضی کی وجہ سے یہ بات نہیں کہتا بات یہ ہے کہ تم کھاتے بہت ہو اور تمہیں اتنا کھاتے ہوئے دیکھ کر میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور اس کے تصور سے میرے پیٹ میں ایسا خلل واقع ہوتا ہے کہ تمہارے جانے کے بعد مجھے مسہل پینا پڑتا

ہے تو سال میں ایک بار تو مسہل لے لینا آسان ہے دوبار بڑا مشکل ہے۔

اس راز کو سن کر اس شخص کا فرمائش کر کے بہت دل خوش ہوا ہوگا کہ اس سے فرمائش ہی نہ کرتا۔ مگر نہیں طالب کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر شیخ ساری عمر صورت دکھانے کو منع کر دے تو اس پر راضی رہے اور یہ کہے۔

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میں ملاقات کا خواہشمند ہوں اور وہ جدائی کا خواہاں ہے میں اپنی مرضی دوست کی مرضی پر قربان کر دی) اور یوں کہے

ارید وصاله و یرید هجری
فاترک ما ارید لما یرید

یعنی میں ملنا چاہتا ہوں اور محبوب ملنا نہیں چاہتا تو میں اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے سامنے چھوڑ دیتا ہوں۔ حضورؐ نے حضرت وحشی بن حرب قاتل حمزہ رضی اللہ عنہما سے جب وہ اسلام لا کر حاضر خدمت ہوئے یہ فرمایا۔

هل تستطیع ان یغیب وجهک عنی (الصحیح للبخاری ۵:۱۲۹)

کیا تم مجھ سے اپنے چہرہ کو غائب رکھ سکتے ہو۔

انہوں نے بدل و جان اس ارشاد کو قبول کیا اور عمر بھر آ کر صورت نہ دکھائی ہائے کیا ان کے دل پر سانپ نہ لوٹتا ہوگا کیسے کیسے عشق کے شرارے اٹھتے ہوں گے۔ بھلا صحابیؓ کو حضورؐ کے دیدار سے صبر ہو سکے بہت سخت مجاہدہ ہے۔ مگر حضرت وحشی نے طلب رضا کے لئے سب کچھ جھیل لیا۔ اپنی جان پر مشقت گوارا کی مگر حضورؐ کو تکلیف نہیں دی کیونکہ آپ کو ان کی صورت دیکھ کر اپنے چچا کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

اسی طرح حضرت مرزا صاحب کے مرید نے اس ارشاد کو دل و جان قبول کیا بلکہ اگر سچا عاشق ہوگا تو سال میں ایک دفعہ کا آنا بھی ترک کر دیا ہوگا یا بہت کھانے کی عادت چھوڑ دی ہوگی۔

عالم ارواح کی نسبت

حضرت مرزا صاحب کا ایک اور واقعہ یاد آیا کہ آپ کی خدمت میں مولانا غلام یحیی بہاری جن کا حاشیہ رسالہ قطبیہ پر مشہور ہے حاضر ہوئے ان کی ڈاڑھی بہت بڑی تھی کہ ایک مشت سے بھی بہت زیادہ تھی۔ بعض لوگوں کو ڈاڑھی بڑھانے کا شوق ہوا کرتا ہے بس مرزا

صاحب کے سامنے پہنچے اور آپ کی نظر ان کی ڈاڑھی پر پڑی فوراً آنکھوں پر ہاتھ دھر لیا اور فرمایا جلدی کہو جو کچھ کہنا ہے۔ کیسے آئے ہو۔ عرض کیا بیعت ہونے آیا ہوں۔ فرمایا پیر و مرید میں مناسبت شرط ہے آدمی اور ریچھ میں کوئی مناسبت نہیں۔ مجھ سے آپ کو فیض نہ ہوگا مولانا غلام یحیٰ نے ایسی بات کب سنی تھی وہ تو مولانا اور مقتدا بنے ہوئے تھے۔ اس جواب پر خفا ہو کر چلے گئے کہ ہم کسی اور سے بیعت ہو جائیں گے کوئی آپ ہی ایک شیخ نہیں رہ گئے۔ کہنے کو تو کہہ گئے مگر سارے جہان میں مرزا صاحب جیسا کوئی نہ ملا۔ یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں کوئی اور شیخ ہی نہ تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی سے مناسبت نہ ہوئی بس وہ حال تھا۔

ہمہ شہر پرز خوباں منم و خیال ماہے　　　چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

اور مناسبت کا ہونا نہ ہونا یہ کسی کے اختیار میں نہیں یہ تو عالم ارواح میں ہو چکی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ **الارواح جنود مجندة ماتعارف منها ائتلف وماتنا کرمنها اختلف** (**الصحیح للبخاری** ۴: ۱۶۲)

ارواح لشکر جمع کردہ ہیں جن میں وہاں آشنائی ہو چکی ہے وہ ماوف دونوں ہیں اور جن میں وہاں تناکر وتنافر ہو چکا ہے وہ یہاں بھی اختلاف رکھتے ہیں۔

عورتیں اس مسئلہ کو خوب سمجھتی ہیں جب کسی لڑکی کا نکاح بری جگہ ہو جاتا ہے تو ان کو زیادہ رنج نہیں ہوتا بلکہ یوں کہتی ہیں کہ نجوگ یوں ہی ملا ہوا تھا اور کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جوڑیاں ملا دی ہیں جس کا جوڑ جس کو بنایا ہے اسی سے نکاح ہوتا ہے۔ اسی طرح مریدین و مشائخ میں بھی جوڑیاں ملی ہوئی ہیں جس کو جس سے مناسبت ہوتی ہے اسی سے تعلق حاصل کرتا ہے۔

شیخ شمس الدین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ترکستان سے شیخ کی تلاش میں چلے مگر کوئی ایسا بزرگ نہ ملا جس سے مناسبت ہو آخر ہندوستان پہنچ کر شیخ علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ سے مناسبت ہوئی اور ان ہی سے فیض ہوا آخر کار مولانا غلام یحیٰ بعد میں پھر آئے اور اس وقت ڈاڑھی ٹھیک کر کے آئے یعنی ایک مشت سے جو زائد تھی اس کو ترشوا دیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ ہاں اب آدمیوں کی صورت سے آئے ہو۔ ب مجھ سے مناسبت ہو جائے گی۔ چنانچہ بیعت فرمایا اور خانقاہ میں رکھا۔ پھر یہ حال ہو گیا۔

جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

چنانچہ مرزا صاحب سے رخصت ہو کر جب مولانا غلام یحیٰ لکھنؤ پہنچے تو وہاں کسی

استاد شاگرد میں رسالہ قطبیہ کے حاشیہ میں ایک مقام پر اختلاف ہو رہا تھا۔ ان کو معلوم ہوا کہ خود مصنف لکھنؤ میں آئے ہوئے ہیں تو خیال آیا کہ چلو مصنف ہی سے اس کو حل کیا جائے یہاں جو آئے اور مولانا کو وہ مقام دکھلایا تو کچھ دیر غور کر کے فرمایا کہ میری بھی سمجھ نہیں آیا اللہ اکبر! علوم رسمیہ کو کیسا دل سے نکالا کہ اپنی تصنیف کو بھی نہ سمجھ سکے۔

میں مرزا صاحب کی لطافت مزاج کا ذکر کر رہا تھا کہ مولانا غلام یحییٰ کی فوق الحد ڈاڑھی دیکھ کر آپ پریشان ہو گئے اور بیعت سے انکار کیا۔ غرض اس قدر نازک مزاج تھے کہ بادشاہوں کا دماغ بھی ایسا نازک نہ تھا اور اس میں لطافت ذکر کا بھی اثر تھا۔ اللہ کا نام لینے سے مزاج میں لطافت بڑھ جاتی ہے پھر ایسے شخص کو مخلوق کی بے تمیزی سے تکلیف ضرور ہو سکتی ہے اور اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے انتقام ہو سکتا ہے اس لئے مرزا صاحب مخلوق سے نہ ملتے تھے۔

شفقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی لطافت کا یہ حال تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لطافت کا کیا حال ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت عالی و رفیع ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینے والا مواخذہ حق سے کب بچ سکتا ہے اس لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت تکلیف ہوتی تھی کہ میری وجہ سے مخلوق پر مواخذہ ہو۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کچھ امت اجابت کے ساتھ مخصوص نہ تھی امت دعوت پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد شفقت تھی۔

ملا دو پیازہ نے ایک آل نامہ لکھا۔ اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ الرسول خیر خواہ دشمناں (رسول دشمنوں کا خیر خواہ ہوتا ہے) واقعی انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہے کہ وہ دشمنوں سے بھی غایت شفقت و خیر خواہی کرتے ہیں چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام کا ارشاد اپنی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد قرآن مجید میں مذکور ہے۔

فتولی عنھم وقال یاقوم لقد ابلغتکم رسلت ربی ونصحت لکم
فکیف اسی علیٰ قوم کافرین

شعیب ان سے منہ موڑ کر چلے اور فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچا دیئے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی۔ پھر میں ان کافر لوگوں پر کیوں رنج کروں۔ اس میں **فکیف** آسی اپنے دل کو سمجھانے کے لئے فرمایا دراصل ان

کو اپنی قوم کی بدحالی پر صدمہ اور رنج تھا جس کو **لقد ابلغتکم رسلت ربی و نصحت لکم** کے بعد ظاہر کرنا چاہتے تھے مگر بجائے اظہار حزن کے اپنے دل کو سمجھاتے ہیں کہ کافر قوم پر کیا افسوس کروں اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو صدمہ سخت ہوا تھا جس کی وجہ سے دل کو بہلانا پڑا حضورؐ کے بارہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فقد نعلم انه لیحزنک الذی یقولون فانهم لایکذبونک ولکن الظٰلمین بایات اللّٰہ یجحدون

ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اقوام مغموم کرتے ہیں سو یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے لیکن یہ ظالم لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی حالت سے بہت صدمہ اور رنج تھا اور ظاہر ہے کہ رنج وہیں ہوتا ہے جہاں شفقت ہو اگر حضور کو امت دعوت کے حال پر شفقت نہ ہوتی تو ان کی بدحالی پر رنج کیوں ہوتا اور بہت آیتوں میں آپ کا حزن مذکور ہے اور احادیث میں تو اس شفقت کی بہت ہی تصریح ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ میری اور تمہاری مثال اس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلائی اور جس پر پروانے گرنے لگے اور وہ چاروں طرف سے ان کو ہٹاتا ہے اسی طرح تم سب جہنم کی آگ میں گرنا چاہتے ہو اور تمہاری کمر پکڑ کر اس سے ہٹاتا ہوں اور تم میرے ہاتھ سے نکلے جاتے ہو اور اس میں گرتے ہو۔

غرض اس سے حضور کو سخت تکلیف ہوتی تھی کہ لوگ اپنے ہاتھوں جہنم میں جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

لعلک باخع نفسک الایکونوا مؤمنین

شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر جان دے دیں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔

فعلک باخع نفسک علی اثارھم ان لم یؤمنوا بھذا الحدیث اسفاً

شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے۔

مع العسر یسرا کی تفسیر

غرض مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ایذائیں پہنچتی تھیں جن کے متعلق اس آیت میں حق تعالیٰ نے آپ کو تسلی فرمائی ہے فرماتے ہیں **ان مع العسر یسرا** اس میں الف لام عہد کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ایذائیں اس وقت آپ کو دی جا رہی ہیں اور جو دشواری اس وقت موجود ہے اس کے بعد آسانی ہونے والی ہے۔

یہ تفسیر حق تعالیٰ نے میرے قلب پر القاء فرمائی ہے۔ اس سے بہت سے اشکالات رفع ہو گئے اگر لام عہد کے لئے نہ مانا جائے تو ایک اشکال تو یہ ہوتا ہے کہ ہم بہت سی مشکلات کو آسان ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے خیر مسلمانوں کے مصائب کے متعلق تو یہ جواب بھی دے سکتے ہیں کہ آخر میں یسر ہو جائے گا لیکن اگر العسر کو عام رکھا جائے تو اس میں کفار کے مصائب بھی داخل ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ان کی مصائب قیامت میں بھی حل نہ ہوں گی۔ اب لام کو عہد کے لئے ماننے سے کوئی اشکال نہ رہا۔

لیکن اس پر یہ سوال باقی رہے گا کہ پھر بزرگوں نے اس کو عام طور پر ہر جگہ کیوں پیش کیا ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی پریشانی عرض کی تو آپ نے فرمایا **لن یغلب عسر یسرین** (ایک سختی دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں) اور ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اسی آیت کی طرف ہے کہ ایک عسر دو یسر پر غالب نہیں آ سکتا بوستان کے ان اشعار میں

کسے مشکلے برد پیش علیؓ الخ (کسی نے اپنی مشکل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کی)

یہی حکایت مراد ہے بعض نے اس حکایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے جواب میں فرمایا تھا۔

اذا ضاقت بک البلوی ففکر فی الم نشرح   فعسر بین یسرین اذا فکرتہ فافرح

(جب تجھ کو تنگی آ گھیرے تو سورہ انشراح میں غور و فکر کر کہ اس میں ایک تنگی کو دو آسانیوں کے درمیان ہے سوچ اور خوش ہو)

اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یوں نہیں بلکہ اس طرح ہونا چاہیے۔

فبعد العسر یسر ان اذا فکرتہ فافرح

آپ نے قبول فرمایا یہ دونوں شعر اس میں تو مشترک ہیں کہ عسر ایک ہے اور یسر دو اور اس

کی وجہ یہ ہے اصولی قاعدہ ہے کہ معرفہ کا اعادہ اگر تعریف کے ساتھ ہو وہ عین اول ہوتا ہے اور نکرہ کا اعادہ اگر تنکیر کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ غیر اول ہوتا ہے تو آیت میں عسر تو ایک ہوا اور یسر دو ہوئے۔ اس میں تو دونوں شعر مشترک ہیں اور اس میں مختلف ہیں کہ یہ یسر عسر واحد کے بعد ہیں یا اس کے طرفین میں ہیں مگر اشکال مذکور دونوں صورتوں میں ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ قول اول تو بطریق اسناد حضرت علیؓ سے ثابت نہیں اور ثابت بھی ہو تو یہ علم اعتبار کے طور پر ارشاد فرمایا ہوگا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالی کے معاملات کبھی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ایک عسر کے ساتھ یا بعد دو یسر عطا فرماتے ہیں چنانچہ حضورؐ کے ساتھ یہ معاملہ نص سے ثابت ہے اور دوسروں سے نفی نہیں تو امید رکھو کہ حق تعالی تم سے بھی یہی معاملہ فرمائیں گے **وانا عند ظن عبدی بی** (میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں) کو ملا کر یہ مضمون زیادہ قوی ہو گیا کہ اس امید سے ان شاء اللہ تمہارے ساتھ ضرور ایسا ہی معاملہ ہوگا۔ تو اس سے تسلی حاصل کرو۔ یہ حاصل ہوگا حضرت علیؓ کے قول کا تو وہ میری تفسیر کے منافی نہیں۔

بہر حال اس آیت میں حضورؐ کو تسلی ہے نیز میرے ذوق میں ظاہر یہ ہے کہ اس میں **ان مع العسر یسرا** کا تکرار محض تاکید کے لئے ہے اور تاکید میں نکتہ یہ ہے رسول اللہؐ کو مکہ میں مختلف قسم کی تکلیفیں تھیں تو ایک مرتبہ **ان مع العسر یسرا** فرمانے سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید کسی خاص نوع عسر کے زوال کی خبر دی گئی ہے اس کے بعد یہ فکر ہوتا کہ نہ معلوم کون سی عسر کے زوال کی خبر دی گئی ہے تکرار جملہ سے یہ شبہ رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ ہر قسم کے عسر کے لئے آسانی کا وعدہ ہے اور یہ استغراق عہد کے منافی نہیں۔ مراد افراد معہودہ کا استغراق و عموم ہے اور لفظ مع میں نکتہ یہ ہے کہ گو مراد معنی بعد ہیں مگر لفظ بعد سے یہ وہم ہوتا ہے کہ نہ معلوم کتنی مدت کے بعد یسر ہوگا۔ اس لئے لفظ مع اختیار فرمایا کہ کچھ زیادہ دیر نہیں ایسی بعدیت ہے کہ گویا معیت ہی ہے۔ یہ گفتگو تو تفسیر کے متعلق تھی۔

احتمالات عقلیہ اب میں اس آیت سے وہ مضمون بیان کرتا ہوں جو بطور کلیت کے اول میرے ذہن میں آیا تھا اور مضمون کلی سے حدیث **اذا انتصف شعبان** (سنن ابی داؤد ۲۳۳۷، مشکوۃ المصابیح ۱۹۷۴) جب نصف شعبان گزر جائے) کی تائید بھی ہو جائے گی۔ وہ مضمون کلی یہ ہے کہ ایک ضد کبھی دوسری کے حصول کا سبب ہو جاتی ہے یہ تو ظاہر ہے کہ رافع ضد ہو جائے۔

لانِ الضدین لا یجتمعان

دو ضدیں کبھی جمع نہیں ہوتیں۔

مگر کبھی ضد جالب ضد بھی ہوتی ہے گو بواسطہ سہی۔ واقعات میں اس کی نظیر یہ ہے جیسے پیاس لگی جس سے پانی کی تلاش ہوئی اور قاعدہ ہے من جد وجد (جو کوشش کرتا ہے وہ پا لیتا ہے) آخر پانی ملا تو پیاس بجھ گئی۔ یہاں پیاس سیرابی کا سبب ہوگئی۔ یہ اجمالی بیان ہے اس مضمون کلی کا۔ اب میں اول اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں پھر آیت سے اس کا تعلق بیان کروں گا پھر اس حدیث کی تفریع اس مضمون کلی پر عرض کروں گا۔

اب سمجھئے کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا کر جب دیکھا جائے تو اس کی تین حالتیں ہوں گی۔ یا تو دونوں میں مناسبت ہوگی یا منافات ہوگی یا نہ مناسبت ہے نہ منافات ہے یہ تو مطلق تعلق و عدم تعلق کے اعتبار سے تقسیم تھی۔

اب دوسرے اعتبار سے تقسیم کرتا ہوں یعنی خاص تعلق سببیت کے اعتبار سے وہ یہ کہ ایک شے یا تو دوسری شے کے حصول کا سبب ہے یا رفع کا سبب ہے یا نہ سبب حصول ہے نہ سبب رفع ہے اس وقت میں ان چیزوں سے تو بحث نہیں کرتا جن میں باہم کوئی علاقہ ہی نہیں نہ مناسبت کا نہ منافات کا۔ کیونکہ جب ان میں کوئی تعلق ہی نہیں تو سببیت و مسببیت کا تعلق بھی نہ ہوگا اور میں اس وقت اسباب میں گفتگو کر رہا ہوں پس تقسیم اول اور تقسیم ثانی کی ایک ایک شق میری بحث سے خارج ہے۔ صرف ہر قسم کی دو شقوں میں گفتگو ہے۔

اب مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ اشیاء میں باہم یا مناسبت ہے یا منافات ہے پھر ان میں سے آیا تو ایک دوسرے کے حصول کا سبب ہے یا رفع کا غرض دو قسم کی چیزیں ہیں اور دو قسم کے اثر ہیں احتمالات عقلیہ کل چار ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شے یا دوسرے کی مماثل ہے یا منافی پھر ہر ایک میں دو احتمال ہیں یا تو ایک دوسرے کا جالب ہے یا سالب ہے تو مماثلین کی بھی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک وہ جو مماثل آخر کا جالب ہے دوسرے وہ جو اپنے مماثل کا سالب ہے اسی طرح متنافیین کی بھی دو قسمیں ہوئیں یا تو منافی آخر کا جالب ہے یا سالب ہے ان چار صورتوں میں دو احتمال تو قرین قیاس ہیں کہ مماثل جالب مماثل ہو اور منافی سالب منافی ہو اور دو بعید از قیاس ہیں کہ مماثل سالب مماثل ہو اور ضد جالب ہو۔

جو صورتیں قرین قیاس ہیں ان کا وقوع بکثرت ہے اور ظاہر ہے۔

مثلاً سرد اشیاء کے استعمال سے کسی شخص کے مزاج میں برودت کا غلبہ ہو گیا تو مماثل جالب مماثل ہو گیا اسی طرح یہ بھی بکثرت واقع ہے کہ برودت کا غلبہ تھا اور حرارت سے کام لیا گیا تو ضد رافع ہو گئی

مگر عجائب قدرت سے یہ ہے کہ دوسری دو صورتیں بھی واقع ہیں کہ مماثل سالب مماثل ہو اور اس کو بھی بعض عقلاء یعنی اطباء نے تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ ویدک اور طب ہندی کی بناء اسی پر ہے یہ لوگ علاج بالمثل کرتے ہیں یعنی مثلاً حرارت کو ادویہ حارہ سے رفع کرتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ اس طریق علاج سے بھی نفع ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے اب یا تو۔

انا عند ظن عبدی بی (مسند الامام احمد ۲:۳۱۵، ۴.۱۰۶)

میں اپنے بندوں کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔

کے طور پر یہ نفع ہوتا ہو (کہ بندہ خدا کے ساتھ جو گمان کر لیتا ہے اللہ تعالی اس کو پورا کر دیتے ہیں یا ان لوگوں کو یہ مسئلہ مکشوف ہو گیا ہے کہ مماثل سالب مماثل ہوتا ہے۔

کشف کوئی کمال دینی بھی نہیں ورنہ ظاہر میں تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن عقلاء کے مان لینے سے اس میں بھی زیادہ بعد نہیں رہا۔

مگر حیرت در حیرت یہ ہے کہ احتمال رابع کا وقوع بہت ہی زیادہ ہے اور باوجود اس کے عقلاء میں سے اس کی طرف کسی کی نظر نہیں گئی کہ ضد جس طرح سالب ضد ہوتی ہے اسی طرح جالب ضد ہوتی ہے اس کی طرف شریعت مقدسہ نے اشارہ کیا ہے جیسے عنقریب بیان ہوتا ہے اس کی ایک نظیر تو میں نے اوپر بتلائی ہے کہ پیاس سیرابی کا سبب ہوتی ہے بھوک سیر شکمی کا سبب ہوتی ہے کیونکہ بھوک لگنے کے بعد کھانے کی تلاش ہوتی ہے پھر محنت کر کے کھانا حاصل کیا جاتا ہے جس کے کھانے سے سیر شکمی ہو جاتی ہے۔

اور لیجئے مصائب سبب ہو جاتے ہیں رفع مصائب کا یا تو اس طرح مصیبت کے بعد حصول راحت کی تدبیریں کی جاتی ہیں یا اس طرح کہ مصیبت پر صبر و تحمل کیا جاتا ہے والصبر مفتاح الفرج یعنی صبر کے بعد بہت جلد راحت حاصل ہوتی ہے) تو مصیبت سے صبر حاصل ہوا اور صبر سے راحت حاصل ہوئی۔ اس طرح مصیبت سبب راحت ہو گئی۔

نیز کبھی جبن سبب ہو جاتا ہے شجاعت کا کیونکہ بزدل آدمی کو دشمن سے خوف جو زیادہ ہوتا تو وہ مقابلہ کے وقت مدافعت میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتا ہے اور شجاع بے خطر ہوتا ہے وہ اپنے مقابل کو زیادہ وقیع نہیں سمجھتا اس لئے معمولی طور پر حملہ کرتا ہے جس سے بعض دفعہ کمزور و بزدل غلبہ حاصل کر لیتا اور شجاع مغلوب ہو جاتا ہے پھر جب بزدل کو ایک دفعہ کسی بڑے بہادر کے مقابلہ میں کامیابی ہو جاتی ہے تو آئندہ کے لئے اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ جبن کی بدولت چند روز میں شجاع بن جاتا ہے۔

اسی طرح غنا سبب ہو جاتا ہے افلاس کا کیونکہ غنا سے بے فکری ہوتی اور بے فکری میں فضول خرچی ہوتی ہے جس سے افلاس تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور افلاس کا سبب غنا ہونا تو کثرت سے مشاہد ہے یہ امر عجائب میں سے ہے کہ ضد جالب ضد ہوتی ہے اور سنیئے حدیث میں آتا ہے۔

من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰہ (الترغیب والترہیب للمنذری ۳.۵۶۰، ۴ ۱۹۷)

جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کی اللہ تعالیٰ نے اس کے درجے کو بلند فرمایا یہاں پستی بلندی کا سبب ہو گئی۔

قبض و بسط

اور لیجئے معاملات باطن میں کبھی قبض سبب ہوتا ہے بسط کامل کا۔ کیونکہ حالت قبض میں یہ شخص توبہ و استغفار و گریہ و زاری کرتا ہے اور رضاء حق پر راضی رہتا ہے جو صبر کا اعلیٰ درجہ ہے **والصبر مفتاح الفرج** (صبر فراخی کی چابی ہے) اس لئے قبض کے بعد پہلے سے بھی زیادہ بسط حاصل ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

چونکہ قبض آید تو دروے بسط بیں　　　تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں!

(اے سالک جب تجھ پر قبض طاری ہو تو اس کے بعد بسط دیکھ خوش و خرم رہو پیشانی پر بل مت ڈالو)

مولانا نے یہاں پر دروے بسط بیں فرمایا ہے کہ عین قبض میں تم بسط دیکھو۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے ان **مع العسر یسرا** فرمایا ہے اور جس طرح آیت میں مع بمعنی بعد ہے اسی طرح مولانا کے کلام میں دروے بمعنی بعد وے ہے۔ جس کو مبالغۃً زیادت تسلی کے لئے دروے سے تعبیر فرمایا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب نے ایک بات ایسی فرمائی تھی جس سے دروے بسط ہیں اپنے حقیقی معنوں میں بھی صحیح ہوسکتا ہے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب قلب پر وساوس وخطرات کا ہجوم ہو اور کسی طرح بند نہ ہوتے ہوں (اور یہی قبض کی حالت میں پیش آتا ہے) تو تم اس وقت ان خطرات ہی کو حضور و دلجمعی کا اس طرح سبب بناؤ کہ یوں سوچو کہ خدا تعالی کی کیا قدرت ہے کہ میرے دل میں ایک دریا خیالات کا بہادیا جس کے بند کرنے سے بندہ عاجز ہے اس وقت تم ان خطرات ہی کا مراقبہ کرو اور انہی سے قدرت کا مطالعہ کرو۔ اب یہ خطرات جو اول سبب بعد تھے سبب قرب بن جائیں گے اور عین قبض کی حالت میں دروے بسط ہیں کا منظر سامنے ہو جائے گا کہ وساوس بھی ہیں جو قبض ہے اور قدرت کا مشاہدہ بھی ہے جو بسط ہے۔

سبحان اللہ یہ ہیں علوم جن کو علوم کہنا چاہئے پھر قبض کے بعد بسط ہوتا ہے اس وقت جو فرحت سالک کو ہوتی ہے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ عارف شیرازی کے کلام میں بکثرت قبض وبسط کا بیان ہوا ہے۔ ایک مقام پر قبض کے متعلق فرماتے ہیں۔

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش　　بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال　　مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(باغبان کو اگر خواہش تو اس کو بلبل کی طرح ہجر کے کانٹوں کی اذیت پر صبر کرنا چاہئے اے دل محبوب کی زلف کے پھندے میں پھنس کر پریشانی سے گریہ وزاری مت کر سمجھدار پرندہ جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر وتحمل چاہئے)

اور ایک مقام پر بسط کی حالت میں فرماتے ہیں۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

(صبح کے وقت مجھ کو غصہ سے نجات دی گویا اندھیرے میں مجھ کو آب حیات بخشی)

اس کلام کے سننے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسی فرحت خوشی حاصل ہوئی ہے اور چونکہ یہ بسط مرشد کی توجہ سے حاصل ہوا تھا اس لئے آگے فرماتے ہیں۔

کیمیا نیست عجب بندگی پیر مغاں　　خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

(شیخ کی پوری تابعداری عجیب کیمیا ہے کہ اس کے پیروں کی خاک بننے سے بڑے درجات ملے)

نافع توجہ

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ توجہ مرشد کب نافع ہوتی ہے جب کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اس کے بتلانے کے موافق عمل کیا جائے اور اپنے کو اس کے ہاتھ میں مثل مردہ بدست زندہ کر دیا جائے کہ وہ جس طرح تم میں چاہئے تصرف کرے اس کے بعد جو مرشد کی توجہ ہوتی ہے وہ واقعی کیمیا ہوتی ہے اس سے میں ان لوگوں کے کان کھولنا چاہتا ہوں جو ہوسناک ہیں جو ایک توجہ سے کامل ہونا چاہتے ہیں تو وہ سمجھ لیں کہ توجہ کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک توجہ بلا عمل یہ عادۃً بے اثر ہے۔
(۲) ایک توجہ مع العمل یہ موثر ہے۔

سو یاد رکھو کہ توجہ بلا عمل کا اثر یہ محض موجود ذہنی ہے۔ اس کا خارج میں وقوع نہیں اور جہاں تم اس کا وقوع سمجھتے ہو وہاں بھی عمل ضرور موجود ہے تم کو اس کی خبر نہ ہو۔ کیونکہ اعمال کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) اعمال جوارح (۲) اعمال قلبیہ

اعمال جوارح کی اطلاع تو دوسروں کو ہو سکتی ہے مگر اعمال قلب کی اطلاع خدا کے سوا یا خاصان خدا کے سوا دوسروں کو نہیں ہوتی۔ تو بعض طالب ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ظاہری اعمال کچھ زیادہ نہیں ہوتے نہ وہ کچھ زیادہ مجاہدے کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اعمال قلبیہ ان کے زیادہ ہوتے ہیں وہ ہر وقت قلب کی نگہداشت میں مشغول ہوتے ہیں اور یہ ظاہری مشاہدہ سے بھی اشد ہے۔ تو جن کو تم بلا عمل کے توجہ سے کامیاب ہوتا دیکھتے ہو وہ اس عمل شدید کے عامل ہیں۔ حقیقت میں وہ بلا عمل کے توجہ محض سے کامیاب نہیں ہوئے بلکہ توجہ مع العمل ہی سے کامیاب ہوئے ہیں۔

بس اس توجہ کے نفع کا طریقہ یہ ہے کہ شیخ نے ایک کام بتلایا اور طالب نے اس کے موافق عمل کیا۔ شیخ کو اس کی اطلاع ہوئی وہ جوش میں آ کر اس کے لئے دعا کرتا ہے اور اس کی طرف توجہ پہلے سے زیادہ کرتا ہے اس سے بے شک نفع ہوتا ہے کیونکہ

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مراد متقیں

(تو جو چاہے گا وہی اللہ تعالیٰ چاہیں گے اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کی مراد پوری فرماتے ہیں)

اللہ تعالیٰ مقبولین کی مراد کو پورا کرتے ہیں جب بھی کسی شخص کی کامیابی چاہتے ہیں تو حق تعالیٰ بھی اس کو کامیاب ہی کر دیتے ہیں اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جب عمل کی ہر حالت میں ضرورت ہے اور توجہ بھی عمل ہی سے نافع ہوتی ہے تو پھر توجہ کی کیا ضرورت ہے؟

تو بات یہ ہے کہ کام دونوں ہی کے مجموعہ سے چلتا ہے عمل اور توجہ دونوں ہی کی ضرورت ہے دیکھو جو طالب علم استاد کے کلام کو شوق سے سنتا ہے استاد کو اس پر توجہ زیادہ ہوتی ہے پھر اسی کی توجہ سے اس کو دوسروں سے زیادہ علم حاصل ہوتا ہے کتابیں تو سب ہی ختم کر لیتے ہیں مگر جس کا نام علم ہے یعنی فہم سلیم اور تفقہ فی الدین وہ اسی کو حاصل ہوتا ہے جس نے توجہ سے پڑھا اور اساتذہ کو راضی رکھا ہو اور جس طالب علم نے محض محنت ہی کی ہو مگر اساتذہ کو راضی نہ رکھا ہو تجربہ کر لیا جائے کہ اس کو حقیقی علم حاصل نہ ہوگا گو الفاظ یاد ہو جائیں۔

بہر حال توجہ شیخ نہایت ضروری ہے مگر وہ بعد العمل ہی مفید ہے۔ قبل از عمل مفید نہیں الا نادراً وہو کالمعدوم اور بلا عمل کی توجہ سے تو کیا توقع رکھی جائے خواہ خدا تعالیٰ کی بھی عادت یہی ہے کہ ان کو بھی توجہ بعد العمل ہی ہوتی ہے اور اگر کسی کو عمل کے غیر ضروری ہونے کا اس حدیث سے شبہ ہو کہ ایک بار رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا

کہ جنت میں کوئی اپنے عمل سے نہ جائے گا

اس پر صحابہؓ نے عرض کیا۔

ولا انت یا رسول اللہ یعنی یا رسول اللہ کیا آپ بھی اپنے عمل سے نہ جائیں گے۔

حضورؐ نے فرمایا۔ کہ ہاں میں بھی عمل سے نہ جاؤں گا مگر یہ کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت میں مجھے ڈھانپ لیں۔

چنانچہ اس حدیث کو بعضے لوگ عدم ضرورت عمل کی تائید میں بیان کیا کرتے ہیں مگر یہ ان کی غلطی ہے۔ یہ حدیث تو ضرورت عمل کو بتلا رہی ہے کیونکہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ جنت میں جو کوئی جائے گا خدا تعالیٰ کی رحمت سے جائے گا اب نصوص سے معلوم کرو کہ مورد رحمت کون لوگ ہیں سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان رحمة الله قريب من المحسنين

رحمت حق تعالیٰ نیکوکاروں کے قریب ہے۔

معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ بھی عمل ہی کے بعد توجہ فرماتے ہیں بدوں عمل کے وہ بھی توجہ نہیں فرماتے ایک جواب تو یہ ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث کے یہ معنی نہیں کہ عمل کو دخل ہی نہیں یہ تو نصوص قطعیہ کے خلاف ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ وہ علت تامہ کا جزو اخیر نہیں ہے وہ جزو اخیر رحمت ہی ہے۔ گو عمل بھی علت تامہ کے اجزاء میں سے ہو۔ بہر حال عمل کی ضرورت دلائل قطعیہ سے ثابت ہے۔

بس اب جو لوگ محض توجہ سے کامیاب ہونا چاہتے ہیں اور عمل نہیں کرتے وہ بندہ نفس ہیں آرام طلب ہیں۔ ان میں عشق وطلب نہیں بھلا عشق اور چین؟ دعوے محبت اور آرام طلبی۔

این خیالست و محال ست و جنوں
(یہ خیال ہے اور ناممکن ہے اور دیوانگی ہے)

اور میں کہتا ہوں کہ اگر توجہ بلا عمل مفید بھی ہوتی تب بھی عاشق کو بدوں عمل کے چین کیوں کر آ سکتا ہے۔ عاشق سے کبھی نہیں ہو سکتا کہ محض دعویٰ عشق پر اکتفا کرے اور عمل سے اس کا ثبوت نہ دے ایسے عشق کو تو ہم اور آپ بھی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔

ایک رئیس خان صاحب فرماتے تھے کہ بچپن میں ایک طالب علم مجھ پر عاشق ہوا۔ میں نے کہا اگر تم میرے عاشق ہو تو سیر بھر چونہ بے بجھا کھالو بس یہ سن کر خاموش رہ گئے۔ میں نے ایک جوتا نکال کر مارا کہ اب سے عشق کا نام نہ لینا۔

ارے جب مخلوق دعویٰ عشق بلا عمل پر راضی نہیں تو خدا تعالیٰ اس عشق کو کیسے قبول فرما لیں گے بس یہ لوگ ایسے عاشق ہیں کہ لینے دینے کے لئے منہ میں خاک محبت رکھیں گے پاک طالب کی شان تو یہ ہوتی ہے کہ عمل اور مجاہدہ کے بعد اگر ناکامی بھی ہو۔ تب بھی عمل سے دلگیر نہیں ہوتا اور برابر کام میں لگا رہتا ہے ایک عارف فرماتے ہیں

یابم اورا یا نہ یابم جستجوئے می کنم   حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی طلب میں لگا رہوں گا وہ ملے یا نہ ملے اس کی آرزو میں لگا رہوں گا۔

اور مولانا فرماتے ہیں۔

گر مرادت را مذاق شکر ست   بے مرادی نے مراد دلبر ست

عاشق کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ میرے عمل پر کچھ ثمرہ مرتب ہوا یا نہیں اور عمل سے فائدہ ہوتا ہے یا نہیں وہ تو محض محبت کی وجہ سے محبوب کی خدمت میں لگا رہتا ہے چاہے کامیابی ہو یا ناکامی اور یوں کہتا ہے۔

یعنی میں ملنا چاہتا ہوں محبوب نہیں ملنا چاہتا تو میں اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے سامنے چھوڑ دیتا ہوں۔

معراج یونس علیہ السلام

مضمون طویل ہو گیا۔ یہ بات اس پر چلی تھی کہ قبض سبب بسط ہو جاتا ہے حالانکہ دونوں باہم ضدیں ہیں لیکن ضد جالب ضد ہو جاتی ہے اسی طرح فناء سبب بقاء ہو جاتا ہے اہل اللہ اسی واسطے اپنے کو مٹاتے ہیں تاکہ بقاء حاصل ہو اور مجاہدہ کے بعد مشاہدہ حاصل ہو بلکہ وہ فناء ہی بقا ہو جاتا ہے اور مجاہدہ ہی مشاہدہ ہو جاتا ہے۔

اور ذلت ہی عزت ہو جاتی ہے کیونکہ بعض عزت بصورت ذلت ہوتی ہے اور بعض قرب بصورت بعد ہوتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گفت پیغمبرؐ کہ معراج مرا نیست بر معراج یونسؑ اجتبا

یہ روایت بالمعنیٰ ہے مولانا اس مقام پر حدیث لاتفضلوبن علی یونس بن متی (مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو) کی تفسیر کر رہے ہیں اور یہی حدیث میں سرخی بھی لکھی ہے مطلب یہ ہے کہ رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ میری معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر ترجیح نہ دو۔

یونس علیہ السلام کی معراج کا قصہ یہ ہے کہ آپؑ نے ایک دفعہ اپنی قوم کو عذاب سے ڈرایا کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب نازل ہوگا انہوں نے مدت پوچھی آپؑ نے میعاد بتلا دی اس تاریخ کے قریب کہیں دوسری جگہ چلے گئے پیچھے قوم پر عذاب آیا۔ آثار عذاب دیکھ کر لوگ ان کی تلاش میں نکلے کہ یونس علیہ السلام مل جائیں تو ان پر ایمان لے آئیں مگر یونس علیہ السلام نہ ملے تو عقلاء نے کہا اگر یونس نہیں ہیں تو رب یونس تو ہیں تم ان سے رجوع کرو اور یونس علیہ السلام پر غائبانہ ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ایمان کا علم ہو جانا کافی ہے۔

واقعی یہ لوگ عاقل تھے افسوس آج کل صدیوں کے مسلمانوں کو بھی ان نو مسلموں

کے برابر عقل نہیں کہ بیعت کے لئے ہاتھ میں ہاتھ دینے کو ضروری سمجھتے ہیں مگر ان نومسلموں کی عقل پر آفرین ہے کہ حقیقت کو بہت جلدی سمجھ گئے کہ بیعت حقیقی اتباع ہے ہاتھ میں ہاتھ دینا ضروری نہیں بلکہ پیر کا سامنے ہونا بلکہ اس کا جاننا بھی ضروری نہیں چنانچہ وہاں پیر غائب تھے اور ان لوگوں نے غائبانہ بیعت کرلی جس کی پیر کو بھی خبر نہ تھی مگر ایسی سچی بیعت تھی کہ خدا تعالیٰ کے یہاں قبول ہوئی اور عذاب ٹل گیا۔

تب عذاب کی میعاد گزر گئی تو یونس علیہ السلام نے آنے جانے والوں سے قوم کا حال پوچھا معلوم ہوا کہ وہ عذاب سے بچ گئے اب ان کو وہاں جاتے ہوئے شرم آئی کہ مجھے جھٹلائیں گے کہ تم فلاں تاریخ تک عذاب آنے کا کہتے تھے ہم تو عذاب سے ہلاک نہ ہوئے اس کی شرم کی وجہ سے قوم کی طرف نہ گئے بلکہ وہاں سے بہت دور چلے گئے اور وحی کا انتظار نہ کیا اور آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ قوم عذاب سے میری تصدیق ہی کی بدولت بچی ہے اور اگر میں واپس جاؤں گا تو پہلے سے زیادہ تصدیق ہی کریں گے بہرحال آگے بڑھتے چلے گئے راستہ میں ایک دریا پڑا۔ اس سے پار ہونے کو کشتی میں سوار ہوئے کچھ دور چل کر کشتی بھنور میں پھنس گئی ناخدا نے کہا معلوم ہوتا ہے اس کشتی میں کوئی ایسا غلام ہے جو اپنے آقا سے بھاگ کر آیا ہے وہ کشتی میں سے نکل جائے ورنہ سب غرق ہو جائیں گے اس زمانہ کے کافر بھی مصائب کا سبب معاصی کو سمجھتے تھے افسوس آج کل مسلمان بھی نہیں سمجھتے الا ماشاء اللہ یہ سن کر یونس علیہ السلام کو تنبہ ہوا کہ میرا بدوں اذن الٰہی قوم کے بلاد سے چلا آنا اچھا نہ ہوا مجھے اللہ تعالیٰ سے اذن لینا چاہئے تھا اس تنبہ کے بعد آپ سے رہا نہ گیا اور لوگوں سے کہا بھائی وہ غلام میں ہوں جو اپنے آقا سے بھاگ کر آیا ہوں لوگوں کو آپ کی بات کا یقین نہ آیا اور کہا آپ کی صورت تو غلاموں کی سی نہیں بلکہ سرداروں جیسی ہے بھلا آپ غلام کدھر سے ہوئے سچ ہے۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی
نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(ولی کے اندر نور حق ظاہر ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو انہیں اچھی طرح دیکھ لے)

خصوصاً انبیاء علیہم السلام کو تو حق تعالیٰ حسن صورت حسن سیرت سب کچھ اتنا عطا فرماتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں کسی کو بھی حاصل نہ ہو پھر ان کمالات ظاہرہ و باطنہ کے ہوتے ہوئے ان پر غلامی کا کسی کو شبہ ہو سکتا تھا غرض آپ اصرار کر رہے تھے کہ بھاگا ہوا غلام میں ہی

ہوں۔ تم مجھے دریا میں ڈال دو اور لوگ انکار کر رہے تھے آخر کار قرعہ اندازی پر فیصلہ ہوا کہ جس کے نام کا قرعہ نکل آئے اسی کو ڈال دیا جائے گا۔ قرعہ میں بھی یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا لوگوں نے کہا یہ تو اتفاقی بات ہے پھر قرعہ ڈالو۔ تین دفعہ قرعہ ڈالا گیا اور ہر دفعہ یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا اب تو لوگوں نے مجبور ہو کر آپ کو دریا میں ڈال دیا۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فساھم فکان من المدحضین

یونس بھی شریک قرعہ ہوئے وہی ملزم ٹھہرے

وہاں باذن حق ایک مچھلی منہ کھولے ہوئے تیار بیٹھی تھی جس نے فوراً آپ کو نگل لیا۔ سمندر میں بعض مچھلیاں بہت ہی بڑی ہوتی ہیں۔ نگلنے کو تو مچھلی نے نگل لیا مگر وہاں معدہ کو حکم ہو گیا کہ خبردار یونس علیہ اسلام کو ہضم نہ کرنا۔ اب وہ پیٹ میں صحیح سالم زندہ رہے چالیس دن کے بعد مچھلی نے کنارہ پر آپ کو اگل دیا جس کا قصہ تفاسیر میں مفصل موجود ہے۔

اس قصہ سے کسی ناواقف کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید یونس علیہ السلام کی یہ حالت کامل نہ تھی خصوصاً جب کہ وہ قرآن کے بعض عنوانات پر بھی نظر کرے جیسے اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائے جب کہ یونس علیہ السلام نے دعا کی اور وہ غم سے گھٹ رہے تھے۔ اگر خداوندی احسان ان کی دستگیری نہ کرتا تو وہ میدان میں بدحالی کے ساتھ ڈالے جاتے۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہے۔

اور مچھلی والے کا تذکرہ کیجئے جب وہ خفا ہو کر چل دیئے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان پر کوئی دارو گیر نہ کریں گے پس انہوں نے اندھیروں میں پکارا کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں آپ پاک ہیں میں بے شک قصوروار ہوں۔

مغاضبا کی تفسیر بعض نے تو کچھ اور ہی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے روٹھ کر چلے گئے تھے ہماری تو یہ ہمت نہیں مگر اشکال اس پر بھی نہیں کیونکہ اولال انبیاء علیہم السلام سے ثابت ہے چنانچہ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

اے اللہ! اگر یہ مختصر جماعت مسلمانوں کی ہلاک ہوگئی تو آج کے بعد زمین میں کوئی آپ کی عبادت نہ کرے گا۔

اس میں بجز ادلال کے اور کیا تاویل ہو سکتی ہے ایسے ہی یونس علیہ السلام کا بدوں

اذن کے چلا آنا بطور ادلال کے تھا کہ عذاب کیوں نہیں نازل فرمایا اسی کو حق تعالیٰ نے مغاضبت سے تعبیر فرمایا۔

رہا یہ کہ پھر ادلال پر مواخذہ کیوں ہوا؟ تو بات یہ ہے کہ جس طرح انبیاء حق تعالیٰ پر ناز کرتے ہیں ایسے ہی کبھی وہ بھی ادلال فرماتے ہیں اور ان کو اس کا زیادہ حق ہے کیونکہ محبوب ہیں تو یہ مواخذہ بھی بطور ادلال کے تھا جس کو دوسری عبارت میں عتاب محبوبانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بہرحال اس قصہ سے کسی کو یونس علیہ السلام کے کمال پر شبہ ہو سکتا تھا رسول اللہؐ نے حدیث **لاتفضلونی علی یونس بن متی** (میری معراج کو یونس کی معراج پر ترجیح نہ دو) میں اس شبہ کو رفع فرمایا ہے کیونکہ ان کی یہ حالت کمال کے منافی نہ تھی یہاں سے لوگ یہ مسئلہ بھی سمجھ لیں کہ انبیاء علیہم السلام میں باہم ایسا موازنہ نہ کرنا چاہئے جس سے کسی کی تنقیص لازم آئے اور حدیث **لاتفضلونی** (مجھے ترجیح نہ دو) میں اسی تفضیل کی ممانعت ہے اور یہ صورت اکثر تفصیلی تفضیل میں پیش آتی ہے باقی اجمالی تفضیل کا مضائقہ نہیں جو نصوص میں وارد ہے۔

مولانا اس حدیث کی تفسیر دوسری طرح کرتے ہیں اور غالباً اس کا منشاء عموم کے تحت میں خصوص کو داخل کرنا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ حدیث میں تفصیل جزئی کی ممانعت ہے اور مطلب یہ ہے کہ میری خاص حالت کو یونس علیہ السلام کی کسی خاص حالت پر فضیلت نہ دو مولانا اس عموم میں معراج کو بھی داخل کرتے ہیں کہ میری معراج کو بھی یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو اس کے بعد عجیب بات بیان فرمائی ہے کہ جس قصہ کو تم یونس علیہ السلام کے لئے منافی کمال سمجھتے ہو در حقیقت وہ ان کی معراج تھی پس مولانا فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کو اس واقعہ میں معراج حاصل ہوئی تھی اور یہ مشہور ہے کہ حضورؐ کے سوا کسی نبی کو معراج نہیں ہوئی اس کا مطلب یہ ہے کہ جس صورت میں آپ کو معراج ہوئی اس صورت سے کسی کو نہیں ہوئی ورنہ حقیقت معراج جملہ انبیاء میں مشترک ہے۔

حقیقت معراج

حقیقت کے اعتبار سے ہر پیغمبر کو معراج ہوئی ہے کیونکہ معراج کی حقیقت ہے قرب حق اور ظاہر ہے کہ قرب حق جملہ انبیاء کو حاصل تھا اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ قرب حق

کسی خاص صورت کے ساتھ مقید نہیں بلکہ کبھی بصورت عروج ہوتا ہے اور کبھی بصورت نزول ہوتا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں:-

قرب نیز پستی؟ ببالا رفتن است   قرب حق از قید ہستی خود رستن است

اور قرب بصورت نزول کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے حدیث میں آتا ہے سب سے زیادہ قرب بندہ کو جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے وہ حالت سجدہ میں ہوتا ہے نیز قرآن میں ہے واسجدوا قترب یعنی سجدہ کرو اور مقرب بن جاؤ۔

جس سے سجدہ کا محل قرب ہونا معلوم ہوا حالانکہ ظاہر میں وہ پستی ذلت اور نزول کی حالت ہے اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کو اس واقعہ میں معراج بصورت نزول ہوئی تھی تو یہ واقعہ منافی کمال نہ تھا بلکہ عین کمال تھا کیونکہ معراج کا کمالات سے ہونا مسلم ہے۔

باقی ہمارے حضورؐ چونکہ صورت وحقیقت کے جامع ہیں اس لئے آپ کو معراج بصورت عروج ہوئی جس میں حقیقت اور صورت دونوں کو جمع کر لیا گیا پھر آپ کو معراج میں جس طرح عروج تھا نزول بھی تھا اور نزول میں بھی صورت معنی دونوں مجتمع تھے۔ صورت تو یہ کہ آپ بلندی سے زمین کی طرف تشریف لائے اور حقیقت یہ کہ فنا کے بعد بقا حاصل ہوا اور یہ نزول ہے جس کو اہل سلوک جانتے ہیں۔

اس جامعیت کے متعلق ہمارے حاجی صاحب نے بڑے مزہ کی بات فرمائی ایک دفعہ شریف مکہ کچھ حضرت سے بدظن ہو گیا تھا کسی نے کچھ شکایت پہنچا دی تھی اسی اثناء میں ایک دن حضرت کی مجلس میں شریف صاحب کے ایک درباری حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں کچھ اس کا تذکرہ ہوا حضرت نے ان شکایات کے بے اصل ہونا ظاہر فرمایا۔ پھر حضرت کو جوش آ گیا اور فرمایا کہ اگر شریف صاحب کو ان شکایات کا یقین آ گیا ہے تو مجھے اس کی بھی پرواہ نہیں۔ وہ میرا کیا کر سکتے ہیں بس یہی نا کہ مکہ سے نکال دیں گے تو میرا اس میں کوئی ضرر نہیں۔ میں جہاں بیٹھوں گا وہاں ہی مکہ ہوگا اور وہاں ہی ہوگا مدینہ۔ کیونکہ مکہ کی حقیقت ہے تجلی الوہیت اور مدینہ کی حقیقت ہے تجلی عبدیت اور یہ عارف کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے تو پھر شریف صاحب میرا کیا بگاڑ لیں گے اگر کوئی سر بھنگ ہوتا تو بس اتنے کلام پر اکتفا کرتا مگر قربان جایئے حاجی صاحب کے کہ وہ واقعی محقق تھے اتنی بات پر کلام کو ختم نہیں

کیا بلکہ اسکے بعد یہ بھی فرمایا کہ محقق عارف ہیں وہ صورت و معنی دونوں کے جامع ہوتے ہیں وہ معنی کے ساتھ صورت کی بھی قدر کرتے ہیں اور جب تک ان سے ہوسکتا ہے مکہ مدینہ کی صورت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہاں کوئی مجبوری ہی آپڑے تو خیر۔

سبحان اللہ جوش کی حالت میں بھی فن پر پوری نظر رہی اور سنبھل کر مسئلہ کو پورا فرمادیا جس پر اب کوئی اشکال نہیں ہوسکتا ورنہ سب سے پہلے حضرت ہی پر اشکال وارد ہوتا کہ جب حقیقت مکہ مدینہ کی آپ کیساتھ ہے تو پھر صورت مکہ میں آپ نے قیام کیوں اختیار کیا۔

تو اس جامعیت کی وجہ سے رسول اللہ کو معراج بصورت عروج ہوئی۔ افسوس آج کل بعض لوگ حضورؐ کے لئے معراج جسمانی کے منکر ہیں گویا وہ کمال صورت کے منکر ہیں ان لوگوں نے بڑا ظلم کیا ہے اور ان کے پاس انکار کی کوئی بھی دلیل نہیں غرض یونس علیہ السلام کی وہ پستی اور نزول عین ترقی تھی تو ضد کے جالب ضد ہونے پر کیا شبہ کیا جائے بلکہ معاملات باطن میں تو ضد عین ضد بھی ہو جاتی ہے مگر باعتبارات مختلفہ اعتبارات کا ملانا ضروری ہے اور **ولولا الاعتبار لبطلت الحکمة** (اگر اعتبار نہ ہو تو حکمت باطل ہو جاتی ہے) یہی وہ مضمون ہے جس طرف آیت **ان مع العسر یسرا** میں میرا ذہن منتقل ہوا کہ کبھی ضد بھی جالب ضد ہو جاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سختی و دشواری کے ساتھ آسانی ہے تو اس میں لفظ مع گو سببیت پر دلالت نہیں کرتا محض اقتران پر دال ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقتران محض اتفاقی نہیں بلکہ عسر کو یسر میں دخل ہے کیونکہ عسر سے نفس پامال ہوتا ہے اور عارف کو اس وقت اپنا عجز و فنا مشاہدہ ہوتا ہے نیز صبر جمیل و رضا بالقضا حاصل ہوتا ہے یہ سب یسر و فرح کا سبب بن جاتے ہیں اس کے ساتھ جب وہ حدیث ملالی جائے کہ انبیاء پر تکالیف و شدائد اس لئے زیادہ آتے ہیں تاکہ ان کے درجات بلند ہوں پھر تو عسر کے سبب یسر ہونے میں کوئی بھی اشکال نہ رہے گا اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لیجئے کہ عسر یسر باطنی کا سبب تو ہوتا ہی ہے کیونکہ درجات بڑھتے ہیں مگر اکثر یسر ظاہری کا بھی سبب ہو جاتا ہے۔ آخر متقین کے واسطے ہے اور ہم اپنے رسولوں کی اور مومنین کی مدد ضرور کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے ایمان والوں سے اور جنہوں نے اچھے عمل کئے کہ ان کو ضرور زمین میں خلیفہ بناؤں گا اور بے شک زمین کے میرے بندے جانشین ہوں گے۔

عموماً انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے کہ اول ان پر عسر ہوا پھر انجام کار ہر طرح یسر حاصل ہوا کہ ظاہر میں بھی وہ اپنے اعداء پر غالب ہوئے پس یسر باطنی کے اعتبار سے تو مع العسر یسرا میں مع اپنے حقیقی معنوں میں ہے کہ عسر کے ساتھ ساتھ یسر ہے کیونکہ انبیاء کی ترقی درجات عین یسر کی حالت میں ہوتی رہتی ہے۔

یسر ظاہری کے اعتبار سے بمعنی بعد سے تعبیر فرمایا جو تفسیر لیجئے گا ویسے ہی مع کے معنی لے لیجئے بہرحال اولاً یہ مسئلہ خود بخود میرے دل میں آیا تھا کہ ضد سبب ضد بھی ہو جاتی ہے پھر اس آیت میں بھی اس کی طرف ذہن چلا گیا جس کی تقریر ابھی کر چکا ہوں الحمد للہ مضمون کلی بھی بیان ہو گیا اور آیت سے اس کا تعلق بھی بیان ہو گیا۔

احکام کی عظمت

اب اس حدیث کی تفریع اس مضمون پر باقی رہی۔ عرض کرتا ہوں کہ اسی مضمون کی ایک فرع یہ حدیث ہے کہ رمضان سے پہلے نصف شعبان کے بعد روزہ نہ رکھو۔ یہ ترجمہ ہوا تفریع کی تقریر آگے آتی ہے اس سے پہلے اس حکم کی حکمت بیان کرتا ہوں کہ اس سے تفریع سمجھنے میں سہولت ہوگی کہ اس حکم کی حکمت کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں گو حکمت کا معلوم کرنا ضروری نہیں اور نہ مسلمان کو عمل کے لئے اس کا انتظار ہونا چاہئے کہ حکمت کیا ہے لیکن اگر حکمت معلوم ہو جائے تو یہ حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کیونکہ یہ بھی ایک علم عظیم ہے جس سے احکام کی عظمت کا انکشاف ہوتا ہے چنانچہ اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ ان دونوں میں خوب گھی دودھ کھا کر رمضان میں قوت و نشاط کے ساتھ روزہ رکھے گا۔ دوسرے یہ کہ رمضان سے پہلے روزہ رکھنے میں رمضان کا اشتیاق کم ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے حضورؐ نے بقاء اشتیاق کے لئے نصف شعبان کے بعد روزہ کو منع کر دیا کیونکہ انتظار و اشتیاق کے بعد جو شے حاصل ہوتی ہے اس میں نشاط زیادہ ہوتا ہے بلکہ ایک شاعر تو یوں کہتا ہے۔

جو مزہ انتظار میں دیکھا　　پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا

مگر یہ مذاق نقص کا پتہ دے رہا ہے یا عاشق میں یا محبوب میں کہ وصل کے بعد مزہ جاتا رہا یا کم ہو گیا معلوم ہوا کہ یا تو اس شخص کا عشق برائے نام تھا جو کہ جوش کم ہونے سے

نیست ونابود ہو گیا یا محبوب ناقص ہے جس سے وصال کر کے حقیقت معلوم ہو گئی کہ بس آپ کا یہ حسن اور یہ کمال ہے ورنہ اگر دونوں کامل ہوں تو پھر انتظار کا مزہ وصال کے مزا کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ اس وقت محب کا تو یہ حال ہوتا ہے۔

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور محبوب کے حسن کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

باقی اس میں شک نہیں کہ جو چیز انتظار کے بعد ملتی ہے اس میں بہ نسبت اس کے جو بلا انتظار کے مل جائے زیادہ نشاط وحظ ہوتا ہے اس لئے حضورؐ نے انتظار کو باقی رکھنے کے لئے رمضان سے کچھ روز پہلے روزہ کو منع فرما دیا۔ ان حکمتوں سے میرا ذہن اسی قاعدہ کلیہ کی طرف منتقل ہوا جس کی تقریر اوپر کر چکا ہوں۔ یعنی میرے قلب میں یہ بات آئی کہ یہاں حضورؐ نے ایک ضد کو دوسری ضد کے لئے معین بنایا ہے جو کہ ایک قسم کا سبب ہوتا ہے کیونکہ وجود معین کے بعد اکثر مقصود کا ترتب ہو جاتا ہے اور یہی سببیت ہے۔ بس یہ ترک صوم صوم رمضان کے لئے سبب ہو گیا کیونکہ رمضان سے پہلے ترک صوم سے صوم رمضان پر قوت زیادہ ہو گی اور انتظار کی شان پیدا ہو کر رمضان کے روزوں میں نشاط زیادہ ہو گا۔ اور اذا انتصف شعبان کے عنوان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نصف آخر سے پہلے روزہ مشروع ہے کیونکہ کسی کو ایک میعاد کے ساتھ محدود کر دینا اس کی علامت ہے کہ اس حد سے باہر یہ حکم نہیں پس اذا انتصف کے لفظ سے جو ایک حد معلوم ہو رہی ہے اس سے قبل نصف آخر صوم کی اجازت معلوم ہوتی ہے جو ابھی مذکور ہوئی ہے۔

وہ دوسری احادیث ہیں جن میں لیلۃ النصف من شعبان کی فضیلت وارد ہے یعنی پندرہ شعبان کی رات اور پندرہ کی رات شرعاً وہ ہے جو چودھویں تاریخ کا دن ختم ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے کیونکہ شرعاً لیل مقدم ہے نہار سے تو پندرہ کی رات وہ ہے جو پندرہ تاریخ کے دن سے پہلے ہے مثلاً ہمارے یہاں شعبان کی پہلی منگل ہے اور پندرہ بھی منگل کی ہے تو پندرھویں رات وہ ہے جو پیر کا دن گزرنے سے شروع ہو گی۔ اس رات کے متعلق حدیث میں یہ حکم ہے کہ

قوموا لیلها وصوموا نهارها

رات میں قیام کرو اور دن میں روزہ رکھو۔

کہ اس رات میں قیام کرو۔ قیام اللیل رات کی عبادت کو کہتے ہیں اور دن میں روزہ رکھو اس حدیث میں اخیر نصف شعبان کے قبل روزہ کا شروع ہونا مذکور ہے۔

یہاں شاید بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس مہینہ میں تاریخ کے اندر اختلاف ہے بعض کے نزدیک پیر کو پندرہ ہے تو اب یہ خلجان ہے کہ پندرہ تو ایک ہی ہوگی یا پیر کو یا منگل کو تو پھر کس دن کا روزہ رکھیں اور کونسی رات کو جاگیں اور دونوں راتوں اور دنوں کی عبادت کرنا یہ گراں ہے تو اب نہ معلوم منگل کی رات اور منگل کے دن میں عبادت کرنے اور روزہ رکھنے سے ہم کو یہ فضیلت حاصل ہوگی یا نہیں۔

تو سمجھ لو کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ثواب کے اعتبار سے پندرہ ایک ہی ہوگی گو حساب میں پندرہ ایک نہ ہو مگر حق تعالیٰ کسی خاص مکان یا زمان میں ایک فضیلت پیدا کر کے اس کے پابند نہیں ہو جاتے کہ دوسرے مکان یا زمان میں اس فضیلت کو پیدا نہ کر سکیں بلکہ وہ ہر رات اور ہر دن میں اس فضیلت کو پیدا کر سکتے ہیں۔

رہا یہ کہ امکان سے وقوع تو لازم نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری نصوص سے اس کا وقوع بھی ثابت ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ ایسا ہی کرتے ہیں کہ جو برکت ایک تاریخ میں تمہارے واسطے ہے وہی برکت دوسروں کے لئے دوسری تاریخ میں پیدا کر دیتے ہیں جس کو وہ اپنی تحقیق کے موافق پندرہ سمجھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو برکت کا ایک رات سے دوسری میں منتقل کر دینا کیا مشکل ہے ان کی تو یہ شان ہے

اولئک یبدل اللّٰہ سیاتھم حسنات

کہ حق تعالیٰ گناہ کو حسنہ بنا دیتے اور جرم کو اطاعت کر دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ حشر میں اللہ تعالیٰ ایک بندہ سے دریافت فرمائیں گے کہ تو نے ایسا کیا تھا؟ تو نے فلاں گناہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ اول چھوٹے گناہوں کو گنائیں گے بندہ جس کا اقرار کرے گا اور اپنے دل میں ڈرے گا کہ ابھی سنگین جرائم کا تو ذکر ہی نہیں ہوا۔ دیکھئے ان پر کیسی گرفت ہو مگر حق تعالیٰ کبائر کے ذکر سے پہلے یہ فرما دیں گے کہ جاؤ ہم نے تم کو ہر گناہ کے عوض ایک نیکی دی۔ اب وہ بندہ خود اپنے گناہ گنوائے گا کہ الٰہی میں نے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کیے ہیں ان کا تو یہاں ذکر ہی نہیں آیا مجھے ان کے عوض بھی نیکیاں دلوائیے یہ تو آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں **یبدل اللہ سیئاتھم حسنات** کا مصداق یہ ہے ملکات سیئہ کو مبدل بہ ملکات حسنہ کر دیتے ہیں۔ بخل کو سخاوت سے اور جہل کو علم سے بدل دیتے ہیں اور حسیات میں یہ صورت ہے کہ پانی کو خون کر دیتے ہیں جیسا کہ عورتوں اور گائے بکری کے پستان میں مشاہد ہے۔ تو اگر وہ ایک تاریخ کی برکت دوسری تاریخ میں بھی رکھ دیں تو کیا بعید ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

گر بخواہد عین غم شادی شود   عین بند پائے آزادی شود
کیمیا داری کہ تبدیلش کنی   گرچہ جوئے خوں بود نیلش کنی

(اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو عین غم کو شادی بنادیں عین قید وغم آزادی ہو جائے تو ایسی کیمیا رکھتا ہے کہ اس کو بدل کر کچھ سے کچھ کر دے اگرچہ خون کی ندی ہو تو اس کو (شفاف) پانی بنادے)

واقعی حق تعالیٰ سے زیادہ کیمیا بنانے والا کون ہوگا۔ جب تم کیمیاوی تدابیر سے تانبے کو سونا اور رانگ کو چاندی بنا دیتے ہو۔ تو وہ پتھر کو سونا بنا دیں تو کیا بعید ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ سونا چاندی اور سب دھاتیں زمین ہی سے نکلتی ہیں اللہ تعالیٰ نے اس مٹی سے کیا کیا بنا دیا۔

رہا یہ کہ ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے لئے دوسری نص موجود ہے جو ان کے حساب سے پندرہ تاریخ ہے حدیث میں ہے۔

روزہ اسی دن کا ہے جس دن تم روزہ رکھو اور عید الفطر کا وہی دن ہے جس دن تم عید الفطر مناؤ اور عید الاضحیٰ اسی تاریخ کو ہے جس دن تم قربانی شروع کر دو۔

اس کا مطلب حضرت استاد نے یہ فرمایا کہ جس تاریخ میں تم اپنی تحقیق کے موافق روزہ شروع کر دو یا تحقیق کر کے روزہ ختم کر دو تو خدا کے نزدیک وہی روزہ کی تاریخ اور افطار کی تاریخ ہے یعنی جو ثواب اور برکت رمضان و عید الفطر و عید الاضحیٰ کے دن میں رکھی گئی ہے ہر شہر کے مسلمانوں کو ان ایام میں حاصل ہوگی جو ان کے نزدیک رمضان وغیرہ کی تاریخیں ہیں لہٰذا تم اپنی تحقیق کے موافق جس دن کو پندرہ شعبان سمجھ کر روزہ رکھو گے وہی معتبر ہے اور اسی دن سے پہلی رات تمہارے لئے پندرھویں رات ہے اختلاف تاریخ سے شبہ میں نہ پڑو۔

قرب الی اللہ وقرب الی النار

مگر خدا کے لئے اس رات میں قرب الی اللہ کے لئے جاگنا قرب الی النار کے لئے نہ جاگنا قرب النار کے لئے جاگنا یہ ہے کہ آتش بازی کے واسطے جاگا جائے نہ یہ آتش بازی

کیا آتش بازی ہے رات کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ آگ برس رہی ہے یہ بالکل یاجوج وماجوج کا سا فعل ہے وہ بھی آسمان کی طرف آسمان والوں سے لڑنے کے لئے تیر پھینکیں گے جن کو حق تعالیٰ کے حکم سے خون سے بھر کر واپس کیا جائے گا۔ اسی طرح یہ لوگ آسمان کی طرف آگ بیل وغیرہ پھینکتے ہیں۔ اس سے خود بھی بچو اور اپنے بچوں کو بھی بچاؤ۔ کیونکہ اپنے اہل و عیال کو گناہوں سے بچانا بھی گھر کے سردار پر واجب ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

یایھا الذین امنوا قواانفسکم و اھلیکم ناراً

اے ایمان والو! اپنے کو بھی آگ سے بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں صاحب کیا کریں بچے آتش بازی کے لئے ضد کرتے ہیں۔ یہ محض لغو عذر ہے بھلا اگر بچے زہر کھانے پر ضد کریں تو کیا تم کھلا دو گے ہرگز نہیں۔ پھر دونوں میں فرق کیا ہے اس کے سوا اور کیا فرق کیا ہے کہ جس چیز کو اطباء جسم کے لئے زہر کہہ دیں اس کو تو تم مضر سمجھتے ہو اور جس کو رسول اللہؐ روح ایمان کے لئے زہر بتلا دیں اس کو تم مضر نہیں سمجھتے۔ ذرا ہوش ٹھکانے کرو اور ایمان کو سنبھالو۔

دوسرے بچوں کا بہلانا ہی کیا مشکل ہے ذرا سی بات میں بچہ بہل سکتا ہے جسے بدوؤں کا بہلانا آسان ہے بدو چالاک نہیں ہوتے۔ اکثر بھولے اور سیدھے ہوتے ہیں۔

ایک شخص اپنے بدو کو چمچے میں گھی بھر کر دیا کرتے تھے وہ اس پر ضد کیا کرتا تھا کہ چمچہ کو خوب بھرا کرو۔ انہوں نے کیا حرکت کی کہ چمچہ کی تہہ میں پہلے کھچڑی جما دیتے پھر گھی بھر کر دیا کرتے۔ چونکہ چمچہ ظاہر میں اوپر تک بھرا ہوا ہوتا اس لئے بدو خوش ہو جاتا۔ بس وہ یہ چاہتا تھا کہ چمچہ اوچھا نہ ہو چاہے نیچے کچھ بھی بھرا ہو۔

ایک دفعہ چند بدوؤں کو کسی کے اسباب میں جیبی گھڑی ملی۔ اس کی جو آواز سنی تو سب حیران ہو گئے کہ اس کے اندر کیا بول رہا ہے آخر یہ رائے پاس ہوئی کہ اس میں جن بول رہا ہے جیسا یہاں بھی جب کسی مریض کا مرض ظاہر میں سمجھ نہ آتا ہو تو اسے آسیب ہی سمجھتے ہیں بالآخر گھڑی کو ایک پتھر پر رکھ کر اوپر سے بڑا پتھر زور سے مارا دیکھا تو آواز بند۔ کیونکہ فنر اور کمانی کے ٹکڑے ہو چکے تھے اب سب کے سب بڑے خوش ہوئے کہ ہم نے جن کو مار ڈالا۔

بدو ایسے بھولے ہوتے ہیں ان کو بہلا لینا کچھ مشکل نہیں ایسے ہی بچوں کا بہلانا بھی کچھ

دشوار نہیں۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ بچپن میں رمضان المبارک کے مہینہ میں ختم قرآن کی شرینی لینے کو ہمارا جی چاہتا تھا اور ہم ختم کے دن ہر مسجد میں پہنچنا چاہتے تھے لیکن والد صاحب ہم کو منع کرتے اور ختم کے دن کبھی کہیں نہ جانے دیتے اور فرماتے وہاں جا کر کیا لوگے بس بہت سے بہت دو چار جلیبیاں مل جائیں گی لو ہم تم کو بازار سے بہت سی جلیبیاں منگوا دیتے ہیں۔ خوب اچھی طرح کھالو اور ختم کے موقع پر نہ جاؤ۔ کھانے پینے کی چیز کے لئے کہیں جانا بری بات ہے انہوں نے اس طرح ہمارے دل سے مٹھائی کی حرص نکالی۔ اور ایسے اچھے طریقے سے نکالا کہ ہم کو ناگوار بھی نہ ہوتا تھا کیونکہ واقعی اپنے گھر اس دن اتنی مٹھائی کھا لیتے تھے کہ مسجد میں دس آدمیوں کو بھی نہ ملتی ہوگی۔ اسی طرح آپ بھی اپنی اولاد کے جذبات کی اصلاح کیجئے۔

فضیلت شب براءت

بہرحال شب براءت کی بڑی فضیلت ہے شب قدر کے قریب قریب برابر اس کی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے سورۂ دخان میں لیلۃ مبارکۃ کی تفسیر شب برات سے کردی ہے اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ لیلۃ القدر اور شب براءت کے فضائل احادیث میں ملتے جلتے سے ہیں۔ یہی دیکھ کر انہوں نے قرآن میں بھی لیلۃ مبارکۃ سے شب براءت ہی سمجھ لی۔ مگر یہ خلاف ظاہر ہے کیونکہ آیت میں لیلۃ مبارکۃ کی صفت یہ مذکور ہے کہ اس میں نزول قرآن ہوا ہے اور شب براءت میں نزول قرآن ہونے کا کہیں ثبوت نہیں۔ اس لئے راجح یہ ہے لیلۃ مبارکۃ سے قرآن میں تو لیلۃ القدر ہی مراد ہے مگر اس میں شک نہیں کہ شب براءت کی بھی بڑی فضیلت ہے اس رات میں اور راتوں سے زیادہ عبادت کرنا چاہئے اور صبح کو روزہ رکھا جائے۔

تو جوبات **اذا انتصف شعبان** (سنن ابی داؤدؒ ۲۳۳۷، مشکوۃ المصابیح ۱۹۷۴) سے اشارۃً معلوم نہ ہوئی تھی دوسری احادیث سے صراحۃً معلوم ہوگئی کہ نصف شعبان سے پہلے روزہ مشروع ہے بلکہ مسنون ہے۔

اب خاص اس روزہ کی حکمت بھی سمجھئے میرے نزدیک یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے رمضان سے پہلے نصف شعبان کا روزہ رمضان کے نمونہ کے لئے مسنون فرمایا ہے تا کہ رمضان سے وحشت وہیبت نہ ہو کہ نہ معلوم روزہ کیسے ہوگا۔ اور کیا حال ہوگا اس لئے آپ نے پندرہ شعبان کا روزہ مقرر فرما دیا کہ اس دن کا روزہ رکھ کر دیکھو چونکہ یہ ایک ہی روزہ ہے اس لئے اس کی ہمت

سہولت سے ہوجاتی ہے جب وہ پورا ہوگیا تو معلوم ہوجاتا ہے کہ بس رمضان کے روزے بھی ایسے ہی ہوں گے اور اس تاریخ میں رات کی عبادت بھی تراویح رمضان کا نمونہ ہے اس سے تراویح کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے کہ جب زیادہ رات تک جاگنا کچھ بھی نہ معلوم ہوا تو تراویح کے لئے ایک گھنٹہ زیادہ جاگنا کیا معلوم ہوگا۔ پس یہ تو اعانت بالمثل علی المثل ہوئی اور پندرہ شعبان کے بعد روزہ سے منع کرنے میں استعانت بالضد علی الضد ہے اور یہ سب ایک ہی جملہ میں موجود ہے۔

بھلا ہے کوئی ایسا بلیغ جو ایک ہی جملہ میں علاج بالضد اور علاج بالمثل دونوں کو جمع کر دے اور اس سے رسول اللہ کا کمال شان تربیت کا بھی ثبوت ہوتا ہے کیونکہ کوئی بڑے سے بڑا عاقل اگر تسہیل صوم رمضان کی کوئی صورت تجویز کرتا تو بہت سے بہت یہ کرتا کہ رمضان سے پہلے بھی ایک دو روز کا روزہ رکھ لیا جائے تا کہ طبیعت کو روزہ سے مناسبت ہوجائے تو صوم سے صوم میں استعانت کرتا باقی یہ علاج کسی کی سمجھ میں نہ آسکتا تھا کہ ترک صوم کو بھی سہولت صوم میں دخل ہے۔ اس لئے رسول اللہؐ نے تجویز فرمایا کہ نمونہ کے لئے پندرہ شعبان کا روزہ اور اس کی رات کا قیام مسنون فرما کر اس کے بعد روزہ سے منع فرمادیا۔

اب میں ختم کرتا ہوں اور خلاصہ پھر عرض کرتا ہوں کہ اسباب ومسببات میں جو عقلی احتمال چار نکلتے ہیں ان میں یہ احتمال بظاہر بہت بعید تھا کہ ضد جالب ضد ہو مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وقوع بھی بکثرت ہے اور میرے قلب میں نصف آخر شعبان میں روزہ ممنوع ہونے کی حکمت یہی آئی ہے کہ اس میں استعانت بالضد علی الضد مقصود ہے جس کی مفصل تقریر اوپر ہوچکی ہے پس اب ہم کو چاہیے کہ اس رات میں جو اس پہر کے بعد آئے گی معمول سے کچھ زیادہ جاگیں اور عبادت میں مشغول ہوں۔ جاگنا بلا عبادت کے مفید نہیں اور قیام اللیل سے نصوص میں محض جاگنا مراد نہیں ہوتا بلکہ جاگنے کے ساتھ عبادت کرنا مراد ہے اور پندرہ تاریخ کا روزہ رکھو اور ابھی سے صیام وقیام رمضان کے لئے آمادہ ہوجاؤ۔

اس کی ایک آمادگی یہ بھی ہے کہ گناہوں سے پاک وصاف ہوجاؤ توبہ کرو اور اہل حقوق کے حقوق ادا کرو۔ کیونکہ گناہوں کو کسل فی الطاعت میں بڑا دخل ہے اور ایک آمادگی یہ ہے کہ تراویح کے لئے صحیح قرآن پڑھنے والوں کو تلاش کرو۔ تیز پڑھنے والوں کو نہ ڈھونڈو کیونکہ ایسا تیز قرآن پڑھنا جسمیں حروف بگڑ جائیں اور مقتدیوں کی سمجھ میں بھی نہ آئے مفید نہیں بلکہ الٹا گناہ کا سبب ہے اگر صحیح پڑھنے والا نہ ملے تو الم ترکیف ہی سے تراویح پڑھی جاوے۔

اب اللہ سے دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔

تکمیل الاسلام

تکمیل اسلام کے متعلق یہ وعظ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ کی رات کو مدرسہ حسن علی کراچی بندرگاہ میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو دو گھنٹے میں ختم ہوا حاضری ۳۵ کے قریب تھی اس میں دیگر معززین کے علاوہ ایک انگریز پرنسپل بھی موجود تھا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰه نحمده و نستعینه و نستغفره و نؤمن به و نتوکل علیه و نعوذ باللّٰه من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یهده الله فلا مضل له و من یضلله فلا هادی له و نشهد ان لا اله الا الله و حده لا شریک له و نشهد ان محمد اعبده و رسوله صلی الله تعالیٰ علیه و علی اله واصحابه و بارک وسلم۔ اما بعدفقد قال الله تبارک و تعالیٰ یایها الذین امنوا اتقوا الله حق تقته ولا تموتن الا و انتم مسلمون و اعتصموا بحبل الله جمیعاً ولا تفرقوا واذکروا نعمة الله علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخواناً و کنتم علی شفاحفرة من النار فانقذکم منها کذلک یبین الله لکم ایته لعلکم تهتدون ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینهون عن المنکر و اولئک هم المفلحون ولا تکونوا کالذین تفرقوااختلفوا من بعد ماجاء هم البینات واولئک لهم عذاب عظیم یوم تبیض وجوه وتسود و جوه فاما الذین اسودت وجوههم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون واما الذین ابیضت وجوههم ففی رحمة الله هم فیها خالدون تلک ایت الله نتلوها علیک بالحق و ما الله یرید ظلماً للعالمین ولله ما فی السموت وما فی الارض والی الله ترجع الامور

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو ڈرنے کا حق اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا اور مضبوط پکڑے رہو اور اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نااتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کرکے بتاتے رہتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ پر رہو اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف

بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کا کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہوجانا جنہوں نے باہم تفریق کرلی اور باہم اختلاف کریں اور ان کے پاس احکام واضح پہنچنے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی اس روز کہ بعضے چہرے سفید ہوجاویں گے اور بعضے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جاوے تا کہ تم لوگ کافر ہوئے تھے اپنے ایمان لانے کے بعد تو سزا چکھو بسبب اپنے کفر کے اور جن کے چہرے سفید ہوگئے ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے اور اللہ ہی کی ملک ہیں جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رجوع کئے جاویں گے۔

تمہید

صاحبو! قبل اس کے کہ میں ان آیات کے متعلق کچھ بیان کروں دو باتیں عرض کرنا ضروری ہیں ایک تو یہ کہ میرے بیان کے متعلق ابھی جو کچھ کہا گیا ہے یہ محض ان حضرات کا حسن ظن کا ثمرہ ہے ورنہ میں اپنے کو ان الفاظ کا مستحق نہیں سمجھتا۔ البتہ اس کے ساتھ ہی جب یہ سوچتا ہوں کہ حدیث میں

انتم شهداء لله فی الارض

تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہ ہو زمین میں۔

فرمایا گیا ہے حتیٰ کہ مسلمان اگر کسی کے متعلق ظن سے کچھ کہہ دے تو حق جل و علا شانہٗ اس کی برکت سے تصدیق شہادت کے لئے اس کو کسی اچھے درجے پر پہنچادیتے ہیں۔ تو میں اس نعمت پر خدا تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں۔

دوسرا امر یہ ہے کہ اگرچہ میں نے پورا رکوع تلاوت کیا ہے مگر مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ زیادہ بیان کرنے میں لوگوں کا حرج ہوگا۔ خاص کر ایسے لوگوں کو جو اپنے اوقات کے پابند ہیں۔ دوسری بات اس کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ وعظ درحقیقت امراض روحانی کا علاج ہوتا ہے یعنی اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ امراض روحانی کی تشخیص کی جائے اور پھر ان کا علاج کہ وہ وعظ سننے کے وقت کیا نیت رکھیں اور وجہ اس کے عرض کرنے کی یہ ہوئی کہ تتبع

احوال سے یہ معلوم ہوا کہ سامعین کی اغراض وعظ سننے سے مختلف ہوتی ہیں اور اسی طرح واعظ کی بھی مختلف نیتیں ہوتی ہیں میں اپنا تبریہ اغراض فاسدہ سے نہیں کرتا۔ لیکن بحمد اللہ مجھے اس پر تنبہ ہو جاتا ہے اور لغزش ہو جانے سے میں استغفار کر لیتا ہوں۔ واعظین کے متعلق کہنا تو اس وقت فضول ہے کیونکہ یہ مجمع واعظین کا نہیں ہے۔

سامعین کی اغراض

ہاں سامعین کی اغراض کے متعلق دو چار جملے کہہ دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی غرض تو وعظ سننے سے یہ ہوتی ہے کہ وہ واعظ کے بیان سے قابل اعتراض اجزاء کو انتخاب کریں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

بعضوں کی یہ نیت ہوتی ہے کہ تقریر سے لذت حاصل کریں گے۔ صاحبو! اس میں شک نہیں کہ اللہ جل شانہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اور اس کی شرح میں لذت ضرور ہے لیکن ہر ایک چیز کا اصلی موضوع لہ علیحدہ ہوتا ہے سو یہ دیکھو کہ اس کام کی اصلی غرض کیا ہے۔ لذت یا اور کچھ اس کی نسبت ارشاد ہے۔

کتاب انزلنه الیک مبارک لید بروا

یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اسی واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

اس میں خداتعالیٰ نے تصریحاً فرمادیا کہ یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس سے علم و عمل کا فائدہ حاصل کریں۔ لید بروا میں علم کی طرف اشارہ ہے اور لیتذکر میں عمل کی طرف۔

بعضوں کی غرض یہ ہوتی ہے اور یہ بظاہر اور اغراض سے اسلم ہے کہ ہم کو اس مجلس کی شرکت سے ثواب ہوگا۔ سو خوب سمجھ لو کہ اگرچہ شرکت فی الوعظ سے ثواب لازم آ جائے اور اس پر مرتب ہو جائے لیکن اصلی غرض یہ بھی نہیں ہے جیسا کہ اور آیت سے معلوم ہوا ہے۔ ثواب کے لئے دوسرے کام بہت ہیں۔ نماز' روزہ' تلاوت قرآن اگرچہ بے سمجھے ہی تلاوت ہو۔ تو نفس ثواب کے لئے اس کی کچھ ضرورت نہیں کہ قطع مسافت کر کے گھر سے مجلس وعظ تک آئے وقت صرف کرے۔

وعظ کی غرض

پس معلوم ہوا کہ وعظ کی غرض اصلی یہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ مجھ میں کیا کیا امراض ہیں۔

جتنے امراض وعظ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سے میرے اندر کتنی باتیں پائی جاتی ہیں اور جو پائی جاتی ہیں ان کا علاج کیا ہے۔ اس مقصود کے سوا باقی سب خیالات غیر اصلی ہیں اور جب یہ ہے تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگر کسی وعظ میں ذرا بھی لذت نہ آئے تو اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔

دیکھئے آپ نے کبھی طبیب سے نسخہ لکھوا کر یہ انتظار نہ کیا ہوگا کہ آپ کو اس میں لذت بھی آئی یا نہیں۔ البتہ اگر کوئی صاحب فن خود نسخے کو دیکھ کر اس طرح لذت یاب ہو کہ کیسی دقائق کی رعایت اس میں رکھی گئی ہے تو دوسری بات ہے۔ باقی اصلی غرض نسخے سے یہی ہوتی ہے کہ مرض و علاج متعین ہو جائے اور علاج کرنے سے مرض کا قلع قمع ہو جائے۔ پس یہی غرض وعظ میں بھی ہونی چاہیے کہ ہم میں کیا کیا امراض ہیں اس کے سوا ساری اغراض کو فراموش کر دینا چاہیے۔ بالکل یہ حالت ہونی چاہیے کہ

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

(ہم نے جو کچھ پڑھا ہے اسے بھلا دیا ہے سوائے دوست کی باتیں جس کا ہم تکرار کرتے ہیں)

حقیقت میں بڑی بات یہی ہے اور قرآن مجید میں جو قصص مذکور ہیں ان سے بھی یہی غرض ہے کہ لوگ سابقین کی حالت پر اپنی حالت کو قیاس کریں اور دیکھیں کہ انہوں نے کیا کیا اور اس کا کیا ثمرہ ان کو ملا اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم کو بھی وہی ثمرہ حاصل ہوگا۔ تو اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ وعظ کی اصلی غرض کیا ہے۔ یعنی جو کچھ بیان ہو اس کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھنا اور میں درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے لئے اس بیان کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھئے اس وقت جو کچھ خرابیاں ہو رہی ہیں وہ سب اسی سبب سے ہیں کہ ہم اپنی حالت کو نہیں دیکھتے۔ جو کچھ سنتے ہیں اس کا مصداق دوسروں کو سمجھتے ہیں۔ یہ کبھی احتمال بھی نہیں ہوتا کہ ہم میں بھی یہ امراض ہوں گے۔

ہمارا دعویٰ اسلام

بس اب اپنا بیان شروع کرتا ہوں اور اول اجمالاً یہ بتلائے دیتا ہوں کہ اس وقت جو مضمون میں بیان کروں گا وہ کیا ہے سو وہ یہ کہ اسلام حقیقی کیا ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ہم جو کہتے ہیں انا مسلم یہ سچ ہے یا نہیں کیونکہ محض زبان سے کہہ دینے سے اسلام حاصل نہیں ہوسکتا۔

وجائزة دعوى المحبة في الهوى ولكن لا يخفى كلام المنافق

(اور عشق میں دعویٰ محبت جائز ہے لیکن منافق کی زبان مخفی نہیں رہی)

اس میں شک نہیں کہ آج کل مسلمان بیدار ہیں اکثر کو اپنے اسلام ایک طرف توجہ ہے۔ غفلت کی شکایت اب بہت کچھ دور ہوگئی ہے لیکن نرا تنبہ مفید نہیں جب تک کہ اس کی حقیقت معلوم نہ ہو۔ دیکھو اگر ایک شخص کو یہ معلوم ہو کہ مال حاصل کرنے کی ضرورت ہے لیکن نہ اس کی حقیقت معلوم ہو اور نہ ذریعہ تحصیل۔ تو کیا نرا احساس ضرورت مال حاصل کرنے کے لئے کافی ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مال کی حقیقت بتا دی جائے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص ایک پیسے کو بھی مال سمجھتا ہو اور ایک پیسہ کما کر اپنے کو مالداروں کی فہرست میں شمار کرنے لگے۔ کیا کوئی شخص اس کو مالدار سمجھے گا یا یوں کہا جائے گا کہ اس کو جنون ہو گیا ہے۔ پیسہ بھی کوئی مال ہے۔ حالانکہ ادنیٰ جس پر مال کا نام اطلاق کیا جاتا ہے۔

پیسہ بھی ہے لیکن یہاں دقائق فلسفیہ کا لحاظ نہیں ہوتا یوں تو ہر شخص اپنے کو مالدار سمجھ سکتا ہے لیکن مال کی حقیقت معتبرہ معلوم کرنے کے بعد وہی مالدار سمجھا جائے گا جس کے پاس معتدبہ مقدار مال کی موجود ہو ورنہ وہی حال ہوگا کہ

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے
حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(خواجہ سمجھتا ہے کہ اُسے بہت کچھ حاصل ہے لیکن خواجہ کو سوائے غرور و تکبر کے اور کچھ حاصل نہیں ہے)

پس اسی طرح حالت موجودہ میں کہ بہت سے اعمال دین سے ہم متروک ہیں ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم مسلمان ہیں ایسا ہی دعویٰ ہے جیسا کہ اس شخص کا ایک پیسہ کما کر صاحب مال ہونے کا دعویٰ تھا۔ پس جس طرح اس کو مجنون کہا گیا ہم کو بھی مجنون کہا جائے گا۔ البتہ ہمارا دعویٰ اس وقت قابل التفات ہوگا کہ جب ہمارے پاس اس حد تک ایمان ہو کہ اس کی غرض علیٰ وجہ الکمال حاصل ہو سکے۔

دیکھئے میں خدا تعالیٰ کی ایک بڑی رحمت پر متنبہ کرتا ہوں یعنی اس تقریر کا مقتضا نہ تو یہ تھا کہ ناقص الایمان کو مومن ہی نہ کہا جاتا۔ جیسے کہ ایک پیسے کے مالک کو مالدار نہیں کہا جاتا۔ چنانچہ خوارج اور معتزلہ نے ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہا۔ پھر معتزلہ تو اس کو ایمان سے خارج کرتے ہیں لیکن کافر نہیں کہتے اور خوارج تو بالکل کافر ہی کہتے ہیں۔ اب دیکھئے اہل سنت والجماعت نصرہم اللہ (اللہ تعالیٰ ان کی نصرت فرمائیں آمین) کو کہ انہوں نے شارع کی نصوص رحمت کو سمجھ کر ایسا حکم نہیں کیا۔

اس پر مجھے بطور جملہ معترضہ کے ایک ضروری بات یاد آئی یعنی ہم میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ نصوص کو عقل پر منطبق کرتی ہے اور اصل رہبر عقل کو قرار دیتی ہے میں کہتا ہوں کہ یہ رائے بڑی مصیبت کی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ عقل آپ کی اتنی خیر خواہ نہیں ہے جیسی وحی ہے۔ دیکھئے عقل آپ کی ایسی دشمن نکلی کہ ایک نافرمانی میں کافر بنادیا جس کی اوپر تقریر ہوئی۔ اب وحی کے خواص دیکھئے کہ باوجود آپ کی نافرمانی کے ارشاد ہے۔

لاتکفرہ بذنب ولا تخرجہ عن الایمان

کسی کو گناہ کی وجہ سے کافر مت کہہ اور ایمان سے خارج نہ کر۔

اور دو جملے ارشاد فرمانے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جملہ اول سے خوارج کا رد فرمانا منظور ہے۔

اور جملہ ثانیہ سے معتزلہ اور خوارج دونوں کا۔ اب آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے کتنے خیر خواہ ہیں اور آپ کی عقل کس قدر دشمن ہے۔ اسی لئے خداتعالیٰ فرماتے ہیں۔

النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام مؤمنین کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

کیا معنی کہ ہمارے نفس نے تو عقل کے مشورے سے ایک نافرمانی سے کفر کا فتویٰ دے دیا تھا اس قاعدے سے کہ ناتمام ذخیرے پر تمول کا حکم نہیں کیا جاتا جیسا کہ اوپر کی مثال سے معلوم ہوا۔ اس طرح ایمان ناقص پر بھی ایمان کا حکم نہیں کیا جائے گا۔ یہ تو عقل کا فتویٰ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود گناہ میں مبتلا دیکھنے کے بھی مسلمان ہی فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ شریعت ہم سے زیادہ ہماری خیر خواہ ہے۔ لہذا اب یوں کہنا چاہئے اور یہی مذہب رکھنا چاہئے۔

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

میں نے عقل دور اندیش کو آزمایا اس کے بعد اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا۔

یعنی عقل کا تو امتحان کرلیا وہ تو مخالف ثابت ہوئی اب دیوانہ وحی رہنا چاہئے اور اس دیوانگی کے واسطے یہ کہنا چاہئے۔

اگر قلاش وگر دیوانہ ایم　　　مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

ہم اگر مفلس اور دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے۔ محبوب حقیقی اور اس کی محبت کے متوالے ہیں اور

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد　　　اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

وہ خود ہی دیوانہ ہے جو آپ کا دیوانہ نہیں ہوا۔

یہ وہ دیوانی ہے کہ اس پر ہزار فرزانگی قربان ہے یہ جملہ معترضہ تھا اصل مقصد یہ تھا کہ جیسے مالدار وہ ہے کہ اس کے پاس اصلی ذخیرہ ہو ایسے ہی اسلام کا دعویٰ اس کو زیبا ہے کہ اس کے پاس کامل ایمان ہو ورنہ ہمارا دعوی ایسا ہے جیسا اس ایک پیسے والے کا اور مثال لیجئے حسین اس کے کہیں گے جس کی آنکھ ناک سب درست ہو اور جس کی یہ حالت ہو کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوب کی ہے)

ورنہ اگر کسی کی ناک کاٹ لی جائے اور وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر آئے تو کتنا حسین معلوم ہو گا لیکن کوئی ہاتھ اٹھا دے تو پھر دیکھئے کتنا پژمردہ ہوتا ہے تو جیسا ایک حسن ظاہری ہے ایسے ایک حسن باطنی بھی ہے جب ہر صفت کمال کے ساتھ ہو گی اس وقت حسین اور مسلم کہیں گے۔

ورنہ اسکا حسن باطن اور اسلام ایسا ہے جیسے آپ کسی دوست سے کہیں کہ ہم کو ایک آدمی کی ضرورت ہے اور وہ ایک مدت کے بعد آپ کے پاس ایک آدمی کو ایک چارپائی پر لاد کر لائے جتنے امراض ہیں قریب قریب سب میں مبتلا ہے۔ آنکھیں بھی نہیں، کان بھی نہیں، ہاتھ پیر بھی بیکار ہیں۔ فاتر العقل بھی ہے البتہ جاندار ہے اگر اس کو کوئی قتل کر دے تو قانوناً پھانسی ہو جائے مگر کیا اس آدمی سے آپ کی غرض پوری ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں! کیا آپ تعجب سے نہ پوچھیں گے کہ اس کو کیوں لائے ہو اب اگر وہ دوست یہ کہے کہ آپ کے واسطے لایا ہوں آپ نے فرمائش کی تھی کہ ایک آدمی لا دو تو آپ ہنسیں گے اور کہیں گے کہ اگرچہ یہ لغۃً اور قانوناً آدمی ہے لیکن جب اس سے میری غرض حاصل نہیں ہوتی تو میرے لئے تو یہ آدمی نہیں ہے۔

مقصود اسلام

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب دیکھئے کہ اسلام سے کیا غرض ہے۔ آیا نجات کاملہ یا محض ایک قومی شعار بنانا جیسا کہ آج کل کے عقلاء نے سمجھ رکھا ہے کہ غرض مذہب سے صرف یہ ہے کہ اس سے ہماری ایک قوم بن جائے اور ہمارے اندر ایک اجتماع کی شان پیدا

ہو جائے جیسا کہ اس وقت اکثر لوگوں نے یہی غرض سمجھی ہے۔ مذہب کی حیثیت سے بہت کم لوگ اس پر متوجہ ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں مذہبی رنگ نہیں ورنہ اگر مذہب کے لحاظ سے متوجہ ہوئے تو مذہبی رنگ بھی ان میں ضرور پیدا ہوتا۔

میں ایک انجمن میں بلایا گیا اس کی حالت جو تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نہ اس کے ممبروں کی آمدنی شریعت کے موافق ہے نہ اعمال ان کے درست ہیں ترک صلوۃ وشرب خمر تک میں بعضے مبتلا ہیں۔ میں نے داعی سے کہا کہ غرض اہل انجمن کی خیر خواہی قوم بیان کی جاتی ہے لیکن اگر وہ خیر خواہ قوم ہیں تو اپنے خیر خواہ کیوں نہیں اور جب انہوں نے اپنی اصلاح نہیں کی تو کیسے مان لیا جائے کہ ان کو قوم پر توجہ ہے۔

صاحبو! لیڈران قوم کو متوجہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کریں گے اس وقت تک ان کی خیر خواہی کسی درجے میں موثر نہ ہوگی نہ ان کی خیر خواہی کو کوئی تسلیم کرے گا اسی کو تو فرماتے ہیں۔

اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم و انتم تتلون الکتب

کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے ہو کتاب کی۔

تو ان حالات کو دیکھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام من حیث الاسلام بہت کم لوگوں میں ہے۔ صرف اسلام من حیث القوم رہ گیا ہے جیسے اپنے ہم عصروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ مذہب کے ذریعے سے ایک اجتماعی شان پیدا کرتے ہیں اسی طرح خود بھی ان کے قدم بقدم چلتے ہیں اور بڑی علامت اس کی یہی ہے کہ یہ لوگ اپنی اصلاح کچھ بھی نہیں کرتے اور میں کچھ ان ہی کی شکایت نہیں کرتا بلکہ اپنی بھی شکایت کرتا ہوں کہ ہم بھی فکر اصلاح سے خالی ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ شراب نہیں پیتے زنا نہیں کرتے لیکن غیبت میں ہی مبتلا ہیں۔ اگر ہم نے زنا کو خدا کا گناہ سمجھ کر چھوڑا ہے تو دوسرے گناہوں کو کیوں نہیں چھوڑتے معلوم ہوا کہ شراب وغیرہ کو چھوڑنے کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ خاندان و وضع کے خلاف ہونے سے چھوڑا ہے کہ کبھی باپ نے نہیں پی تھی دادا نے نہیں پی تھی تو اگر ہم پئیں گے تو سخت رسوائی ہوگی۔ تو اپنی وضع کی حفاظت کے لئے اس سے اجتناب کیا نہ کہ شریعت کے زجر سے بخلاف غیبت کے کہ باپ دادا سب کرتے چلے آئے ہیں اس لئے اس کو عیب نہیں سمجھتے باقی غیبت کے ترک پر کبھی توجہ نہیں ہوئی۔ ورنہ گناہ

ہونے کی رو سے شرب خمر اور ارتکاب غیبت دونوں مساوی ہیں خوب کہا ہے۔

ریا حلال شمارند جام بادہ حرام — زہے طریقت وملت زہے شریعت وکیش

کہ عجیب بات ہے ریا کو عملاً حلال سمجھ رکھا ہے اور جام بادہ کو حرام سمجھ رکھا ہے حالانکہ دونوں برابر ہیں دونوں کو چھوڑنا چاہئے اور یہ مطلب نہیں کہ دونوں میں مبتلا ہو جائیں۔ افسوس ہے کہ ہمارا ماٹ کا ماٹ ہی بگڑ گیا ہے۔ خوب کہا ہے اور یہ بزبان حال استغاثہ ہے۔ نہ اس اعتقاد سے کہ حضورؐ سنتے ہیں محض جوش میں کہا ہے کہ

اے بہ سراپردہ یثرب بہ خواب — خیز کہ شد مشرق ومغرب خراب

(اے وہ ذات اقدس جو مدینہ منورہ میں آرام فرما ہے اٹھئے کہ مشرق ومغرب اب حالت زار میں ہے)

جدھر جا کر دیکھتے ہیں خرابی ہی خرابی ہے۔ بہر حال گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑنا چاہئے اور چونکہ اس امر میں سب گناہ مشترک ہیں اس لئے سب کو چھوڑنا چاہئے ایسا نہ کرنا چاہئے جیسے بعض لوگ اپنے تقدس میں بٹہ لگنے کے خیال سے شراب تو چھوڑ دیتے ہیں مگر غیبت نہیں چھوڑتے۔ کیونکہ عرفاً اس سے تقدس میں بٹہ نہیں لگتا۔ اس تقدس پر کہ معصیت سے بھی زائل نہ ہو مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ حکایت تو بے تمیزی کی ہے لیکن آج کل کے تقدس کا پورا فوٹو ہے۔ مشہور ہے کہ ایک آوارہ عورت تھی بی بی تمیزہ اس کو کسی بزرگ نے نماز کا پابند کر دیا اور وضو بھی سکھا دیا۔ وہ سمجھے تھے کہ اس کی بدولت فحش گناہ بھی چھوڑ دے گی۔ پانچ چھ مہینے کے بعد جو آنے کا اتفاق ہوا تو پوچھ کہ بی بی نماز پڑھا کرتی ہو۔ کہنے لگی کہ جی ہاں انہوں نے کہا کہ وضو بھی کیا کرتی ہو کہنے لگی کہ جی ہں انہوں نے کہا کہ وضو میں کیا کرتی ہو کہنے لگی کہ آپ کرا تو گئے تھے۔ بس اسی سے پڑھ لیتی ہوں۔

تو جیسے اس بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ وہ نہ سونے سے ٹوٹتا تھا نہ بدکاری سے ٹوٹتا تھا ایسا ہی آج کل کا تقدس بھی ہے کہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں۔ پس عوام میں تقویٰ اس کو سمجھا جاتا ہے کہ وضع ظاہر کو درست کرلیں۔ رہا باطن اس کی جو حالت بھی ہو خوب کہا ہے۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل — و اندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ میدارد یزید

یعنی ظاہری حالت ان کی ایسی ہے جیسے کافر کی قبر مزین ہوتی ہے اور اس کے اندر خدا

تعالیٰ کا قہر و غضب نازل ہوتا ہے۔

اور جیسے یہ پرانے لوگوں کی شکایت تھی ایسے ہی نئے وضع کے لوگوں کی یہ شکایت ہے کہ انہوں نے اسلام کو بالکل ہی نہیں سمجھا۔ غرض جب اسلام سے مراد نجات کاملہ ہے اور وہ حاصل ہوتی ہے اسلام کامل سے جس طرح مقصود تمول سے انتفاع کامل تھا اور وہ حاصل ہوتا تھا تمول کامل سے پس اسلام کامل کو تحقیق کرنا چاہئے بس میں چند جملوں میں اس کے متعلق بیان کرتا ہوں۔

اسلام کی حقیقت

فرماتے ہیں اے مسلمانو! ڈرو خدا سے جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم کو بجز اسلام کے کسی حالت پر موت نہ آنا چاہئے۔

یہ ایک آیت کا ترجمہ ہے اس ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ خدا تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کیا ہے وہ چیزوں کا جن میں سے ایک امر ہے اور ایک نہی ہے امر یہ ہے کہ خدا سے ڈرو اور نہی یہ ہے کہ بجز اسلام کے کسی حالت پر مت مرو۔

یہاں چند امور قابل غور ہیں انہی سے میرا مضمون نکل آئے گا ایک یہ کہ یہ خطاب جو ایمان والوں کو ہے تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ دوسرے لوگ نہ ڈریں بلکہ اوروں کو خطاب اس لئے نہیں کیا کہ یہ خطاب ان کے لئے قبل از وقت تھا اور اسی سے فیصلہ ہو جائے گا کہ کفار جزئیات کے مخاطب ہیں یا نہیں سو قبل از وقت وہ مخاطب جزئیات کے نہیں ہیں البتہ جب وہ اس زمرے میں داخل ہو جائیں اس وقت وہ بھی مخاطب ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کالج میں ایک کورس بنایا گیا اور یہ خطاب کر کے اس کو پیش کیا گیا کہ اے طالب علمو! اس کو سیکھو۔ تو یہاں جو خاص طالب علموں کو خطاب ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اوروں سے سیکھنے کا مطالبہ نہیں۔ کیونکہ یہ پرنسپل اوروں کو بھی کالج میں داخل ہو کر طالب علمی کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ تو مطلوب ہر ایک سے ہوا لیکن جو شخص ہنوز کالج کا طالب نہیں بنا اس کو یہ خطاب قبل از وقت ہے اس کو یہ کہیں گے کہ تم کالج کے طالب علم ہو جاؤ۔ اس کے بعد جب وہ نام لکھ لے گا تو اس کو یہ خطاب کیا جائے گا تم فلاں درس سیکھو۔

اسی طرح کلام مجید کے اس خاص خطاب کا یہ مطلب نہیں کہ غیر اہل اسلام سے

تقویٰ مطلوب نہیں۔ لیکن ان کو یہ خطاب کرنا قبل از وقت ہے ان سے اول یہ کہا جائے گا کہ تم ایمان لے آؤ۔ اس کے بعد تقویٰ کا حکم کیا جائے گا اور اگر کہیں قرآن میں خطاب عام سے اتقوا فرمایا ہے تو وہاں اتقوا سے آمنو مراد ہے کیونکہ ایمان بھی تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں ایک بات کا تو امر فرمایا ہے اور ایک سے نہی۔ چنانچہ ترجمے سے ظاہر ہے۔ اس کا قائل ہونا ممکن نہیں کہ مضامین میں ارتباط نہیں۔ اور یہ تو ایک ہی آیت کے دو جملے ہیں۔ خود آیتوں میں بھی اس کا قائل ہونا صحیح نہیں کیونکہ اگر آیتوں میں ترتیب نہ ہوئی تو ترتیب تلاوت کی ترتیب نزول کے خلاف کہنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ نازل تو کہیں ہوئی اور رکھی گئی کسی دوسری جگہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مناسب مضامین کے لحاظ سے ترتیب مقرر ہوئی ہے اور جب آیتوں آیتوں میں ارتباط ہے تو اجزائے آیت میں علی سبیل الاولیت ارتباط ہوگا اور جب یہ ہے تو بظاہر امر و نہی دونوں میں عنوان ایک ہونا چاہیے تھا یہ کیا بات ہے کہ امر میں تقویٰ کا لفظ اختیار کیا گیا اور نہی میں۔

الا و انتم مسلمون (مگر در آں حالیکہ تم مسلمان ہو)

فرمایا گیا ہے مرتے وقت تک مسلمان رہنا۔ اور ربط کا ہونا ضروری ہے پس یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ اتقوا اللہ اور مسلمون دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مسلم وہ ہے کہ حق تقویٰ کو حاصل کر چکا ہو اور اسی پر قائم رہے ورنہ وہ مسلم کامل نہیں علی ہذا اسلام کا حق تقویٰ ہے اور جب اسلام کامل یہ ہے تو اب دیکھئے کہ آپ میں یہ اسلام ہے یا نہیں۔ اس کے لئے حق تقویٰ کی تفسیر کو دیکھئے اگر وہ حاصل ہے تو اسلام کامل حاصل ورنہ نہیں۔ تو مفسرین میں سے بعض نے تو اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے۔

ان یطاع ولا یعصیٰ

یہ کہ اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے اور بعض نے لکھا ہے۔

ان یشکر ولا یکفر

شکر کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔

اسی طرح اور بھی تفسیریں ہیں جن میں کچھ تعارض نہیں۔ سب کا اجتماع مقصود ہے۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اعمال اسلام کو کامل کیا جائے اس کا ایک جز اطاعت و ترک

معصیت بھی ہے۔ ایک جز و شکر و ترک کفر بھی ہے اور ان کی تخصیص بطور تمثیل کے ہے۔ مقصود یہ ہے کہ سب اعمال کو جمع کرنا چاہیے پس اسلام تو یہ ہے۔

عوام کی غلطی

مگر اس وقت لوگوں نے اسلام کی حقیقت کو دوسرے طور پر سمجھ رکھا ہے اہل سائنس نے دواؤں کا ست نکالا تھا مگر اس وقت کے عقلاء نے اسلام کا ست نکالا ہے۔ اپنے خیال کے موافق کچھ چیزیں اسلام میں داخل کر لیں کچھ چیزوں کو خارج کر دیا مگر صاحبو! ست اس چیز کا نکالا کرتا ہے جس میں کوئی فضول جز و بھی ہو۔ تو کیا آپ کے نزدیک اسلام میں کوئی فضول جز و بھی موجود ہے۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے تو اس سے تو خدا تعالیٰ پر اعتراض لازم آتا ہے۔

صاحبو! اسلام کا کوئی جز و بھی قابل ترک کے نہیں۔ حتیٰ کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو ایک مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اگر میں اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں تو اسلام کے خلاف نہ ہوگا۔ کیونکہ کچھ فرض نہیں اور توریت پر بھی عمل ہو جائے گا۔ اس پر یہ آیت نہایت شدومد کے ساتھ نازل ہوئی۔

یا یھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان

اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو۔

خیال کیجئے کہ گوشت کھانا بھی کوئی رکن اعظم تھا مگر اس کے ترک کو قربت سمجھنے پر کس قدر شدومد ہوا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا اتنا جز و بھی ترک کے قابل نہیں۔ پھر ست کیسے نکل سکتا ہے اور ست اسلام کا اس طرح نکالا ہے کہ بعض نے تو صرف عقیدوں کو کافی سمجھا ہے اور اعمال وغیرہ کی کچھ ضرورت نہ سمجھی۔ اگرچہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے عقیدوں میں بھی انتخاب کیا ہے لیکن وہ بہت اقل و نادر ہیں مگر ہیں ضرور۔

چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز کی ضرورت اب نہیں رہی۔ یہ عرب کے واسطے مقرر ہوئی تھی کہ وہ نامہذب تھے اب ہم متمدن ہیں ہم میں کوئی توحش کی شان باقی نہیں رہی۔ لہذا (نعوذ باللہ) اس کو اسلام سے حذف کر دیا جائے۔ انا للہ اس مشورے کا صحیح اور سیدھا جواب یہ ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے افسوس ہے کہ لوگ آج کل اس جواب کی قدر نہیں کرتے اور اس کو عجز اور دفع لوقتی پر محمول کرتے ہیں۔ اور ہم سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ قطع نظر حوالہ قرآن وحدیث سے ہر قانون کی لم بیان کرو۔

صاحبو! قوانین ظاہری جن میں بہت سے خلاف عقل عوام بھی ہیں ان کی لم کیوں نہیں تلاش کی جاتی۔ صرف وجہ یہ ہے کہ اس قانون کی وقعت دلوں میں ہے اور قانون اسلام کی وقعت نہیں۔ ورنہ اگر اس کی بھی وقعت ہوتی تو ہرگز اس میں چوں وچرا کی جاتی بلکہ یہ کہا جاتا ہے۔

زباں تازہ کردن باقرار تو　　　نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپکے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

اور یہ شان ہوتی ہے کہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

یعنی زندگی عطا فرمائیں تو آپ کی مہربانی ہے اور اگر آپ قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں۔ دل آپ پر آ گیا ہے جو کچھ تصرف کریں میں آپ پر راضی ہوں۔

دیکھئے انسان کو اگر کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے سامنے کیسا سرافگندہ ہو جاتا ہے۔ مجنوں کی لیلیٰ کے عشق میں کیا حالت ہوگئی تھی تو۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلے بود　　　گوئے گشتن بہر او اولے بود

(اللہ تعالیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیا کم ہے اس کیلئے کوچہ گردی اولیٰ ہے)

کیا خدا کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہوگئی ہے۔ اور لیجئے! اگر محبوب دس روپے مانگے تو محب کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ دس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے بلکہ غنیمت سمجھتا ہے اور مسرور ہوتا ہے افسوس کہ ایک مردار کی فرمائش پر تو مسرت ہو اور خدا تعالیٰ کے ارشاد کی لم تلاش کی جائے۔

میں ایک موٹی بات بتلاتا ہوں کہ قانون کی حکمت واضع قانون سے دریافت کرنی چاہئے نہ کہ عالم قانون سے۔ مثلاً اگر حاکم قانون مروج کی رو سے فیصل کر دے اور آپ اس سے پوچھیں کہ اس قانون کی مقرر کرنے میں کیا مصلحت ہے تو وہ کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہی کہے گا کہ ہم قانون کے حافظ ہیں واضع نہیں۔ مصالح واضعان قانون سے دریافت کرو۔

صاحبو! جب حاکم کو یہ جواب دینے کا اختیار ہے تو کیا علماء یہ جواب نہیں دے سکتے اور جب حاکم کا یہ جواب زبردستی اور عجز پر محمول نہیں کیا جائے گا تو علماء کے اس جواب کو عجز پر کیوں محمول کیا جاتا ہے اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ سائلین پر اتنی شفقت نہ کیا کریں۔ اور خواہ مخواہ عوام کو دلیر نہ بنائیں اور پنے درپے نہ کریں رہا یہ ڈر کہ بعض لوگ مصالح نہ معلوم

ہونے سے اسلام سے نکل جائیں گے تو میں کہتا ہوں کہ بلا سے نکل جائیں۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست   باب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

(جمال محبوب ہمارے عشق ناتمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ وروپ، خط وخیال کی حاجت نہیں ہے)

اسلام کو ایسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے بس قانون کے موافق جواب دو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس لئے پوچھتے ہیں کہ دوسروں کو بتلائیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ۔

آرزو مے خواہ لیک اندازہ خواہ   برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

تمنا کرو لیکن اپنے تحمل سے نہ بڑھو۔ اسلام کی خدمت کرو لیکن اپنے اندازہ کے موافق۔ اگر تم نے دو چار باتیں معلوم کر کے ایک دو سوال کا جواب دے دیا تو ان کے علاوہ دوسرے سوالات میں کیا کرو گے۔

چار پارا قدر طاقت بار نہ   بر ضعیفاں قدر قوت کار نہ
طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر   طفل مسکیں را از آں ناں مردہ گیر

یعنی بچے کو اگر روٹیاں دینے لگو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مرے گا تو عوام کو چاہئے اپنے درجے پر رہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کی خدمت نہ کرو۔ مگر جو خدمت تحقیق لمیات کی تم نے شروع کی ہے اس کو محدود کرو لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے۔

اعمال کی تلخیص

غرض بعض نے عقائد میں بھی تلخیص کی ہے لیکن ایسے بہت کم ہیں۔ باقی اعمال کی تلخیص وحذف کرنے والے تو بہت ہی ہیں اور بعض نے عقائد کے ساتھ اعمال کو بھی ضروری سمجھا۔ مگر کسی نے تو صرف نماز کو اختیار کیا اور زکوٰۃ کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس نے دیکھا کہ اگر چار ہزار روپیہ ہوگا تو اس میں سے ایک سو روپیہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ اس کو بالکل ہی ترک کر دیا ان لوگوں کی وہ حالت ہے کہ۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   ور زر طلبی سخن دریں است

اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں۔ اگر مال مانگو اس میں کلام ہے۔ کوئی صاحب اندیشہ نہ

کریں کہ شاید اب چندے کی فرمائش کی جائے گی۔ میں چندہ نہیں مانگوں گا۔ مقصود زکوۃ دینے والوں کی حالت کا بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا صرف زبانی دعویٰ رکھتے ہیں۔ باقی امتحان کے وقت جی چراتے ہیں۔

مشہور ہے کہ کسی بخیل سے اس کے دوست نے انگوٹھی مانگی تھی کہ وہ یادگار کے طور پر رہے۔ اس نے کہا کہ جب اپنا ہاتھ خالی دیکھا کرو تو مجھے یاد کرلیا کرو کہ ہم نے ایک دوست سے انگوٹھی مانگی تھی مگر اس نے نہیں دی تو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بھی ایسی محبت رکھیں کہ صرف نماز پڑھ لیا کریں تا کہ اس کے ذریعے سے بزرگوں میں داخل سمجھے جائیں باقی اور اعمال کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بعض نے نماز کے ساتھ زکوۃ کو بھی لیا لیکن حج کو چھوڑ دیا کہ اتنے دنوں تک دکان بند کرنی پڑے گی۔ نقصان ہوگا سفر میں تکالیف ہوں گی بعض نے اس کو بھی لیا لیکن ابواب آمدنی کو نہیں روکا۔ پھر ان میں بعض نے رشوت لینی شروع کر دی۔ بعض نے سود خوری اختیار کر لی۔ اور کہا جاتا ہے کہ اگر رشوت یا سود لینا چھوڑ دیں تو آمدنی کے وسائل بند ہو جائیں گے۔ یہ تو وہ کوتاہیاں تھیں جن میں اکثر اہل دنیا مبتلا ہیں۔

خواص کی کوتاہیاں

بعض کوتاہیاں ہیں کہ ان میں دیندار بھی مبتلا ہیں مثلاً اکثر لوگ جن میں دیندار بھی ہیں ریل کے سفر میں اسباب زیادہ لے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل ناجائز ہے خوب سمجھ لیجئے کہ قیامت میں یہ سب دینا پڑے گا۔ علیٰ ہذا ڈاکخانے کے بعض قواعد مثلاً اگر کسی ٹکٹ پر بالکل مہر نہ لگی ہو اور وہ ایک مرتبہ کام میں آچکا ہو تو اس کو دوسری دفعہ کام میں لانا جائز نہیں ہے۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ میرے ایک عزیز سے کسی نے پوچھا کہ دیانت کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ دیانت یہ ہے کہ ڈاکیا ایک لفافہ دے کر جائے اس کا ٹکٹ مہر سے محفوظ نظر آئے اور اس وقت کوئی شخص اس مکتوب الیہ کے پاس نہ ہو نہ کسی کو خبر ہونے کا اندیشہ ہو اور یہ ٹکٹ کو سالم اتار کر کام میں لا سکتا ہو اور وہ ایسے وقت میں محض خدا کا خوف کر کے لفافہ کھولنے سے پہلے اس ٹکٹ کو اتار کر پھاڑ ڈالے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو سمجھا جائے گا کہ یہ پورا دیانت دار ہے۔

مقصود اس سے دیانت داری کی ایک مثال دینا ہے نہ کہ اس میں منحصر کرنا اور اس

سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اسلام کی کیا خوبیاں ہیں واللہ اسلام ہرگز چالاکیوں اور مکاریوں کی اجازت نہیں دیتا کہ یعنی کسی کو ذرا سی تکلیف پہنچانا بھی اسلام کے خلاف ہے۔ یہاں تک حکم ہے کہ جانور کو ذبح کرو تو اس کو راحت دو۔ یعنی چھری کو خوب تیز کرلیا کرو۔ کیا انتہا ہے رحمت کی کہ ذبح کہ بظاہر تکلیف ہے لیکن شرافت انسانی کی وجہ سے اس کی اجازت دے دی گئی ہے اس میں بھی راحت رسانی کا کتنا بڑا خیال ہے۔

رہا یہ شبہ کہ تکلیف تو اب بھی ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو کیا خبر ہے کہ خود مرنے میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے یا ذبح میں زیادہ ہوتی ہے اگر شبہ ہے تو مرنے سے بھی ہونا چاہئے کیونکہ ذبح کا شارع اور موت کا خالق ایک ہی ہے۔ اگر اس کی تشریع پر شبہ ہے خلاف رحمت ہونے کا تو موت کے تکوین پر بھی ہونا چاہئے۔ تو جس نے جانور پر رحمت کا حکم کیا ہے وہ انسان کے لئے رحم کو کیوں نہ واجب کرے گا۔ پھر دھوکا دغابازی خیانت کو کیسے جائز رکھے گا۔ مگر افسوس کہ ہم نے اس کو ذرا بھی رعایت نہ کی۔ اپنے بھائیوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ خصوصاً جو لوگ آج بڑے کہلاتے ہیں ان کے معاملات کی بری حالت ہے۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ریل میں سوار ہوئے۔ ایک قلی کے سر پر ان کا اسباب تھا۔ اسباب کو رکھوا کر انہوں نے قلی کو ایک گھسی ہوئی دونی دی۔ اس نے کہا کہ حضور یہ تو خراب ہے کہنے لگے کہ ہم کیا کریں۔ اس نے کہا کہ بدل دیجئے۔ کہنے لگے ہم نہیں بدلتے۔ اس نے کہا کہ صاحب میں کیا کروں گا کہنے لگے کہ چلا دینا۔ اس نے کہا کہ میں کیسے چلا دوں گا۔ تو کہتے ہیں کہ جیسے ہم نے چلا دی۔ بھائی تم نے تو اس لئے چلا دی کہ تم بڑے شخص ہو۔ اگر اس قلی کو بھی کوئی ایسا ذلیل مل جائے جس کی ذلت کی نسبت اس کی عزت کے ساتھ ایسی ہو جیسے اس کی ذلت کی نسبت تمہاری عزت کے ساتھ تو وہ بھی چلا سکے گا۔ مگر ایسا شخص اس کو کہاں ملے گا۔ آخر وہ روتا ہوا واپس چلا گیا اور گاڑی چھوٹ گئی۔

ایسا افسوس ہوا کہ جب یہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر ہمدردی کے لیکچر دیتے ہیں تو اس وقت ان کی زبان کیسی چلتی ہے اور کس قدر زور ہوتا ہے جس سے معلوم ہو کہ ان کے برابر دنیا بھر میں کوئی ہمدرد نہیں اور اعمال کی یہ حالت ہے۔

اسلام اور امن

صاحبو! میں یہ قسم کہتا ہوں کہ مذہب کا پابند ہو کر تو ہمدردی کرنا ممکن ہے ورنہ ہرگز ممکن نہیں۔ نرے تمدن سے کبھی کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بالکل واقعات سے ظاہر ہے اس وقت لوگوں نے مذہب کو بالکل چھوڑ دیا ہے اگر مذہب کی پابندی ہو جائے تو ہرگز کبھی کسی سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچ سکتی اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے امن عام کی کتنی حفاظت کی ہے۔

میں ایک دوسری بڑی مثال تعلیم حفظ امن کی اسدم میں وکھلاتا ہوں ابن ابی الدنیا نے روایت کیا ہے۔

لاتسبوا الملوک فانما قلوبھم بیدی ۔الحدیث

(کنز العمال ۱۴۵۸۶، ۱۴۸۶۸)

یعنی اگر حکام سے تم کو تکلیف پہنچے تو ان کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ ان کے قلوب تو میرے اختیار میں ہیں۔ بلکہ مجھ سے اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرو۔ میں ان کے قلوب کو نرم کر دوں گا۔ اللہ اکبر! کس قدر امن پسندی ہے کہ حکام کو زبان سے بھی کچھ کہنے کی اجازت نہیں اگر چہ ان سے بظاہر کچھ تکلیف ہی پہنچی ہو بلکہ یہ حکم ہے کہ میری اطاعت کرو۔ غرض معاملات کے متعلق یہاں تک تعلیم ہے مگر لوگوں کی معاملت میں دیکھ لیجئے کیا حالت ہے۔

اسلام میں معاملات ومعاشرت

بعض نے معاملات کو بھی لیا لیکن معاشرت کو بگاڑ دیا حالانکہ شریعت نے معاشرت کی ایک جزئی بیان کرتا ہوں قرآن شریف میں ارشاد ہے۔

یایھا الذین امنوا لاتدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا علیٰ اھلھا

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کر لو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کر لو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

یہ مسئلہ استیذان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بغیر استیذان کے کسی کے گھر میں داخل نہ ہو اور یہ آیت مجمل ہے اس میں استیذان کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی کہ کب تک اجازت مانگا کریں۔ حدیث میں اس آیت کی شرح ہے کہ تین مرتبہ اجازت چاہو اگر اجازت نہ ملے تو واپس

چلے جاؤ۔ چوتھی بار مت پوچھو کہ مخاطب تنگ ہوگا اور یہ مردانہ اور زنانہ دونوں کے لئے ہے۔ لیکن مردانہ قطعات مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ان میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ہاں آنے کی ہر شخص کو اجازت ہوتی ہے جیسے حکام کی عدالتیں یا مجلس عام۔ وہاں استیذان کی ضرورت نہیں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں استیذان کی ضرورت ہے بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ وہاں بیٹھنے کی غرض قرائن سے بھی معلوم ہوجاتی ہے کہ خلوت ہے اور علی العموم سب کو آنے کی اجازت نہیں۔ تو شریعت کا حکم ہے کہ اگر قرائن سے معلوم ہوجائے کہ اس وقت اس شخص کو خلوت مقصود ہے تو بغیر استیذان وہاں ہرگز نہ جاؤ پھر کیا کوئی صاحب اس پر عمل کرتے ہیں اور اگر کوئی کرتا ہے تو اس کو طعن کیا جاتا ہے نیز حکم ہے کہ اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک مرتبہ کوئی اجازت نہ دے پھر دیکھئے جو عمر بھر اس طرف رخ بھی کریں کیونکہ صاحب اگر وہ آزاد نہ ہو تو طلب اجازت کیا ہوئی یہ تو محض اطلاع ہوئی کہ ہم آگئے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ لیجئے۔ حکم ہے کہ جب نماز جمعہ سے فارغ ہوجاؤ اور کوئی دوسرا بھی جلسہ وعظ وغیرہ کے نہ ہو تو منتشر ہوجاؤ اور کھاؤ کماؤ لیکن دل بیار دست بکار خدا کو نہ بھولو حاصل اس کا یہ ہے کہ جس کام کے لئے جمع ہوئے تھے جب یہ کام ہوچکے تو متفرق ہوجاؤ کیونکہ بیکار اژدہام میں ممکن ہے کوئی فساد کھڑا ہوجائے۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ اگر تین آدمیوں کا مجمع ہو تو ان میں سے دو کو یہ جائز نہیں کہ ایک کو تنہا چھوڑ کر کسی خفیہ مشورے میں لگ جائیں جب تک کہ تیسرا چلا نہ جائے یا کہ کوئی چوتھا نہ آجائے کیونکہ اس کو ناگوار ہوگا۔ اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ مجھ کو غیر سمجھا اور مجھ سے پردہ رکھا۔ اور جب چوتھا آجائے گا تو اس تیسرے کو اس لئے رنج نہ ہوگا اس کو احتمال ہوگا کہ شاید چوتھے سے مخفی کرنا راز کا مقصود ہے۔ اور چوتھے کو اس تیسرے سے یہی احتمال ہوگا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چیز کے متعلق ایک نہایت مناسب قانون مقرر فرمادیا ہے۔ مگر افسوس ہے ہمارے بھائیوں نے ان قانونوں کو کبھی دیکھا بھی نہیں۔

بعض لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے معاشرت کو بھی کچھ کچھ لیا ہے۔ مگر اخلاق کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور ایسے بکثرت ہیں کہ جن کو اخلاق کے صحیح معنی بھی معلوم نہیں۔ تو سمجھ لیجئے کہ تہذیب اخلاق وہی چیز ہے جس کو تصوف کہتے ہیں اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ ہم جس طرح

اعمال ظاہرہ کے مکلف ہیں اسی طرح اعمال باطنہ کے بھی مکلف ہیں۔ ہم کو حکم ہے کہ تکبر نہ کریں۔ ہم کو حکم ہے کہ خدا کی محبت پر کسی کی محبت غالب نہ کریں ہم کو حکم ہے کہ دل میں بغض وکینہ نہ رکھیں پھر بتلایئے کہ ہم نے اس کی کیا فکر کی ہے اور جو لوگ کچھ بھی کر رہے ہیں وہ حقیقت کو چھوڑ کر رسم پرستی کر رہے ہیں۔ اصل حقیقت کی طرف کسی کو بھی توجہ نہیں الا ماشاء اللہ!

تو اسلام کامل یہ ہوا کہ عقائد بھی درست اور کتاب وسنت کے موافق ہوں اور اعمال یعنی دیانات ومعاملات، گواہی، وکالت، تجارت، زراعت اور معاشرت مثلاً کھانا، پینا اٹھنا بیٹھنا اور اخلاق باطنہ صبر وشکر واخلاص یہ سب کے سب موافق شریعت کے ہوں۔ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام اسلام کامل ہے۔ اگر ان میں سے ایک جزو بھی کم ہو تو وہ اسلام ایسا ہے جیسا کوئی شخص حسین ہو لیکن اس کے ناک نہ ہوں۔ اس تقریر سے آپ کو اسلام کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی۔

ہمارے امراض اور ان کا علاج

اب غور کیجئے کہ ہم نے مسلم کہلانے کا استحقاق کس درجہ تک حاصل کیا ہے واقعی ہماری وہ حالت ہے کہ

طاؤس را بہ نقش ونگارے کہ ہست خلق　　تحسین کنند او خجل از زشت پائے خویش

مور کے نقش ونگار (یعنی خوبصورتی کی) مخلوق تحسین کرتی ہے اور وہ اپنے پاؤں کی خرابی سے شرمندہ ہے۔

اے مسلمانو! اگر تمہیں کسی نے مولوی کہہ دیا یا شاہ صاحب کہہ دیا یا رفارمر کہہ دیا تو مغرور نہ ہو جانا کہ ہم بھی کچھ ہوں گے صاحبو! خود بھی تو اپنی حالت کو دیکھو کہ ہم واقع میں کیا ہیں۔

ہماری وہ حالت ہے جیسے ایک قصہ ہے کہ کسی شخص کے پاس ایک گھوڑا تھا اس نے ایک چابک سوار سے کہا کہ میرا گھوڑا بیچ دو۔ اس نے بازار میں کھڑا کر کے بیچنے کے لئے خلاف واقع اس کی بہت کچھ تعریف کرنی شروع کی۔ مالک نے جو سنا تو کہنے لگا کہ جب یہ ایسا ہے تو لاؤ مجھی کو دے دو۔ احمق نے چابک سوار کی حکایت کو تو سنا اور اس سے دھوکہ ہوا۔ مگر یہ خبر نہ ہوئی کہ گھوڑا تو میرا ہی ہے۔ میں نے ہی پانچ برس تک خود اس کو رکھا ہے اور بیچ رہا ہوں۔

اسی طرح ہم کو اگر کوئی مولوی یا لیڈر کہتا ہے تو ہماری تلبیس سے پھر اپنے مشاہدے کو

غلط سمجھنا اور خوشامدیوں کی روایت کو صحیح سمجھنا عجیب بات ہے۔ ان خوشامدیوں کے باب میں اور ہمارے دھوکہ کھانے کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں۔

تن قفس شکل ست اما خارجاں   از فریب داخلان و خارجان
اینش گوید نے منم ہمراز تو   آنش گوید نے منم انباز تو
او چو بیند خلق را سرمست خویش   از تکبر مے رود از دست خویش

حالانکہ آدمی سے اپنی حالت مخفی نہیں رہ سکتی۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

بل الانسان علیٰ نفسه بصیرة ولو القیٰ معاذیرة

بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گو اپنے حیلے پیش لائے۔

میری تقریر گو مختصر ہے یہ ایک کافی میزان ہے ہم لوگوں کی حالت کی۔

اب میں مختصر ان امراض کا علاج بیان کرتا ہوں ہمارے ان امراض کے دو سبب ہیں۔

ایک قلت علم دوسرا ضعف ہمت

یعنی بعض خرابیاں تو قلت علم سے پیدا ہوئی ہیں اور بعض خرابیاں باوجود جاننے کے قلت ہمت سے اور قلت ہمت قلت خشیت سے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً سردی کے وقت نماز کا قضا کر دینا اس کا سبب قلت خشیت اور قلت ہمت ہے تو ان اسباب کو دور کرنا چاہیے۔ یعنی اول تو بقدر ضرورت علم دین پڑھنا چاہئے۔ اگر اصطلاحی عالم بنے تو بہت ہی اچھا ہے۔ رہا دنیا داروں کا اس پر شبہ کہ اصطلاحی عالم بن کر پھر یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟ یہ واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے۔ کیونکہ یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جو شخص کسی جماعت کی خدمت میں محبوس ہو اس کا نفقہ اس جماعت کے ذمہ ہے۔ اور جب یہ بات ہے تو کہنا کہ کہاں سے کھاؤ گے واقع میں اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے۔ یہ سوال تو علماء کر سکتے تھے کہ یہ کہاں سے کھائیں گے مگر وہ تو خدا پر نظر کر کے بیٹھ رہے۔ اب یہ خود یاد دلاتے ہیں کہ ہم میں ایک عیب ہے کہ باوجود ہمارے ذمہ ہونے کے ہم خیال نہیں کرتے حاصل جواب کا یہ ہے کہ قوم کے ذمہ ہے کہ ان لوگوں کے اخراجات کی متکفل ہو۔ مگر علماء کو یہ چاہئے کہ وہ قوم پر ہرگز نظر نہ کریں بلکہ

دلا رامے کہ داری دل درد بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

اور ہر وقت اس کو پیش نظر رکھیں۔

ولله خزائن السموات والارض

اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں خزانے آسمانوں اور زمین کے۔

اکبر بادشاہ کی حکایت مشہور ہے کہ یہ ایک مرتبہ شکار پر گئے اور ساتھیوں سے بچھڑ کر کہیں دور نکل گئے ایک دیہاتی نے ان کو مہمان رکھا۔ اکبر اس سے بہت خوش ہوئے اور کہا کہ دارالسلطنت میں آنا چنانچہ وہ دہلی آیا۔ اکبر اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگی۔ دیہاتی نے یہ حالت دیکھی جب دعا سے فارغ ہوئے تو پوچھ کہ تم کیا کر رہے تھے؟ اکبر نے کہا کہ خدا تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا اور مراد مانگ رہا تھا کہنے لگا کیا تم کو بھی مانگنے کی ضرورت ہوتی ہے؟ اکبر نے کہا کہ بے شک! کہنے لگا کہ پھر میں اسی سے کیوں نہ مانگوں جس سے تم کو بھی ضرورت مانگنے کی ہوتی ہے۔

اہل علم کو چاہیے کہ اگر خدمت دین کریں تو نہ اس لئے کہ ہم کو نذرانہ ملے گا خدا کی قسم خدا کا نام دونوں عالم سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے خوب کہا ہے۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اپنی قیمت دو جہاں بتلائی ہے۔ نرخ بڑھایئے کیونکہ ابھی ارزاں ہے

غرض مولویت کے درجے تک اگر پہنچیں تو بہت ہی اچھا ہے لیکن اگر کوئی مولوی نہ بنے تو بقدر ضرورت علم دین ضرور حاصل کر لینا چاہئے اور ضروریات یہ ہیں۔ عقائد، دیانات، معاملات، معاشرت، اخلاق اس کے بعد خواہ انگریزی ہو یا صنعت سیکھو جو چاہو کرو نیز اگر کوئی ذی استعداد ہو تو اس کے علاوہ اجزائے مذکورہ کے وہ کتابیں بھی پڑھا دی جائیں جن میں ملحدین کے اعتراضات علی الاسلام والمسلمین کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ تو خواندہ لوگوں کی تحصیل علم کا طریقہ ہے۔

رہے بے پڑھے لوگ ان کی تعیم کی یہ تدبیر ہے کہ کوئی عالم ہفتے میں ایک دوبار عام لوگوں کو کسی مسجد وغیرہ میں جمع کر کے احکام سنا دیا کرے اور سمجھ دیا کرے اور عورتوں کی تعلیم یوں ہو سکتی ہے کہ ان کے گھروں کے مرد روزانہ دینی رسائل ان کو پڑھ کر سنا دیا کریں اور جو علماء سے سنیں وہ ان کے کان میں ڈالتے رہیں۔ اور اگر کوئی محلے میں خواندہ عورت ہو کبھی کبھی اس سے کتاب پڑھوا کر سن لیا کریں۔ یہ وہ طریقہ ہے کہ اس سے عام امت محمدیہ عالم ہو سکتی ہے۔

رہا ضعف ہمت و قلت خشیت اس کا علاج یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے اس میں یہ سوچا کرے کہ ہم کو خدا تعالیٰ نے کیا کیا نعمتیں دی ہیں اور ہم نے کیا معاملہ خدا کے ساتھ کیا ہے کچھ سوچو کہ

حشر کا میدان ہوگا اور ہم خدا تعالیٰ کے سامنے ہوں گے اور ہم سے ان سب نعمتوں کو ہمارے معاصی کی نسبت سوال کیا جائے گا۔ پھر خدا تعالیٰ کے عذابوں کو یاد کرو اور اس وقت خدا تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر کر خوب گڑگڑا کر دعا کرو اور استغفار کرو اگر اس کو نباہ کر کرو گے تو ایک ہفتے میں ان شاء اللہ تعالیٰ عظیم الشان تغیر حالت میں ہوگا۔ اور اس میں ہر وقت جائز و ناجائز کی فکر ہوگی۔

ایک کام یہ کرو کہ اہل اللہ کی خدمت میں جایا کرو لیکن کسی ایسے کے پاس جاؤ جو کہ بقدر ضرورت عالم ہوں اور اگر ایسا میسر نہ ہو تو بزرگوں کی حکایات و نصائح دیکھ کرو۔ یہ علاج ہے قلت علم و ضعف ہمت کا اور پھر اس حالت پر دوام رکھو جب تم اس حالت پر دائم رہو گے۔

تو **لاتموتن الا و انتم مسلمون** بجز اسلام کے کسی حالت پر جان مت دینا۔

پر پورا عمل ہو جائے گا۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ توفیق عمل دیں امین یا رب العالمین۔

(ناظرین وعظ سے التماس ہے کہ جامع وعظ کے لئے بھی حسن خاتمہ و حصول رضائے باری کی دعا فرمائیں اور تا قید حیات حصول استقامت کی۔

فرمایا کہ شریعت نے مصیبت کے وقت صبر و تحمل کی تعلیم دی ہے۔ تدبیر کرو۔ دعا کرو جوش سے کیا حاصل۔ (کمالات اشرفیہ)

تجارت آخرت

(اشرف المواعظ حصہ سوم)

حاجات بدنیہ و مایہ کے **متعلق** یہ وعظ ۱۷ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد سہارنپور میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا جس میں ۲۲۰ کے قریب طلباء اور قدیم وضع کے لوگ موجود تھے مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد ان لا اله الا الله و حده لا شریک له و نشهد ان سيدنا ومولانا محمد اعبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و على اله واصحابه و بارک وسلم. اما بعدفقد قال الله تعالىٰ ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة (التوبہ:١١١)

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی)

ترقی کی حقیقت

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اس میں خداوند تعالیٰ نے مجملاً ان تمام وظائف ضروریہ کو جو بندے کے ذمہ ضروری ہیں بہت مختصر لفظوں میں ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہم لوگوں میں منجملہ بہت سی کوتاہیوں کے ایک کوتاہی وہ بھی جس کی اصلاح کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگوں میں بہت سی کوتاہیاں ہیں۔ بہت سی باتوں میں اہل اسلام مرکز سے ہٹے ہوئے اور اپنی مخترعہ من سمجھوتوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور اہل اسلام کی تخصیص قید احترازی نہیں یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ کوتاہیاں صرف اہل اسلام ہی میں ہیں دوسری قوموں میں نہیں جیسا کہ بعض اہل مذاق جدید کا خیال ہے اسی لئے وہ جس رنگت اہل اسلام کی مذمت کرتے ہیں تو دوسری قوموں کی مدح کرتے ہیں کہ فلاں قوم میں فلاں صفت نہایت اچھی ہے مگر مسلمانوں میں نہیں اور اس میں بھی بعض تو وہ مدائح ہیں کہ وہ فی نفسہ مدح کے قابل ہیں۔ نیز ان کے ذکر کرنے سے مسلمانوں کو غیرت دلانا مقصود ہوتی ہے کہ جن لوگوں کا دین سے تعلق بھی نہیں ان میں تو یہ مدائح موجود ہیں اور جن لوگوں میں جیسا دین سے ہونا چاہئے وہ بالکل معرا ہیں۔ اس کا تو

مضائقہ نہیں قابل افسوس تو یہ امر ہے کہ یا تو غیر قوموں کی وہ صفات بیان کی جاتی ہیں جو واقعہ میں قابل مدح ہی نہیں ہیں یا اگر قابل مدح ہیں تو ان سے مقصود صرف مسلمانوں پر طعن اور ان کا دل توڑنا اور عیب کھولنا ہوتا ہے یہ امر مسلمانوں کے لئے سخت محل شکایت ہے۔

اگر واقعات کا مشاہدہ کیا جاوے تو ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ واقعی اکثر اہل اسلام کا یہ شیوہ ہو گیا ہے ہر عاقل آدمی کو قرائن سے ان کے لب ولہجہ سے اس نفرت سے جو کہ ایسے لوگوں کو مسلمانوں سے ہے ان سب کے مجموعہ سے اس کا اخذ کر لینا بعید نہیں کہ ان لوگوں کا مقصود محض اہانت ہوتی ہے مسلمانوں کی پھر لطف یہ کہ جن مدائح کی مسلمانوں نفی کی جاتی ہے وہ واقع میں مدائح بھی نہیں۔ یعنی شریعت مطہرہ کے نزدیک مطلوب نہیں ہیں۔ اگرچہ دنیا میں کسی درجہ میں مطلوب ہوں لیکن مسلمان من حیث المسلمان (مسلمان ہونے کی حیثیت سے) کے منہ سے ان مدائح کا نکلنا بالکل ایسا ہے کہ جیسے کوئی شخص ہاتھی کی یہ تعریف کرنے لگے کہ وہ اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اگر اس کو وزن کیا جاوے تو پچاس من کا اترے کہ یہ صفت اگرچہ واقعی صفت ہے لیکن اس کو تہذیب نفس اور قابل مدح ہونے میں کچھ دخل نہیں۔

بس اسی قسم کے وہ مدائح ہیں کہ جن کو آج کل مدائح سمجھا جاتا ہے اگرچہ ان میں کسی درجہ میں منفعت ضرور ہے جیسے ہاتھی کے اس قدر وزنی ہونے میں کیونکہ حکیم مطلق نے ہاتھی کو اتنا بڑا جثہ بلا وجہ نہیں عطا فرمایا لیکن حکیم مطلق نے اس کو کمال قابل مدح نہیں ٹھہرایا۔

چنانچہ ان ہی مخترعہ مدائح میں ایک مدح ترقی کرنا بھی ہے کہ اس کو بہت بڑی مدح سمجھا جاتا ہے علی ہذا خودداری وغیرہ۔ سو غور کر کے دیکھ لیجئے کہ شریعت نے ان کو مدح کے قابل سمجھا ہے یا نہیں۔ ترقی نہایت خوبصورت لفظ ہے لیکن اس وقت اس کا ماحصل محض طول امل وحرص ہے جس کی شریعت مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے۔ صحابہ کرامؓ جو کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے نمونے تھے۔ انہوں نے اس کو اپنے خیال میں کبھی جگہ نہیں دی۔ جناب رسول مقبول نے کبھی اس کی تعلیم نہیں فرمائی۔ حضور کی سیرت جس کا ایک ایک واقعہ احادیث میں مدون ہے اس کو دیکھا جائے ابتداء سے انتہا تک کہیں بھی آپ کو یہ تعلیم نہ ملے گی۔ رہے تاریخ واقعات سو ان کا یہ حکم ہے کہ اگر وہ حدیث سے مطابق ہوں تو قابل اخذ ہیں ورنہ ہیچ محض۔

حدیث وتاریخ میں تفاوت

کیونکہ مورخین میں یہ بڑا مرض ہے کہ وہ واقعات میں اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں۔ پھر اس رائے کو بصورتِ واقعہ بیان کرتے ہیں زمانہ حال کے بعض خودرو مصنفین پر افسوس ہے کہ وہ محدثین پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے واقعات میں اپنی رائے کو شامل کیا ہے لیکن جو شخص محدثین کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ محدثین علیہم الرحمۃ نے کس تدین سے کام لیا ہے۔ البتہ یہ اعتراض مطابق واقع کے مورخین پر ضرور ہو سکتا ہے۔ صاحبو! محدثین کا تدین اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ اگر ایک باب میں حدیث سے ایک بات کو ثابت کرتے ہیں تو اس کے بعد ہی دوسرا باب اس کا معارض صوری بیان کرتے ہیں اور اس میں بھی حدیث پیش کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ان حضرات کا مقصود محض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات جمع کرنا ہے نہ کہ اپنی رائے کو ثابت کرنا یا اس پر زور دینا۔ کیونکہ جب ایک حدیث کے ساتھ دوسری حدیث جو پہلی سے صورت معارض ہے موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اس محدث کی رائے کسی ایک جانب ہوگی۔ تو بصورت ایراد معارض کوئی خاص رائے کیونکر مقصود ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اپنی اغراض کو تائید مقصود نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود تمام احادیث کا لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے کہ دیکھیں اور خوب سمجھ لیں۔

ہاں تاریخ میں اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں کہ ایک مورخ نے اپنے خیال کے موید واقعات کو لیا اور دوسرے نے اپنے خیال کے مویدات کو۔ پس جب حدیث و تاریخ میں یہ تفاوت ہے تو حدیث قابل وثوق ہوئی اور اس کے مقابل تاریخ قابل وثوق نہ ہوئی۔ تو جو واقعات تاریخ میں حدیث کے خلاف ہوں گے اور حدیث ان کو باطل کرتی ہوگی وہ محض ہیچ ہیں ہرگز قابل قبول نہیں۔

انحناء و انطباق غرض حدیث کو دیکھئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ آپ کا طرز زندگی کیا تھا اور وہی طرز زیین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا۔ تو صحابہؓ کے ہاں طول امل اور طول حرص کا نشان نہیں تھا ان کی ترقی ترقی دین تھی۔ اگرچہ اس کے تابع ہو کر ان حضرات کو دنیا کی بھی وہ ترقی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں۔ لیکن مطمح نظر صرف ترقی دین تھا۔

چنانچہ ان حضرات کی اس شان کو خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

الذین ان مکناهم فی الارض اقاموا الصلوٰة واتواالزکوٰة و امروا بالمعروف ونهوا عن المنکر

یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دے دیں تو یہ لوگ اس وقت بھی نمازیں قائم کریں اور زکوۃ دیں اور اچھی باتوں کی ترغیب دیں اور بری باتوں سے روکیں۔

یہ ہے ان کے خیالات کا نقشہ جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہوسکتا۔ اب ان کو یاد رکھئے اور پھر ان کے ساتھ اپنے خیالات کو دیکھئے اور انطباق کیجئے واللہ ایسا دشوار انطباق ہے جیسے خط مستقیم پر خط منحنی کو منطبق کرنے لگیں کہ جب تک اس میں استقامت اور اس میں انحنا باقی رہے کبھی انطباق ممکن ہی نہیں تو ہمارے خیالات خط منحنی کی طرح ہیں اور ان حضرات کے خیالات کے مثال خط مستقیم ہے۔

بحمداللہ! یہ مثال ایک خاص اعتبار سے بھی بہت ہی اچھی خیال میں آئی کیونکہ خط منحنی کے انطباق علم المستقیم کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعض اجزاء تو خط مستقیم پر سے گزرے ہوتے ہیں اور بعض اجزاء اس سے ہٹے ہوئے ہیں۔ یہی حالت ان خیالات مخترعہ کی ہے ان میں اگر ایک قدم شریعت پر ہے تو دوسرا اس سے بالکل الگ جس کا کسی تاویل سے بھی جادہ شریعت پر انطباق نہیں ہوسکتا۔ پس ایسے حالات کس طرح قابل مدح ہوسکتے ہیں۔

ہمدردان قوم کی حالت

غرض جن مدائح کی آج کل لوگ علی العموم مسمانوں سے نفی کرتے ہیں وہ مدائح واقع میں اس مسلک میں داخل ہونے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے اور اگر بعض باتیں واقع میں قابل مدح ہوں بھی جیسے ہمدردی وایثار وغیرہ تب بھی ان کی نفی کرنے سے مقصود محض مسلمانوں کی تذلیل ہوتی ہے دلسوزی یا ہمدردی ہرگز مقصود نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر ہمدردی ہوتی تو دوسری باتوں میں بھی تو ان کے ساتھ ہمدردی ہوتی حالانکہ میں اس وقت ان ہی طاعنین میں بہت سے لوگ دیکھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اختلاف کو بھی گوارا نہیں کرتے۔ مسلمانوں کا اسلام بھی ان کو پسند نہیں اور جب یہ حالت ہے تو کسی طرح بھی کہا نہیں جاسکتا کہ ان کو مسلمانوں سے ہمدردی ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو مان بھی لیا جائے تب بھی اس خاص سبب سے جو مذکور ہوا ہرگز ممکن نہیں کہ ان کی ذات سے عام

مسلمانوں کو کسی قسم کی بہبودی یا نفع پہنچ سکے۔

بدیہی بات ہے کہ طبیب اس وقت مریض کو نفع پہنچا سکتا ہے کہ جب مریض کے پاس آئے نبض دیکھے قارورہ دیکھے۔ تسلی دلجوئی کرے اور اگر ایسا نہ کرے بلکہ دور ہی سے محض صورت دیکھ کر الٹا سیدھا نسخہ تجویز کر دے تو عقلمند باور نہ کرے گا کہ یہ طبیب اس مریض کو اس کے مرض سے نجات پانے کا سبب بن سکتا ہے اور وہ مریض اس کے علاج سے تندرست ہو سکتا ہے۔

دیکھ لیجئے طاعون کے زمانہ میں جو طبیب مریضوں سے دور رہتے ہیں ان کی ذات سے کیا کسی مریض کو فائدہ پہنچتا ہے؟ کسی ایک کو بھی نہیں! ہاں اس طبیب سے ضرور فائدہ پہنچتا ہے جو مریض کے مرض کو اپنا مرض سمجھ کر اس کے ساتھ بالکل گھل مل جائے۔

مجھ سے ایک طبیب نے بیان کیا کہ ایک زمانہ میں جب ان کے قصبہ میں مرض طاعون پھیلا تو ۶۳ مریض ان کے زیر علاج رہے جن میں سے ۵۳ تندرست ہو گئے اور دس مریض انتقال کر گئے۔ کہتے تھے کہ ان ۶۳ میں ایک مریض ایسا بھی تھا کہ جب اس کی نبض کو میں نے دیکھا ہے تو شدت حرارت کی وجہ سے میری انگلی پر چھالا پڑ گیا لیکن پھر بھی اس کی تدابیر میں مصروف رہا۔

غرض جب طبیب مریض سے نفرت کرے گا وہ مریض کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا آج دیکھ لیجئے کہ ان مدعیان طبابت اخلاق کا کیا برتاؤ قوم کے ساتھ ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اپنے ساتھ بھی ان کی ہمدردی نہیں اور اپنے امراض کے لاج پر بھی توجہ نہیں اور یہی سبب ہے قوم سے ہمدردی نہ کرنے کا۔ کیونکہ طبعاً اپنا خیر خواہ انسان زیادہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی جو خیر خواہی کرتا ہے اس میں اپنی خیر خواہی مضمر ہوتی ہے۔ پس جو شخص اپنا ہمدرد نہ ہو گا وہ دوسروں کا کیسے ہمدرد ہو گا یہ لوگ اول اپنی اصلاح کریں پھر دوسروں کی اصلاح حقیقی کی فکر کریں۔ آج یہ حالت ہے کہ اظہار ہمدردی اسلام میں بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں انجمن قائم ہوتی ہیں مگر نہ نماز کی فکر ہے نہ روزے کا خیال ہے۔ مال کی اتنی افراط ہے کہ دس آدمیوں کو اور بھی ساتھ لے جا سکیں۔ لیکن محبت اسلام کا یہ عالم ہے کہ خود بھی حج کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ وضع کو دیکھئے تو سر سے پاؤں تک بالکل اسلام کے خلاف۔ گفتگو دیکھئے تو وہ مذہب سے بالکل جدا۔ تو جب ان کو اپنے امراض کے ازالہ کی فکر نہیں تو پھر دوسروں کے امراض کے ساتھ ان کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

بات یہ ہے کہ ہر زمانہ کی ایک رسم ہوتی ہے اہل زمانہ اسی پر چلنے لگتے ہیں۔ آج کل یہ رسم ہے کہ ہر مشہور یا غیر مشہور تحصیل شہرت یا تکمیل شہرت کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کے ذرائع بہم پہنچاتا ہے منجملہ ان ذرائع کے ایک یہ بھی ہے کہ انجمنیں قائم کی جائیں اور جلسے کیے جائیں کوئی ان انجمنوں کا گورنر ہو جائے کوئی سکرٹری کوئی کچھ اور کوئی کچھ اور اس سے عام و خاص کا ان کو ایک امتیاز ہو جائے۔ پھر رسم بھی اگر شریعت پر منطبق ہوتی تو بھی نفع سے خالی نہ ہوتی کیونکہ وہ اس انطباق کی برکت سے ایک دن مبدل بہ حقیقت ہو سکتی تھی اور جب ظاہری انطباق علی الشریعۃ بھی نہ ہو تو سراسر مضر اور سم قاتل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حکماء امت نے عوام الناس سے صرف اسی قدر تعلق کو کافی سمجھا ہے کہ وہ اپنی صورت ظاہری کو شریعت کے موافق بنالیں اور صورت عبادت پابند ہو جائیں کیونکہ وہ حضرات جانتے ہیں کہ یہ صورت ہی ان شاء اللہ ایک دن مبدل بحقیقت ہو جائے گی۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر عبادت میں ریا بھی ہو اس کو کیے جاؤ کیونکہ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہتا چندروز میں عادت ہو جاتی ہے پھر عادت سے عبادت ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ذریعہ قرب بن جاتی ہے اس کو مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

از صفت و ز نام چہ زاید خیال   واں خیالت ہست دلال وصال

یعنی اسم سے خیال پیدا ہوتا ہے پھر وہ خیال ہی رہبر ہو جاتا ہے وصال کی طرف۔ مگر یہ اسی وقت ہے جب کہ صورت شریعت پر منطبق ہوتی۔ تو اس کے مبدل بحقیقت ہو جانے کی امید تھی مگر انطباق ہوتا کیونکر اس لئے کہ انطباق کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ شریعت کی وقعت دل میں ہو اور یہاں وہی ندارد ہے۔

آج کل کے عقلاء شریعت مطہرہ کو مولویوں کے خیالات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور ان پر اعتراض کرتے ہیں لیکن ہم کو غنیمت سمجھنا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ان لوگوں نے اعتراض سے بچا لیا اگرچہ واقع میں اثر اس قول کا آپ ہی پر ہو گا لیکن تاہم مورد عتاب تو صرف مولویوں کو بنایا۔ ہم اس کے بھی شکر گزار ہیں۔ مگر ان معترضین کو یہ ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ درحقیقت ان کے اعتراضات کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی پر پڑتا ہے کیونکہ ضرب الغلام اہانۃ المولی یعنی اگر کوئی شخص کسی کے غلام کو مارے اگرچہ اس نے بظاہر آقا کو کچھ نہیں

کہا مگر واقع میں یہ آقا کی بھی اہانت ہو گئی کیونکہ آقا اور غلام میں اس قدر تغایر نہیں جس قدر یہ شخص سمجھ رہا ہے بلکہ اس میں ایسا تغائر ہے جیسا کہ احول کے مرئیات میں ہوتا ہے۔

مشہور ہے کہ کسی استاد نے اپنے شاگرد کو کہا کہ فلاں طاق میں ایک بوتل رکھی ہے وہ اٹھا کر لے آؤ۔ شاگرد چونکہ احول تھا وہاں جو پہنچا تو ایک بوتل کی دو نظر آئیں استاد سے کہنے لگا کہ یہاں دو بوتلیں رکھی ہیں ان میں سے کون سی لاؤں؟ استاد نے کہا کہ دو نہیں بلکہ ایک ہی ہے۔ کہنے لگا میں خود مشاہدہ کر رہا ہوں آپ میرے اس مشاہدہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس پر استاد نے غضبناک ہو کر کہا کہ ایک بوتل توڑ دو اور دوسری میرے پاس لاؤ۔ شاگرد نے ایک بوتل کو توڑا تو وہ دونوں ٹوٹ گئیں۔ کہنے لگا کہ اب تو یہاں ایک بھی نہیں رہی۔ مولانا نے اس قصہ کو کلام مجید کی اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔

لانفرق بین احد من رسله

ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

تو ایک کی تکذیب کرنے سے سب رسولوں کی تکذیب ہوتی ہے اور اس سے خدا تعالیٰ کی تکذیب بھی ہو جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نائب کی تکذیب منیب کی تکذیب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا علماء کی تکذیب سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہو گی اور اس سے خدا تعالیٰ کی تکذیب ہو گی مگر جو لوگ اس پر بالکل نظر نہیں بلکہ سب دھڑک علماء پر اعتراض کر دیتے ہیں۔

ایثار اور فرعون

خلاصہ یہ ہے کہ آج کل کے جلسے اور انجمنیں بالکل رسم بلا معنی ہیں اور صورت بھی ٹھیک نہیں اور لوگوں نے محض ان کو رسم سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ نفع پہنچانا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ یہ جب اپنا ہی دین برباد کر رہے ہیں تو دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کا کب قصد کر سکتے ہیں اور اگر کہئے کہ یہ ایثار ہے کہ اپنے دین سے دوسروں کے دین کو مقدم رکھا ہے۔ اس لئے باوجود اپنے دین کے قائم نہ کرنے کے دوسروں کے دین کی درستی کرتے ہیں تو سمجھو کہ ایثار کی اجازت دنیاوی منافع میں ہے دینی منافع میں نہیں یعنی اگر ہمارا کوئی دنیاوی نفع فوت ہو کر دوسرے کا نفع ہو جائے تو اس کو ایثار کہیں گے اور ہمارا

دین تباہ ہو کر دوسروں کو نفع پہنچے تو یہ ایثار نہیں کہلائے گا۔ ورنہ اگر دین کو تباہ کر کے بھی ایثار ہوتا باغی سب سے زیادہ صاحب ایثار ہونے چاہئیں اور ان کو سب سے زیادہ خیر خواہ سرکار کہنا چاہئے کیونکہ ان میں اتنی بڑی ہمدردی ایثار ہے کہ انہوں نے اپنی جان بھی دے دی اور تمام منافع جو اطاعت سے ان کو پہنچتے وہ دوسری رعایا کے لئے چھوڑ دیئے۔

صاحبو! یہ وہی ایثار ہے جو فرعون میں تھا۔ دین چھوڑ کر دنیا پر قناعت کی اس کی ایک حکایت ہے کہ مصر کی زراعت کا مدار رود نیل کے جوش پر تھا ایک سال اس کو جوش نہیں ہوا۔ لوگ فرعون کے پاس آئے اور کہا تو مدعی الوہیت ہے ہم لوگ قحط میں مر جاتے ہیں۔ یہ تیری الوہیت کب کام آئے گی اس نے کہا کہ کل رود نیل کو جوش ہوگا۔ رات کو دعا کی اے اللہ! اگرچہ میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ میری کوئی معروض قبول ہو لیکن میری ہمت تو دیکھئے کہ میں نے آپ کو چھوڑا جنت کو چھوڑا ابداً لآباد کے عذاب کو گوارا کیا۔ ان سب کے بدلے صرف ایک التجا کرتا ہوں کہ میری دعا قبول فرمائیے کہ جب میں رود نیل کو حکم دوں تو اس کو جوش ہو جائے۔ چنانچہ اس کی یہ دعا قبول ہوگئی اور ایسا ہی ہو گیا۔

اس دعا کی قبولیت سے کوئی اپنے دل میں یہ شبہ نہ کرے کہ اس کافر ملعون کی دعا کیوں قبول ہوگئی بات یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ سب کی سنتے ہیں حتیٰ کہ شیطان جو کہ سب سے زیادہ ملعون ہے اس کی درخواست بھی قبول ہوگئی اور پھر درخواست بھی خاص عتاب کے وقت کی۔ علی العموم اس وقت کی درخواست پوری نہیں ہوتی اور درخواست بھی ایسی عجیب جو آج تک کسی نے نہ کی تھی اور نہ ظاہراً منظوری کے قابل تھی کہ۔

انظرنی الی یوم یبعثون

مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک گویا خداوند تعالیٰ کی طرف سے تو یہ عتاب کہ

ان علیک لعنتی الی یوم الدین

بے شک تجھ پر لعنت ہے قیامت کے دن تک

اور شیطان کی طرف سے یہ درخواست کہ **رب انظرنی الی یوم یبعثون** (اے اللہ مجھے روز محشر تک مہلت دے) تو جب اس کی ایک ایسی عجیب درخواست ایسے عجیب وقت میں قبول ہوگئی تو فرعون کی درخواست قبول ہونے میں کیا تعجب ہو سکتا ہے۔

شیطان کے اس واقعہ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

اول تو اس کی بے حیائی کہ جوتیاں سر پر پڑ رہی ہیں اور اس کو درخواست کرنے کی سوجھ رہی ہے۔

دوسرا اس کا شوق کہ باوجود اس حالت کے بھی اس کو پورا یقین تھا کہ ضرور درخواست قبول ہوگی۔

تیسرے خدا تعالیٰ کا فضل و کرم کہ درخواست کے ساتھ ہی **انک من المنظرین** ارشاد ہوا۔

جب دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو دوستوں کو کب محروم کیا جا سکتا ہے۔

دوستاں را کجا کنی محروم　　تو کہ بادشمناں نظر داری

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوستوں کو کیسے محروم کریں گے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر شفقت دشمنوں پر بھی ہے)

یہ قصہ مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کا ہے کہ جب اس بارگاہ میں دشمن کی دعا قبول ہوئی تو ہماری دعا کیوں نہ قبول ہوگی۔ مگر یہ ضرور ہے کہ شیطان کے برابر اڑیل ہو جاویں۔ غرض جیسی فرعون کی ہمت تھی ویسی آج کل کے ایثار والوں کی ہمت بھی ہے اور اگر فرعون کی وہ ہمت ہمت کہنے کے قابل نہیں تو ہمارا یہ ایثار بھی ایثار نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جو اپنا خیر خواہ نہیں وہ دوسروں کا بھی خیر خواہ نہیں ہے تو ہم جو کچھ کر رہے ہیں محض رسم کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ ہیں وہ صفات جن کو مدائح قرار دیا جاتا ہے۔ ان مسلمانوں سے نفی کرنا اور دوسری قوموں میں مدائح کے شمار میں ثابت کرنا کہاں تک قابل قدر ہو سکتا ہے ہم لوگوں کی زبان پر وہ الفاظ ہیں جو کہ جسد بلا روح ہیں کہ رات دن ان کو دہرایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کے برابر کوئی دلسوز ہی نہیں۔ لیکن جیسے حدیث میں آیا ہے۔

لایجاوز حنا جزھم (سنن الترمذی ۲۱۸۸) (ناجائز) ان کے گلے سے آگے نہیں گزرتی دل پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا اور جب خود متکلم کے قلب پر اثر نہیں تو سامعین کے قلب پر کیا خاک اثر ہو سکتا ہے۔ غرض مسلمانوں کی کوتاہیوں کا بیان جو اس انداز تحقیر پر ہو وہ بے شک مذموم ہے۔ اس سے تو احتراز واجب ہے لیکن اگر براہ شفقت ہو تو ضروری ہے اور اسی شفقت کی راہ سے خاص مسلمانوں کی شکایت ان کوتاہیوں کے متعلق بھی مضائقہ نہیں۔ پس میرا تخصیص کے ساتھ کہنا کہ مسلمانوں میں کوتاہیاں ہیں بطور قید احترازی کے نہیں بلکہ تخصیص کی نظر سے ہے کہ ہمارا خطاب اس وقت خاص مسلمانوں سے ہے اور اس موقع پر

ان ہی کی اصلاح مہتم بالشان ہے۔ اس مضمون کو اس قدر تفصیل سے بیان کرنے کا قصد نہ تھا۔ اتفاقاً اس میں تفصیل ہوگئی جو ان شاء اللہ مفید ہوگی۔

سامان تدبیر

اب اس کوتاہی کو جو یہاں مقصود بالذکر ہے عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ منجملہ ان موجودہ کوتاہیوں کے ایک کوتاہی یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں نے دین کے اجزاء کو متفرق کر دیا ہے یعنی دین میں انتخاب کر لیا ہے جیسے کوئی چیز تقسیم ہوا کرتی ہے مثلاً انعام کی گھڑی رومال وغیرہ میں سے ایک نے گھڑی لے لی۔ دوسرے نے رومال تیسرے نے کچھ اور چوتھے نے کچھ اور اسی طرح ہمارے بھائیوں نے اس وقت مذہب میں عمل کیا ہے کہ ایک نے دین کے ایک جزو کو لے لیا دوسرے نے دوسرے جزو کو اسی کو قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

جعلو االقران عضین

جنہوں نے آسمانی کتاب کے مختلف اجزا کر رکھے تھے۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔

افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض

کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے۔

اس تفریق کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ایک منجملہ ان کے یہ ہے کہ کچھ حصہ پر ایمان لایا جائے اور کچھ حصے سے انکار کیا جائے۔ مسلمان اس سے تو بری ہیں ایک یہ کہ بعض کو چھوڑ دیا جائے اس کی بہت صورتیں ہیں۔ ایک کو اس وقت بیان کیا جاتا ہے کہ بعض نے تو صرف اعمال بدنیہ کو دین سمجھا اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہ دیندار کہلاتے ہیں کہ انہوں نے دین کا مدار زیادہ تر اعمال بدنیہ کو سمجھا۔ بعض نے فقط اعمال مالیہ کو اختیار کر کے دوسرے اجزاء کو خیرباد کہہ دیا۔ چنانچہ اس وقت دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں۔ بعض روساء کہ ان کو مشقت اٹھانا دشوار ہے انہوں نے تو یہ تجویز کر لیا۔ کہ چار روپیہ کسی رفاہ عام کے کام میں دے دو۔ بس کافی ہے اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ نفع متعدی نفع لازمی سے زیادہ انفع ہے صاحبو! یہ بالکل وہی بات ہے کہ۔

کلمة حق ارید بها الباطل

سچی بات سے باطل مفہوم سمجھ لینا۔

کیا اعمال مالیہ پر کاربند ہو کر اعمال بدنیہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ ان کا وجوب ساقط ہو جائے گا۔ ذرا قرآن کو دیکھئے کہ جہاں **اتوا الزکوۃ** ہے وہیں **اقیموا الصلوۃ** بھی موجود ہے۔ قرآن میں تامل کرنے کے بعد کسی کو ذرا بھی گنجائش اس کی نہیں مل سکتی ہے۔

رہا یہ شبہ کہ اگر قرآن میں کسی کو یہ گنجائش نہیں ملتی تو یہ بہتر فرقے کیوں کر پیدا ہو گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب گنجائش قبل از غور ہے۔ جب تک غور نہ کیا جائے اس وقت تک قرآن کی حالت مرزنجی کی سی ہے کہ معتزلہ اس سے اپنے توہمات کو ثابت کر رہے ہیں اور قدریہ اپنے توہمات کو مجسمہ اپنے دعوے پر دلیل پیش کرتے ہیں۔ معطلہ اپنے دعوے پر لیکن غور کرنے کے بعد سوائے مذہب حق کے کسی ایک مذہب کی بھی گنجائش کلام مجید میں نہیں رہتی ارشاد ہے۔

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدو افیہ اختلافاً کثیراً

کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پائے۔

معلوم ہوا کہ یہ بات تدبیر کے بعد نظر آتی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں تو جو کچھ اختلاف ہے وہ بوجہ غور نہ کرنے کے ہے اور تدبیر بھی اس شخص کا معتبر ہوگا جس کے پاس سامان تدبر بھی ہو ہر کس و ناکس کا تدبر معتبر نہیں۔

آج کل کے عقلاء کا تدبر ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ایک شخص نے گلستان کے اس شعر میں تدبر کیا تھا۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست — در پریشان حالی و درماندگی

(دوست وہ ہے جو پریشانی اور مصیبت کے وقت اپنے دوست کی مدد کرے)

ایک مرتبہ ان کے ایک دوست کہیں پٹنے لگے اور خود بھی کچھ ہاتھ چلا رہے تھے۔ انہوں نے وہاں جا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پہلے سے بھی زیادہ پٹائی ہوئی۔ کسی نے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو کہا کہ میں نے شیخ سعدی کے اس قول پر عمل کیا ہے دوست آں باشد الخ جیسا اس نے گلستان کو سمجھا تھا ویسا ہی ہمارے بھائی قرآن میں تدبر کرنے والے موجود ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے مگر باطنی سلامتی کے سائے کے ساتھ۔

ایک صاحب پنجاب میں مجھ سے ملے۔ کہنے لگے کہ تحقیقات جدیدہ سے یہ ثابت ہو

گیا ہے کہ تخم میں ایک نر اور ایک مادہ ہوتا ہے میں کہتا ہوں خیر یہی ہو لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ قرآن میں بھی یہ مسئلہ موجود ہو مگر وہ کہنے لگے کہ میں نے سوچا کہ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے یا نہیں۔ کئی مہینے تک سوچتا رہا لیکن کہیں نہ ملا۔

سبحان اللہ! صاحبو قرآن میں اس مسئلہ کو ڈھونڈنا ایسا ہے جیسا کوئی طب اکبر میں جوتا بنانے کی ترکیب ڈھونڈنے لگے۔ کیوں صاحبو! اگر کوئی ایسا کرنے لگے تو عقلاء وقت اس کی نسبت کیا فتویٰ دیں گے۔ وہی فتویٰ اس کی نسبت بھی دینا چاہئے۔

غرض کہنے لگے کہ مدت کے بعد ایک روز اتفاق سے میری بیوی قرآن پڑھ رہی تھی جب اس نے یہ آیت پڑھی۔

سبحان الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض

وہ ذات پاک ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات کے قبیل سے بھی۔

تو بہت خوش ہوا کہ قرآن میں یہ مسئلہ صراحۃً موجود ہے۔ تو وہ بزرگ ازواج کے معنی خاص یہاں میاں بیوی اور نر و مادہ کے سمجھے۔ حالانکہ ازواج کے لغوی معنی جوڑے کے ہیں۔ خواہ کسی چیز کا جوڑ ہو حتیٰ کہ زوج الخف والنعل بھی کہتے ہیں۔ زوج کے معنی وہی ہیں جس کو فارسی میں جفت اور اردو میں جوڑا کہتے ہیں۔ میاں بیوی کو بھی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی باہم جوڑا ہوتے ہیں یہ نہیں کہ ہر جگہ میاں بیوی ہی کے معنی ہوں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری جفت پاپوش اٹھا لاؤ یا یہ کہے کہ میرے جوتے کا جوڑا اٹھا دو تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میرے جوتے کی میاں بیوی اٹھا لاؤ۔ پس معنی آیت کے تو یہ ہیں کہ ہم نے نباتات میں بھی جوڑے پیدا کئے ہیں کہ اگر ایک انار کھٹا ہے تو دوسرا میٹھا ہے علیٰ ہذا۔ لیکن ان مجتہد صاحب نے ان ازواج کا ترجمہ زن و شوہر کیا اور قرآن میں اپنے نزدیک اس مسئلہ کو بھی داخل کر دیا۔

تو اگر ایسے قرآن میں تدبر کریں گے تو قرآن کی جو گت ہو گی ظاہر ہے اور اس قسم کے تدبر کرنے والے اس سے پہلے بھی ہوتے آئے ہیں۔ میرے ایک استاد بیان کرتے تھے کہ ان کے پاس ایک درزی بیٹھا ہوا تھا اس نے اول یہ پڑھا۔

امنت باللہ وملئکتہ و کتبہ و رسلہ والیوم الاخر والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعدالموت.

میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کے پیغمبروں پر اور قیامت کے دن پر اچھی اور بری اللہ کی طرف سے آتی ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا۔

پھر ایک آہ سرد کھینچی اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب بادلوں کی بھی موت ہے یہ گت بعد الموت کی بنائی کہ عین کی جگہ الف پڑھ کر اس کی یوں تعمیل کی کہ بادل موت بہت لوگوں نے قرآن کی تفسیریں لکھنی شروع کر دیں لیکن وہ تفاسیر اسی قسم کی ہیں وجہ یہ کہ ان کے پاس سامان تدبر یعنی علم و تقویٰ نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ تدبر بھی ضروری ہے جس کو آیت میں فرمایا۔ افلایتدبرون القرآن کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور پھر تدبر کے لئے سامان تدبر بھی ضروری ہے جیسا کہ ظاہر ہے پس اس آیت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن میں غور کرنے کے بعد اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی اور جہاں بالکل صریح دلالت ہو وہاں تو تدبر کی بھی ضرورت نہیں چنانچہ بدنیہ و مالیہ کی تفریق کی غلطی پر اقیموا الصلوۃ و آتوا الزکوۃ صاف دال ہے جہاں اتوا الزکوۃ کا حکم ہے وہاں اقیموا الصلوٰۃ بھی ہے۔ یہ تو دنیادار امراء کی حالت کا بیان تھا۔

قابل اصلاح رسوم

دوسرے وہ لوگ ہیں جن پر دینداری کا بہت ہی غلبہ ہے انہوں نے اپنے مذاق کے موافق ایک اور مسلک اختیار کیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ دینداری جو کچھ ہے وہ جان سے کام لینے میں ہے۔ ان لوگوں نے طاعات مالیہ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ میں اپنے ہی کو کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میری سوانح عمری لکھنے لگے تو اس کا آسانی سے پتہ بھی نہ لگے گا کہ فلاں جگہ دس روپے دیئے۔ اس طرح ہم میں اکثر کی یہ حالت ہوتی ہے غرض اس تفصیل سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہم لوگوں نے دین کے اجزاء کو تقسیم کر رکھا ہے کہ ایک جزو کو ایک نے اختیار کر لیا ہے اور دوسرے کو دوسروں نے یہ ایک کلی کوتاہی ہے۔ پھر اس کے تحت میں اور بہت سی جزئیات داخل ہیں۔ یعنی پھر خود عبادت بدنیہ میں بھی ایک تفریق ہے۔ مثلاً کسی نے وظیفہ کو لے لیا۔ کسی نے صرف قرآن کو لے لیا۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں اپنے مرشد کی تعلیم پر اس شدت سے پابند ہوں کہ نماز چاہے قضا ہو جائے لیکن مرشد کی تعلیم قضا نہیں ہوتی۔

اسی طرح اموال میں تفریق کی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ جب مرنے لگتے ہیں تو چونکہ کوئی اولاد نہیں ہوتی اس لئے وہ مسجد بنانا تجویز کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ نمازیوں کی تعداد سے مسجدوں کی تعداد زیادہ ہے۔ قصبہ آنولہ کی نسبت سنا ہے کہ وہاں بے حد مسجدیں ہیں اور غضب یہ ہے کہ باوجود اس کثرت کے اب بھی اگر کسی کو اس طرف توجہ ہوگی تو اپنی مسجد الگ ہی بنانے کی سوجھے گی۔ اور مزہ یہ کہ نئی مسجد شروع کر کے پرانی کے سامان لینے پر نگاہ دوڑتی ہے کیونکہ چندہ تو اس قدر ہو نہیں سکتا۔ کام ادھر میں رہ جاتا ہے اور اس وقت مولویوں سے اجازت لینے کی فکر کرتے ہیں کہ حضرات پرانی مسجد بالکل ویران ہے آباد ہونے کی امید نہیں کیا اس کا ملبہ نئی مسجد میں خرچ کر لیں۔

میں نے اپنے قصبے میں دیکھا ہے کہ لوگوں نے ایک پرانی مسجد کو چھوڑ کر دس پندرہ قدم کے فاصلہ پر ایک نئی مسجد بنائی۔ اب چند روز سے لوگ اس پرانی کی درستی پر بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یا ایک پھر ویران ہوگی یا دونوں کی جماعتیں ٹوٹیں گی۔

کانپور میں ایک شخص نے مسجد بنائی۔ دوسرے برادری کے بھائی نے اس کے مقابلہ پر ایک دوسری مسجد تیار کی۔ جب دونوں بن کر تیار ہوئیں تو نمازی کی فکر ہوئی۔ آخر یہ تجویز کیا گیا کہ نماز کے بعد شرینی تقسیم کی جایا کرے تاکہ نمازی بڑھیں۔

وجہ اس کی یہی ہے کہ اس قسم کے لوگ مسجد بنانا زیادہ ثواب سمجھتے ہیں کہ مسجد کے کام میں روپیہ صرف ہونے میں زیادہ ثواب ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص تیل لایا اور اس سے پوچھا گیا کہ اس کو طالب علموں میں صرف کر دیا جائے یا مسجد میں تو وہ مسجد ہی تجویز کرتا ہے بلکہ اکثر عوام الناس کا یہ خیال ہے کہ مسجد میں تیل جلنے سے قبر میں روشنی ہوتی ہے۔ اس بناء پر اگر کوئی مر جائے اور اس کو ثواب پہنچانا ہو تو کھانا مسجد میں بھیجتے ہیں۔ دوسری جگہ دینے کو ویسا ثواب نہیں سمجھتے۔

اس میں ایک اور قید تراشی ہے کہ وہ کھانا بھی رات کے وقت بھیجا جاوے شاید یہ سمجھتے ہوں کہ دن کو تو آفتاب نکلا ہے اس کی کم و بیش روشنی تو ضرور قبر میں پہنچے گی۔ برخلاف رات کے کہ اس میں بالکل تاریکی ہوتی ہے اس لئے اس وقت اس طعام اور چراغ کے ذریعہ سے روشنی پہنچے گی اور دن کو بھیجنا (رات کے وقت اس نافع ہونے کی توقع پر) شاید اس لئے پسند نہیں کرتے ہوں گے کہ خدا جانے وہاں کا انتظام کافی ہوگا یا نہیں تو ایسے وقت پہنچاؤ کہ فوراً ہی پہنچے ایسا نہ ہو کہ کارکنان قضا و قدر کہیں رکھ کر بھول جائیں اور مردہ ساری رات تاریکی میں رہے۔

اسی کے قریب قریب گڑ دینے کی رسم ہے۔ یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ سکرات موت کی تلخی اس سے دور ہوگی۔ صاحبو! گڑ تو وہاں پہنچتا نہیں اور یہ کہیں ثابت نہیں کہ میٹھی چیز کا ثواب بھی میٹھا ہوتا ہے۔

غرض اس قسم کی بہت سی خرافات لوگوں میں ہیں اور ان سب کے لئے مسجد ہی کو تجویز کیا ہے کیونکہ ان کے اعتقاد میں مسجد میں بھیجنے سے زیادہ ثواب ہوتا ہے اور مسجد میں بھی زیادہ تر ثواب خاص منبر پر رکھنے سے سمجھا جاتا ہے مگر وہ بھی اس وقت کہ جب اس پر نیاز بھی دی جائے ورنہ ان کے خیال میں اتنا مال ضائع ہی گیا۔

کانپور میں ایک مرتبہ چند عورتیں کچھ مٹھائی لے کر عشاء کے بعد جامع مسجد میں آئیں وہاں ہی مدرسہ کے طلباء رہتے تھے میں اس وقت مکان پر جا چکا تھا صرف طلباء مسجد میں موجود تھے طالب علموں کا فرقہ آزاد ہوتا ہی ہے۔ وہ ان سے مٹھائی لے کر نیاز دیئے بغیر ہی سب کھا گئے۔ ان سب عورتوں نے بے حد شور و غل کیا۔ ان کی آواز سن کر ان کے گھر کے مرد بھی جمع ہو گئے۔ یہ ہنگامہ برپا دیکھ کر ایک طالب علم میرے پاس دوڑا آیا اور کہا کہ مسجد میں اس قسم کا ہنگامہ برپا ہے اور یہ اس کی وجہ ہے۔ میں نے مسجد میں آ کر دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ آخر میں نے اس وقت باقتضائے مصلحت طالب علموں کو برا بھلا کہا ایک آدھ کو مارا بھی اور مٹھائی کی قیمت پوچھ کر طالب علموں سے سب قیمت دلوائی اور عورتوں کو سمجھا دیا کہ یہاں نہ لایا کرو۔

قیمت دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ صرف اڑھائی آنے کی مٹھائی تھی حالانکہ یہ مقدار ایسی مقدار نہ تھی جس پر اس قدر ہنگامہ کی نوبت آتی۔ نیز وہ ان ہی طالب علموں کے لئے لائی گئی تھی۔ لیکن محض نیاز نہ ہونے کی وجہ سے ان عورتوں کے خیال میں ثواب نہیں پہنچا تھا جو یہاں تک نوبت پہنچی۔ حالانکہ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر دس دفعہ بھی نیاز دے دی جائے لیکن کسی کو کھلایا یا دیا نہ جاوے تو کچھ بھی ثواب نہیں پہنچتا اور اگر ایک دفعہ بھی نیاز نہ دی جاوے اور کسی مستحق کو دے دیا جاوے تو ثواب پہنچ جاتا ہے۔

ایک ظریف درویش نے بیان کیا کہ ایک مقام پر فاتحہ تھی ہم کو بھی بلایا گیا کھانا چنا گیا تو فاتحہ شروع ہوئی۔ فاتحہ خواں نے حضرت آدم علیہ السلام سے نام گنوانے شروع کئے۔ جب بہت دیر ہوگئی تو میں نے کہا کہ صاحب ساری دنیا کے تو نام شمار کئے جاتے ہیں مگر ہمارا نام بھی تو لے لو۔ کیونکہ جب تک ہم نہ کھائیں گے ان میں سے ایک کو بھی ثواب نہ پہنچے گا۔ اس پر وہ لوگ خفا تو بہت ہوئے کہ وہابی ہیں لیکن فاتحہ کا سلسلہ جلدی ختم ہو گیا۔

غرض عام طور سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بدوں نیاز کے ثواب نہیں ہوتا نیز اس میں قوانین بھی ایجاد کیے ہیں چنانچہ مجھ سے ایک شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ گیارہویں اٹھارہ تاریخ تک جائز ہے اس کے بعد جائز نہیں گویا یہ نماز کا وقت ہے کہ فلاں گھنٹے تک رہے گا اس کے بعد نہ رہے گا۔

صاحبو! یہ عقائد روکنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے تو سمجھو کہ لوگ تم کو دیکھ کر عقیدہ پیدا کر لیں گے۔ صاحبو! عوام الناس اس قدر حد سے نکل گئے ہیں کہ شریعت سے بہت دور جا پڑے۔

غضب ہے کہ بعض مقامات میں خدائی رات منائی جاتی ہے اور صبح کو اللہ تعالیٰ کی سلامتی کے گیت گاتی ہوئی مسجد میں آتی ہیں اور آ کر جھک کر سلام کرتی ہیں۔ غرض مسجدوں کی بابت یوں سمجھتی ہیں کہ گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔

فریب آمیز صورتیں

سو بعض نے اموال کا مصرف مسجد ہی کو قرار دیا ہے بعض لوگوں نے انجمنوں یا مدارس کو لیا۔ خواہ دینی مدارس ہوں یا دنیوی لیکن ان میں جنہوں نے مدارس دنیوی کو لیا وہ تو کبھی اکھڑ کر بھی مسجد کی طرف نہیں گرتے۔ پس انہوں نے مدرسہ سنبھال کر مسجد کو چھوڑ دیا۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ قوم سے جس طرح ہو چندہ جمع کیا جائے خواہ وہ شریعت کے موافق ہو یا شریعت کے مخالف ہو۔ یعنی یہ لوگ دباؤ ڈال کر چندہ وصول کرتے ہیں جو کہ شریعت سے بالکل ہی حرام ہے اور یہ غضب کرتے ہیں کہ اگر کوئی غریب چار آنے دے دے تو ان کی نمائشی قدر اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کو نیلام کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ اس کی قدر کی گئی کہ یہ غریب کا عطیہ ہے حالانکہ مقصود محض اس بہانے سے بڑی رقم وصول کرنا ہوتا ہے۔ صاحبو! ان لوگوں سے غریبوں کی کیا قدر ہو گی۔ غریبوں کی قدر وہ کرے گا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کرے۔

حضرت مولانا گنگوہی ایک مرتبہ بیمار ہو گئے۔ جب تندرست ہوئے تو صاحبزادے نے شکریہ میں بہت لوگوں کی دعوت کی۔ مولانا نے اپنے ایک خاص خادم سے فرمایا کہ جب غریب لوگ کھانا کھا چکیں تو ان کے سامنے کا بچا ہوا کھانا جو کہ سقوں کو دیا جاتا ہے وہ سب میرے پاس لے آنا کہ وہ تبرک کھاؤں گا اور خیال نہ کرنا کہ ان کا بدن صاف نہیں ان کے

کپڑے صاف نہیں اور اس کو تبرک اس لئے قرار دیا کہ اول تو وہ لوگ مومن ہیں۔ دوسرے ان کی یہ شان ہے کہ حدیث قدسی میں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان عند المنکسرة قلوبهم (الأسرار المرفوعہ لعلی القاری ۱۱۷، ۳۷۲)

میں شکستہ دل والوں کے ساتھ ہوں۔

حدیث میں آیا ہے۔

یا عائشته تربی المساکین (البدایه والنهایه ۶ : ۵۹)

اے عائشہ مسکینوں کی اعانت کرو

چنانچہ وہ کھانا حضرت کے پاس لایا گیا اور حضرت نے اس کو نہایت رغبت سے کھایا تو کسی نے اس قسم کی قدر غریبوں کی کر کے دکھائی ہے۔ مگر اس وقت قدر دانی کی بھی نئی نئی فریب آمیز صورتیں ایجاد ہو رہی ہیں حتیٰ کہ اس ایک چونی کو سینکڑوں روپوں سے فروخت کیا جاتا ہے حالانکہ اس میں علاوہ تلبیس کے ربوا بھی لازم آ جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں تفاضل ہو جاتا ہے اور تفاضل ایک جنس میں ربوا ہے اور اگر ربوا کا کوئی علاج بھی کر لیں تو تلبیس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

ایک مقام پر ایسا ہوا کہ ایک چونی فروخت ہونے لگی۔ ایک غریب نے جو سبق پڑھایا ہوا تھا اس پر ایک ہزار روپیہ لگا دیا اور بیچنے والوں نے اسی کے نام پر نیلام کو ختم کر دیا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ چونی میرے نام پر ختم ہو گئی ہے تو رونے لگا۔ لوگوں نے رونے کی وجہ پوچھی کہنے لگا میرے پاس تو کچھ نہیں ہے میں نے تو صرف اس لئے ایک ہزار رکھ دیا تھا کہ لوگ سن کر اس سے آگے بڑھیں گے انجمن والوں کا فائدہ ہو جاوے گا۔ آخر ایک صاحب اٹھے اور فرمایا کہ قوم میں کوئی ایسا نہیں کہ اس عالی ہمت کا قرضہ اپنے ذمہ لے لے۔ غرض اس غریب کے واسطے چندہ کیا گیا اور اس طرح پر ایک ہزار کی تعداد پوری کی گئی۔

جائے غور ہے کہ یہ کارروائی صدق سے کس درجہ بعید ہے اور صاحبو یہ صدق ہی وہ چیز ہے جو کہ آج مسلمانوں سے بالکل مفقود ہے کہ اب ان کے ہر بات میں ایک پہلو ہوتا ہے۔ ہاں مخلصین میں اب بھی بحمد اللہ یہ صدق باقی ہے غرض یہ حالت چندے کی ہوتی ہے۔

مساجد کی حالت

اس مذاق والوں کی یہ حالت ہے کہ گویا یہ کام کر لیا تو دین پر پورا عمل کر لیا۔ نہ ان کو

پھر نماز کی ضرورت ہے نہ روزے کی اور اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو گھروں میں گویا مسجد میں آنے کی ان کے لئے بالکل معافی ہے۔

ایک رئیس صاحب کہنے لگے کہ مسجد میں کس طرح جاویں۔ وہاں نہ چٹائی ٹھیک ہے نہ وہاں فرش پنکھے کا انتظام ہے جگہ جگہ کائی جم رہی ہے۔ گھر پر ہر طرح کی آسائش ہے میں نے کہا ذرا سنبھل کر شکایت کرو۔ یہ تم کس کی شکایت کرتے ہو۔ غریبوں کی یا خدا تعالیٰ کی۔ سو غریبوں کی شکایت تو اس لئے نہیں ہو سکتی کہ ان کے پاس اتنی وسعت ہی نہیں کہ وہ سب سامان کر سکیں ۔ خدا تعالیٰ کی شکایت اس لئے نہیں ہو سکتی کہ یہ خدائے تعالیٰ کا اول تو کام نہیں تمہارا کام ہے۔ دوسرے خدائے تعالیٰ کیا فرشتوں سے یہ کام لیں۔ یہ بھی خدا کا کرنا ہے کہ تم کو حکم کیا خدمت مساجد کا اور اس کے لئے وسعت بھی دی۔ پس یہ معلوم ہوا کہ تمہاری ہی کوتاہی ہے اس لئے تم اپنی ہی شکایت کر رہے ہو اگر تم مسجد میں جاتے تو تم کو اس کی حس ہوتی اور خیال پیدا ہوتا۔

لطف یہ کہ بعضے لوگ مسجد کی مدد کیا کرتے الٹا مسجد کی چیزیں اپنی ملکیت کے طور پر سمجھتے ہیں اور منگا منگا کر اپنے کاموں میں لاتے ہیں اور اگر کوئی روکے تو اس غریب پر خفگی ہوتی ہے کہ مسجد کیا تمہاری ملکیت ہے نہیں صاحب تمہاری ملکیت ہے۔ کہ اس کی چیزیں تم خوب استعمال کرو۔ کبھی مسجد میں کچھ دینے کی بھی تم کو توفیق ہوتی ہے۔

ایسے لوگوں کی حالت بعینہ اس قصائی کی سی ہے کہ اس کا ایک رشتہ دار قصائی مر گیا تھ اس کی بیوی یہ کہہ کر روتی تھی کہ ہائے تیری چھریں کون لے گا تیرے مویشی کون لے گا۔ ایک شخص ہر بات کے جواب میں بول رہا تھا کہ میں لوں گا۔ اس میں وہ عورت نوحہ میں بولی کہ تیرا قرض کون دے گا۔ وہ صاحب فرماتے ہیں بولو بھائی کس کی باری ہے۔

تو یہی حالت ہماری مساجد کے ساتھ ہے کہ خدمت کا بار تو دوسروں پر اور چیزیں برتنے والے یہ۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو تختے بھی لے جاتے ہیں یہ تو دینداروں میں بھی مرض ہے کہ مسجد کا گرم پانی گھر منگا لیتے ہیں۔ غرض میں نے ان سے کہا کہ مسجد کی یہ حالت تمہاری ہی بدولت ہے کہنے لگے کہ مولوی تو مسجد میں فرشی پنکھا لگانے سے منع کرتے ہیں۔ میں نے کہا میں اجازت دیتا ہوں تم لگا لو۔ کہنے لگے کہ لوگ شور و غل کریں گے اور مجھ پر اعتراض کریں گے میں نے کہا کہ ان شاءاللہ چار دن میں جب نماز کی برکت سے قلب پر عبدیت کا

اثر ہوگا تو خود ہی مخدومیت کو چھوڑ دو گے۔ کسی مولوی کو منع کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ حاصل یہ کہ اسی قسم کے لوگ دین صرف اس کو ہی کہتے ہیں کہ کچھ روپیہ خیرات کر دیا جائے۔

سرمایہ کاری

بعضے تو ان سب سے نرالے لوگ ہیں کہ وہ نہ اعمال بدنیہ کریں نہ مالی۔ اگر ان کے پاس سرمایہ ہو تو اس کو بنک میں جمع کر دیا ان لوگوں کو منع کیا جاتا ہے تو منع کرنے والوں کو یہ لوگ تاریک خیال بتلاتے ہیں۔ ایک شخص نے اسی قسم کے ایک صاحب سے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ تم سود لیتے ہو تو وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ تم میری ذاتیات پر حملہ کرتے ہو سبحان اللہ امر بالمعروف ذات پر حملہ کرنا ہو گیا۔ آخر جب انہوں نے سمجھایا تو کہنے لگے کہ بھائی یہ وقت جائز و ناجائز کی تحقیق کا نہیں۔ اس وقت تو جس طرح ہو سکے روپیہ کمانا چاہئے۔

یہ مذکورہ بالا تو ان لوگوں کی حالت تھی جو کہ دنیا کے مدارس قائم کرتے ہیں اور جو دین کے مدارس کے حامی ہیں انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب ہم نے وعظ یا خطاب سے دوسروں کو ترغیب دی تو ہم کو سو دو سو روپیہ دینے کی کیا ضرورت ہے الدال علی الخیر کفاعلہ کا ہی ثواب بہت ہے۔ الحاصل ہر ایک فرقہ نے اپنے خیال کے موافق دین کا ایک خلاصہ نکال رکھا ہے۔

تو صاحبو! یہ کتنی بڑی کوتاہی ہے مگر اس وقت ان مذکورہ اقسام میں سے بضرورت مقام اس کوتاہی کو بالخصوص بیان کرتا ہوں جو کہ غالب ہے وہ یہ کہ مال کے خرچ کرنے کو مشکل سمجھتے ہیں۔ جہاں معلوم ہوا کہ خرچ کرنے پڑیں گے تو انہوں نے فوراً اپنی جان بچا کر اس موقع سے بھاگنے کی کوشش کی۔

ممکن ہے کہ اس خاص کوتاہی کے بیان سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ کیا محض چندہ مانگنے کے واسطے یہ وعظ کہا جاتا ہے تم تو تحریک چندہ کو پسند نہیں کرتے تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ بے شک اس وقت ترغیب چندہ ہی کے لئے وعظ کہنا زیادہ مقصود ہے اور میں مطلق ترغیب کو ناپسند نہیں کرتا۔ ترغیب تو خدا تعالیٰ کے کلام مجید میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ البتہ اس کو خاص حد تک کلام مجید میں رکھا گیا ہے یعنی اعمال کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک بذل نفس (۲) دوسری بذل مال

تو جو نسبت اس کو کلام مجید میں ہے اگر وہی نسبت کسی شخص کا وعظ میں بھی ہو تو اس کا کیا مضائقہ ہے اور اس نسبت کے محفوظ رہنے کا یہ طریقہ ہے کہ یا تو ایک ہی وعظ میں دونوں مضمونوں کو بیان کر دیا جائے یا کسی ایک وعظ میں بذل نفس کے متعلق بیان کر دیا جائے چنانچہ اس وعظ سے زیادہ مقصود ترغیب ہے انفاق فی سبیل اللہ کی اور اگر چہ واعظین کی یہ عادت ہے کہ جب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں تو شروع سے ترغیب کا مضمون بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو موجب وحشت عامہ سمجھ کر یوں کرتے ہیں کہ بیان شروع دوسرے مضمون سے کرتے ہیں اور اس کو کسی جگہ جوڑ لگا کر اسی وعظ میں شامل کر دیتے اور میں اس طرز کا مخالف تو نہیں ہوں کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہے مگر اس میں اتنا ضرور ہے کہ ایسے شخص کے ہر وعظ میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید اب چندے کا ذکر چھیڑا جاوے۔ اس لئے میں نے شروع ہی سے اس مضمون کو لیا اور کہے دیتا ہوں کہ اس وقت محض چندے کا بیان ہوگا جس کا جی چاہے سنے اور جس کا جی چاہے نہ سنے اور جس کا جی چاہے چلا جاوے۔ جو سنے گا اپنے نفع کے لئے سنے گا ہمارا اس میں کوئی نفع نہیں اور نفع کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس وقت سننے والوں کو کوئی گھڑی انعام میں مل جائے گی مگر قرآن میں صاف ارشاد ہے۔

وما تنفقوا من خير فلا نفسكم وما تنفقون الا ابتغآء وجه اللّٰه
وما تنفقوا من خير يوف اليكم و انتم لاتظلمون.

جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدے کی غرض سے کرتے ہو اور تم کسی اور غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی پاک خدا کے کرتے ہو۔ یہ سب پورا پورا تم کو مل جائے گا۔ اس میں ذرا کمی نہ کی جائے گی۔

ان آیتوں میں غور کیجئے کہ کیا ارشاد ہوتا ہے پس یہ شبہ کہ ہم نے تمہاری ہی زبان سے متعدد بار چندہ مانگنے کی ممانعت سنی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مطلق ممانعت ہی سمجھ جانا یہ ناتمام مضمون سننے سے ناشی ہوا ہے۔ آیات بالا میں معلوم ہو گیا ہے کہ یہ مضمون بھی دین کا جزو ہے۔

چندہ اور ہدیہ کی بے احتیاطیاں

البتہ چندہ مانگنے کی متعدد صورتیں ہیں ان میں سے جو صورت شریعت پر منطبق ہوگی وہ بے شک محمود ہوگی باقی مذموم ہوگی اور یہ قاعدہ کچھ چندے کے ساتھ خاص نہیں بلکہ نماز

روزہ میں بھی یہی قاعدہ ہے۔ مثلاً جو نماز شریعت پر منطبق ہوگی وہ محمود ہوگی ورنہ مذموم۔ مثلاً اگر کوئی شخص بے وضو نماز پڑھنے لگے یا قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھنے لگے تو وہ نماز ناجائز اور مذموم نماز ہوگی۔ اسی طرح یہی قاعدہ طاعات مالیہ میں بھی ہے کہ چندہ دینے کے جواز کے لئے کچھ شرائط ہیں اگر وہ پائی جائیں تو جائز ہوگا ورنہ ناجائز۔ پھر وہ کچھ چندہ ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہدیہ وغیرہ میں بھی وہی شرائط ہیں۔ اس وقت اکثر کمی یہ ہے کہ ان شرائط کا لحاظ نہیں کرتے اور یہ کمی زیادہ تر لینے والوں میں ہے دینے والے تو چونکہ حتی الامکان دیتے ہی کم ہیں۔ اس لئے وہ اکثر ان خرابیوں سے بھی بچے ہوئے ہیں البتہ لینے والے بہت زیادہ مبتلا ہیں اور یہ کوتاہی دو جگہ ظاہر ہوتی ہے کیونکہ معاملہ دو قسم کا ہوتا ہے۔

(۱) ایک تو وہ جو کہ بالعوض ہو۔ (۲) دوسرا وہ جو کہ بلاعوض ہو۔

پہلی قسم میں بھی اگرچہ خرابیاں آج کل بہت ہیں۔ مگر پھر بھی اس میں ایک حد تک جواز کی صورتیں بھی بکثرت معمول بہا ہیں لیکن بلاعوض میں تو بہت ہی بے احتیاطی کی جاتی ہے اور بلاعوض کی صورت دو ہیں۔ ہدیہ یا چندہ۔ ان دونوں میں بے احتیاطیاں سرسر ہو رہی ہیں چنانچہ ہدیہ میں ایک تو یہ بے احتیاطی کر رکھی ہے کہ کبھی کسی کا ہدیہ واپس ہی نہیں کیا جاتا جو شخص بھی ہدیہ پیش کرے اس کو فوراً قبول کر لیا جاتا ہے بلکہ اگر کوئی شخص واپس کر دیتا ہو تو اس کو برا کہتے ہیں اور اس پر اعتراض کرتے ہیں۔

صاحبو! رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک ہدیہ لینا بھی ناپسندیدہ ہے۔

ما اتاک من غیر اشراف نفس فخذہ ومالا فلاتبعہ نفسک
(جمهرة انساب العرب ۱۶۷)

کہ جو بلا انتظار نفس آوے اس کو لے لو اور جو نہ آوے اس کی فکر میں نہ پڑو۔

اسی حدیث میں حضورؐ نے ہدیہ قبول کرنے کے متعلق ایک قید بتلائی ہے اس کو ادب سے تعبیر کیا جائے یا شرط واجب سے۔ میں اس وقت اس سے خالی الذہن ہوں۔ جو کچھ حضورؐ نے بتلا دیا کہ اشراف نفس سے بچنا چاہئے میں نے اس سے ایک امر مستنبط کیا ہے۔ اگر استنباط غلط ہو تو اس کی اصلاح کر دی جائے۔

میں نے اس سے یہ قاعدہ سمجھا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس آمد و رفت رکھو تو ہمیشہ ہدیہ لے جانے کے پابند نہ ہو بلکہ کبھی ہدیہ لے کر چلے جاؤ اور کبھی خالی چلے جاؤ۔ کیونکہ تجربہ بتلا رہا ہے کہ پابندی کی صورت میں جب اس شخص کی صورت نظر پڑے گی تو طبعاً ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ خدا جانے کچھ لایا ہے یا نہیں یہی اشراف ہے تو اس کا علاج یا تو یہ ہے کہ نفس ایسا ہو جائے کہ اس میں اشراف ہی نہ ہو یا یہ ہے کہ پابندی سے منع کر دیا جائے چنانچہ میں نے اپنے لئے یہی تجویز کیا ہے بلکہ نہ لانا اکثر ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

ہدیہ کے آداب

دوسری حدیث میں ہے تھا دو اتحابو (السنن الکبریٰ للبیہقی ۶:۱۶۹) (ہدیہ دو آپس میں محبت بڑھاؤ) تو ہدیہ دینے کی مصلحت حضورؐ نے ازدیاد محبت قرار دیا ہے اور ازدیاد محبت اس وقت ہوتا ہے جب ہدیہ لے کر جی خوش ہو اور جی اس وقت خوش ہوتا ہے کہ جب اشراف نفس نہ ہو ورنہ مسرت نہیں ہوتی۔ بلکہ انتظار کی جو کلفت تھی وہ رفع ہو گئی۔ تو اس حدیث سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہدیہ میں اشراف کی نوبت نہیں آنی چاہئے۔ دوسرے اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ بیعت کے وقت ہدیہ نہ لینا چاہئے کیونکہ اس کی بھی وہی حالت ہوتی ہے جیسا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ بھائی آج کل کے پیروں کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی دیہاتی ان کے سامنے سر کھجلانے لگے تو پیر صاحب کا خیال ہوتا ہے کہ شاید پگڑی میں سے روپیہ نکال کر دے گا۔ واقعی بالکل سچ ہے۔

حرص و طمع نے ہماری وہ حالت بنا دی کہ جیسے ایک مرید نے اپنے مرشد سے اپنا ایک خواب بیان کیا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے کہ میری انگلیاں نجاست میں بھر رہی ہیں اور آپ کی انگلیوں پر شہد لگا ہے۔ پیر صاحب سن کر کہنے لگے کہ اس کی تعبیر ظاہر ہے کہ تو دنیا کا کتا ہے ہم لوگ اللہ والے ہیں۔ مرید نے کہا حضور ابھی خواب پورا نہیں ہوا۔ میں نے اسی میں دیکھا کہ آپ کی انگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں۔ اس پر پیر صاحب بہت خفا ہوئے۔

غرض یہ خواب صحیح ہو یا غلط لیکن اس خواب سے مرید نے جس حالت کا فوٹو کھینچا ہے وہ بالکل مطابق واقع کے ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ مرید تو پیر سے دین حاصل کرنے کے لئے تعلق رکھتا ہے اور پیر مرید سے دنیائے مردار سمیٹنے کی فکر میں ہے۔

اسی قسم کے ایک پیر کے کوئی مرید تھے ان میں سے کسی نے پوچھا کہ میاں تم کو پیر سے کچھ فائدہ بھی ہولیا نہیں۔ مرید نے کہا کہ میاں جہاں سقاوہ ہی میں کچھ نہ ہو تو لوٹ میں کہاں سے آوے۔

مجھے اس موقع پر ایک حکایت یاد آئی۔ بلگرام میں بزرگ تھے ان کے پاس ایک شخص پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ حسب معمول ایک روز وہ پڑھنے کے لئے آئے تو دیکھا کہ استاد صاحب کے چہرے پر ضعف کے آثار نمودار ہیں۔ دیکھ کر سمجھ گئے کہ آج شیخ کے ہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر پڑھنے سے عذر کر دیا اور گھر واپس گئے اور وہاں سے کھانا پکوا کر لائے۔ جب کھانا پیش کیا تو شیخ نے کہا کہ کھانا تو عین حاجت کے وقت آیا ہے لیکن اس کے لینے میں ایک عذر شرعی مانع ہے۔ وہ یہ کہ جب تم واپس گئے تو مجھے اسی وقت خیال آیا کہ تم میرے لئے کھانا لینے کو جاتے ہو۔ تو یہ کھانا اشراف نفس کے بعد آیا ہے اور اس کا لینا حدیث کے خلاف ہے وہ شاگرد بھی کیسے مودب تھے کہ اصرار نہیں کیا اور سینی لے کر فوراً اٹھ کر چل دیئے اور تھوڑی دور پہنچ کر پھر لوٹے اور آ کر عرض کیا کہ حضرت اب تو اشراف نفس نہیں رہا ہوگا کیونکہ میرے واپس لے جانے کے بعد آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ اب وہ کھانا گیا۔ لہٰذا اب تو اس کو قبول فرمائیے۔ چنانچہ آپ نے قبول فرمالیا۔

سبحان اللہ! جب دل میں محبت ہوتی ہے خدمت کا طریقہ خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ بقول شخصے

شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے در کار نیست

(جس دل میں شوق ہو اس کو رہبر کی ضرورت نہیں)

برخلاف آج کل کے کہ اگر کوئی شیخ انکار کر دے تو مرید یا شاگرد پھر بھی اس کو پریشان کرتا ہے۔

ایک ادب ہدیہ کا یہ ہے کہ دنیاوی حاجت کی آمیزش اس میں نہ ہو بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ آ کر ہدیہ دیتے ہیں اور پھر تعویز لکھوانے کی فرمائش کرتے ہیں ایسے ہدیہ کو فوراً واپس کر دینا چاہیے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کو ایک اونٹ دیا۔ آپؐ نے اس کے عوض میں کئی اونٹ اس کو دیئے مگر وہ شخص راضی نہ ہوا۔ اس پر حضور کو سخت رنج ہوا اور آپؐ نے خطبہ فرمایا کہ فلاں فلاں خاندان کے سوا کسی سے ہدیہ نہ لوں گا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ اس شخص نے

دنیوی غرض سے ہدیہ دیا تھا اور اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ اکثر لوگوں سے اول ملاقات میں ہدیہ نہ لینا چاہئے کیونکہ اول ملاقات میں یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ ہدیہ دینے والے کی کیا نیت ہے۔ اسی لئے میں نے اپنا یہ معمول مقرر کرلیا ہے کہ جو نیا شخص آتا ہے اس سے میں ہدیہ نہیں لیتا۔ البتہ اگر قرائن قویہ سے خلوص ثابت ہوجائے تو مضائقہ نہیں۔

رسم پرست لوگوں نے اس ہدیہ لے جانے کی وجہ یہ نکالی ہے کہ اگر پیر کے پاس خالی ہاتھ جائے گا تو وہاں بھی خالی ہاتھ آئے گا۔ چنانچہ اس کی نسبت مثل بھی مشہور ہے کہ خالی آئے اور خالی جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جاتے ہی پیر جی کی مٹھی گرم کردو کہ اور اس مٹھی گرم کرنے کے ایک محاورہ کی ایک اصل ہے۔ وہ یہ کہ پیرزادوں نے اپنا راز چھپانے کے لئے لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ مصافحہ میں ہدیہ دیا کریں تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے۔

صاحبو! اول تو مصافحہ ایک مستقل عبادت ہے اس میں دنیا کے انضمام کے معنی دوسرے اس کی کیا خبر ہے کہ اس شخص کے بعد کوئی دوسرا شخص مصافحہ نہ کرے گا۔ تو؟ اگر کبھی دوسرے نے بھی مصافحہ کرلیا تو اس کو معلوم ہوگا کہ پیر صاحب کو یہ ہدیہ دیا گیا۔ پھر اخفا کہاں رہا اور اگر دوسروں کو مصافحہ سے روکا جائے پھر تو خواہی نخواہی دال میں کالے کا شبہ ہوگا۔ کیونکہ بعضی احتیاط سبب بے احتیاطی کا بن جاتی ہے۔

چنانچہ مشہور ہے کہ ایک شخص کا نکاح ہونے والا تھا اس نے کسی دوسرے سے ایک دوشالہ مستعار لے لیا۔ جب بارات آگئی تو لوگ دولہا کو دیکھنے کے لئے آئے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ دولہا کون ہے تو صاحب دوشالہ دولہا کی طرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہیں لیکن دوشالہ میرا ہے۔ دولہا نے کہا یار تم بھی عجیب آدمی ہو اسے ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہنے لگے کہ اب ایسا نہ کروں گا تھوڑی دیر میں اور کسی نے آکر پوچھا تو آپ فرماتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہیں مگر دوشالہ میرا نہیں۔ اس پر دولہا اور بھی جھلایا کہ بندہ خدا تم کو اس کے ذکر کی کیا ضرورت پڑی تھی کہنے لگے کہ اب ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا نہ ہوگا کچھ دیر بعد ایک اور صاحب نے آکر پوچھا تو آپ نے فرمایا کو دلہا تو یہ ہیں مگر دوشالہ کا کوئی ذکر نہیں اس پر دولہا نے دوشالہ ان کے اوپر پھینک دیا۔

تو جیسے اس شخص کا یہ کہنا کہ وشالہ میرا نہیں یا دوشالہ کا ذکر ہی نہیں بظاہر احتیاط تھی مگر

باعتبار اثر کے پوری بے احتیاطی تھی۔ اسی طرح دوسرے مصافحہ کرنا بھی اظہار ہوگا ہدیہ کا جب اظہار ہوگیا تو پھر اخفا کہاں رہا۔ نیز جب دوسروں کے بھی مصافحہ کا احتمال ہے تو مرید صاحب کو یہ ڈر بھی تو ہونا چاہئے کہ اگر کوئی شخص پیر کے ہاتھ سے لے کر بھاگ جائے تو کیا کریں گے کیونکہ جب اخفا کر کے لیا دیا گیا ہے تو ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ تھا۔

اگر کہیے کہ ہم دوسرے کے مصافحہ کرنے سے پہلے جیب میں رکھ لیں گے تو میں کہوں گا کہ مصافحہ میں لینے کی مصلحت تو فوت ہوگئی۔ کیونکہ جب جیب میں رکھا گیا تو بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور اگر میری رائے غلط ہے تو اس کی غلطی ظاہر کر دی جائے۔

غرض بعض لوگ یہ تعلیم کرتے ہیں کہ جب پیر کے پاس جاؤ تو کچھ لے کر ضرور جاؤ ورنہ جو خالی جاوے وہ خالی آوے۔ یہ کلمہ تو ٹھیک ہے مگر اس کا مطلب لوگوں نے غلط سمجھا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جو خلوص سے خالی جائے گا وہ خالی آئے گا۔ اگرچہ پیر کو روپیہ بھی کیوں نہ دیا ہو۔ غرض خلوص نہ ہونے سے توفیض سے بھی خالی رہا اور روپیہ دے کر اس سے بھی خالی ہوگیا۔

ایک اور بات بھی ہدیہ کے متعلق کہنی ضروری ہے کہ بعض اوقات جو چیز ہدیہ میں دی جاتی ہے وہ مقدار میں اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس کا لینا گراں معلوم ہوتا ہے مثلاً ایک شخص نے دس روپیہ لا کر پیش کئے تو بعض دفعہ کسی وجہ سے ان کے لینے سے طبیعت پر گرانی ہوتی ہے کہ اس کے متعلق میں مدت سے سوچا کرتا تھا کہ اگر ہم واپس کرنا چاہیں تو کسی شرعی قاعدے کے تحت اس واپسی کو داخل کریں مگر الحمدللہ یہ بھی حدیث سے سمجھ میں آ گیا۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

لا یرد طیب فانه خفیف المحمل (کنزل العمال ۱۷۳۵۵)

اچھے ہدیہ کو واپس نہ کیا جائے کیونکہ وہ ہلکا بوجھ ہے۔

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رد کرنے کی علت طیب کے خفیف المحمل ہونے کو قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ علت نہ پائی جائے بلکہ اس کے برخلاف طبیعت پر گرانی اور بار گزرے تو ایسی چیز کا واپس کر دینا جائز ہوگا۔

میں نے اس کا ایک تخمینی معیار مقرر کر لیا ہے وہ یہ کہ کسی شخص سے اس کی ایک دن کی آمدنی سے زیادہ ہدیہ نہ لیا جائے اور جب ایک دن کی آمدنی کے برابر ایک مرتبہ لے لیا تو پھر

دوسرا ہدیہ ایک مہینہ گزرنے سے پہلے نہ لیا جائے گویا اگر کسی شخص کی تنخواہ تیس روپے ماہوار ہے تو اس سے مہینہ بھر میں صرف ایک روپیہ ہدیہ میں لینا مضائقہ نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ جب ایک شخص جوش طبیعت سے اس سے زیادہ دینا چاہتا ہے تو انکار کی کیا ضرورت۔ تو سمجھو کہ جس جوش میں مصالح کی رعایت نہ ہو وہ جوش نہیں بلکہ جنون ہے جس کی اصلاح کرنی واجب ہے۔

اسی موقع پر اور ایک امر کو بھی جو کہ صدقہ وغیرہ سب میں مشترک ہے سمجھ لینا چاہئے وہ یہ کہ ہدیہ صدقہ چندہ، قرض، غرض جو طریقہ داد و دہش کا ہو حرام مال میں نہ ہونا چاہئے اگر کوئی حرام سے دینا چاہے تو صاف انکار کردے۔ یہ تو ضروری امور ہدیہ کے متعلق تھے۔

آداب چندہ

دوسرا امر جس میں بے احتیاطی کی جاتی ہے وہ چندہ ہے اس میں ایک تو یہ ضروری ہے کہ وسعت سے زیدہ نہیں لیا۔ ان لوگوں سے جن پر حضور کو پورا اطمینان تھا کہ ان کی قوت توکل کی کامل ہے۔ جیسے حضرت صدیق اکبر حضورؐ نے ان سے کل سرمایہ قبول فرمالیا ہے۔

ایک شرط یہ ہے کہ چندہ دینے والے کی طبیعت پر گرانی نہ ہو یعنی ان طرق سے بچے جن میں دینے والے کی طبیعت پر بار پڑنے کا احتمال ہو کیونکہ حدیث میں ہے۔

لایحل مال امرءٍ الابطیب نفسہ (کتاب التمہید لابن عبدالبر ۲۳/۱۰)

آدمی کا مال بغیر اس کی رضامندی کے جائز نہیں

ایک شرط یہ ہے کہ اپنی مذلت نہ ہو کیونکہ بعض طریقے ایسے بھی چندہ لینے کے ہیں کہ ان میں دینے والے پر بار تو نہیں ہوتا مگر لینے والا نظروں سے گر جاتا ہے۔ حدیث میں جو سوال کی ممانعت آئی ہے وہ اسی بناء پر ہے اور اسی وجہ سے جہاں نہ گرانی ہو نہ مذلت وہاں حاجت کے وقت طلب کرنا درست ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ اگر مانگو تو صلحاء سے مانگو (ہم لوگ جو مدعی اصلاح ہیں اس حدیث کو سن کر بہت متفکر ہوں گے کہ خدا خیر کرے اب سائلین کا ہجوم ہوگا) اور فرمایا کہ بادشاہ سے مانگو۔

خلاصہ یہ ہے کہ یا تو اہل اللہ سے مانگو یا بہت بڑے امیر سے۔ اس کا راز یہ ہے کہ سوال کی حرمت کی وجہ دو ہیں۔ ایک ذلت دوسرے مخاطب کی گرانی طبع کا احتمال۔ لیکن یہ علی سبیل منع الخلو ہیں علی سبیل منع الجمع نہیں۔ اور جب علت مرتفع ہوگی۔ معلول بھی مرتفع ہوگا جب بادشاہ

سے مانگا تو نہ ذلت نہ گرانی۔ گرانی تو اس لئے نہ ہوگی کہ جس کے پاس کروڑوں موجود ہیں وہ اگر دس پانچ دے دے تو اس کے خزانہ میں کیا کمی آتی ہے اور ذلت اس لئے نہیں کہ بادشاہ خود اتنا بڑا رتبہ رکھتا ہے کہ یہ اس کی نظر میں چڑھا ہی کب تھا کہ آج نظروں سے گر گیا۔

بزرگوں سے مانگنے کی اجازت بھی اسی لئے ہے کہ ان سے مانگنے میں مذلت تو اس لئے نہیں ہو سکتی کہ وہ سب سے کم اپنے کو سمجھتے ہیں دوسرے ترحم ان میں بہت ہوتا ہے ہر ایک پر ان کو رحم آتا ہے وہ کسی کو کیوں ذلیل سمجھنے لگے اور گرانی اس لئے نہیں ہوگی کہ وہ ہر چیز سے بالکل آزاد ہیں گراں کو نہ کرنا ہوگا وہ آزادی سے جواب دے دیں گے۔ کسی سے وہ کیوں دبیں گے۔ اس لئے گرانی ان کے پاس بھی نہیں آتی۔ ان کی سادگی و آزادی کی وہ حالت ہے کہ۔

دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند   دلبر ماست کو با حسن خداداد آمد
زیر بارند درختان کہ ثمرہا دارند   اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

حسیناں جہاں کو بناؤ سنگھار کی ضرورت ہے اور ہمارے محبوب کو حسن خداداد حاصل ہے۔ پھل دار درخت زیر بار رہتے ہیں مبارک ہو سرو کہ وہ تمام غموں سے آزاد ہے۔

اور ان کی یہ حالت ہے کہ۔

گردو صد زنجیر آری بگسلم   غیر زلف آں نگار دلبرم

یعنی بجز احکام خداوندی کی قید کے اور کوئی قید بھی ان کو مقید نہیں کر سکتی بڑی قید ننگ و ناموس کی ہوتی ہے اس کو وہ مٹا چکے۔ جس کا طریقہ وہ ہے جو اس شعر میں مذکور ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما

اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیال درست ہو جاتے ہیں تجھ سے تمام بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے۔ تجھ سے نخوت اور ناموس کا دفعیہ ہو جاتا ہے تو ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس ہے۔

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد   او ز حرص و عیب کلی پاک شد

جن کا جامہ عشق سے چاک ہو گیا وہ حرص اور تمام نقائص سے بالکل پاک ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔

ساقیا برخیزد ودرده جام را خاک بر سر کن غم ایام را
گرچہ نامی ست نزد عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

غرض وہ بالکل آزاد ہیں۔ ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں پڑ سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ جس کے سبب ان دونوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا لیکن جب یہ علت معلوم ہوگئی اور یہ اجازت اسی بناء پر ہے۔ تو اگر کہیں ان دونوں میں بھی ایک کا احتمال ہو تو ان سے مانگنا جائز نہ ہوگا اور یہی وجہ تھی میری ممانعت کی چندہ سے ورنہ مطلق ممانعت ہرگز مقصود نہ تھی۔ اور یہ سن لیجئے کہ دین تو ہر وقت باعزت ہے لیکن ظاہر نظر میں اس کی عزت علماء کی عزت سے سمجھی جاتی ہے اگر یہ لوگ نظروں سے گر گئے تو سمجھئے کہ دین نظروں سے گر گیا۔

اور اس وقت جو دین نظروں سے گر گیا ہے یہ ہماری ہی بدولت اور محض ہماری صورت احتیاج بنانے کی وجہ سے ہے کہ لوگ ہماری اس حالت کو دیکھ کر خود دین کی تعلیم کو موجب ذلت سمجھنے لگے اور ہم کو بھی اس احتیاج نے اس نوبت تک پہنچایا بقول شخصے

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

(جو چیز شیروں کو لومڑی مزاج بنا دیتی ہے وہ ضرورت ہے حاجت ہے ضرورت ہے)

مگر بعض ایسے صاحب ہمت بھی ہیں کہ وہ باوجود احتیاج کے بھی ذلت گوارا نہیں کرتے۔ ایک شہزادہ ایرانی کسی حادثہ سے آوارہ ہو کر لکھنؤ آیا وہاں ایک رئیس مسافرانہ وارد تھے۔ شہزادہ نے ان کی دعوت کی۔ دوسرے کسی موقعہ پر وہ حالت سفر میں پریشان ہو کر اتفاقاً ان رئیس کے گھر پہنچے۔ ایک مریل ٹٹو پر خستہ وزار سوار تھے۔ رئیس صاحب نے ان کی صورت دیکھ کر براہ تاسف کہا۔

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

(جو چیز شیروں کو لومڑی مزاج بنادتی ہے وہ ضرورت ہے حاجت ہے ضرورت ہے)

شہزادہ بگڑ گیا اور فی البدیہہ جواب دیا کہ

شیر نر کے می شود روبہ مزاج میزند بر فرقش خود صد احتیاج

(شیر نر کب لومڑی مزاج بن سکتا ہے وہ سینکڑوں حاجتوں کو جوتے پر مار دیتا ہے)

اور کہا کہ تم ہم کو غربت کی وجہ سے ذلیل سمجھتے ہو اور یہ کہہ کر چل دیا۔

تو جو لوگ مقتدا کہلاویں ان کے لئے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ وہ نظروں سے نہ

گریں اور یہ امر حاصل ہوتا ہے استغناء سے۔ البتہ جب کبھی چندے کی ضرورت ہو تو تحریک عام کا مضائقہ نہیں کیونکہ اس میں کوئی ذلت نہیں رہی تحریک خاص اس میں اگر یہ یقین نہ ہو کہ میں ذلیل ہوں گا اور نہ مخاطب پر گرانی ہو گی تب تو جائز ہے اور اگر ان میں سے ایک کا بھی احتمال ہو تو ناجائز۔ اور میں جو ہمیشہ ممانعت کیا کرتا ہوں وہ اسی تحریک خاص کی بعض صورتوں میں یہ تحقیق ہے اس کی جو میں سمجھتا ہوں۔

دعوت الی الدین

رہا عمل سو عمل کرنے میں اپنی اپنی رائے ہے۔ میں نے اپنے لئے یہ تجویز کر لیا ہے کہ تحریک عام میں تو کبھی نہ روکا جائے اور تحریک خاص کو مع دونوں قسموں کے ترک کر دیا جائے اس وقت میں تحریک عام کر رہا ہوں۔ اس میں بحمد اللہ کوئی مضائقہ نہیں ہے اور نہ یہ سوال ہے بلکہ دعوت الی الدین ہے اس کے متعلق اس آیت کا کافی فیصلہ موجود ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان یسئلکموها فیحفکم تبخلو و یخرج اضغانکم

اگر تم سے تمہارے مال طلب کریں۔ پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری ظاہر کر دے۔

یہ سوال کرنے کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر خدا تعالیٰ تم سے مانگنے لگے اور مبالغہ سے مانگے تو تم بخل کرنے لگو اور وہ تمہارے کینے کو ظاہر کر دے آگے فرماتے ہیں۔

هآنتم هولآء تدعون لتنفقوا فی سبیل الله فمنکم من یبخل و من یبخل فانما یبخل عن نفسه والله الغنی و انتم الفقراء وان تتولوا یستبدل قوماً غیر کم ثم لایکونوا امثالکم۔

دیکھئے سوال کی تو نفی کرتے ہیں اور دعوت الی الانفاق کا اثبات فرماتے ہیں اور سوال کرنے پر بخل کرنے میں زیادہ مذمت نہیں کرتے ہیں بلکہ ایک گونہ اس میں معذور رکھتے ہیں چنانچہ **فیحفکم تبخلوا** میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور دعوت الی الانفاق میں بخل کرنے کی مذمت فرماتے ہیں کہ۔

من یبخل فانما یبخل عن نفسه

جو شخص بخل کرتا ہے وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے۔

کہ خدا تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ۔

ان تتولوا یستبدل قوماً غیر کم ثم لایکونوا امثالکم

اگر تم روگردانی کروگے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری کسی قوم کو پیدا کر دے گا۔ پھر تم جیسے نہ ہوں گے۔ جو کہ تمہاری طرح بخیل اور جان چرانے والے نہ ہوں اور تم سے ہر طرح افضل ہوں گے۔ دیکھئے ترغیب پر بخل کرنے سے کس قدر دھمکایا ہے کہ تمہاری تان گاڑی نہیں چلتی دوسرے سے بھی ہزاروں خدمت گزار موجود ہیں۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی　　منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

بادشاہ کی خدمت کر کے احسان نہ جتلاؤ کہ ہم نے خدمت کر کے اس کے احسان مند ہو کہ اس نے تم سے خدمت لے لی۔

خدا تعالیٰ ہی کا ہم پر احسان ہے کہ ہم سے یہ کام لے لیا۔ تو اس آیت میں خدا تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ سوال اور چیز ہے اور وہ کیا ہے کہ جس میں اخفاء ہو اور اخفاء دو قسم کا ہے ایک صوری دوسرا معنوی جیسے وجاہت سے وصول کرنا کہ یہ بھی اخفاء کی ایک فرد ہے۔ غرض جس میں ایلام قلب ہو وہ اخفاء ہے اور اس پر تخلوا کا ترتب کچھ بعید نہیں سا ایک ہے ترغیب اس میں بخل کرنا مذموم ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو صورتیں غیر مشروع ہیں وہ تو سوال میں داخل ہیں اور جو مشروع ہیں وہ ترغیب ہیں۔ غرض میں آپ لوگوں کو ترغیب دیتا ہوں اور مجھے اس ترغیب کے متعلق بہت سے مضامین محرکہ یاد نہیں ہیں۔ ہاں صرف یہ یاد ہے کہ

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللّٰہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللّٰہ یضاعف لمن یشآء واللّٰہ واسع علیم۔

جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے سات بالیں جمیں ہر بالی کے اندر سو دانے ہیں اور اللہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت وسعت والا ہے اور جاننے والا ہے اور اس مقام پر خدائے تعالیٰ نے بہت دور تک انفاق فی سبیل اللہ کا حکم فرمایا ہے۔ یعنی یہ ربع پارہ اس انفاق کی فضیلت میں ہے۔ اس سے معلوم ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ بھی بہت ضروری چیز ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری حالت یہ ہے۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست　　ور زر طلبی سخن دریں است

اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں اگر مال مانگو اس میں کلام ہے۔

ہم لوگوں کو دین سے جو کچھ محبت ہے اس کا خلاصہ وہی ہے جو کہ مولانا نے مثنوی میں لکھا ہے کہ ایک شخص سفر میں چلا جارہا تھا۔ راستہ میں دیکھا کہ ایک کتا پڑا ہوا سسک رہا ہے اور ایک آدمی اس کے پاس بیٹھا ہوا رو رہا ہے۔ مسافر نے اس شخص سے رونے کا سبب پوچھا اس نے کہا یہ کتا میرا بہت بڑا رفیق تھا۔ آج یہ مر رہا ہے۔ اس کے غم میں روتا ہوں۔ پوچھا کہ اسکو کیا بیماری ہے۔ کہا کہ صرف فاقہ۔ یہ ماجرا سن کر مسافر کو اس کی اور کتے کی حالت پر رحم آیا قریب ہی ایک بورا بھرا ہوا رکھا تھا۔ مسافر نے پوچھا کہ میاں اس میں کیا چیز ہے اس شخص نے کہا اس میں روٹیاں بھری رکھی ہیں۔ مسافر نے کہا ظالم کتے کے مرنے پر بیٹھا رو رہا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ اس بوری میں سے ایک روٹی نکال کر اس کو دے دے۔ کہنے لگا کہ جناب مجھے اس قدر محبت نہیں ہے کہ اس کے لئے روٹیاں بھی خرچ کرنے لگوں۔ روٹیوں کے دام لگے ہیں اور آنسو تو مفت کے ہیں۔

اسی طرح ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس کا لڑکا بیمار ہوا کسی نے ختم قرآن کی رائے دی اور کسی نے خیرات کا مشورہ دیا تو اس نے قرآن تو پڑھوایا لیکن خیرات کا ایک پیسہ نہیں دیا۔ اسی طرح ہم لوگ محبت دین کے دائی تو ہیں مگر پیسہ خرچ کرنے میں محبت سب ختم ہو جاتی ہے۔

میں جو اس وقت ترغیب دے رہا ہوں کہ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم ضرور ہی دو۔ کیونکہ دین کا کام ان شاء اللہ تمہارے نہ دینے کی صورت میں بھی ضرور ہی چلے گا۔ میں صرف اس لئے ترغیب دے رہا ہوں کہ یہ بھی ایک شریعت کا مسئلہ ہے جس کا پہنچانا ضروری ہے لیکن اس ترغیب کے ساتھ ہی محل صرف کا بتلانا بھی ضروری ہے۔ مگر اس کے بتلانے سے پہلے میں یہ ظاہر کئے دیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے کسی کے کہنے سے نہیں کہا نہ آگے کسی کا کہا ہوا کہوں گا ہاں اس کی مجھے خبر نہیں کہ کسی نے تصرف باطنی سے میرے دل میں ڈال دیا ہو۔ مگر میں یقین کے ساتھ اس کی بھی نفی کرتا ہوں کیونکہ بحمد اللہ ہمارے بزرگ ایسے نہیں ہیں کہ وہ اس قسم کے تصرفات سے کام لیں۔ بالخصوص ایسے مواقع پر کہ جہاں ان حضرات کو خلاف مرضی ہونے کا احتمال ہو۔ ہاں خدائے تعالیٰ نے دل میں ڈالا اور میں نے بیان کیا۔

واسطہ قرب

تو انفاق مالی کے مصارف کا فیصلہ یہ ہے کہ مفید انجمنیں مدرسے مسجدیں وغیرہ ہیں تو سب

ضروری مگر جس وقت جو مصرف زیادہ ضروری ہو وہ زیادہ قابل توجہ ہے۔ میرے خیال میں اس مقام پر اس وقت میں مدرسہ مظاہر العلوم کے متعلق دار الطلبہ میں بڑی ضرورت سے کما بھی کیفاً بھی بلکہ مناسب ہو کہ لوگ اس کو دیکھ بھی لیں۔ لوگوں کے دیکھ لینے میں انشاء اللہ برکت بھی ہوگی۔

اس دار الطلبہ کے باب میں حدیث ہے اوبیجاً لابن السبیل بناہ یعنی اگرچہ وہ ابن السبیل فاسق ہو لیکن پھر بھی اس کے لئے گھر بنانے میں ثواب ہوگا چہ جائیکہ وہ طلبہ علم ہوں جو کہ اضیاف ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھر یہ بھی نہیں کہ یوں ہی سکونت رکھیں بلکہ **قال اللہ قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم** کا شغل رکھیں کہ اس کے برابر کوئی شغل نہیں۔ حدیث میں ہے۔

الدنیا ملعون و ما فیہا ملعون الاذکر اللہ و ماوالاہ اوعالم او متعلم (سنن ابن ماجہ ۴۱۱۲)

دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ ملعون ہے مگر اللہ کا ذکر اور جو اس کے نزدیک ہے اور عالم اور طالب علم۔

تو علم دین ذکر اللہ بھی ہے اور اس میں عالم اور متعلم بھی جمع ہیں اور دوسرے متعلقین، ماوالاہ بھی۔ غرض ذکر اللہ اور ماوالاہ اور عالم اور متعلم تو لعنت سے مستثنیٰ ہوئے باقی سب موجب بعد عن الرحمۃ ہیں۔

اس سے بعض مخلصین کو اسباب دنیا کی نسبت سخت تشویش ہونا ممکن تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی کیسی تدبیر فرمائی گویا ایک پاکیزہ کیمیا سکھلائی کہ اس دنیائے ملعون کو اگر ماوالاہ میں داخل کر دو تو پھر سبب قرب ہو جائے گی۔ تو اس سے زیادہ کیمیا ہوگی کہ واسطۂ لعنت واسطہ قرب بنادیا جائے اور یہی ایک ذرا سی آنچ میں مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

عین آں تخییل را حکمت کند　　عین آں زہراب را شربت کند
آں گماں انگیز را سازد یقین　　مہر ہا روید از اسباب کیں

اور لوگ مغرور نہ ہوں کہ ہم تو ان کاموں میں دیتے ہیں چنانچہ اس وقت بھی مدرسہ میں دیا ہے لہٰذا ہم پہلے سے ہی داخل ہیں۔ سو جتنا دیا ہے وہ تو اس ترغیب سے نہیں دیا۔ اس پر دینا تو جب سمجھا جائے کہ جنہوں نے مدرسہ میں کچھ دیا ہے وہ اسی قدر دار الطلبہ میں اور دیں اور جنہوں نے اب تک کچھ نہیں دیا وہ بھی حسب ہمت دیں اور جو نہیں لائے وہ وعدہ کرلیں۔ مگر اس کا خیال نہ رہے کہ نری زبان ہی نہ ہو بلکہ پورا کریں۔ اور کوئی صاحب قلیل کثیر کا خیال نہ کریں۔ یہ صدقہ جاریہ ہے جتنا ہو سکے اس کی شرکت کو غنیمت سمجھیں۔

صدقہ جاریہ وہ چیز ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے اور ذرہ ذرہ نیکی کو ترستا ہے اور سوچتا ہے کہ کاش اس وقت کوئی ایسی سبیل ہو کہ کوئی شخص ایک مرتبہ سبحان اللہ ہی کہہ کر بخش

دے حتیٰ کہ بڑے بڑے اولیاء اللہ بھی احتیاج ظاہر کرنے میں کہتے ہیں۔

اے کہ برما میروی دامن کشاں　　　از سر اخلاص الحمدے بخواں

(اے وہ شخص جو دامن جھاڑتے ہوئے گزر گیا ذرا ایک مرتبہ اخلاص سے سورۃ الفاتحہ پڑھتے جانا)

کہ اگر اور کچھ نہیں تو ایک دفعہ تو ایک الحمد ہی پڑھتے جاؤ۔ آج جس الحمد کو ہم ہزار بار خود پڑھ سکتے ہیں بعد مرگ اس کو ایک دفعہ دوسرے کی زبان سے پڑھنے کے لئے ترسیں گے۔ تو یہ صدقہ جاریہ اس وقت کام آئے گا۔

نیز جس وقت قیامت کے روز اعمال پیش کئے جائیں گے اور دیکھے گا کہ میرے پاس کافی نیکیاں نہیں اس وقت جب ورق الٹا جائے گا تو اس کو معلوم ہوگا کہ کسی جگہ بخاری کا ثواب لکھا ہوا کسی جگہ مسلم شریف کا ثواب لکھا ہوا کہیں قرآن شریف پڑھنے کا ثواب لکھا ہوا ہے علی ہذا۔ صاحبو! اگر آج سے ہزار سال کے بعد قیامت آئے تو اس وقت تک اس مکان میں یا تعلیم پانے والوں کے سلسلہ میں جتنی مرتبہ بخاری کا ختم ہوگا اور جتنی دفعہ مسلم شریف پڑھائی جائے گی برابر اس کی روح کو ثواب ملتا رہے گا اور قیامت کے روز اس کی غایت پریشانی کے وقت ان شاء اللہ تعالیٰ کہا جائے گا کہ تو نے جو دار الطلبہ میں مثلاً مدد کی تھی کہ آج یہ پوٹ ثواب کی اس کی بدولت تم کو مل رہی ہے اس وقت خوش ہوگا اور زبان حال سے کہے گا۔

جما دے چند دادم جاں خریدم　　　بحمد اللہ زہے ارزاں خریدم

(میں نے چند سکوں کے عوض جان خریدی الحمد للہ میں نے بہت سستی خریدی)

اور اس وقت معلوم ہوگا کہ ایک روپیہ یا دو روپے دینے سے کیا نفع عظیم حاصل ہوا۔ صاحبو! خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہئے کہ اتنی بڑی دولت مفت میں ہاتھ آتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض وہمی مزاجوں کو شبہ ہو کہ جب اس مکان میں یہ کام یا خود یہ مکان نہ رہے گا تو کیسے ثواب ملے گا اور اول تو اس کا گمان کرنا ہی برا ہے۔ یاد رکھو کہ نیک کام کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا کرتا۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد　　　چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

(اگر سارا جہاں ہوائے مخالف بن جائے تب بھی اللہ والوں کا چراغ گل نہ ہوگا)

غرض اس میں کبھی انقطاع نہیں ہوتا اور بالفرض ہو بھی تو یہ قاعدہ مقرر ہے۔ انما الاعمال بالنیات (عملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے) تو نیت تو دینے والوں کی ہمیشہ ہی کے لئے اس کی اعانت کرنے کی ہے اگر اسی پر پڑ رہو کہ جتنے دن قیام ہوا تنے ہی دن کا ثواب ملے تو جنت دائمی

کا استحقاق بھی نہ رہے گا۔ کیونکہ جب سو برس تک بھی نیکیاں نہیں کیں تو سو برس سے زیادہ جنت میں کیوں رہیں۔ حالانکہ جنت میں ابدالاباد رہنا ثابت ہے تو اس نیت کی بدولت ہے کہ ہر مسلمان کی نیت یہ ہے کہ اگر قیامت تک زندہ رہیں گے تو اس دین پر رہیں گے۔ اسی لئے جزائے موید ملتی ہے اسی طرح یہاں بھی نیت تابیدی ہے پس یہ وسوسہ غلط ٹھہرا۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے تقسیم اور تجزیہ کا غلط ہونا ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے نفسوں اور جانوں کو خرید لیا ہے۔ تو دونوں کو جمع فرمانے سے یہ بتلا دیا کہ نہ صرف بذل مال کرنے والے مغرور ہوں اور نہ صرف بذل جان کرنے والے بلکہ جب دونوں کا بدل ہوگا تو جنت کا استحقاق ہوگا۔ تو صاحبو! جنت ایسی سستی نہیں ہے خوب سمجھ لو کہ۔

الا ان سلعة اللّٰه غاية الا ان سلعة اللّٰه بى الجنة (تفسير البغوى ۷: ۹، تفسير ابن كثير ۷: ۳۸۱، اتحاف السادة المتقين ۱۰: ۲۵۳)

خبردار اللہ کا سامان مہنگا ہے خبردار اللہ کا سامان جنت ہے۔

اب میں طالب علموں کے کام کی ایک بات بتلاتا ہوں کہ اس مقام پر شبہ ہو سکتا ہے کہ بذل نفس تو خاص خاص کاموں میں ہوتا ہے یعنی قتال میں جس کے آگے ذکر بھی ہے یقاتلون فی سبیل اللہ تو بذل نفس کیسے ہوا تو سمجھو کہ خدا تعالیٰ نے خود آگے چل کر فرما دیا ہے۔

التآئبون العابدون الحامدون السآئحون الراكعون.

وہ ایسے ہیں جو کہ توبہ کرنیوالے ہیں حمد کرنیوالے روزہ رکھنے والے رکوع کرنیوالے

یہ آیت اس شبہ کو بالکل زائل کر کے بتلا رہی ہے کہ یہ سب کام بذل نفس ہی میں داخل ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ دلیل ہے کہ آگے ارشاد ہوتا ہے۔

و بشر المومنين (مسلمانوں کو بشارت دیجئے)

یہ المومنین اسی عن المومنین سابق کا اعادہ ہے۔ پس ان اعمال کے بعد یہ حکم دینا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان مومنین مذکورین کو بشارت دے دیجئے صریح طور سے دال ہے کہ جس اشتراء انفس واموال کا اوپر ذکر تھا وہ یہ اعمال ہیں پس یہ سب بذل نفس ہو گیا اس تقریر سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ تمام شریعت مطہرہ بذل نفس اور بذل مال کی تفصیل ہے۔ یہ تھا میرا مقصود اس وقت کے بیان سے۔ اب میں ختم کرتا ہوں کہ درخواست کرتا ہوں کہ یہ میری طرف سے مدرسہ میں قبول ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ برکت دے۔ آمین یا رب العالمین۔

تقویم الزیغ

انسداد بدعت والحاد کے متعلق یہ وعظ ۲۹ شوال ۱۳۲۹ھ بعد نماز عشاء ۳ گھنٹے کھڑے ہو کر انجمن ضلع ہردوئی میں بیان فرمایا نو سو کے قریب حاضری تھی جس میں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ حضرات تھے مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ و حدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمد اعبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علی اٰلہ واصحابہ و بارک وسلم. اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ و ان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ

یہ دین میرا سیدھا راستہ ہے سو اس پر چلو جو کہ مستقیم ہے دوسری راہوں پر مت چلو وہ تم کو اللہ کی راہوں سے جدا کر دیں گی۔

ضرورت تدبیر

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس سے اوپر خدا تعالیٰ نے بعض احکام اعتقادیہ اور بعض احکام عملیہ بیان فرمائے ہیں ان کے بعد یہ جملہ ارشاد ہوا ہے ترجمہ اس کا یہ ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے اس کا اتباع کرو دوسرے طریقوں کا اتباع نہ کرو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے دور کر دیں گے۔

اس ترجمہ سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اس وقت کس مضمون کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اور یہ کہ یہ کوئی نیا مضمون نہیں ہے۔ بارہا کان اس سے آشنا ہوتے ہوں گے۔ اس پر ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ مضمون بارہا سنا ہوا ہے تو اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ سننا دوسری چیز ہے اور سمجھنا دوسری چیز ہے۔ ہم نے سنا تو ہے مگر سمجھا نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ نے کہیں کہیں اس کی شکایت بھی کی ہے۔ اس کو تفکر اور تدبر بھی کہتے ہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔

و یتذکر اولوا الالباب عقلمندوں کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

مسلمان تحصیل علوم وغیرہ کو ضروری سمجھتے ہیں اور وہ ہیں بھی ضروری لیکن ان کی جو اصل ہے جس کی یہ سب فرع ہیں۔ اس کی ضرورت کا تصور بھی نہیں ہوا بلکہ اس حالت کا بھی تصور نہیں۔ اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ذرا التفات بھی نہیں ہوا الا ماشاء اللہ کہ بعض کو تو اس کا خیال ہے ورنہ علی العموم اس طرف سے بالکل بے پروائی ہے۔ اور وہ بات کچھ بہت لمبی چوڑی نہیں۔ بہت چھوٹی سی بات ہے لیکن چھوٹی ظاہر ہی میں ہے ورنہ مثل قول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

خفیفتان علے اللسان ثقیلتان فی المیزان (الصحیح للبخاری ۸:۱۰۷، ۱۷۳، ۹:۱۹۹)

زبان میں ہلکے ہیں میزان میں بھاری ہیں۔

حقیقت میں وہ بات بہت بڑی ہے اور اسی کی بدولت کچھ حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تدبر اور تفکر کیا کریں۔ مسلمان اس سے کچھ ایسے غافل اور بے خبر ہیں کہ گویا انہوں نے اس کا سبق ہی نہیں پڑھا اور دوسروں کی کیا شکایت کروں۔ خود اپنی ہی یہ حالت ہے کہ زبان پر لمبے چوڑے مضامین ہیں لیکن اپنی حالت میں تدبر اور تفکر نہیں اور جب میں اپنے کو مریض سمجھتا ہوں اپنی شکایت کرتا ہوں تو اگر سننے والوں کو بھی شکایت کروں تو کچھ بے موقع نہیں۔ ہاں اگر اپنا شکوہ کرتا تو سامعین کی تکدر خاطر کا ضرور خیال تھا۔

غرض ہم مسلمانوں میں اس کی بہت کمی ہے ہم نے تدبر سے کام لینا بالکل چھوڑ دیا ہر شخص اپنے یوم ولیلہ کو دیکھ لے جن لوگوں کے اوقات کا کوئی انضباط ہی نہیں۔ وہ تو شمار ہی سے خارج ہیں اور اکثر لوگ ہم سے ہی ہیں کہ صبح کا کام شام پر اور شام کا کام صبح پر ملتوی رکھنا معمولی بات ہے میں نے ایسے افراد بھی دیکھے ہیں کہ انہوں نے ایک ایک خط کو صبح شام میں ہفتہ بھر تک ڈالے رکھا۔ جیسے بعض حفاظ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے جب سے قرآن پڑھا ہے ایک ختم کی نوبت نہیں آئی۔ ایسے لوگ تو شمار ہی سے خارج ہیں لیکن جن لوگوں کے اوقات منضبط ہیں وہ اپنے نظام الاوقات میں دیکھیں کہ پانچ منٹ بھی تدبر کے لئے انہوں نے رکھے ہیں۔ کہیں نام ونشان بھی نہ ہوگا۔ اکثر مسلمانوں کو اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں۔ خدا تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں۔

کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا ایاته ولیتذکر اولوا الالباب

یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کے اوپر نازل کیا تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

دوسری جگہ شکایت فرماتے ہیں۔

افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا

تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ گیا ہے۔

یہ لوگ قرآن میں غور ہی نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ گئے ہیں کہ تدبر کی قدرت ہی نہیں رہی کیونکہ تدبر کرتے تو یہ حالت ہرگز نہ رہتی۔ تدبر کا خاصہ ہے کہ اس سے رحمت کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور بغیر اس کے کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

انلزمکموھا وانتم لھا کارھون

یعنی کیا ہم ان کو زبردستی اپنی رحمت چمٹا دیں گے اگرچہ وہ کراہت کرتے ہوں۔

سو اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔ کیا ہمارے یہاں اس کے رکھنے کی جگہ نہیں۔ اگر ہزار بار چاہیں تو ہم بھی متوجہ ہوں گے اور تمہاری توجہ سے زیادہ متوجہ ہوں گے اور کام بھی ہماری ہی توجہ سے چلتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بچہ کو آپ لینا چاہیں اور لینے کو ہاتھ بڑھائیں تو اگر بچہ اپنی بساط کے بموجب دوڑے اور کوشش کرے اگرچہ گر ہی جائے تو آپ خود دوڑ کر اٹھا لیتے ہیں اور یہ مسافت آپ ہی کے بڑھ کر اٹھا لینے سے طے ہوتی ہے ورنہ اس بچے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ خود مسافت کو طے کر سکے۔

اسی طرح خدا تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ اگر یہ بھی کچھ ہاتھ پیر ہلائے اور کوشش کرے تو اس جانب سے جذب ہوتا ہے اور اس جذب کی بدولت یہ وہاں پہنچتا ہے۔ اور یہ فرلانگ دو فرلانگ کی مسافت تو ممکن ہے کہ بچہ قطع کرے برخلاف اس بعد کے جو ممکن اور واجب میں ہے کہ اگر ادھر سے جذب نہ ہو تو کبھی یہ مسافت طے ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ادھر سے جذب ہونا آپ کی طلب پر موقوف ہے جس کو افسوس ہے کہ آپ نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہر وقت ہدایت دینے کو تیار ہیں مگر افسوس کہ ہم ہی قاصر ہیں اور وہ طلب یہی ہے کہ ہم تدبر کریں اور سوچ لیا کریں اس سے خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہوتا ہے۔

وعظ سننے کا مقصد

صاحبو! میں پھر کہتا ہوں کہ تدبر اور سوچ اگرچہ بظاہر بہت چھوٹی سی بات ہے لیکن ثمرہ کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات ہے اور اس کے ترک کردینے سے ہم بہت خرابیوں میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اسی طرح یہ مضمون جو آج بیان کرنا مقصود ہے اس کو بھی آپ نے بہت دفعہ سنا ہوگا مگر کبھی اس میں غور کرنے اور سمجھنے کی نوبت نہیں آئی اس لئے آج سمجھانے کے لئے اس کو اختیار کیا گیا۔

میں مضمون آیت کو پھر دہرائے دیتا ہوں تاکہ وہ تازہ ہو جائے اور وعظ سے یہی مقصود بھی ہوتا ہے کہ جو مضامین کانوں میں پڑے ہیں لیکن ان سے غفلت ہوگئی ہے وہ پھر تازہ ہوجائیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر وعظ میں کوئی نئی بات ہی بیان کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ وعظ سننے سے اصل مقصود کیا ہونا چاہئے کیونکہ آج کل وعظ سننے والوں کے مختلف مقاصد ہوا کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو اس لئے وعظ سننے آتے ہیں کہ واعظ کی تقریر کا اندازہ کریں کہ وہ کس قبیل کی ہے بیان مسلسل ہوتا ہے یا اکھڑا اکھڑا ہوتا ہے۔ مضامین کی آمد کا کیا حال ہے بعض لوگ اس لئے سنتے ہیں کہ مضامین سن کر واعظ کے خیالات کا اندازہ کریں گے کہ یہ کس خیال کا آدمی ہے۔ بعض لوگ اس لئے آتے ہیں کہ اس کے بیان اور مضامین میں عیب نکالیں گے۔ بعض کی اچھی نیت ہوتی ہے لیکن صرف یہ کہ مجلس وعظ میں شریک ہونے سے اتنا وقت ثواب میں گزرے گا۔ یہ نیت اگرچہ مستحسن ہے لیکن کافی نہیں کیونکہ وعظ سننے سے یہ مقصود نہیں ہوتا۔ ثواب تو نفلوں میں تلاوت قرآن میں بھی بہت کچھ ملتا ہے وعظ سننے کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ امراض باطنی جن پر کبھی ہماری نظر بھی نہیں جاتی ان کو سنیں اور ان پر ہم کو توجہ ہو۔ بس اس غرض کو پیش نظر رکھ کر وعظ سننا چاہئے۔

ایک مشترک مرض

غرض خداتعالیٰ اس مقام پر فرماتے ہیں

ان هذا صراطي مستقيماً فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله . ... هذا صراطي مستقيماً

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے

رب نے تم پر حرام فرمایا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔

میں عامل اشیر ہے جو کہ ہذا سے مفہوم ہے ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ میرے اس سیدھے راستہ کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا کر دیں گے۔ جن میں ایک خدا کا بتلایا ہوا راستہ ہے اور دوسرے خود بندوں کے تراشے ہوئے ہیں پس ان سب راستوں میں ایک تو یہ اتباع کے قابل ہوگا باقی سب ترک کے قابل لیکن یہ ضرور ہے کہ طریق الہی کو دوسرے طریق سے ممتاز اور جدا کرنے کے لئے کوئی معیار ہو جس سے ہم کو یہ بات معلوم ہو سکے کہ فلاں راستہ خدا کا بتلایا ہوا اور قابل اتباع ہے اور اس کے سوا دوسرے قابل ترک اگر غور کیا جائے تو اسی آیت کے پورے مضمون سے اس معیار کا پتہ چل جائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ اس معیار کو چھوڑ دینے ہی سے یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے یہ حالت ہوگئی کہ بعض لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ ہم نے طریق الہی کو چھوڑ دیا یا لئے ہوئے ہیں چنانچہ اس جزو آیت سے اوپر کا جزو اس کے ساتھ ملا جائے تو اس سے معلوم ہو جائے گا فرماتے ہیں **قل تعالوا اتل ماحرم علیکم ربکم ان لاتشرکوابه شیئاً و بالوالدین احساناً** نبی کریم صلی اللہ عیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ فرما دیجئے کہ آؤ میں تم کو احکام خداوندی بتلاؤں اور وہ فلاں اور فلاں ہیں اس ارتباط باہمی سے اس بات کا فیصلہ ہوگیا کہ معیر طریق خداوندی کے دوسرے طریق سے ممتاز ہو جانے کا یہ ہے کہ جس بات کو نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم فرمائیں اور پڑھ کر سنائیں وہ طریق خداوندی ہوگا اور حضور جو کچھ فرمائیں وہ وحی ہوتا ہے تو خلاصہ یہ نکلا کہ وحی سے جو ثابت ہو وہ طریق الہی ہے تو وحی معیار ہوئی مختلف طریق کے ممتاز کرنے کی اور اسی پر دار ومدار رہا۔

اس مضمون کو بھی مسلمانوں نے بہت دفعہ سنا ہوگا لیکن برتاؤ اور مسلمانوں کے حالات میں غور کرنے سے یہ معوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے قلب میں تو وحی کی مطلق عظمت ہی نہیں اور بعض کے دل میں وحی کی وقعت تو ہے لیکن اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

اس وقت مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں مگر سب میں مرض مشترک یہ ہے کہ وحی کو معیار نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے مناسب تھا کہ ایک ہی فرقہ کہا جاتا لیکن چونکہ انداز الگ

الگ ہیں اس لئے سب کو ایک نہیں کہا جا سکتا۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بادشاہ کی عملداری میں مختلف طرح کے آدمی رہتے ہوں اور بعض تو ایسے ہوں کہ وہ قوانین کو تسلیم ہی نہ کرتے ہوں بعض ایسے ہوں کہ قوانین کو تو تسلیم کریں لیکن ان قوانین کے صحیح فرض کو نہ سمجھتے ہوں تو یہ سب لوگ اس قدر مشترک میں تو شریک ہیں کہ معیار قانون پر نہیں چلتے لیکن چونکہ تسلیم اور عدم تسلیم کا فرق بھی ہے اس لئے دونوں کو الگ الگ شمار کیا جائے گا اور برتاؤ بھی دونوں کے ساتھ مختلف ہوگا قانون کے غلط سمجھنے کے متعلق مجھے ایک حکایت یاد آئی اس میں ان شاء اللہ یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائے گی کہ قانون کو تسلیم کرنے کے بعد بھی کیوں کر اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے۔

احکام خداوندی کی عظمت کا فقدان

ایک غیر ملک کے دیہاتی نے ریل کا سفر کیا اور قریب ایک من کا بورا اپنے ساتھ لیا جب اسٹیشن پر پہنچا تو ملازمین ریلوے نے ٹکٹ کے ساتھ اسباب کی بلٹی بھی طلب کی اس نے بجائے بلٹی کے اپنے ٹکٹ ہی کی طرف اشارہ کیا ملازم ریلوے نے اس کو سمجھانے کے طور پر کہا کہ تمہارا اسباب چونکہ پندرہ سیر سے زیادہ ہے اور پندرہ سیر سے زیادہ اسباب محصول ادا کئے بغیر لے جانے کی اجازت قانون ریلوے میں نہیں ہے اس لئے ایک بلٹی اس اسباب کی بھی ہونی چاہئے یہ سن کر وہ دیہاتی کہتا ہے کہ پندرہ سیر سے یہ خاص وزن مراد نہیں بلکہ وہ مقدار جس کو ایک آدمی اٹھا سکے اور چونکہ ہندوستانی لوگ پندرہ سیر ہی اٹھا سکتے ہیں اس لئے یہ خاص وزن لکھ دیا گیا ہے اور ہم ایک من اٹھا سکتے ہیں اس لئے ہمارے ایک من کے لئے وہی قانون ہوگا جو تمہارے پندرہ سیر کے لئے ہے خیر حکایت تو ایک لطیفہ ہے لیکن ہم کو اس سے سبق لینا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ کیا وہ ٹکٹ کلکٹر اس دیہاتی کے جواب کو سن کر اس کو معذور سمجھے گا یا اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کتاب قانونی دیہاتی کے سامنے رکھ دے اور اس کو قانون سمجھانے کی اشتباہ رفع کرنے کی کوشش کرے اور اگر وہ ہر شخص کے ساتھ ایسا کرے تو کیا اپنے منصبی کام کو پورے طور پر انجام دے سکے گا کہ کبھی نہیں بلکہ یہ مشغلہ اس کو معطل کر دے گا۔ بس ان ساری دقتوں کو پیش نظر رکھ کر آپ بتلائیے کہ

ٹکٹ کلکٹر کیا کرے گا صرف یہی کہ ہاتھ پکڑ کر اس کو پولیس کے حوالے کر دے گا تو جیسا اس دیہاتی نے قانون کی غلط تفسیر کی تھی اسی طرح آج کل قرآن کی غلط تفسیر کی جاتی ہے اور زور دے کر کہا جاتا ہے کہ اس قانون قرآنی کا یہی مطلب ہے حالانکہ نہ وہ مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا نہ صحابہ کرامؓ نے سمجھا۔ نہ خدا تعالیٰ نے بتایا صاحبو قرآن فہم لوگوں کی نظروں میں اس قسم کی تفاسیر کی وقعت اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی وقعت اس دیہاتی کی تفسیر قانون کی تھی حالانکہ بظاہر اس کی یہ تفسیر اور تاویل جی کو لگتی ہے کہ اگر کوئی شخص قانون پر نظر رکھتا ہو تو وہ اس کو سن کر یقین کر لے کہ یہی معنی قانون کے ہیں اور آپ کو جو یہ تفسیر سن کر معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے قانون مدت سے سنا ہوا ہے ورنہ جس نے کبھی اس قانون کو نہ سنا ہو اور وہ اس گفتگو کو سنے کہ ٹکٹ کلکٹر تو کہتا ہے قانون یوں ہے اور دیہاتی کہتا ہے کہ قانون کی لم کیا ہے کیوں یہ خاص وزن قانون میں رکھا گیا ٹکٹ کلکٹر جواب دیتا ہے کہ ہم عامل قانون ہیں مجوز قانون ہیں ہم نہیں جانتے لیکن کہ کیا لم ہے اس پر دیہاتی کہتا ہے کہ تم اگرچہ نہیں جانتے لیکن میں جانتا ہوں لم اس کی یہ ہے کہ پندرہ سیر سے زیادہ اکثر ہندوستانی اٹھا نہیں سکتے اور اب یہ لم ہے تو جہاں یہ منتفی ہوگی قانون بھی منتفی ہوگا تو اس دیہاتی کی آب وتاب کی تقریر اور ٹکٹ کلکٹر کا بظاہر عاجزانہ جواب اس کا یہ خیال یہ بات قائم کروائے گا کہ قانون کی اصل حقیقت دیہاتی نے سمجھی اور ٹکٹ کلکٹر محض زبردستی کر رہا ہے۔

حالانکہ قانون دان آدمی جانتا ہے کہ قانون وہی ہے جو ٹکٹ کلکٹر کہہ رہا ہے اور اس لئے وہ ٹکٹ کلکٹر کی جملہ تجویز کو جو اس دیہاتی کے متعلق ہوں بجا اور مناسب سمجھے گا۔ یہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے بچپن سے شریعت کے احکام نہیں سنے اور ہوش سنبھال کر انہوں نے ایک عالم اور ایک جاہل کی گفتگو سنی کہ عالم کہتا ہے شریعت کا یہ قانون ہے اور جاہل اس کی لم دریافت کر رہا ہے جس کے جواب میں عالم یہ کہہ کر ختم کر دیتا ہے ہم عالم قانون ہیں واضع قانون نہیں لم اور مصلحت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے جو کہ واضع قانون ہے ہم اس کے ذمہ دار نہیں اور وہ جاہل مدعی عقل کہتا ہے کہ میں اس کی لم جانتا ہوں اور یہ کہہ کر احکام میں تحریف شروع کر دیتا ہے جس طرح اس دیہاتی نے قانون ریلوے میں تحریف کی تھی۔

تو صاحبو! کیا وجہ ہے کہ اس گنوار کے قصے میں تو اس کو ناحق پر اور ٹکٹ کلکٹر کو حق پر کہا

گیا اور اس جاہل کی گفتگو میں علماء کے جواب کو زبردستی پر محمول کیا گیا اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے بتلایئے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ احکام خداوندی کی عظمت دل میں نہیں اور حکومت کے احکام کی عظمت دل میں ہے۔

تلاش حجت کے اسباب

کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس کے احکام میں علتیں نہیں تلاش کی جاتیں بے چوں وچرا تسلیم کرلیا جاتا ہے اور جس کی عظمت دل میں نہیں رہتی اس کی ہر بات میں لم اور کیف کیا جاتا ہے۔

چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض مرتبہ کوئی ایسا حکم سرکار کی طرف سے آتا ہے کہ جس سے طبیعت منقبض ہوتی ہے عقل بھی ابا کرتی ہے لیکن اس کو بلا تامل تسلیم کرلیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب حکومت نے حکم دیا تو اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوگی اس طرح کے بہت سے احکام ہیں جس کی علت عوام کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن ان کو مانا اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔

مثلاً اگر ایک روپے کا عدالتی ٹکٹ لفافہ پر لگا کر ڈاک میں بھیج دیا جائے تو لفافہ بیرنگ ہو جائے اور ڈاک خانہ کا دو پیسے کا ٹکٹ لگائیں تو بیرنگ نہ ہوگا۔ ہزاروں آدمی ہوں گے جو اس قانون کی لم نہیں جانتے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی عدالتی ٹکٹ لگا کر بھیجے اور لفافہ بیرنگ ہو جائے تو گورنمنٹ سے یہ نہیں پوچھا جاتا نہ اس کی لم دریافت کی جاتی ہے کہ ایک روپیہ میں لفافہ کیوں بیرنگ ہوا اور دو پیسہ میں کیوں بیرنگ نہیں ہوتا۔ غرض کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا کہ اس کی مخالفت کی جائے یا علت تلاش کی جائے۔ برخلاف اس کے مگر ایک دوست کوئی حکم کرے یا کسی امر میں رائے دے تو اس میں صدہا عیب نکال دیتے ہیں وجہ اس کی یہی ہے کہ حکومت کی وقعت دل میں ہے اور دوست کی نہیں کیونکہ وہ آپ کے برابر کا ہے اور حکومت بالادست ہے۔

صاحبو ذرا غور کرو کہ خدا تعالیٰ کے احکام میں علت ڈھونڈ کر آپ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عظمت آپ کے دلوں میں نہیں رہی۔ اور اگر اس کے سوا کوئی دوسری وجہ ہے تو مجھے بتلایئے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے حکم یا رائے کو باوجود اس کے بالادست نہ ہونے اور ہمارے دل میں اس کی عظمت نہ ہونے کے بھی اس وجہ سے

کہ ہم اس رائے کو اپنے لئے مفید سمجھتے ہیں تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص کسی طبیب کے پاس گیا اور جا کر مرض کی تشخیص کرائی اور نسخہ لکھوایا تو اس موقع پر آپ نے کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ اگر اجزاء نسخہ کی حکمت اور علت اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس نے طبیب سے دریافت کیا ہو یا اس کے ساتھ الجھنے لگا ہو کہ یہ اوزان خاص کیوں رکھے گئے۔ واللہ کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو زبان سے کبھی نہیں کہتے کیونکہ جانتے ہیں کہ ہمارے ہی فائدے کے لئے اس نے نسخہ تجویز کیا ہے۔ ایسا نہ ہو چوں وچرا کرنے سے کبیدہ خاطر ہو کہ ہم کو نکال دے اور پھر کبھی نہ گھسنے دے۔

تو صاحبو! اگر احکام خداوندی کی قدر بھی دلوں میں نہ ہو تب بھی اس لئے ان کو تسلیم کرلو کہ وہ صرف تمہارے ہی فائدہ کے لئے تجویز کئے ہیں۔ ایسا نہ ہو تمہارے اغراض سے خداتعالیٰ خفا ہو جائیں اور تم پر کوئی مصیبت آپڑے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم　　　بلکہ تا بر بندگاں دے جو کنم

میں نے مخلوق کو نفع حاصل کرنے کیلئے نہیں پیدا کیا بلکہ سخاوت کے لئے پیدا کیا ہے۔

تو اگر احکام خداوندی کی وقعت گورنمنٹ کے احکام کے برابر نہیں ہے تو حکیم ہی کا سا برتاؤ کیا ہوتا۔ اور جب یہ بھی نہیں تو معلوم ہوا کہ احکام خداوندی کی اتنی بھی قدر نہیں۔ البتہ حکیم کی تجویز میں ایسے لوگ ضرور چھیڑ چھاڑ نکالا کرتے ہیں جن کو نسخہ پینا منظور نہ ہو بلکہ محض مشغلہ کے طور پر گئے ہوں تو میں لوگوں کے حالات دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر وہی لوگ احکام خداوندی میں لم کیف کرتے ہیں جن کو کچھ نہیں کرنا ہوتا۔ اور جن کو عمل کرنا ہوتا ہے وہ اگر سوال کرتے ہیں تو یہ کہ نماز میں فرض کس قدر ہیں واجب کتنے۔ کیونکہ ان کو یہ فکر ہے کہ لاعلمی میں ہم سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جس سے نماز ہی جاتی رہے۔ ان کو لم وکیف سے بالکل تعلق نہیں ہوتا۔

پس حجت تلاش کرنے کے دو سبب ہوئے۔ ایک تو احکام کی وقعت نہ ہونا۔ دوسرے عمل کی نیت نہ ہونا اور علل تلاش کرنے والوں کے دلوں میں نہ وقعت ہے نہ عمل کی نیت ہے۔ بہرحال مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت ہے جو وحی کی عظمت اور قدر نہیں کرتے اور ایک ایسی جماعت ہے جو وحی پر نہیں چلتے۔ ان دونوں کے لئے معیار وحی کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔

صراط مستقیم

بالجملہ جس طرح معاملات حکام و رعیت میں معیار تعیین و تصحیح کا قانون ہے اسی طرح

طریق نجات کے لئے بھی معیار صحیح قانون الٰہی ہے جس کو وحی کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت خداتعالیٰ فرماتے ہیں۔ "اتل مآ اوحی الیک من الکتب و اقم الصلوٰۃ جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے اس کو پڑھئے اور نماز کی پابندی کیجئے۔

کہ جو آپ پر وحی ہوا ہے اس کو پڑھئے تو خلاصہ دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نکلا کہ جو وحی سے ثابت ہو وہ خداتعالیٰ کا راستہ ہے اور ہذا صراطی مستقیما میں صراط کو جو اپنی طرف منصوب و مضاف فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ تک پہنچانے والا میرا بتلایا ہوا راستہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو راستہ خدا تک پہنچنے والا ہوگا وہ مستقیم ہی ہوگا اس لئے مستقیما فرمایا اور مستقیم کے یہ معنی نہیں کہ کوئی خط مستقیم ہے۔ نیز یہ بھی مقصود نہیں کہ خداتعالیٰ کا بتلایا ہوا کوئی دوسرا غیر مستقیم ہے۔ نیز یہ بھی مقصود نہیں کہ خداتعالیٰ کا بتلایا ہوا کوئی دوسرا غیر مستقیم راستہ بھی ہے جس سے احتراز کرنے کو اس کی صفت مستقیم لائے ہوں بلکہ خداتعالیٰ کا ایک ہی راستہ بتلایا ہوا ہے جو کہ مستقیم ہی ہے تو آج کل چونکہ لوگوں نے اس طریق کو معیار نہیں بنایا اس لئے بہت سے فرقے ہوگئے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ فرقوں سے مراد مسلمانوں کے فرقے ہیں کافروں کے نہیں۔ تو بعض تو وہ ہوئے جنہوں نے وحی الٰہی کے وہ معاملہ کیا جو اس دیہاتی نے کیا تھا کہ وحی کو وحی تو مانا مگر اس میں تغیر و تبدل کرنے لگے۔

آسمان اور سائنس

چنانچہ مسلمانوں کے ایک بڑے فرقے کی یہ کوشش ہے کہ قرآن کی آیتوں کو جس طرح بن سکے سائنس پر منطبق کیا جائے اور ایسے لوگ علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ لکیر کے فقیر ہیں۔ صاحبو! میں دعویٰ کرتا ہوں کہ سائنس کا کوئی تحقیقی مسئلہ قرآن کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا اور تحقیقی کی قید اس لئے لگائی ہے کہ سائنس کے مسائل دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ محض تخمین سے ان میں کام لیا گیا ہے اور اکثر اسی قسم کے ہیں دوسرے وہ ہیں کہ جو تحقیق سے ثابت ہوئے ہیں تو جو مسائل تحقیقی ہوں گے وہ کبھی قرآن کے کسی جزو سے کے معارض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ قطعی عقلی قطعی نقلی کے معارض نہیں ہو سکتا۔

صاحبو آج کل تو تحقیق کا زمانہ ہے اور مسائل میں غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے تو ذرا

اس میں بھی غور کرو کہ اہل سائنس کے جتنے دعاوی ہیں سب صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ مثلاً اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں سب ستارے فضا میں گھوم رہے ہیں۔ تو دیکھو یہ مسئلہ ظنی ہے یا یقینی تو سائنس کی رو سے آسمان کا عدم قطعی طور پر سے ثابت نہیں ہو سکتا آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو کہ عدم الوجود کو مستلزم نہیں۔

وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیونکہ وجود آسمانی فی نفسہ ممکن ہے یعنی آسمان کا وجود و عدم دونوں عقلاً برابر ہیں اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس کے وجود کی خبر کوئی مخبر جو قطعاً صادق ہو دیتا ہے تو اس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے اور اس کے وجود کی خبر ایک مخبر صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے پس ان تینوں مقدموں میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ آسمان موجود ہے اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بناء پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممتنع پس نہ ضروری الوجود ہوا نہ ضروری العدم۔ تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت العدم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا اس وقت تک بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں ہے البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ ہم تقریر سابق سے ان کو وجود آسمان تسلیم کرا دیں گے البتہ اس کے ضروری الوجود نہ ہونے پر شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ یونان کے دلائل قریب قریب سب مخدوش ہیں جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں۔ واقعیت یہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم۔

رہی یہ بات کہ علی العموم اس نیلگوں رنگ آسمان نہیں ہے اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اول تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بناء الفاسد علی الفاسد ہے دوسرے اگر ثابت ہو بھی جائے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا ممکن ہے کہ آسمان سے آگے ہو۔

بس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے دلائل سائنس متصادم ہے سخت غلطی

ہے کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن ناطق اور تصادم وتعارض ناطقین میں ہوتا ہے ساکت وناطق میں نہیں ہوسکتا اور جب تعارض نہیں ہے تو سماء کی تفسیر کواکب یا فوقنا وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی اور ایسے محرفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انہوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا۔ کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی۔ جس طرح اس دیہاتی کو کہا گیا تھا کہ اس نے قانون پر عمل نہیں کیا ایک صورت تو وحی کو معیار نہ بنانے کی تھی۔

وحی اور حدیث

ایک اور یہ صورت ہے کہ بعض لوگ وحی کو مانتے بھی ہیں اور اس کی حقیقت کو بھی کچھ سمجھتے ہیں لیکن اس کو قرآن پر منحصر سمجھتے ہیں اور فقہ وحدیث کو وحی سے خارج کردیتے ہیں تو غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ لوگ بھی وحی کو نہیں مانتے اور اس کو معیار نہیں سمجھتے۔ وجہ یہ ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ قانون کی شرح اگر مقنن کردے تو وہ شرح بھی قانون ہی ہے یا اگر اصول اقلیدس سے اشکال جدیدہ بنائی جائیں تو ان اشکال کو بھی اقلیدس ہی کی اشکال کہا جائے گا۔

پس حدیث تو چونکہ وحی ہے اگرچہ غیر متلو ہے۔ اس لئے وہ خداتعالیٰ کی طرف سے قرآن کی شرح ہے اور اس لئے اس کا حکم بھی قرآن شریف کا سا ہے اور مسائل فقہ چونکہ انہی اصول پر مبنی ہیں جو قرآن وحدیث میں ہیں اس لئے وہ بھی حکم میں وحی کے ہوں گے۔ تو وحی کبھی جلی ہوتی ہے اور کبھی خفی۔ خداتعالیٰ فرماتے ہیں۔ **ثم ان علینا بیانه** چنانچہ جب حضورؐ پر آیت۔

ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوه یحاسبکم به اللّٰه

نازل ہوئی تو صحابہؓ نے یہ سمجھا کہ شاید وساوس پر بھی گرفت ہو۔ اس لئے بہت گھبرائے ان کی گھبراہٹ پر دوسری آیت نازل ہوئی جس نے اس کی تفسیر کردی۔ **لایکلف اللّٰه نفسا الا وسعها** اس آیت نے بتلادیا کہ وساوس پر جب تک کہ وہ وسوسے کے درجے میں رہیں مواخذہ نہ ہوگا نیز حدیث کے ذریعے سے حضورؐ نے اس کی تفسیر فرمائی۔

ان اللّٰه تجاوز عن امتی عما وسوست صدوء ها مالم تعمد او تتکلم او کما قال (مشوة المصابیح: ۶۳، حلیة الاولیاء لأبی نعیم ۲۵۹:۲، ۲۶۱.۷)

پس حدیث قرآن کی تفسیر ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور بعض چیزیں چونکہ حدیث میں بھی مجمل رہ گئی تھیں مثلاً مسائل ربوا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **مثلاً بمثل یداً بید**

والفضل ربوا (شرح معانی الآثار للطحاوی ۴:۶۶، ۶۷) اور دوسری جگہ یہ فرمایا کہ **دعوا الربوا والریبہ** اس سے معلوم ہوا کہ ربوا حرام ہے مگر اس کی جزئیات کا پتہ اس سے نہیں چلتا تھا۔ ہمارے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بشل اور ید ابید سے سب جزئیات کو نکال دیا جن کو عوام الناس نہ سمجھ سکتے تھے اور اسی لئے علم اصول مدون کیا۔ نیز یہ بھی کہہ دیا کہ **القیاس مظہر لا مثبت** جس میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ جو کچھ کہا ہے حدیث و قرآن ہی کی تفسیر ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جابجا یہ ارشاد فرمایا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وحی سے فرماتے ہیں۔ کوئی بات وحی کے خلاف نہیں تو اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو حدیث یا فقہ کو نہیں مانتے اور محدثین اور فقہاء پر اعتراض کرتے ہیں۔

اہمیت حدیث

صاحبو! حدیث سے کیونکر استغناء ہو سکتا ہے فرمایئے کہ اگر حدیث کو نہ مانا جائے تو رکعت کی تعداد یا اوقات نماز کی تعیین کس طرح معلوم ہو گی۔ اگرچہ اوقات خمسہ کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے لیکن وہ اس طرح ہے کہ جس کو پیشتر سے معلوم ہو وہ ان پر منطبق کر سکتا ہے ورنہ خود قرآن سے بلا مدد حدیث تعیین نہیں ہو سکتی کیونکہ قرآن میں صراحۃً نہیں ہے۔ اشارات ہیں اور تعداد رکعات کا اشارہ بھی نہیں اور یوں زمین کا آسمان مان لیا جائے تو اس کو ثبوت بالقرآن نہ کہا جائے گا۔ مثلاً ایک صاحب نے تعداد رکعت کو قرآن کی اس آیت سے ثابت کیا ہے۔

الحمد للّٰہ فاطر السمٰوٰت والارض جاعل الملٰئکۃ رسلاً اولی
اجنحۃ مثنٰی و ثلٰث و رباع

سب تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پر دار بازو ہیں۔

اور کہا ہے کہ اس آیت سے نماز کا دو رکعت اور تین رکعت اور چار رکعت ہونا ثابت ہوتا ہے صاحبو! کہاں فرشتوں کا ذکر کہاں رکعات کی تعداد یہ سب نفس کا زیغ اور کید ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ نفس کا کید ایسی بلا ہے کہ بہت سی اصلاح کرنے سے بھی دفع نہیں ہوتا اور جس نے اصلاح ہی نہیں کی ہو اس کے کید کے دور ہونے یا سرے سے کید نہ ہونے تو کیا امید ہو سکتی ہے اور وہ کید یہ ہے کہ نفس نے دیکھا کہ حدیث وفقہ میں احکام بکثرت ہیں اور ان سب پر عمل ہونا دشوار ہے اس لئے اس نے یہ ترکیب نکالی کہ ان سب کو

چھوڑ و صرف قرآن شریف کو لو۔ اور اپنی مرضی کے موافق تفسیر کر و کہ جس سے کچھ کرنا ہی نہ پڑے میں کہا کرتا ہوں کہ اس زمانے میں احمال کیمیاوی کی بہت ترقی ہوئی کہ دین کا ست نکل آیا۔ صاحبو! جس کو طلب شریعت ہوگی وہ کبھی ایسی ترکیبیں نہیں نکال سکتا۔ دیکھئے جس کو بھوک کی شدت ہوتی ہے وہ زیادہ کا طالب ہوا کرتا ہے نہ یہ کہ موجود کو بھی اڑانے کی فکر کرے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں　　　　بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

نہ اس کے حسن کی کوئی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی۔ مستسقی پیاسا مر جاتا ہے اور دریا اسی طرح باقی رہتا ہے۔

حقیقت میں جب طلب ہوتی ہے تو موجودہ ذخیرے کو سن کر بھی تمنا ہوتی ہے کہ کچھ اور ہوتا اور جب طلب نہیں ہوتی تو سب میں اختصار کیا جاتا ہے یہاں تک تفسیر بالرائے کی جاتی ہے کہ ایک صاحب نے حرمت ربوا ہی کا انکار کر دیا اور کہا کہ کلام مجید میں جو ربوا آیا ہے۔ وہ بضم الرائے ہے جس کے معنی اچک لینے کے ہیں۔ چونکہ اعراب حضورؐ کے زمانے میں نہ تھے بعد میں لگائے گئے۔ اس لئے غلطی ہوگئی اور بکسر الرائے لکھ دیا گیا۔

صاحبو! ربا بضم الرائے عربی کا لغت تو نہیں ہے جس کے معنی اچک لینے کے ہیں۔ پس کیا یہ لفظ فارسی کا قرآن میں داخل کر دیا گیا۔ اور محرفین پر تو زیادہ افسوس نہیں کہ وہ تو اپنے مطلب کے لئے کرتے ہیں۔ مگر افسوس ان پر ہے جو قرآن شریف کو مانتے ہیں اور پھر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب احکام قرآن سے ثابت ہو جائیں۔ سچ ہے۔

دوستی بے خرد چو دشمنی ست　　　　حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

(بے عقل کی دوستی دشمنی ہے حق سبحانہ وتعالیٰ اپنی خدمت (دین) سے بے پراہ ہے)

واللہ اس وقت وہ حالت ہے کہ دین دار اور بے دین سب کی حالت خراب ہے وہ شعر یاد آتا ہے جو کسی نے حضورؐ میں عرض کیا ہے۔

اے بسرا پردہ یثرب بخواب　　　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(اے وہ ذات اقدس جو مدینہ منورہ میں آرام فرما ہے اٹھئے کہ مشرق و مغرب خراب ہو گئے)

موضوع قرآن

ایک صاحب مجھ سے ملے۔ کہنے لگے کہ ڈاکٹری تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ منی میں کچھ

کیڑے ہوتے ہیں مجھے مدت سے خیال تھا کہ قرآن کی کسی آیت سے بھی یہ بات ثابت ہو تو اچھا ہے۔ چنانچہ ایک روز میں قرآن شریف پڑھ رہا تھا اس میں یہ آیت **خلق الانسان من علق** (جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا) اور علق جونک کو کہتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔

بھلا خیال تو فرمایئے کہ آیت کے یہ معنی ہیں؟ کہاں جونک کہاں کیڑے کہاں ڈاکٹری کے مسائل کہاں قرآن شریف۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص فن طب کی کتابوں میں کپڑا بننے کی ترکیب تلاش کرنے لگے یا فن طب میں حدیث ڈھونڈنے لگے۔ چنانچہ ایک صاحب نے ایسا کیا بھی کہ میرے پاس طب اکبر یا میزان الطب لے کر آئے اور کہنے لگے کہ آپ رسم بسم اللہ کو منع لکھتے ہیں حالانکہ اس کتاب میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسینؓ یا حسنؓ کا چار سال چار ماہ چار دن کی عمر میں مکتب کرایا اور لوگوں کو جمع کیا۔

صاحبو! جس فن کی کتاب ہو اس فن کے مسائل اس میں تلاش کرنے چاہئیں تو اب یہ دیکھ لیا جائے کہ قرآن شریف کس فن کی کتاب ہے۔ قرآن جغرافیہ نہیں کہ اس میں جغرافیہ کے مسائل ڈھونڈیئے۔ طب ابدان نہیں کہ بخار کھانسی کی ادویہ اس میں ملیں قرآن شریف طب روحانی ہے اور تہذیب نفس کی کتاب ہے تو جیسے طب ابدان میں زراعت اور صناعی کے مسائل نہ ملیں گے قرآن سے بھی بجز طب روحانی کے دوسرے مسائل کی تلاشی سعی بے حاصل ہے اور اگر کسی دوسری چیز کا ذکر بھی آیا ہے تو وہ کسی بھی روحانی مرض کے دفع کے لئے۔

مثلاً امراض روحانی کے ایک مرض جہل باللہ وبصفاتہ بھی تھا۔ قرآن نے اس کو دفع کیا اور اس ضرورت کے لئے یہ فرمایا کہ۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنہار

تحقیق زمینوں اور آسمان کو پیدا کرنے میں دن اور رات کے بدلنے میں اللہ کی توحید کی نشانیاں ہیں۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کو معلوم کرنے کے لئے مصنوعات میں غور کرو۔ مثلاً آسمان کے وجود میں رات اور دن کے وجود میں مگر نہ اس حیثیت سے کیا آسمان سیال ہے یا نہیں زمین کروی الشکل ہے یا مسطح بلکہ مطلق وجود اور مصنوع ہونے کے اعتبار سے۔ پس قرآن میں ایک مسئلہ بھی سائنس کا بحیثیت سائنس کے مذکور نہیں اور ہم اس

پر فخر کرتے ہیں کیونکہ کسی طب کی کتاب میں جوتے بنانے کی ترکیب نہ ہونا اس کتاب کا کمال ہے۔ مسلمانو! خدا کی قسم یہ قرآن کا غایت درجہ کمال ہے کہ اس میں یہ خرافات نہیں ہیں۔ نہ قرآن کو اس کی ضرورت کہ زبردستی اس میں ان مسائل کو داخل کیا جائے۔

بہ نقاش احتیاج نیست دیوار گلستاں را
(نقاش کو باغ کی دیوار کی ضرورت نہیں)

اگر قرآن میں خرافات ہوتے تو قرآن شریف کتاب الطبیعات ہوتی نہ کہ طب روحانی۔ لہذا قرآن سے کیڑوں وغیرہ کا وجود ثابت کرنے کی کوشش۔

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست
(بے عقل کی دوستی دشمنی ہے)

ہے میں کہتا ہوں کہ اگر علق کے یہی معنی ہیں جو کہ ان ڈاکٹر صاحب نے فرمائے تو کیا وجہ ہے کہ اس کو نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھا نہ ابوبکرؓ سمجھے نہ دوسرے صحابہ اور تابعین نے سمجھا۔ چنانچہ کسی نے یہ تفسیر نہیں کی اگر کہا جائے کہ آج مسئلے کی تحقیق ہوئی ہے اس سے پیشتر یہ محقق نہ تھا تو اس میں اول تو اپنے اسلاف کے کتنے بڑے جہل کا قرار ہے دوسرے اگر کوئی ملحد تم سے کہے کہ تمہارا قرآن نازل ہوا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور پڑھا تمام صحابہ و تابعین نے لیکن سمجھا ہم نے تو تم کیا جواب دو گے اور اگر قرآن ایسا ہی وسیع ہے کہ اس میں ہر چیز کو داخل کیا جا سکتا ہے تو پھر اپنے کو اور اپنے متعلقین کو بھی داخل کر دو۔

جیسے مشہور ہے کہ کسی گاؤں میں تین چودھری تھے ایک کا نام ابراہیم تھا دوسرے کا موسیٰ، تیسرے کا عیسیٰ امام نے نماز میں سبح اسم ربک سورت پڑھی جس کے آخر میں ہے۔ صحف ابراہیم وموسی۔ تو عیسیٰ چودھری خفا ہو گیا امام نے پھر وہی سورت پڑھی اور موسیٰ کے بعد عیسیٰ بھی بڑھا دیا۔

اسی طرح مجھ سے ایک مقام پر ایک ڈاکٹر ملے کہنے لگے کہ جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جس طرح حیوانات میں مذکر اور مونث کا جوڑا ہوتا ہے اسی طرح نباتات کے تخم میں بھی ہوتا ہے کہ تخم کا ایک حصہ نر ہوتا ہے دوسرا مادہ مجھے خیال ہوا کہ قرآن سے بھی یہ بات ثابت ہو تو بہت خوب ہو۔ ڈپٹی صاحب کا ترجمہ دیکھا اس میں بھی نہ ملا۔

آخر ایک روز بیوی سورہ یاسین پڑھ رہی تھی اس میں جو آیت پڑھی۔

سبحن الذی خلق الازواج کلها مما تنبت الارض

وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات زمین کے قبیل میں سے تو فوراً سمجھ میں آ گیا کہ اس آیت میں وہ مسئلہ مذکور ہے۔

صاحبو! یہ خبط نہیں تو کیا ہے اس آیت کو اس مسئلے سے کیا تعلق زوج کے معنی خاص میاں بی بی کے نہیں ہیں بلکہ مطلق جوڑے کے معنی ہیں خواہ وہ مذکر و مونث کے طور پر ہو یا دوسرے طور پر چنانچہ زوجی الخف بولتے ہیں۔ بس حق تعالیٰ نے اس میں یہ فرمایا ہے کہ نباتات میں بھی اقسام مختلفہ ہیں نہ یہ کہ ان میں میاں بی بی ہے۔ غرض بطور مثال کے یہ ایک مسئلہ پیش کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ بہت سے مسائل ہیں جو کہ بالکل تخمینی ہیں اور وہ قرآن سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ان مسائل سائنس پر قرآن شریف کی تفسیر کی بناء کہی جائے اور چند روز کے بعد یہ دعوی سائنس کے کاذب ثابت ہوں تو اس کی کیا تدبیر کی جائے گی کہ ملحدین اس وقت آپ کو کہیں کہ دیکھئے تمہارے محققین اس مسئلے کو قرآن کا مدلول بتلا گئے ہیں اور مسئلہ غلط ثابت ہوا تو قرآن کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔ اس کا کیا جواب دو گے۔

اساس احکام شرعیہ

افسوس ہمارے بھائی مسلمان ذرا غور نہیں کرتے کہ اس کا انجام کیا ہو گا اور بالکل نہیں سمجھتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ سمجھنے کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو تحقیق ہو اس کا تو ان کے پاس سامان نہیں یا علماء کی تقلید ہو اس سے عار آتی ہے اور بڑا لطف یہ ہے کہ قرآن شریف سے ثابت کرنے کی کوشش ہے مگر ثابت کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔

چنانچہ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ ڈاڑھی رکھانے کا وجوب قرآن سے ثابت نہیں تو دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ میں قرآن سے ثابت کرتا ہوں۔ دیکھئے قرآن میں ہے۔

قال یابنئوم لاتاخذ بلحیتی

اے میرے حقیقی بھائی! میرے سر اور ڈاڑھی کو مت پکڑ۔

تو اگر حضرت ہارون علیہ السلام کے ڈاڑھی نہ تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیسے اس کو پکڑ لیا اور ان کو لاتاخذ کہنے کی ضرورت پڑی۔ اس جواب کو سن کر معترض صاحب

خاموش ہو گئے حالانکہ اس جواب سے صرف ڈاڑھی کا وجود معلوم ہوتا ہے وجوب سے اس میں تعرض نہیں اور جب دوسرے وقت ان مستدل صاحب سے ان کے جواب کی حقیقت ظاہر کی گئی تو فرماتے ہیں کہ خیر اس وقت تو معترض کو خاموش ک دیا۔

صاحبو! اہل علم کو تو اس قسم کے جوابوں سے عار آنی چاہئے اور یہ خرابی اس کی ہے کہ اگر چہ نیت خراب نہیں لیکن چونکہ مجیب نے دیکھا کہ ہمارے زمانے کے لوگ بغیر آیت قرآن پیش کئے مانتے نہیں اس لئے سائل کے تابع ہو کر ہر جواب کو قرآن سے ثابت کرنے لگے۔ حالانکہ اس کا کھلا نتیجہ تحریف ہے پس آج ہی سے کیوں تحقیقی جواب نہ دیا جائے اور سائل کی تبعیت چھوڑ دی جائے مثلاً ڈاڑھی رکھانے کے متعلق میں تحقیقی جواب عرض کرتا ہوں لیکن اول یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ جواب بالکل پھیکا اور سیدھا سادہ ہوگا کیونکہ تحقیقی بات ہمیشہ بے مزہ ہوتی ہے۔

دیکھئے غالب اور مومن خاں کے اشعار میں کیا کچھ لطف آتا ہے اور حکیم محمود خاں کے نسخے پر کسی کو وجد نہیں ہوتا۔ غرض وہ تحقیقی جواب یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنے کا وجوب کا ثبوت قرآن سے دینا ہمارے ذمہ نہیں ہے اور درحقیقت یہ سوال کہ قرآن سے ثابت کرو متضمن ایک دعوے کو ہے کہ احکام شرعیہ کا ثابت ہونا قرآن ہی میں منحصر ہے۔ تو اول سائل سے اس دعوے کی دلیل دریافت کی جائے گی۔ جب وہ اس دعویٰ پر دلیل قائم کر دے گا اس وقت ہمارے ذمہ جواب ہوگا۔ اور جب وہ جواب نہ دے سکے گا تو ہم ثابت کریں گے اصول شریعت کے چار ہیں۔

(۱) قرآن شریف (۲) حدیث شریف (۳) اجماع (۴) قیاس

پس جب کسی حکم کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حکم شریعت سے ثابت ہے اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ یہ حکم ان چاروں میں سے کسی ایک سے ثابت ہے ہاں اگر کسی ایک سے بھی ثابت نہ کر سکے تو حکم شرعی کہنا غلط ہوگا۔

اس کی تائید کے لئے میں ایک قانونی نظیر بیان کرتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص نے عدالت میں جا کر کسی دوسرے شخص پر ایک دعویٰ کیا۔ عدالت نے اس سے دعویٰ کے گواہ طلب کئے اور اس نے قانون کے موافق گواہ پیش کر دیئے جن پر کسی قسم کی جرح نہیں ہو سکی۔ کیا اس کے بعد مدعا علیہ کو یہ حق ہے کہ وہ یوں کہہ سکے کہ میں ان گواہوں کی گواہی تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ

اگر صاحب جج خود آ کر گواہی دیں تو میں تسلیم کروں گا اور اگر کوئی مدعا علیہ ایسا کہے تو عدالت اس کو کیا جواب دے گی۔ یہی کہ یا ان گواہوں میں جرح کرو یا دعویٰ تسلیم کرو۔ وجہ اس جواب کی یہ ہے کہ اثبات دعویٰ کے لئے مطلق حجت کی ضرورت ہے۔ حجت خاص کی ضرورت نہیں ہے۔

پس کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں حکم کو قرآن ہی سے مانوں گا۔ حدیث یا اجماع وغیرہ سے تسلیم نہ کروں گا۔ البتہ اگر کسی حدیث یا اجماع میں جرح کرے تو اس کا حق ہے اور علماء اس جرح کا جواب دینے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ہے تحقیقی جواب۔ لیکن ہمارے بھائیوں نے اس طرز کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور بالکل معترضین کے تابع ہو گئے ہیں۔ لیکن کہاں تک ان کے تلووں کے نیچے ہاتھ دیں گے کبھی تو عاجز ہونا پڑے گا۔ بہتر یہ ہے کہ

بروئے خود در طماع باز نتواں کرد

ایسے ہوس ناک لوگوں کا اول ہی علاج کرنا چاہئے خوب سمجھ لو کہ قرآن شریف ہی سے ہر بات کے ثابت کرنے کی کوشش کرنا سخت مشکل میں پڑنا ہے حدیث فقہ سب قرآن ہی کے حکم میں ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ حکیم علوی خاں کے مطب کو لے کر ایک شخص نے جمع کیا اور ہر نسخے کے متعلق ضروری ہدایات لکھ دیں کہ فلاں نسخہ غلبہ صفرا کے لئے ہے اور فلاں نسخہ غلبہ بلغم کے لئے اور دوسرے شخص نے ان سب نسخوں کو بتویب کر دی کہ امراض راس کے نسخے الگ کر دیئے اور امراض چشم کے الگ۔ تو مفسر اور مبوب کو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ حکیم علوی خاں کا مطب نہیں ہے بلکہ یہی کہیں گے عباراتناشتی و حسنک و واحد (ہماری عبادتیں متعدد ہیں اور آپ کا حسن ایک ہے) اور یہ کہا جائے گا۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
می انداز قدت را می شناسم

کہ جو بس چاہے پہن لے میں تو تیرے قد سے تجھے پہچان لیتا ہوں ہاں اس پہچان کے لئے طلب شرط ہے۔ اگر طلب نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ورنہ طالب کو حدیث فقہ سب میں قرآن ہی نظر آئے گا۔

صاحبو! یہ تفریق طلب نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ طاب کی تو یہ شان ہوتی ہے۔

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی
ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

یعنی میری جان فگار اور چشم بیدار میں تو ہی سمایا ہوا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے

تجھی کو گمان کرتا ہوں۔

ایسا شخص حدیث و اجماع کو ہرگز الگ نہ سمجھے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جس طرح محبوب کبھی غیر محبوب کے لباس میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے اسی طرح کبھی غیر مطلوب کے لباس میں آ جاتا ہے تو ان میں تمیز کرنی بھی نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ آج کل یہ مرض عام ہے کہ غیر محبوب کو محبوب سمجھ کر اس پر عاشق ہو گئے ہیں۔

ابتلاء الحاد و بدعات

یہ وہ لوگ ہیں جو اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اس میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ تو گویا ایک جماعت نے اتباع کو ایسا چھوڑا کہ وہ الحاد تک پہنچ گئے۔ دوسرے فرقے نے اس شدت سے اتباع کا دعوے کیا کہ بدعات میں مبتلا ہو گئے۔ یعنی ان کو اپنی رسوم بھی عبادات نظر آنے لگیں اور وہ رسوم اگرچہ جائز بھی ہوں لیکن ان کو عبادت سمجھنا سخت غلطی ہے کیونکہ عبادت وہ ہے جس پر ثواب کا وعدہ ہو اور ان رسوم میں ثواب کا وعدہ کسی حدیث یا آیت میں نہیں ہے۔

غرض اس وقت یہ دو مرض کہ دلائل کو غیر دلائل سمجھنا جو کہ الحاد ہے اور غیر دلائل کو دلائل سمجھنا جو کہ بدعت ہے ہندوستان میں بکثرت ہے امت محمدیہ میں ذی اثر۔

دو فرقے ہیں ایک امراء کا اور ایک عام فقراء کا ان دونوں فرقوں کی حالت نہایت درجہ خراب ہے اور ان فرقوں کی بدولت بہت زیادہ الحاد اور بدعت دنیا میں پھیلا۔ امراء میں الحاد زیادہ پایا جاتا ہے اور فقراء میں بدعت زیادہ پائی جاتی ہے اور اگرچہ ایک تیسرا فرقہ علماء کا بھی ہے لیکن میں نے ان کو اس لئے اضلال سے خارج کیا ہے کہ جہاں تک دیکھا جاتا ہے علماء کا دوسروں پر کم اثر ہے پس ان کی وجہ سے چنداں خرابی نہیں پڑ سکتی۔

اور جن علماء کا کم و بیش اثر ہے تو وہ ان کی بزرگی اور درویشی کے خیال کی وجہ سے ہے۔ صرف عالم ہونے کی وجہ سے علم کا کچھ اثر نہیں۔ بلکہ جو صرف عالم سمجھے جاتے ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ اگر عوام اہل دنیا ان کی توہین نہ کریں تو غنیمت ہے یا اگر کسی عالم کے باوجود بزرگ نہ سمجھے جانے کے عزت اور اثر ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے اعتبار سے ذی جاہ ہوتا ہے اور علی العموم اہل جاہ کی طرف لوگ اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔ کیونکہ کسی بڑے کی عظمت کرنا خود اپنی عظمت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ منتسب

ہونے سے اپنی بڑائی ہوتی ہے۔ غرض صرف عالم ہونے کی وجہ سے کسی عالم کا کچھ اثر نہیں۔ یا فقیری کی وجہ سے یا جاہ کی وجہ سے اور بلفظ دیگر امیری کی وجہ سے۔ ورنہ اگر صرف عالم ہونے کی وجہ سے کسی عالم کا اثر ہوتا تو طلباء کا بھی بہت اثر ہونا چاہیئے تھا کہ وہ بھی تو عالم ہیں اور میں دوسروں کو کیا کہوں گا خود اپنے اندر بھی یہی حالت دیکھتا ہوں کہ طلباء کی زیادہ وقعت نظر میں نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ علماء کی من حیث العلم کچھ وقعت نہیں ہے۔

ایک رئیس صاحب کے ہاں ایک طالب علم کا کھانا مقرر تھا۔ چونکہ اکثر اس کو وہاں انتظار کرنا پڑتا تھا اس لئے اس کو خیال ہوا کہ اتنا وقت بیکار جاتا ہے اس میں اگر کچھ دین ہی کی خدمت ہو تو اچھا ہے۔ رئیس سے کہنے لگا کہ میں یہاں دیر تک بیٹھا رہتا ہوں اگر آپ کا لڑکا کچھ پڑھ ہی لیا کرے تو اچھا ہے۔ رئیس صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے عربی پڑھی تو یہ نتیجہ ہوا کہ میرا دروازہ پر کھانا لینے کے لئے آتے ہیں میرا لڑکا پڑھے گا تو کسی کے دروازہ پر جائے گا۔

اس حکایت سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ علماء کے ساتھ لوگوں کا کیا برتاؤ ہے اور علماء کا کتنا اثر ہے۔ اور اپنی اس حالت کو سن کر علماء کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اب کیا کریں۔ اگر اب بھی ان کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو سخت افسوس ہے۔

مقام علماء

خیر میں بتلاتا ہوں کہ ان کو بالکل استغناء چاہیئے۔ امام غزالی نے لکھا ہے۔

ارى الملوك بادنى الدين قد قنعوا
وما ارا الم رضوانى العيش بالدون
فاستغن بالدين عن دنيا الملوك كما
استغنى الملوك بدنيا هم عن الدين

وہ دنیا کو لے کر تم سے مستغنی ہو گئے۔ تم دین لے کر ان کی دنیا سے مستغنی ہو جاؤ میں خدا کے بھروسے پر کہتا ہوں کہ اگر اہل علم اہل دنیا سے مستغنی ہو جائیں۔

تو خداتعالیٰ ان کی غیب سے مدد کریں۔ بلکہ خود یہی اہل دنیا جو آج ان کو ذلیل سمجھتے ہیں اس وقت ان کو معزز سمجھنے لگیں گے اور ان کے محتاج ہوں گے۔ کیونکہ ہر مسلمان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے جس طرح اپنی ضروریت کے لئے کم و بیش دنیا کی ضرورت ہے

دین کی اس سے زیادہ ضرورت ہے خواہ وہ عالم ہو یا جاہل' رئیس ہو یا غریب۔ اور یہ ظاہر ہے کہ علماء کے پاس بقدر ضرورت دنیا موجود ہے اور اہل دنیا کے پاس دین کچھ بھی نہیں۔ تو ان کو ہر امر میں موت میں حیات میں نماز میں روزے میں سب میں علماء کی احتیاج ہوگی۔ اور اگر کوئی کہے کہ مجھے دین کی ضرورت ہی نہیں تو وہ مسلمان ہی نہیں۔ غرض ایک وقت ایسا آئے گا کہ اہل دنیا خود علماء کے پاس آئیں گے۔ پس علماء کو بالکل استغناء چاہئے اور خدا تعالیٰ کے دین میں مشغول ہونا چاہئے۔

ہم لوگوں میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کرتے اگر خدا تعالیٰ سے ہم کو تعلق ہو تو کسی کی بھی پروانہ رہے۔ البتہ میں علماء کو بداخلاقی کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ بعضے استغنا بداخلاقی کو سمجھتے ہیں۔

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ امراء کی بہت خاطر داری کرتے تھے اور وجہ اس کی یہ فرماتے تھے کہ نعم الامیر علی باب الفقیر۔ یعنی جو امیر فقیر کے دروازے پر جائے وہ بہت اچھا ہے۔ پس جب کوئی امیر آپ کے دروازے پر آیا تو اس میں امارت کے ساتھ ایک دوسری صفت بھی پیدا ہوگی یعنی نعم کی پس اس صفت کی عظمت کرنی چاہئے۔ لہذا بداخلاقی کی اجازت نہیں۔ ہاں استغناء ضروری ہے۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔

اصل مقصود اس مقام پر یہ تھا کہ علماء کی وقعت اور ان کا کچھ اثر نہیں کیونکہ جس کو دیکھئے علماء پر اعتراض کرنے اور ان کو مشورہ دینے پر آمادہ ہے ایک صاحب ایک مرتبہ علماء پر نہایت برہم اور علماء کو برا بھلا کہہ رہے تھے کچھ دیر تک تو بوجہ اس کے کہ وہ مہمان تھے میں نے صبر کیا۔ آخر جب وہ حد سے بہت ہی آگے نکل گئے تو میں نے پوچھا کہ علماء نے کیا قصور کیا۔ کون سی ایسی خطا ان سے ہوئی۔ کہنے لگے کہ علماء انگریزی پڑھنے کو منع کرتے ہیں اور قوم کے تنزل کے سبب یہ ہیں۔ حالانکہ انگریزی کی بہت ضرورت ہے میں نے کہا کہ اول تو یہ افتراء محض ہے علماء ہرگز انگریزی پڑھنے سے منع نہیں کرتے۔ دوسرے قطع نظر انگریزی کے جواز اور عدم جواز کے آپ یہ بتلایئے کہ علماء کی ممانعت کا کچھ اثر ہے۔ اگر کہیے کہ اثر ہے تو میں کہوں گا کہ کیا وجہ علماء کے اثر نے قوم کے بچوں کو عربی پڑھنے پر کیوں نہ لگا دیا۔ جب علماء ایسا نہیں کر سکے تو معلوم ہوا

کہ علماء کا کچھ اثر قوم پر نہیں اور جب اثر نہیں تو علماء سے کچھ نقصان قوم کو نہیں پہنچا۔

اسباب تنزل

اصل سبب قوم کے تنزل کا کوئی دوسرا امر ہے وہ یہ ہے کہ قوم علی العموم ست کام چور آرام طلب ہے جفاکشی تو ہو نہیں سکتی اپنے چھٹکارے کے لئے مولویوں کے فتوی کو آڑ بنایا۔ صاحبو! کیا وجہ کہ تمام فتاوی میں سے علماء کا صرف یہی ایک فتوی پسند ہوا کبھی دوسرے فتووں پر عمل نہ کیا گیا وجہ یہی ہے کہ یہ اپنی مرضی اور نفس کے موافق تھا۔

ایک شخص سے کسی نے پوچھا تھا کہ قرآن کا کون سا حکم تم کو زیادہ پسند ہے۔ کہنے لگا کہ کلوا واشربوا اور دعا کو پوچھا تو یہ بتلائی۔

ربنا انزل علینا مآئدۃً من السمآء

اے پروردگار! ہم پر آسمان سے دسترخوان پر از نان نازل فرما۔

کیا کوئی شخص اس کو عامل بالقرآن سمجھے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ تابع نفس و ہوا کہیں گے بس یہی حال آج کل علماء کی پیروی اور ان کے اتباع کا ہے کہ جس بات کو اپنی مرضی کے موافق دیکھتے ہیں اس میں علماء کو آڑ بنا لیتے ہیں۔

اس جملہ تقریر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اثر جو کچھ ہے امراء اور فقراء کا ہے اور جو کچھ خرابیاں پھیلیں انہی دو فرقوں کی وجہ سے پھیلیں۔ پہلا فرقہ الحاد میں مبتلا ہے دوسرا فرقہ بدعات میں غرق ہے۔ پس اس امت کے مریضوں کا کیا حال ہوگا۔ جس کے اطباء خود مریض ہیں۔

نیز علماء کے اس زمرہ سے خارج ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اگر خود بگڑیں بھی اور اعمال کو ترک بھی کردیں تو وہ اپنے کو گنہگار سمجھتے ہیں اور اپنے برے اعمال کی طرف کسی کو دعوت نہیں کرتے اور لوگوں کو اپنے اس طرز پر چلانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو نیک ہی راستہ بتلادیں گے برخلاف امراء اور فقراء کے کہ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جس راستہ پر ہم ہیں دوسرے بھی اسی پر ہولیں اگرچہ ہم اور وہ دونوں جہنم کے غار میں جا گریں۔

چنانچہ چند روز ہوئے کہ ایک روشن خیال نے یہ مضمون شائع کیا تھا کہ اسلام کی ترقی کو سب سے بڑی مانع نماز ہے۔ اگر علماء مل کر نماز کو اسلام سے خارج کردیں تو اسلام کو بہت ترقی ہو۔

ہاں اتنا ضرور ہوا کہ بعض عالموں نے اپنا طرزِ عمل ایسا کر دیا کہ دنیا کو ان کی بدولت خود علم سے نفرت ہوگئی۔ یعنی علماء نے امراء سے ملنا اور اختلاط کرنا اس قدر بڑھا دیا اور اس اختلاط کی وجہ سے ان امراء کی ہاں میں ہاں ملانے لگے کہ ان کو دیکھ کر اہلِ دنیا نے یہ سمجھا کہ سب عالم ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

ٹونک کا واقعہ ہے کہ ایک رئیس نے ڈاڑھی منڈا رکھی تھی۔ ایک عالم نے ان پر اعتراض کیا اور وہ رئیس متاثر بھی ہوئے۔ اتفاق سے مجمع میں ایک دوسرے صاحب بھی بیٹھے تھے اور یہ مولوی کہلاتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ڈاڑھی ہرگز نہ رکھنی چاہئے کیونکہ اس میں جوئیں پڑ جاتی ہیں اور وہ زنا کرتی ہیں۔ فرمایئے اس رئیس کی نظر میں کیا وقعت اس عالم کی رہی ہوگی۔ اور زیادہ سبب ان صفات کا کمی خاندان ہوتا ہے۔

ایک شخص نے ڈھاکہ میں مجھ سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ انگریزی خوان طالب علم نہایت باہمت، عالی حوصلہ، جری جفاکش ہوتے ہیں اور عربی خواں طالب علم نہایت پست ہمت، تنگ خیال، سست، کم حوصلہ ہوتے ہیں۔ مقصود ان کا یہ تھا کہ یہ فرق عربی اور انگریزی کے اثر سے ہے۔ یعنی پست ہمتی وغیرہ عربی کے آثار ہیں اور علو حوصلگی وغیرہ انگریزی کے آثار ہیں۔ میں نے کہا جناب علو حوصلگی وغیرہ صفات جس قدر ہیں علو خاندان پر موقوف ہیں یعنی جو عالی خاندان ہوگا اس میں یہ صفات ہوں گے۔ وہ خواہ عربی پڑھے یا انگریزی اور جو عالی خاندان نہ ہوگا اس میں یہ صفات نہ ہوں گی اگرچہ وہ انگریزی اعلیٰ پایہ کی ڈگری حاصل کرے بلکہ اکثر واقعات اور مشاہدات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پست خاندان آدمی اگر عربی پڑھ لیں تو کم وبیش ان کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں اور اگر انگریزی پڑھیں تو بالکل ہی برباد ہو جائیں۔ عربی و انگریزی کے آثار کا پورا مقابلہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ ایک خاندان کا ایک طبیعت کے دو بچے لئے جائیں۔ ایک کو انگریزی شروع کرائی جائے دوسرے کو عربی اور دس برس کے بعد دونوں کا موازنہ کیا جائے اور جب کہ خوش قسمتی سے انتخاب ہی ایسا پاکیزہ ہو کہ عربی کے لئے جولاہے تیلی اور انگریزی کے لئے شرفاء تو عربی کہاں تک اپنا اثر کرے اور کس حد تک ان کی پستی کو مٹائے اور اگر شرفاء میں سے کوئی بچہ عربی کے لئے دیا بھی جاتا ہے تو ایسا کہ جو کہ بالکل ہی کودن ہو۔ تو جب عربی میں سارے

کو دن ہی کو دن منتخب ہوں گے تو پھر ان سے علو حوصلگی کی کیا امید ہو گی اور میں نے ان سے کہا کہ آپ میرے ہمراہ چلئے تو میں آپ کو دکھلاؤں کہ علماء ایسے ہوتے ہیں۔

غرض ایسے علماء سے ایک ضرر یہ پہنچ سکتا ہے اور میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس پر بھی کسی کو کمال حاصل ہو تو وہ اس دنائت وخست سے ضرور دور ہو گا۔ سو ایسے لوگوں کو جب غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ لوگ عالم ہی نہیں ہیں کیونکہ علم کمال ہے اور کمال خاصہ ہے استغناء دیکھئے بڑھئی راج لوہار جب اپنے فن میں کامل ہو جاتے ہیں تو کیسے مستغنی ہو جاتے ہیں۔ تو کیا علم ان ذلیل کاموں کے برابر بھی اثر نہیں رکھتا۔ ضرور رکھتا ہے اور بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ جس میں استغناء نہیں اس کے کمال ہی میں کمی ہے۔

علامہ تفتازانی کا واقعہ لکھا ہے کہ جب امیر تیمور کے دربار میں آئے تو امیر تیمور بوجہ لنگ ہونے کے پیر پھیلائے بیٹھا تھا۔ آپ نے بھی بیٹھ کر پیر پھیلا دیا امیر تیمور کو ناگوار ہوا اور کہا کہ ''معذورم دارمرا لنگ است'' (میں معذور ہوں کہ یہ میرے پاؤں میں لنگ ہے) علامہ فرماتے ہیں کہ ''معذورم دارکہ مرا ننگ است'' (میں معذور ہوں کہ یہ میرے لئے باعث ننگ ہے)

صاحبو! یہ ہے علم کا خاصہ۔ جن لوگوں کو آپ عالم کہتے ہیں یہ واعظ ہیں۔ جنہوں نے چند اردو فارسی کے رسالے یاد کر لئے ہیں۔ ان کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی یہ لوگ اپنے کو علماء کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں اور جہل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک واعظ صاحب نے سورۃ کوثر کا وعظ کیا اور ترجمہ پہلی آیت کا یہ کیا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھ کو کوثر کے مثل دیا۔ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ کاف تو اعطین کا مفعول ہے پھر مثل کس لفظ کا ترجمہ ہے۔

اسی طرح ایک واعظ گنگوہ میں آیا اور وعظ کہا۔ جب جنت دوزخ کا تذکرہ آتا تو بجائے جہنم کے جہذم کہتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ظالم نے کہیں لکھا بھی نہیں دیکھا صرف کسی کی زبان سے سن لیا ہو گا۔

اس سے بھی زیادہ پر لطف یہ واقعہ ہے کہ سہارنپور میں ایک واعظ آیا۔ جمعہ کی نماز کے بعد آپ نے پوچھ کہ ساہبو (صاحبو) یہاں اواج (وعظ) بھی ہوا کرے ہے۔ معلوم ہوا نہیں ہوتا۔ آپ نے پکار دیا بھائیو اواج (وعظ) ہو گی۔ لوگ ٹھہر گئے منبر پر پہنچ کر یسین شریف کی غلط سلط آیتیں پڑھیں اور غلط سلط ترجمہ کر کے دعا مانگ کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی عالم نابینا موجود تھے۔ انہوں نے اس کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری تحصیل کہاں تک ہے تو آپ کیا فرماتے ہیں ہماری تسیل

ہے ہاپوڑ۔ پھر انہوں نے صاف کر کے پوچھا کہ تم نے پڑھا کیا ہے تو آپ فرماتے ہیں ہم نے سب کچھ پڑھا۔ نور نامہ، ساپن نامہ، دائی حلیمہ کا قصہ، معجزہ آل نبیؐ اور تو کیا جانے اندھے۔

یہ نمونہ ہے واعظ صاحب کی لیاقت کا لیکن پھر بھی ان لوگوں سے اتنا ضرر نہیں ہوتا کیونکہ دیکھنے والے اور سننے والے ان کے اس ظاہر جہل کے سبب پہلے ہی معتقد نہیں ہوتے۔ البتہ ان لوگوں سے گہرا ضرر پہنچتا ہے جن کے زرق برق تقریریں مہذب الفاظ شستہ بندشیں مسلسل بیان معلوم ہوتا ہے کہ غزالی وقت خطبہ دے رہے ہیں یا رازی زماں بول رہے ہیں مگر علم دیکھیے تو ہدایت النحو بھی شاید نہ پڑھی ہو یہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تباہ کیا خود ڈوبے اور دوسروں کو بھی لے ڈوبے غرض حقیقی علماء پر کسی قسم کا الزام اس بارے میں نہیں آ سکتا۔

رفع اختلاف کی صورت

ایک شبہ شاید کسی کو پیدا ہو علماء میں چونکہ آپس میں اختلاف ہے اس اختلاف کی وجہ سے لوگ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ میں کہوں گا اگر اختلاف کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوئے تو اس میں بھی انہیں کا قصور ہے۔ اس لئے کہ اختلاف صرف طبقہ علماء میں منحصر نہیں دنیا میں شاید کوئی جماعت، کوئی طبقہ ایسا ہو جس کے افراد متفق اللسان ہوں مثلاً فن طب، ڈاکٹری، صناعی، تجارت غرض جس قدر بھی دنیا میں فنون ہیں۔ سب میں اختلاف ہے۔ پس اگر کسی طبقے کا اختلاف عوام کے لئے ضرر رساں ہو سکتا ہے تو اطباء اور ڈاکٹروں کا اختلاف پھر یہ اختلاف کیوں ان کے لئے مہلک نہیں ہوا وہاں کون سی تدبیر انہوں نے کی جس کی بدولت حکیم عبدالمجید اور حکیم عبدالعزیز کے اختلافات کے ضرر سے محفوظ رہے۔

تدبیر یہ کی کہ دونوں کو کسی معیار پر جانچ کر جس کو زیادہ کامل سمجھا اس کا ہاتھ پکڑ لیا دوسرے کو چھوڑ دیا۔ صاحبو! کیا مستعار زندگی اور چند روزہ آرام کے لئے تو اس تدبیر کی ضرورت ہے اور حیات دائمی کے لئے اس تدبیر کی ضرورت نہیں اگر نہیں معلوم ہوتی تو حیف ہے اس اسلام پر اگر ضرورت ہے تو کیوں اس تدبیر پر عمل نہیں کیا جاتا اور اختلاف کی ضرورت سے کیوں نہیں بچا جاتا۔ اور جس طرح انتخاب اطباء کے لئے مثلاً یہ معیار ہو گا کہ اس نے کسی بڑی جگہ پڑھا ہو سند حاصل کی ہو اس کے ہاتھ سے اکثر مریض اچھے ہوتے ہیں۔ اس میں حرص و طمع نہ ہو بندہ دنیا نہ ہو۔ مریضوں پر شفقت ہو تشخیص مرض میں پوری مہارت ہو۔ اسی

طرح علماء میں بھی انتخاب اسی معیار سے ہوگا کہ جس کے ہاتھ سے اکثر لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے۔ طالبین پر شفقت کرتا ہو' خود دنیا سے نفور ہو' گناہوں سے بچتا ہو' کسی بزرگ کی صحبت میں رہا ہو' اس پر خشیت الٰہی غالب ہو۔ پس اس کے کہنے پر عمل کرو۔ کیونکہ یہ تم کو جو کچھ بھی بتلائے گا اس میں خدا کا خوف کرے گا۔ اور گڑ بڑ کچھ کا کچھ نہ بتلائے گا لیکن دوسروں کو بھی برا نہ کہو۔ بہر حال یہ خدشہ بھی جاتا رہا کہ علماء کے اختلاف سے لوگ گمراہ ہوئے۔

اب صرف دو فرقے ایسے رہ گئے کہ جن کی وجہ سے زیادہ تر گمراہی پھیلی ایک امراء دوسرے فقراء کہ ان میں اکثر گمراہ کن اور گمراہ ہیں۔ (الا ماشاء اللہ) بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کو ابراہیم ادھم کہنا چاہئے اور جنید بغدادی۔

حضرت جنیدؒ کی یہ حالت تھی کہ ایک شخص آپ کا امتحان کرنے آیا اور دس برس تک آپ کے پاس رہا مگر معتقد نہ ہوا ایک روز کہنے لگا کہ میں نے آپ کی بزرگی کی شہرت سنی تھی۔ لیکن میں دس برس سے آپ کے پاس ہوں۔ اس مدت میں میں نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے اس مدت میں جنید کو کسی گناہ صغیرہ یا کبیرہ میں مبتلا دیکھا؟ اس نے جواب دیا کہ گناہ تو کوئی نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ جنید کی یہ کچھ چھوٹی کرامت ہے کہ دس برس تک اس سے خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

علی ہذا ایک دوسرا واقعہ ان کا مشہور ہے کہ ان کے زمانے میں چند مدعیان تصوف کا یہ قول آپ کے پاس پہنچا کہ وہ کہتے ہیں۔ **نحن وصلنا ولا حاجة لنا الی صیام والصلوة** (ہم اب واصل ہو گئے ہمیں نماز روزہ کی ضرورت نہیں) آپ نے سن کر فرمایا۔ **صدقوا فی الوصول ولکن الی سقر** (انہوں نے سچ کہا کہ واصل ہو گئے لیکن دوزخ میں) اور پھر فرمایا کہ اگر میں ہزار برس زندہ رہوں تو نفل عبادت بھی بدوں عذر شرعی ترک نہ کروں۔

تو فقراء میں بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ جنید بغدادی کے مثل ہیں اور امراء میں بھی بعض حضرات ابراہیم بن ادھم کی طرح ہیں لیکن کثرت سے ایسے ہی ہیں جن سے الحاد اور بدعت کا زور ہے ایک جماعت کو تو مثالوں میں بیان کر چکا ہوں۔ دوسری اہل بدعت کی وہ جماعت ہے۔ جو ہم لوگوں کو وہابی کہتی ہے لیکن ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ہم کو کس مناسبت سے وہابی کہا گیا ہے کیونکہ وہابی وہ لوگ ہیں جو کہ ابن عبدالوہاب کی اولاد میں ہیں۔

یا اس کے متبع ہیں۔ ابن عبدالوہاب کے حالات مدون ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ نہ اتباع کی رو سے ہمارے بزرگوں میں ہیں نہ نسبت کی رو سے۔ البتہ آج کل جن لوگوں نے تقلید کو ترک کر دیا ہے ان کو ایک اعتبار سے وہابی کہنا درست ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے اکثر خیالات ابن عبدالوہاب سے ملتے جلتے ہیں۔ البتہ ہم لوگوں کو حنفی کہنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے اصول چار ہیں۔ کتاب اللہ، حدیث رسول، اجماع امت، قیاس مجتہدان چار کے سواء اور کوئی اصل نہیں اور مجتہد اگرچہ متعدد ہیں لیکن اجماع امت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ اربعہ (یعنی امام ابوحنیفہؒ۔ امام شافعی امام احمد بن حنبل۔ امام مالک بن انس) کے مذہب کے باہر ہونا جائز نہیں نیز یہ بھی ثابت ہے کہ ان چاروں میں سے جس ملک میں جس کا مذہب رائج ہو اس کا اتباع کرنا چاہیئے۔ تو چونکہ ہندوستان میں امام ابوحنیفہؒ کا مذہب رائج ہے اس لئے ہم انہیں کا اتباع کرتے ہیں ہم لوگ وہابی کے لقب سے برا نہیں مانتے لیکن اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ قیامت میں اس بہتان کی باز پرس ضرور ہوگی۔

میں بدعت کی جزئیات بھی بتلاتا لیکن اول تو ان کو علماء نے پوری طرح رسائل کے ذریعے سے بتلا دیا ہے۔ دوسرے وقت میں بھی گنجائش نہیں۔ البتہ ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بات قرآن حدیث اجماع قیاس چاروں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو اور اس کو دین سمجھ کر کیا جائے وہ بدعت ہے۔ اس پہچان کے بعد دیکھ لیجئے ہمارے بھائیوں کے جو اعمال ہیں۔ مثلاً عرس کرنا فاتحہ دلانا تخصیص اور تعیین کی ضروری سمجھ کر ایصال ثواب کرنا وغیرہ وغیرہ جتنے اعمال ہیں کسی اصل سے ثابت نہیں اور ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے یا نہیں اور اگرچہ خواص کا عقیدہ ان مسائل میں خراب نہیں۔ لیکن یہ فقہ حنفیہ کا مسئلہ ہے کہ خواص کے جس مستحسن امر سے جب کہ وہ مطلوب عندالشرع نہ ہو عوام میں خرابی پھیلے خواص کو چاہئے کہ اس امر کو ترک کر دیں۔ ہاں اگر وہ امر مطلوب عندالشرع ہو اور اس میں کچھ منکرات مل گئے ہوں تو منکرات کو مٹانے کی کوشش کریں گے اور اس امر کو نہ چھوڑیں گے۔ مثلاً اگر جنازے کے ساتھ منکرات بھی ہوں تو مشایعت جنازہ کو ترک نہ کریں گے۔ کیونکہ مشایعت جنازہ کی مطلوب عندالشرع ہے۔

پس ایصال ثواب دو امر ہیں۔ ایک تعیین وقت دوسرا ایصال ثواب اور ان میں سے

تعین مطلوب عند الشرع نہیں اگر چہ مباح ہے اور چونکہ تعین سے عوام میں خرابی پھیلتی ہے اس لئے ہم تعیین کو ترک کر دیں گے۔ البتہ اگر ساری امت کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ تعیین کو ضروری نہ سمجھے تو ہم خواص کو بلکہ سب کو تعیین کی اجازت دے دیں گے۔ لیکن حالت موجودہ میں (جبکہ اکثروں کا یہ خیال ہے کہ خاص تاریخوں میں ثواب پہنچنے سے زیادہ قبولیت ہوتی ہے اور خلاف شریعت ہے کیسے اجازت دے دی جائے۔

ایک شخص نے مجھ سے کہا گیارہویں اٹھارہ تاریخ تک ہو سکتی ہے پھر نہیں ہو سکتی۔ ایک وعظ میں میں نے ان رسوم کا بیان کیا۔ بعد وعظ کے ایک صاحب کہنے لگے کہ علماء کو ایسے مضامین بیان نہ کرنا چاہئیں کہ تفریق امت ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا بیان کرنا تو آپ کے عمل کرنے پر موقوف ہے جیسے لوگوں کے اعمال اور حالات ہوں گے ویسے ہم بیان کریں گے۔ اگر لوگ ان اعمال کو چھوڑ دیں تو ہم بھی اس قسم کے بیان کو چھوڑ دیں گے۔ تو تفریق کے الزام ان اعمال کے ارتکاب کرنے والوں پر ہے نہ کہ ہم پر۔ غرض یہ امور مطلوب عند الشرع نہیں اور ان سے خرابیاں بہت کچھ پھیل رہی ہیں۔ اس لئے ان کو ترک کر دینا چاہئے۔

ایصال ثواب کی صورت

ایک تو تخصیص اور تعیین قابل ترک ہے دوسرے جو ہیئت ایصال ثواب کی اختراع کر رکھی ہے وہ قابل ترک ہے۔ مجھ سے ایک دیہاتی کہنے لگا کہ اگر ایصال ثواب کے وقت کھانے پر چند سورتیں پڑھ لی جائیں تو حرج ہی کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جس مصلحت سے کھانے پر سورتیں پڑھی جاتی ہیں کبھی روپے پر یا کپڑے پر کیوں نہیں پڑھی جاتیں اور ایک نیت میں اصلاح کرنی ضروری ہے کیونکہ اکثر نیت یہ ہوتی ہے کہ ہم ان کو ثواب پہنچائیں گے تو ان سے ہمارے دنیا کے کام نکلیں گے۔

تو صاحبو! قطع نظر فساد اعتقاد کے اس کی ایسی مثال ہے کہ آپ کسی شخص کے پاس ہدیۃً مٹھائی لے جائیں اور پیش کرنے کے بعد اس شخص سے کہیں کہ آپ میرے مقدمے میں گواہی دے دیں۔ اندازہ کیجئے کہ یہ شخص کس قدر کبیدہ ہو گا اور اس سے اس کی کیسی اذیت ہو گی۔ پس جب اہل دنیا کو اذیت ہوتی ہے تو اہل اللہ کو تو اس سے زیادہ اذیت ہو گی پھر خصوصاً

وفات کے بعد کیونکہ وفات کے بعد لطافت زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ قفس عنصری ٹوٹ جاتا ہے اور صرف روح ہی روح رہ جاتی ہے اور اس کا ادراک کامل ہو جاتا ہے۔ پس جس وقت ان کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ ہدیہ اس غرض سے پیش کیا گیا ہے کس قدر ناگواری ہوتی ہوگی۔ اس کے ماسوا کس قدر شرم کی بات ہے کہ اہل اللہ سے دنیا کے لئے تعلق اور محبت ہو۔

صاحبو! ان کے پاس دنیا کہاں ہے۔ ان سے دنیا کی امید رکھنا بالکل ایسی بات ہے جیسے کسی سنار سے کھرپا بنانے کی امید رکھنا یا کسی حکیم سے یہ فرمائش کرنا کہ تم چل کر ہمارے گھر کی گھاس کھود دو۔

صاحبو! ہم کو حضرت سیدنا غوث الاعظم سے جو محبت ہے تو اس لئے کہ انہوں نے ہم کو راہ ہدایت دکھلائی۔ اس کے مکافات میں ہم ان کو کچھ ثواب بخش دیں کہ ان کی روح خوش ہو اور اس کے خوش ہونے سے خدا تعالیٰ خوش ہوں۔ اور اس تقریر سے یہ بھی معدوم ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے بلکہ اس کی اصلاح کرتے ہیں اور جس دن اصلاح عام ہو جائے گی اس دن ہم یہ بھی نہ کہیں گے۔ مگر جب تک اصلاح نہ ہو اس وقت ہم ضرور لا یجوز (ناجائز) کہتے رہیں گے۔ رہی بدنامی سو بحمد اللہ اشاعت دین میں ہم کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہمارا وہ مذہب ہے۔

اقیا برخیز و درده جام را　　خاک برسر کن غم ایام را
گرچہ بدنامیست نزد عاقلاں　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

اگرچہ عقلاء ظاہر کے نزدیک ہماری حالت بظاہر ایسی ہے جس سے بدنامی ہوتی ہے مگر ہم ایسی نیک نامی نہیں چاہتے جس سے محبوب سے تعلق نہ ہو۔

غرض مقصود اس بیان سے حق کو ظاہر کرنا ہے اعتدال کے ساتھ اور اس کلیہ کو اگر آپ یاد رکھیں گے تو بہت سے اعمال میں آپ کو حد جواز و عدم جواز معلوم ہو جائے گی۔ یہ تو اعتقاد متعلق تھا۔

اکرام مسلم

ایک فرقہ مسلمانوں میں ایسا بھی ہے کہ اس کے عقائد و اعمال سب درست ہیں مگر یہ فرقہ اپنے تقدس پر مغرور اور نہایت متکبر ہے اور دوسرے مسلمانوں کو ذلیل و حقیر سمجھتا ہے۔ صاحبو خوب سمجھ لو۔

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را در سنگلاخ بادیہ پے بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ زندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل ہو کر نہ چل اس لئے مردان راہ کے گھوڑے سخت جنگل میں چلنے سے عاجز رہے ہیں ناامید بھی مت ہو اس لئے کہ رند شرابی اچانک ایک نالہ سے منزل پر پہنچ جاتے ہیں) اور

تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

اور صاحبو! تکبر کس پر کیجئے۔ جو لوگ گناہ گار ہیں ان کو بھی برا اور ذلیل نہیں سمجھ سکتے۔ کسی کا قول ہے۔

گناہ آئینہ عفو و رحمت ست اے شیخ مبیں بچشم حقارت گناہگاراں را

اے شیخ! گناہ (جس کے بعد توبہ نصیب ہو جائے۔ عفو و رحمت کا آئینہ ہے کیونکہ اگر گناہ نہ ہوتے تو توبہ کس چیز سے ہوتی۔ لہذا گناہ گاروں کو چشم حقارت سے مت دیکھو۔

جن کو تم گناہ گار سمجھتے ہو ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ اعتقادی گمراہی میں مبتلا ہیں مگر ان کو کچھ بھی گناہ نہیں۔ کیونکہ

جس نے بغیر علم کے فتوی دیا اس کا گنہ مفتی پر ہوگا۔

تو بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کو کچھ خبر بھی نہیں۔ اس کے ماسوا وہ شخص کس منہ سے دعویٰ کر سکتا ہے جو دوسرے مسلمانوں کو ذلیل سمجھے اور ان پر طعن کرے حدیث کا مضمون ہے جس کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے ترجمہ کیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

(تمام انسان بدن کے ایک حصہ کے اعضاء کی مانند ہیں)

تو گویا تمام مسلمان مثل یک تن کے ہیں اور جب یہ حالت ہے تو آپ کو مسلمانوں کے جہنم میں جانے سے صدمہ اور رنج ہونا چاہئے اور ان کے بچانے کی تدابیر میں لگنا چاہئے۔ ہم کو گنہگار مسلمانوں کے ساتھ وہی دل سوزی ہونی چاہئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تھی۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور زنا کرنے کی اجازت چاہی۔ صحابہ کرامؓ نے سن کر اس کو ڈانٹنا چاہا حضورؐ نے منع فرمایا اور نہایت اطمینان سے فرمایا کہ کیا تو اپنی ماں کے ساتھ ایسا کیا جانا پسند کرتا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا بہن کے ساتھ کیا نہیں فرمایا

بس جس سے تم ایسا فعل کرو گے وہ بھی کسی کی بہن ہوگی۔ آنچہ برخود مپسندی بردیگراں مپسند بس (جو تم اپنے لئے ناپسند کرتے ہو دوسروں کیلئے کیوں پسند کرتے ہو) وہ سمجھ گیا۔

سبحان اللہ! حضورؐ کے پاکیزہ اخلاق اور تربیت کی یہ حالت تھی اور کیوں نہ ہوتی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مخالفین اور کفار تک کی خاطر داری فرماتے تھے کفار آپ کو ستاتے اور فرشتے جبال آ کر عرض کرتا کہ اگر اجازت ہو تو ان سب کو پہاڑوں سے ہلاک کر دوں۔ آپ فرماتے کہ دعوتی وقومی تو جب حضورؐ کو کفار تک کی خاطر منظور تھی تو ہم میں آج کونسی بڑائی پیدا ہوگئی ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو ذلیل سمجھیں اور ان سے تکبر سے پیش آئیں۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ

ترا کے میسر شود ایں مقام کہ بادوستانت خلاف ست وجنگ

اور جب تم دوستوں سے لڑتے اور ان کو حقیر سمجھتے ہو تو کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہو۔ نیز یہ امور خدا شناسی کے بھی مخالف ہیں حضرت بہلول کی حکایت ہے۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوئے جو بگذشت برعارف جنگ جو

گر ایں مدعی دوست بشناختے بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

حضرت بہلول مبارک قدم نے کیا خوب فرمایا۔ جبکہ ان کا گزر ایک (ظاہری) عارف پر ہوا جو جھگڑا کر رہا تھا آپ نے فرمایا کہ اگر اس کو دوست کی معرفت حاصل ہوتی تو اس کو دشمن کی طرف توجہ کی فرصت ہی کب ہوتی۔

نجات کی صورت

صاحبو! کیا بھروسہ ہے کہ شام تک ہماری کیا حالت ہوگی اور چار دن کے بعد ہم کیا ہوں گے۔ اگر قبر میں ایمان ساتھ گیا تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ تو جب ہم کو اپنی حالت پر اطمینان نہیں موجودہ حالت کے اعتبار سے بھی کہ اس میں صدہا نقص ہیں اور آئندہ کے اعتبار سے بھی کہ زیادہ بگڑ جانے کا اندیشہ ہے تو سخت جہل کی بات ہے کہ ہم دوسروں پر ہنسیں اور ان کو ذلت کی نظر سے دیکھیں۔ بڑا پاگل ہے وہ شخص کہ اس پر بیسیوں فوجداری کے مقدمات قائم ہیں۔ اور وہ دوسرے دیوانی کے مقدمات والوں کو ذلیل سمجھتا اور برا بھلا کہتا پھرتا ہے۔

تو اس وجہ سے اس فرقے کو خصوصاً میں کہتا ہوں کہ اگر چہ تمہارے اعتقادات درست ہیں اور بظاہر اعمال بھی خراب نہیں معلوم ہوتے لیکن تم اپنی اندرونی حالت میں غور کرو اور اندرونی حالت کو اچھا نہ سمجھو۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مدار صرف عقائد پر ہے۔ اگر عقائد درست کر لئے تو پھر نجات ہے مگر یہ بالکل غلط ہے یہ صحیح ہے کہ عقائد درست ہونے سے کبھی نہ کبھی نجات ہو جائے گی لیکن محض عقائد پر نجات تام کا مدار سمجھنا غلط ہے۔ بعضے لوگوں کا خیال ہے کہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرنا کافی ہے اگر حضورؐ سے محبت ہو نہ سوال جواب ہوگا نہ حساب کتاب ہوگا۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کا ظاہر درست ہے مگر دل مثل بھیڑیئے کے نہایت سخت ہے۔ ایک بزرگ ایسے لوگوں کی شان میں کہتے ہیں۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل　　　واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　　وز درونت ننگ می دارد یزید

یعنی ظاہری حالت ان کی ایسی ہے جیسے کافر کی قبر مزین ہوتی ہے اور اس کے اندر خدا تعالیٰ کا قہر و غضب نازل ہوتا ہے۔ ظاہری حالت بایزید جیسی ہے اور باطن یزید کو بھی شرماتا ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کو چاہیے کہ باطن کی بھی فکر کریں جس کا طریق یہ ہے کہ۔

قال را بگذار مرد حال شو　　　پیش مردے کاملے پامال شو

زبانی جمع خرچ چھوڑ صاحب حال ہو۔ کسی کامل مرد کے سامنے زانوادب رکھ۔

اصل علاج یہی ہے کہ اپنے کو بالکل مٹا دے اور تواضع پوری طرح اختیار کرے اور یہی تواضع جڑ ہے اتفاق کی بھی۔ آج کل لوگ اتفاق کی کوشش کرتے ہیں مگر اتفاق کی جو جڑ ہے اس کو بالکل چھوڑ رکھا ہے کیونکہ اتفاق ہمیشہ اس سے پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے کم سمجھے۔ اس سے کبھی اختلاف کی نوبت آ ہی نہیں سکتی۔ افسوس آج اس پاکیزہ خصلت کو بالکل چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کے برخلاف خودداری اور تکبر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سبا اس میں ہمیشہ ایسی وضع اختیار کی جاوے کہ مجمع بھر میں ہمیں کو ممتاز اور بڑا سمجھا جائے اور غضب یہ ہے کہ اپنی اولاد کو بھی ابتدا ہی سے اس وضع کا عادی بناتے ہیں۔ غرض ہر فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کو فرعون کا ہمسر سمجھتے ہیں۔ پھر فرمایئے کیونکر ممکن ہے۔ صاحبو! اگر

اتفاق کی واقعی تمنا ہے تو حضرات صوفیہ کے طرز پر چلنے کی کوشش کرو اور ان حضرات کے قدموں پر جا کر پھر دیکھو کیسا اتفاق ہوتا ہے۔

ایک رئیس سے میری گفتگو ہوئی کہ اگر لڑکے سے کسی نوکر پر کوئی زیادتی ہو جائے تو اس کی سزا دینی چاہیے یا نہیں۔ ان رئیس صاحب کی یہ رائے تھی کہ سزا نہ دینی چاہیے۔ کیونکہ سزا دینے سے بچے کی طبیعت پست ہو جاتی ہے اور دماغ میں علوحوصلگی نہیں رہتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ علو کے کیا معنی ان لوگوں کے نزدیک ہیں۔ ایسے علو کو غلو کہا جائے تو بہتر ہے اور نہ کہئے تب بھی ہمارا مقصود حاصل ہے کیونکہ یہ وہی علو ہے جس کو فرماتے ہیں **لایریدون علوا فی الارض ولافساداً** دیکھ لیجئے کہ قرآن نے اس علو کو محمود بتلایا ہے یا مذموم۔ اور اگر قرآن نے مذموم بتلایا ہے تو کیوں کر۔ یہ علو مطلوب ہو سکتا ہے۔ صاحبو! قرآن شریف کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن آج کل کے مخترع تمدن کی بالکل جڑ کاٹ رہا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اتفاق پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ اپنے اعمال درست کرو اور جو لوگ اپنے اعمال درست کر چکے ہیں ان کے پاس آمد و رفت رکھو مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ بزرگوں کی خدمت میں اگر جاؤ تو نیت محض اپنی اصلاح کی کر کے جاؤ بعض لوگ بزرگوں کی خدمت میں جاتے ہیں لیکن نیت ان کی محض وقت پورا کرنا اور دل بہلانا ہوتی ہے۔ اور علت اس کی یہ ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر دنیا بھر کے قصے جھگڑے اخبار شروع کر دیتے ہیں ایسے لوگ اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور ان بزرگ کا بھی وقت ضائع کرتے ہیں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اصلاح ہی کی نیت سے جاتے ہیں لیکن عجلت پسند ہونے کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ دو ہی دن میں ہماری اصلاح ہو جائے۔ ان لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے۔

الحائک اذا صلی یومین منتظر الوحی

جولاہا جب دو دن نماز پڑھ لیتا ہے تو وحی کا منتظر ہو جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کے جواب میں ہمارے حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ کیا کم فائدہ ہے کہ تم کو خدا کا نام لینے کی توفیق ہوگئی اور فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اگر واقعی کچھ بھی حاصل نہ ہو تب بھی طلب نہ چھوڑنی چاہیے۔

یا بم او را یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نہ آید آرزوئے می کنم

کچھ ملے یا نہ ملے جستجو میں لگا رہوں گا اور کچھ حاصل ہو یا نہ ہو میں آرزو کرتا رہوں گا۔

طالب خدا کی یہ شان ہے کہ اگر سو دفعہ اس کو یہ آواز آئے کہ تو دوزخی ہے تب بھی اس کو مایوسی نہ ہو۔ ایک بزرگ کے پاس شیطان آیا اور کہا تم کو عبادت کرتے اتنے دن ہو گئے نہ پیام نہ سلام پھر اس سے کیا نفع وہ معمول چھوڑ کر سو رہا۔ خواب میں حضرت حق جل مجدہ آئے اور وجہ پوچھی۔ اس نے کہا نہ لبیک ہے نہ پیک ہے پھر کیسے دل بڑھے۔ جواب ارشاد ہوا کہ۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست
دیں نیاز و سوز دردت پیک ماست

(تیرا اللہ کہنا ہمارا جواب ہے تیرا یہ سوز و نیاز اور درد ہمارا قاصد ہے)

ایک بزرگ کی حکایت شیخ علیہ الرحمۃ نے لکھی ہے کہ وہ ذکر کرنے بیٹھے تو یہ آواز آئی کہ تم کچھ بھی کرو یہاں کچھ قبول نہیں مگر وہ پھر کام میں لگ گئے۔ ان کے ایک مرید نے کہا کہ جب کچھ نفع ہی مرتب نہیں ہوتا تو محنت سے کیا فائدہ؟ بزرگ نے جواب دیا کہ بھائی اگر کوئی دوسرا ایسا ہوتا کہ میں خدا کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تو اعراض ممکن بھی تھا اب تو یہی ایک در ہے قبول ہو یا نہ ہو۔

توانی ازاں دل بہ پرداختن
کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

(اس شخص سے دل کیسے خالی کر سکتے ہیں جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اس کے گزر کر سکتے ہیں)

اس جواب پر رحمت باری کو جوش ہوا اور ارشاد ہوا کہ۔

قبول ست گرچہ ہنر نیستت
کہ جز ما پناہے دگر نیستت

قبول ہے اگرچہ تو اس قابل نہیں ہے کیونکہ ہمارے سوا تیرے کوئی پناہ نہیں ہے۔

غرض طالب کو ہر حال میں طلب میں مشغول رہنا چاہئے۔ اور یہ حالت ہونی چاہئے کہ۔

اندریں رہ می تراش و می خراش
تادم آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دم آخر بود کہ
عنایت با تو صاحب سر بود

(اس راہ سلوک میں ادھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو اور آخر دم تک بے کار نہ رہو۔ آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہارے ہمراز اور رفیق بن جائیگی)

راہ سلوک میں بہت تراش خراش ہیں۔ لہذا آخر دم تک ایک دم کے لئے فارغ نہ ہو بلکہ کام میں لگے رہو۔ آخر ایک وقت تجھ پر عنایت ہو جائے گی۔

کامل کی پہچان

البتہ اس موقع پر اس کی ضرورت ہے کہ کامل کی کوئی پہچان بتلائی جائے کیونکہ آج کل بہت سے شیطان بھی لباس انسان میں ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نباید داد دست

(بہت سے آدمیوں کی شکل میں شیطان زمین پر بستے ہیں اس لئے ہر کس وناکس کا اندھا ہو کر مرید نہ بنے)

تو پہچان اس کی یہ ہے کہ وہ شریعت کا ضروری علم رکھتا ہو۔ کسی کامل شیخ کی تربیت میں رہا ہو۔ اور اس سے اجازت تربیت حاصل ہو۔ خود شریعت پر عامل ہو۔ شریعت کے خلاف پر اصرار نہ کرتا ہو۔ سنت کا پورا پابند ہو۔ اپنے متعلقین پر شفقت کرتا ہو۔

احتساب میں کمی نہ کرتا ہو۔ جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں وہ کامل ہے اور ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا ہے۔

یک زمانہ صحبت با اولیا　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یعنی اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت بھی سو سال کی بے ریا عبادت وطاعت سے بہتر ہے۔

بحمداللہ طبقات کا بیان بقدر ضرورت ہو گیا۔ اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ سبیل نجات صرف ایک ہے اور اس پر چلنے کا طریقہ یہ ہے جو مذکور ہوا۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت کارآمد ہے اگرچہ لذیذ نہیں۔ اب دعا کیجئے کہ خدا عمل کی توفیق دے۔ آمین یارب العلمین۔

فرمایا کہ شریعت نے دوسرے کے دکھ اور تکلیف میں مدد کرنے کا نہایت اہتمام کے ساتھ حکم کیا ہے مگر افسوس ہمیں آج کل بالکل اس کی پرواہ نہیں کہ دوسرے کو نفع پہنچا دیں ایسے بخیل اور ایسے خود غرض ہو گئے ہیں کہ اپنے لئے تو سب کچھ سامان کر لیتے ہیں۔ جوتہ کا بھی اناج کا بھی کپڑے کا بھی لیکن دوسروں کی فکر مطلق نہیں کرتے کہ مر رہے ہیں یا غمگین ہیں۔ (کمالات اشرفیہ)

العید والوعید

عید و وعید کے متعلق یہ وعظ ۳۰ رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ بروز جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو ۴ گھنٹے ۱۵ منٹ میں ختم ہوا حاضری ۵۰۰ کے قریب تھی مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد ان لا اله الا الله و حده لا شريک له و نشهد ان محمد اعبده و رسوله صلى الله تعالىٰ عليه و على اله واصحابه و بارک وسلم. اما بعدفاعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمٰن الرحيم يريد الله بكم اليسر ولايريد بكم العسر ولتكملوا العدة والتكبروا الله علىٰ ماهداكم ولعلكم تشكرون.(البقره: ۱۸۵)

اللہ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے دشواری کرنا منظور نہیں ہے۔

احکام کی حکمتیں

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے اس سے پہلے حق تعالیٰ نے کچھ احکام صوم کے متعلق بیان فرمائے ہیں پھر ان کو ختم کیا ہے ایسے احکام پر جن میں کچھ حکمتیں بھی ان احکام کی مذکور ہیں چونکہ ان میں ایک مضمون ختم رمضان کے متعلق بھی ہے اس لئے بمقتضائے وقت اس کا اختیار مناسب ہوا۔

اس سے قبل جو احکام مذکور ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ دو حکموں کی مشروعیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ادائے صیام کا ایک قضائے صیام کا چنانچہ اوپر اول یہ فرمایا ہے۔

يايها الذين امنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون اياماً معدودات فمن كان منكم مريضاً اوعلىٰ سفر فعدة من ايام اخر و على الذين يطيقونه فدية طعام مسكين فمن تطوع خيراً فهو خيرله و ان تصوموا خيرلكم ان كنتم تعلمون

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو۔ جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار کرنا ہے جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے ان کے ذمہ

فدیہ ہے وہ ایک مسکین کا کھانا ہے جو شخص خوشی سے خیر کرے وہ اس کے لئے بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے اگر تم خبر رکھتے ہو۔

اس میں قضاء و ادا دونوں کے احکام مذکور ہیں اور ابتداء میں طاقت رکھنے والوں کو بھی افطار صوم کی بھی اجازت تھی اور اس صورت میں فدیہ دینے کا حکم تھا پھر یہ حکم منسوخ کیا گیا چنانچہ اگلی آیت میں فرماتے ہیں۔

شهر رمضان الذی انزل فیه القران هدی للناس و بینات من الهدی والفرقان فمن شهدمنکم الشهر فلیصمه ومن کان مریضاً او علیٰ سفر فعدة من ایام اخر

ماہ رمضان ہے جس میں قرآن پاک بھیجا گیا ہے۔ جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور واضح الدلالات ہے۔ منجملہ ان کتب کے جو کہ ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور روزہ رکھنا چاہئے جو بیمار یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا ہے۔

اس میں بھی ادا و قضا دونوں کا حکم مذکور ہے جس میں بتلا دیا گیا کہ مریض و مسافر کے لئے حکم اول منسوخ نہیں ہوا اس کے بعد **یرید الله بکم الیسر و لا یرید بکم العسر الایة** میں ان احکام کی حکمتوں کا ذکر ہے احکام تو ظاہر ہیں اور لوگ بارہا سن چکے ہیں اس لئے ان کو میں اس وقت بیان نہ کروں گا اس وقت میں اخیر کا مضمون بیان کروں گا جس میں احکام مذکورہ کی حکمتوں کا ذکر ہے کیونکہ اس کو لوگوں نے بہت کم سنا ہوگا اور اکثر اس سے ناواقف ہیں۔ اس لئے اس کا سمجھنا ضروری ہے۔

ہر چند کہ حق تعالیٰ کے احکام میں حکمتوں کا انتظار نہ کرنا چاہئے لیکن اگر کہیں وہ از خود بیان فرما دیں تو ان کو سمجھ جانا چاہئے اور حق تعالیٰ نے کہیں کہیں احکام کی حکمتیں اس لئے بیان فرما دیں کہ بعض دفعہ حکمت کا معلوم ہو جانا مفید ہوتا ہے گو کبھی مضر بھی ہوتا ہے پس اب فیصلہ یہ ٹھہرا کہ از خود تو درپے حکمت نہ ہو اور اگر کہیں حق تعالیٰ ہی بیان کر دیں تو سمجھنا چاہئے کہ یہاں علم حکمت ہم کو مضر نہیں اور جہاں وہ بیان نہ کریں وہ عمل کے لئے حکمت کا انتظار نہ کرے۔ اور غیر مذکور کو مذکور کے ساتھ ملحق کر کے اس پر قیاس نہ کرے کہ ایک جگہ علم حکمت ہم کو مضر نہ ہوا تھا۔ تو یہاں بھی مضر نہ ہوگا۔ لیکن یہ قیاس صحیح نہیں۔ ممکن ہے کہ ہر حکم کی نوعیت جدا ہو جس سے خواص بھی بدل جاویں۔

میں جو احکام کی حکمتیں تحقیق کرنے سے منع کر رہا ہوں احکام کی علتیں جو مجتہدین تحقیق کرتے ہیں ان علتوں کو ان حکمتوں پر قیاس نہ کرنا چاہئے وجہ فرق کی دو امر ہیں ایک تو یہ کہ علتیں مجتہدین کی سمجھی ہوئی ہیں اور یہ حکمتیں غیر مجتہدین کی سمجھی ہوئی دوسرے وہ علتیں بضرورت نکالی جاتی ہیں کہ مسکوت عنہ میں حکم کا تعدیہ کریں اور یہ حکمتیں بلا ضرورت نکالی جاتی ہیں کیونکہ احکام ان حکمتوں پر موقوف نہیں اور گو وہ علل بھی ظنی ہوں گے قطعی نہ ہوں گے اور اسی لئے وہ احکام جو ان علتوں پر مبنی ہیں ظنی ہوں گے مگر علوم ظنیہ بھی اثبات حکم کے لئے کافی ہیں اور حکمت نکالنے سے اثبات حکم مقصود نہیں اس لئے وہاں ظنیت کو خطرناک سمجھا جاوے گا اور یہاں ایک استطرادی تحقیق ہے وہ یہ کہ بعض لوگوں کو بعض نصوص سے علوم ظنیہ کے مطلقاً مفید نہ ہونے کا شبہ ہو گیا ہے۔ جن سے **ان نظن لایغنی من الحق شیئاً** یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

اس سے شیئاً نکرہ ہے تحت نفی کے جس سے معلوم ہوا کہ ظن کسی درجہ میں بھی مفید نہیں تو سمجھنا چاہئے کہ یہ دھوکہ اصطلاح اور محاورہ کے خلط سے پیدا ہوا ہے قرآن کو محاورات پر سمجھنا چاہئے کیونکہ اس کا نزول محاورات عرب ہی پر ہوا ہے نزول قرآن کے وقت اہل عرب ان معقولی اصطلاحات کو جانتے بھی نہ تھے یہ تو بعد میں مقرر ہوئی ہیں۔

پس اب سمجھو کہ محاورات میں ظن کے معنی مطلق خیال کے ہیں خواہ صحیح یا غلط مدلل یا غیر مدلل مطابق واقع ہو یا خلاف واقع۔ تو ظن اصطلاحی بھی اس کی ایک فرد ہے چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ظن کا استعمال بمعنی اعتقاد جازم ہوا ہے۔ **یظنون انهم ملاقوا ربهم** وہ اللہ کی ملاقات کا یقین رکھتے ہیں۔

یہاں اعتقاد جازم مراد ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ اعتقاد آخرت میں ذرا سا بھی شک کفر ہے اور ایک جگہ آخرت کے متعلق کفار کا قول نقل کیا گیا ہے۔

ان نظن الا ظنا وما نحن بمستیقنین

محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو یقین نہیں۔

یہاں وہم و خیال مراد ہے کیونکہ ان کو آخرت کے متعلق ظن اصطلاحی بھی نہ تھا بلکہ وہ تو منکر و مکذب تھے اسی طرح

ان نظن لا یغنی من الحق شیئاً

یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا مفید نہیں ہوتے۔

میں ظن اصطلاحی مراد نہیں بلکہ خیال بلا دلیل مراد ہے کیونکہ یہاں کفار کے بارہ میں گفتگو ہے اور ان کا ظن (ملائکہ بنات اللہ ہونے کے بارہ میں) کسی دلیل سے نہ تھا بلکہ خلاف دلیل تھا چنانچہ اوپر کی آیت سے اس کا کفار کے متعلق ہونا ظاہر ہے فرماتے ہیں۔

ان الذین لایؤمنون بالاٰخرة لیسمون الملائکة تسمیة الانثی.

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لائے وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں شمار کرتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے محض بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں۔

اسی کے متعلق آگے ارشاد ہے **وان الظن لا یغنی من الحق شیئا** (یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا مفید نہیں ہوتے) کہ ایسا ظن جو بلا دلیل ہو جیسا کفار کو تھا مغنی عن الحق نہیں ہے۔

غلبہ حال کا اثر

اب تو مشکل یہ ہے طلباء قرآن کو ملا حسن وحمد اللہ کے بعد پڑھتے ہیں جبکہ ان کے ذہن میں یہ اصطلاحات رچ جاتی ہیں۔ پھر وہی تمام قرآن میں سوجھتی ہیں۔

جیسا کہ میں ایک دفعہ دیوبند میں طالب علمی کے وقت تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا تھا جو مولانا محمد یعقوب صاحب نے نقل کے لئے دیا تھا اس وقت ایک معقولی طالب علم آئے اور پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہو۔ میں نے کہا تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں کہنے لگے شیخ بو علی سینا کا؟ ان کے نزدیک بس وہی تو ایک شیخ تھا اور سارے جولاہے ہی تھے۔

ہم بھی اس مرض میں مبتلا ہیں کہ حدیث وفقہ کی اصطلاحات کو ہر جگہ جاری کرتے ہیں چنانچہ ایک صاحب نے جو معقول نہ جانتے تھے کسی کتاب میں تصدیق کے متعلق امام رازی کے نقل مذہب کے موقع پر لکھا ہوا دیکھا قال الامام تو کہتے ہیں کیا امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب تھا ان کے ذہن میں امام بس وہی تھے غرض یہ کچھ قاعدہ ہے کہ جو چیز ذہن میں رچی ہوتی ہے ہر جگہ وہی سوجھتی ہے۔

جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

یہیں سے معلوم ہوگیا کہ اگر کسی مغلوب صوفی پر وحدۃ الوجود کا حال طاری ہو جائے تو اس پر کیا اعتراض ہے اس غریب کے ذہن میں بھی ایک ذات رچی ہوئی ہے وہی ہر جگہ اس کو سوجھتی

ہے جیسے کسی نے ایک طالب علم سے کہا تھا کہ دو اور دو کے ہوتے ہیں تو وہ بے ساختہ کہتا ہے کہ چار روٹیاں اس غریب کے ذہن میں روٹیاں ہی رچی ہوئی تھیں تو اگر کسی کے ذہن میں خدا تعالیٰ کی ہستی رچ جائے اور ہر چیز میں وہی نظر آنے لگے تو اس پر فتوے کیوں لگائے جاتے ہیں۔

ایک دفعہ مولانا جامی پر بھی وحدۃ الوجود کا حال طاری تھا اس وقت غلبہ حال میں وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی
ہر چہ پیدا مے شود از دور پندارم توئی

(مری جسم و جاں میں تو ہی سمایا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے میں تجھ کو گمان کرتا ہوں)

پیدا می شود یہاں پر بمعنی ظاہر می شود ہے۔ اس وقت کوئی منکر سامنے سے آ گیا اس نے تمسخر کے طور پر کہا مولانا اگر خر پیدا شود؟ آپ نے فوراً جواب دیا پندارم توئی۔ یعنی اگر گدھا سامنے آئے گا تو میں سمجھوں گا تو ہے۔

کیسا پر مغز جواب ہے کہ اپنا دعویٰ بھی صورۃً محفوظ رہا اور اس کے تمسخر کا بھی جواب ہو گیا۔ ان کاملین کو غلبہ حال ایسا نہیں ہوتا کہ مسلوب الحواس ہو جائیں بلکہ ان کے حواس غلبہ حال میں بھی درست رہتے ہیں اور ذرا سے محرک سے حالت سکر مبدل بصحو ہو جاتی ہے اسی لئے مولانا جامی کو سوال منکر کے بعد فوراً ہی ظرافت کی سوجھی۔

بہر حال وحدۃ الوجود کی حقیقت بھی یہی ہے کہ سالک کے دل پر ہستی حق کا خیال رچ جاتا ہے اور اس کا تصور غالب ہو جاتا ہے تو اب ہر چیز میں اس کو وہی نظر آنے لگتا ہے اور اس وقت وہ ہمہ اوست یا ہر چیز پیدا می شود از دور پندارم توئی کہنے لگتا ہے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے مگر اس حالت کے اقوال میں ان کی تقلید نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ باتیں وہ غلبہ حال اور درجہ معذوری میں کرتے ہیں اور معذوری کی حالت کا اتباع نہیں ہو سکتا صاحب صادق پر جب تک عذر غالب نہیں ہوتا بہت ضبط سے کام لیتا ہے جب ضبط کی طاقت نہیں رہتی اور اختیار سلب ہو جاتا ہے اس وقت اس سے ایسے حرکات وجدیہ اور ایسے اقوال شطحیہ صادر ہونے لگتے ہیں سعدی فرماتے ہیں۔

بہ تسلیم سرور گریباں برند
چو طاقت نماند گریباں درند

(حالات تسلیم سے سر در گریباں ہوتے ہیں اور جب تسلیم کی طاقت نہیں ہوتی

گریبان پھاڑ دیتے ہیں)

تو ایسی حالت میں بے اختیار کی باتیں قابل تقلید کیوں کر ہو سکتی ہیں مگر ان پر انکار بھی نہ کرنا چاہئے۔

قرآن بین التمرین

یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ طلباء معقول کے بعد قرآن کو پڑھتے ہیں جب کہ وہ اصطلاحات ان کے ذہن میں رچی ہوئی ہوتی ہیں تو قرآن میں بھی ان کو وہی سوجھتی ہے اسی کی مناسبت سے وحدۃ الوجود کا ذکر آ گیا کہ اس کی حقیقت بھی ایک چیز کا ذہن میں رچ جانا ہے۔ بہر حال ان الظن لایغنی من الحق شیئاً (یقیناً بے ظن خیالات امر حق میں ذرا مفید نہیں ہوتے) میں ظن اصطلاحی مراد نہیں بلکہ ظن بلا دلیل مراد ہے پس ظن اصطلاحی کا غیر کافی ہونا یا حجت نہ ہونا قرآن سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ دلائل شرعیہ سے اس کا معتبر و حجت ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قرآن میں بعض آیات مجملہ و مشکلہ بھی ہیں سب کی سب مفسر و محکم ہی نہیں ہیں اور جب بعض آیات مجمل و مشکل بھی ہیں تو ان کی کوئی تفسیر قطعی نہیں ہو سکتی ورنہ پھر اجمال و اشکال ہی کہاں رہا۔ اور جب کوئی تفسیر نہیں ظنی ہوگی۔ اب اگر ظن مطلقاً غیر معتبر ہے تو آیت مجملہ و مشکلہ بالکل متروک العمل ہو جائیں گی۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔ مثلاً لامستم النساء میں ابہام ہے۔ جس کی وجہ سے تفسیر میں اختلاف ہو رہا ہے کہ اس سے مراد لمس بالید ہے یا ملامسۃ بالجماع ہر فریق اپنی تفسیر کو دلائل سے ثابت کرتا ہے اور جس کے نزدیک جو معنی راجح ہیں اس پر عمل کرتا ہے حالانکہ ہر تفسیر ظنی ہے قطعی کی گنجائش بھی نہیں مگر کسی نے اس آیت کو یہ کہہ کر ترک نہیں کیا کہ اس کی قطعی مراد تو معلوم نہیں اور ظن معتبر نہیں لہذا اس پر عمل نہیں ہو سکتا اور جب ظن معتبر ہے تو جو معنی جس شخص کے نزدیک راجح ہیں وہ اس کو مدلول کلام ہی سمجھ رہا ہے گو قطعاً نہ سہی ظناً ہی سہی جس کا قرینہ یہ ہے کہ اس ظن کی بناء پر وجوب و حرمت کراہت و مندوبیت وغیرہ احکام شرعیہ ثابت کیے جاتے ہیں اور یہ احکام بدوں نسبت الی الشارع کے ثابت نہیں کیے جا سکتے پس ثابت ہو گیا کہ مدلول ظنی بھی مدلول نص ہی ہے) تو جس طرح قطعیات کو قطعاً مدلول نص کہا جاتا ہے اسی طرح ظنیات بھی ظناً مدلول نص ہیں خواہ بلا واسطہ قیاس کے خواہ بواسطہ قیاس کے غرض حکم اور علل کا جدا جدا حکم ہے۔

ایک تفصیل استطرادا ہی علل شرعیہ کے متعلق بیان کرتا ہوں کیونکہ علل کے بارے میں بھی

دو فرقے ہیں ایک وہ جو یوں کہتے ہیں کہ جو صاف صاف بتلادی گئی ہے اس کو بھی علت سمجھو اور جو صاف صاف نہیں بتلائی گئی اس کو بھی تعدیہ کی ضرورت سے تلاش کرو اور اس کو معلوم کر کے حکم کی بناء اس پر سمجھو اور جزئی مسکوت عنہ میں اس کے واسطے سے حکم کو متعدی کرو اور یہ طبقہ فقہاء کا ہے۔

ایک فرقہ وہ ہے جو یوں کہتا ہے کہ جو علت نصاً بتلادی گئی ہے اس پر تو عمل کرو اور جو نہیں بتلائی گئی اس کو تلاش نہ کرو یہ اہل ظاہر ہیں جو قیاس کو حجت شرعیہ نہیں کہتے نیت ان کی بھی اچھی ہے کیونکہ منشاء اس مسلک کا یہ ہے۔

زباں تازہ کردن باقرار تو　　نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

ہمارے نزدیک امام داؤد ظاہری پر مذاق عشق غالب ہے وہ کہتے ہیں کہ جس حکم کی علت بتلائی گئی ہو۔ بس وہی معلل ہے اور جس کی علت مذکور نہیں اس کو معلل بعلت کرنے کی ضرورت نہیں ہم کو بدوں کسی علت کے تلاش کے اس پر اطلاق کے ساتھ عمل کرنا چاہیے مثلاً ایک حدیث میں ہے۔

نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن القران بین البسر والرطب
(تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ۷: ۴۰)

یعنی حضورؐ نے چھواروں کی دو قسموں رطب اور بسر کے ملانے سے منع فرمایا ہے عرب میں عادت تھی کہ پانی میں چھوارے ڈال کو بھگوتے اور اس کا زلال پیا کرتے تھے جس کو نبیذ کہتے ہیں یہ مقوی ہوتا ہے جیسا کہ یہاں بھی اطبا مریض کو بعض ادویہ خیسانده بتلایا کرتے ہیں تو حضورؐ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ دو قسم کے چھوارے ملا کر نہ بھگوئے جائیں اس حکم کو عام فقہاء نے تو معلل بالعلۃ مانا ہے کہ قرآن بین التمرین مطلقاً ممنوع نہیں بلکہ خاص علت کی وجہ سے ممنوع ہے پھر اس علت کے بارے میں اختلاف ہوا ہے بعض نے تو کہا ہے رطب اور بسر کے ملانے سے نبیذ میں تیزی بہت جلد آجاتی ہے اس لئے آپؐ نے منع فرمایا تو مدار حکم اشتداد پر ہے اس صورت میں یہ حکم ان موسموں کے ساتھ خاص ہوگا جن میں اس قرآن سے اشتداد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً گرمی یا برسات میں اور جاڑے کے موسم میں ممنوع نہ ہوگا کیونکہ اس موسم میں تیزی جلدی پیدا نہیں ہوتی نیز گرمی اور برسات میں بھی مطلق قران سے ممانعت نہ ہوگی بلکہ اتنی دیر تک ملا کر بھگونے سے ممانعت ہوگی جس میں

اشتداد کا اندیشہ ہو۔ پس اگر کوئی ایک دو گھنٹہ تک ملا کر بھگو دے تو ممنوع نہ ہوگی۔

بعض نے یہ کہا کہ قران میں بین التمرین میں ایک قسم کا تعمیم ہے اور وہ زمانہ قحط کا تھا اس لئے حضورؐ نے اس تعمم سے منع فرما دیا کہ زمانہ قحط میں ایک شخص تو دو دو قسم کے چھوارے بھگوئے اور ایک کو ایک قسم کا بھی میسر نہ ہو اس صورت میں یہ حکم زمانہ قحط کے ساتھ مخصوص ہوگا۔

اہل ظاہر کہتے ہیں کہ ہم اس حکم کی علت نکالنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے جب حضورؐ نے علت نہیں بتلائی تو قران بین التمرین مطلق ممنوع ہے بعض اہل ظاہر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ دو قسم کے چھوارے ساتھ بھگونا ایسا ہے جیسا جمع بین الاختین۔ گو یہ غلو ہے مگر ہم اس کی بھی قدر کرتے ہیں کیونکہ ان کے اس قول کا منشاء غلبہ عشق اور غلو فی الحبت ہے۔

مگر سب کو معلوم ہے کہ عاشق مغلوب کا اتباع نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کا جوش جنوں اعتدال پر لایا جائے نہ یہ کہ ہم بھی ان جیسے مجنوں ہو جائیں پس اہل ظاہر کی تقلید تو ہم کرتے نہیں بلکہ تغلیط کرتے ہیں لیکن ان کو برا بھلا بھی نہیں کہتے بلکہ ایک درجہ میں ان کی باتوں کی قدر کرتے ہیں کیونکہ منشاء ان اقوال کا غلبہ عشق ہے اور یہ حالت محمود ہے گو مقصود نہ ہو (جیسے غلبہ خشیت سے کثرت بکاء حالت محمود ہے گو مقصود نہیں) تو عشق کا ایسا غلبہ گو مقصود نہیں مگر فی نفسہ محمود ضرور ہے کیونکہ اس شخص میں عشق تو ہے۔

فرعون اور ایمان

کسی درجہ میں عشق کا ہونا ضروری بھی ہے اس کے بالکل نہ ہونے سے ایمان پر خطرہ ہے بقول محققین کے شیطان اسی لئے گمراہ ہوا کہ اس کو حق تعالیٰ سے محض ضابطہ کا تعلق تھا محبت نہ تھی اور ملائکہ میں عشق محبت کا اثر موجود تھا۔ اس لئے حکم کے ساتھ ہی سب فوراً سجدہ میں گر پڑے۔ بلکہ ملائکہ میں بعض پر استغراقی کیفیت طاری ہے کہ ہر وقت غلبہ محبت کی وجہ سے مستغرق رہتے ہیں۔

نیز احادیث سے بھی ملائکہ میں عشق و محبت کے وجود کا پتہ چلتا ہے چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا فرعون کے منہ میں کیچڑ ٹھونسنا غلبہ محبت حق ہی کی وجہ سے تھا جس سے فرعون کے ساتھ بغض فی اللہ بدرجہ غلبہ پیدا ہو گیا کیونکہ جب وہ ڈوبنے لگا تو کہنے لگا۔

امنت بالذی امنت بہ بنو اسرآئیل وانا من المسلمین

(مجھ کو تو طریق عشق میں چلائے زاہد خشک تو بہت دور دراز کا راستہ ہے)

حضرت جبرائیل علیہ السلام کو غصہ آیا کہ کم بخت نے ساری عمر تو خدائی کا دعویٰ کیا۔ اب مرتے ہوئے ایمان لاتا ہے وہ اس کم بخت کے لئے رحمت کو گوارا نہ کرتے تھے۔ اس لئے منہ میں کیچڑ ٹھونس دیا تاکہ زبان سے پوری طرح بات نہ نکل سکے مبادا کہیں رحمت متوجہ ہو جائے چنانچہ ترمذی کی روایت میں خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے۔

فادسه فی فیه فحافته ان تدرکه الرحمته

حضرت جبرئیل نے اس کے منہ میں کیچڑ ٹھونس دیا مبادا رحمت خدا اس کی طرف متوجہ ہو جاوے۔

اور اگر اس پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت جبرائیل نے ایک شخص کو اسلام سے روکا حالانکہ اسلام سے روکنا جائز نہیں سو اس کا علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذاب دیکھنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فلم یک ینفعهم ایمانهم لما راوا باسنا

سو ان کو ان کا یہ ایمان لانا نافع نہ ہوا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا۔

تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے صورت اسلام سے روکتے تھے جس پر گو رحمت فی الاخرۃ مرتب نہیں ہوتی مگر رحمت فی الدنیا متوجہ ہو سکتی ہے جیسے منافقین صورت اسلام کے سبب قتل واسر سے محفوظ رہے اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق واہلاک سے بچ جاتا۔

پھر اس پر اگر کوئی سوال کرے کہ اس آیت میں بأسنا سے مراد عذاب دینا تو ہے نہیں کیونکہ عذاب دینا کی رویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں اور ظاہراً یہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہو جاتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے چنانچہ بعض محتضرین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا اور اس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی پہچانا۔ چنانچہ گھر والوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں تم ان سے پردہ کرو تو ابتداء انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے اور فرعون کے واقعہ سے ظاہراً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے اس وقت اس کو انکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی ہوش تھے چنانچہ اس کا قول **آمنت بالذی آمنت**

به بنو اسرائیل بتلا رہا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل کا حق پر ہونا اور ان کا مومن ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے تو اس کو ادھر کا ہوش ضرور تھا لیکن اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ انکشاف عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے پس اس دلیل سے انکشاف آخرت کی نفی نہیں ہوسکتی اور یہ انکشاف مانع ہے قبول ایمان سے پس اشکال رفع ہوگیا۔

اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان سے اور ایمان نام ہے تصدیق کا اور وہ بعد انکشاف آخرت کے مقبول نہ تھی اگرچہ زبان سے تلفظ کیا جاوے پھر تلفظ کے روکنے سے کیا فائدہ ہوا اور اگر زبان سے اقرار کرنا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جائے تو اقرار کا قصد بھی کافی ہونا چاہئے اگرچہ کسی عذر سے عجز ہوگیا ہو اور یہاں عجز ہوگیا کیچڑ کی وجہ سے تو وہ اقرار مفید محقق ہوگیا پھر کیچڑ ٹھونسنے سے کیا فائدہ ہوا؟

سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گزرا کہ جبرئیل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس لئے گوارا نہیں کیا اگرچہ رحمت ظاہری کا ایک گونہ ظہور نعش کو محفوظ رکھنے سے ہوگیا جیسا کہ ارشاد ہے **فالیوم ننجیک ببدنک الایة** آج ہم تیرا بدن مثال کے لئے قائم رکھتے ہیں۔

مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اسی ظاہری رحمت میں ان کا کیا حرج تھا؟ اس کا جواب وہی ہے جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا منشاء غلبہ بغض فی اللہ تھا اس میں یہ بھی گوارا نہ ہوا اس مبغوض حق سے ایسا بغض بدوں غلبہ عشق حق کے ہو نہیں سکتا۔ اسی طور پر حدیث سے معلوم ہوگیا کہ ملائکہ میں محبت عشقیہ ہے اور شیطان میں یہ محبت نہ تھی اس لئے وہ کم بخت سجدہ نہ کرسکا پس محبت کا ہونا ضروری ہوا بغیر محبت کے نری طاعات وعبادات وعلوم کافی نہیں کیونکہ ان کا بھروسہ کچھ نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ محبت طبعی ہی کا غلبہ ہو بلکہ محبت عقلی کا غلبہ بھی کافی ہے۔

طبعی اور عقلی محبت کا فرق

باقی محققین کا اس میں اختلاف ہے کہ کون سی محبت افضل ہے سو یہ ایک مستقل مسئلہ ہے مگر میری رائے یہ ہے کہ محبت عقلی راجح ہے کیونکہ محبت طبعی اختیاری نہیں اس کا حدوث و بقا بالکل غیر اختیاری ہے اور امر غیر اختیار پر بعض اوقات دوام نہیں ہوتا بخلاف محبت عقلی کے اس کا حدوث وبقاء اختیاری ہے تو اس پر دوام بھی ہوتا ہے۔

اس پر میں ایک واقعہ سناتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ محبت عقلی طبعی سے راجح ہے۔ ایک واقعہ میں پہلے بھی کسی بیان میں بتلا چکا ہوں وہ یہ کہ میرے پاس ایک دن میں چند خطوط آئے تھے جن کی شان خط ایک تھی اور مضمون بھی قریب قریب تھا اور سب میں ہدیہ دینے کے متعلق اطلاع تھی کہ ہم کچھ ہدیہ پیش کرنا چاہتے ہیں اگر اجازت ہو۔

مگر ہر خط میں رقم کی مقدار مختلف تھی۔ اس اختلاف کے سوا اور سب باتیں یکساں تھیں۔ اگر میں نے ہدیہ کے متعلق کچھ معمولات مقرر نہ کئے ہوتے تو خوش اخلاقی سے لکھ دیتا کہ ہاں بھیج دو مگر میں بدوں انشراح واطمینان کے ہدیہ قبول نہیں کرتا اس لئے میں نے لکھا کہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میرے پاس ایک ہی دن کی ڈاک میں اس مضمون کے چند خط آئے ہیں جو سب ایک ہی جگہ سے روانہ ہوئے اور یکساں شان خط ہے اور مضمون بھی قریب قریب ہے تو کیا مشورہ اور کمیٹی کر کے یہ خطوط لکھے گئے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو اس صورت میں یہ ہدیہ میں قبول نہیں کر سکتا اس جواب کے بعد اور تو سب ندارد ہو گئے کسی نے بھی کچھ جواب نہ دیا مگر ایک شخص کا خط آیا اس نے لکھا کہ یکساں خط اور یکساں مضمون ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ گاؤں ہے ہم لوگوں کو لکھنا آتا نہیں اور لکھنے والا گاہے گاہے ملتا ہے جب کوئی لکھنے والا دستیاب ہوتا ہے تو سب آدمی اسی سے خط لکھوا لیتے ہیں۔ یہ بات معقول تھی جو میرے معمول کے خلاف نہ تھی مگر اخیر میں ایک مضمون ایسا لکھا جو میرے معمول کا مؤید تھا۔ وہ یہ کہ اس نے یہ بھی لکھا کہ لیکن اور سب کا یا تو جوش ختم ہو گیا یا رقم باقی نہیں رہی۔ اس لئے سب خاموش ہو کر بیٹھ رہے اور میرا جوش بھی باقی ہے اور رقم بھی محفوظ ہے میں پیچھا نہیں چھوڑوں گا اب میرا ارادہ ہے کہ اس کا ہدیہ قبول کر لوں گا مگر اس وقت اتنا اور پوچھا کہ تم مجھ کو ہدیہ کیوں دیتے ہو۔ تم کو مجھ سے کیا نفع ہوا اور اخیر میں یہ بھی لکھ دیا کہ دوسرے لوگوں کے جوش کی حالت دیکھ کر اب تو تم کو معلوم ہوا کہ میرے معمولات صحیح ہیں اور یہ میں نے یہ اصول کیوں مقرر کئے ہیں۔

تو اس واقعہ میں آپ نے دیکھ لیا کہ جوش تو چند روز میں ختم ہو گیا مگر محبت عقلی باقی رہی اور یہیں سے معلوم ہو گیا کہ ذکر میں جوش و خروش مطلوب نہیں ذاکرین اس کی کمی سے پریشان نہ ہوا کریں کیونکہ جوش کا اکثر قاعدہ ہے کہ جب تک مطلوب حاصل نہیں ہوتا اس وقت تک رہا کرتا ہے۔ حصول مطلب کے بعد جوش نہیں رہا کرتا ہاں اگر مطلوب سے تعلق رہے تو بجائے شوق کے

انس پیدا ہو جاتا ہے پس اس کا کم ہونا محرومی کی علامت نہیں بلکہ وصول کی علامت ہے۔

شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی ذاکر نے شکایت کی کہ حضرت اب وہ پہلا سا شوق نہیں رہا تو فرمایا کہ تم کو خبر بھی ہے پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ محبت تو ماں کے ساتھ بھی ہوتی ہے مگر اس میں جوش نہیں ہوا کرتا۔

پرانی جورو اماں ہونے پر ایک سرحدی نواب کی حکایت یاد آئی بڑھاپے میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ تو حاکم ضلع تعزیت کے لئے گیا اور کہا نواب صاحب ہم کو اس کا بہت افسوس ہے کہ آپ کا بیوی مر گیا۔ انگریزوں کی اردو کھڑی بولی ہو گئی ہے۔ جس میں مؤنث کو مذکر بولا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انگریزی خوانوں کے سب کام بھی کھڑے ہونے لگتے ہیں۔

کسی گنوار کا لڑکا انگریزی پڑھتا تھا ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ میاں آج کل تمہارا لڑکا کونسی جماعت میں ہے کتنا پڑھ گیا ہے۔ تو گنوار کہتا ہے کہ جی وہ بہت پڑھ گیا ہے۔ اب تو کھڑا کھڑا موتنے بھی لگا ہے۔ بس تھوڑی ہی سی کسر ہے شاید وہ کسر یہ ہو کہ کھڑا کھڑا پاخانہ بھی کرنے لگے تو اس گنوار نے انگریزی کا خلاصہ خوب نکالا کہ کھڑے کھڑے سب کام کرنے لگے۔

غرض نواب صاحب سے کلکٹر نے ان کی بیوی کے مرنے پر رنج ظاہر کیا تو رونے لگے اور کہا ’’کلکٹر صاحب! وہ ہمارا بیوی نہ تھا اماں تھا۔ ہم کو روٹی کھلاتا تھا' پنکھا جھلتا تھا۔‘‘

واقعی یہ کام تو پرانی ہی بیوی کرتی ہے۔ نئی دلہن سے یہ کام کہاں ہو سکتے ہیں۔ وہ تو اپنے نخروں اور چونچلوں ہی میں رہتی ہے۔ مگر یہ سب چار دن کی باتیں ہیں۔ سال دو سال کے بعد سب کا جوش ختم ہو جاتا ہے اور بقول مولانا کے پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔

سو ذکر کی یہی حالت ہے کہ اس میں اول ہی اول جوش و خروش ہوتا ہے پھر سکون ہو جاتا ہے اس لئے محبت طبعی عقلی انفع ہے کیونکہ محبت طبعی کا منشا جوش طبیعت ہے اور جوش ہمیشہ نہیں رہا کرتا محبت عقلی بناء علی الکمالات ہوتی ہے تو جب تک کمالات باقی ہیں اس وقت تک محبت بھی رہے گی۔ اور محبوب حقیقی کے کمالات ختم نہیں ہو سکتے تو ان کی محبت بھی ختم نہ ہو گی۔

طبعی و عقلی خوف کا فرق

اب یہاں سے واعظین کی غلطی معلوم ہو گئی کہ وہ اپنے وعظوں میں اس قسم کے مضامین بیان کرتے ہیں کہ افسوس ہے مسلمانوں کو خدا پر اتنا توکل بھی نہیں جتنا ایک دوست

پر بھروسہ ہوتا ہے اگر ایک دوست یہ کہہ دے کہ شام کو تمہاری دعوت ہے تو فوراً چولہا ٹھنڈا کر دیں گے اور خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ومامن دابة فی الارض الا علی الله رزقها

اور کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔

مگر خدا کے وعدوں پر ایسا اطمینان نہیں ہوتا یہ ان کی غلطی ہے اس لئے کہ دوست کی دعوت پر اس واسطے چولہا ٹھنڈا کیا ہے کہ اس نے وقت کی تعیین کر دی تھی کہ شام کو دعوت ہے اور تعیین میں یہ خاصہ طبعی ہے اور خدا تعالیٰ کا وعدہ مطلق ہے کسی وقت کی اس میں تعیین نہیں ہے۔ اگر یہاں بھی تعیین ہوتی تو کوئی مسلمان ہرگز چولہا گرم نہ کرتا۔ یہاں اہل توکل کو بھی عقلی توکل ہے۔

اسی طرح یہ واعظین یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو غیر خدا سے تو خوف ہے حاکم کا ڈر ہے۔ شیر اور سانپ بچھو کا ڈر ہے مگر خدا کا ایسا خوف نہیں ہے کہ یہ بھی ان کی غلطی ہے کیونکہ ان اشیاء سے طبعی خوف ہے اور خدا تعالیٰ سے طبعی خوف ہونا ضروری نہیں بلکہ عقلی خوف ہونا چاہئے اور خوف عقلی کا حاصل یہ ہے کہ احتمال کے درجہ میں یہ خیال ہو کہ شاید مجھے سزا ہو یہ ایسا خوف ہے کہ اس کے ساتھ رجا بھی ہے کیونکہ جس کو یہ احتمال ہوگا کہ شاید مجھے سزا ہو اس کو یہ احتمال بھی ہوگا کہ شاید بدوں سزا ہی کے مغفرت ہو جائے۔ یہ رجاء ہے اور ایمان اسی کا نام ہے کہ خوف بھی ہو رجاء بھی ہو۔

یہاں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے انبیاء کی نسبت فرمایا ہے۔ **یخشونه ولایخشون احدا الا الله** کہ وہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں آیا ہے کہ وہ اژدہا سے ڈر گئے تھے۔ جواب یہ ہے کہ وہ خوف طبعی تھا اور نص میں خوف عقلی مراد ہے اور خوف عقلی انبیاء کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ہوتا کیونکہ ان کا اعتقاد یہ ہے۔

وما هم بضآرین به من احدالا باذن الله.

کہ بدوں خدا کے حکم سے کوئی چیز ضرر نہیں دے سکتی۔

وہ ضار و نافع حق تعالیٰ ہی کو سمجھتے ہیں اسی طرح کاملین کو جب عقلی خدا کے سوا کسی سے نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا مبنیٰ اس بات پر ہے اور خدا تعالیٰ کے سوا کسی میں بھی بالذات

کمالات نہیں ہیں ہاں حب طبعی یعنی عشق غیر خدا سے بھی ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ جس کا امر ہے وہ حب عقلی ہے نہ کہ طبعی اسی لئے نصوص میں حب طبعی عشق کا عنوان کہیں مذکور نہیں ہے بلکہ جا بجا حب کا ذکر ہے۔

مگر ایک غالی نے قرآن میں بھی لفظ عشق کا دعویٰ کیا ہے کہنے لگا کہ حم عسق میں عشق کا ذکر ہے اصل میں یہ لفظ عشق ہی تھا مگر نعوذ باللہ! نعوذ باللہ! چونکہ حضور امی تھے۔ آپؐ سے شین نہیں نکل سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے آپ کی رعایت سے سین بولا مگر اس احمق سے کوئی پوچھے کہ سارے قرآن میں جو شین کا استعمال ہوا ہے یہ کس پر اترا ہے۔ اگر حضور شین نہیں نکال سکتے تھے تو اور جگہ شین کا استعمال کیوں ہوا۔

ایک صاحب نے کہا کہ نہیں یہ وجہ تو نہیں بلکہ شین کے نقطے اس لئے اڑا دیئے تا کہ مولویوں کو پتہ نہ چلے کہ یہ عشق کا ذکر ہے۔ سبحان اللہ! اگر یہ وجہ تھی تو حق تعالیٰ نے تم جیسے بھانڈا پھوڑوں کو یہ راز کیسے بتلا دیا۔ اگر یہ وجہ ہوتی تو حق تعالیٰ ایسے لوگوں کو یہ راز بتلاتے جو مولویوں پر اس کو ظاہر نہ کرتے اور جب تم نے اس راز کو مولویوں تک پہنچا دیا ہے تو لازم آیا کہ خدا نے ایک بات چھپانا چاہا تھا مگر وہ چھپ نہ سکی اور یہ محال ہے۔ اس لئے تمہارا یہ نکتہ بھی غلط ہے غرض یہ جاہلوں کے نکتے ہیں جن کے سر نہ پاؤں سو اس طرح تحریف کر کے اگر عشق کا ثبوت دیا جائے تو اس کا علاج نہیں ورنہ نصوص میں عشق کا کہیں ذکر نہیں اس سے معلوم ہوا کہ حب طبعی مطلوب نہیں بلکہ حب عقلی مطلوب ہے۔

غلبہ حال

پس یہاں سے ان سالکین کی غلطی معلوم ہو گئی جو تربیت میں مختلف لوگوں کے حالات غلبہ خوف و بکاء کو دیکھ کر افسوس کیا کرتے ہیں کہ ہم کو ایسے ایسے حالات نہیں ہوتے۔ رونا نہیں آتا۔ تو وہ سن لیں کہ یہ طبعی گریہ ہے جو بعض کو پیش آتا ہے اور یہ مطلوب نہیں مطلوب عقلی گریہ ہے اور وہ تم کو بھی حاصل ہے کیونکہ نہ رونے پر افسوس ہونا یہ خود گریہ ہے (پس میں افسوس کو تو منع نہیں کرتا بلکہ اس افسوس سے اپنی محرومی کے اعتقاد کو منع کرتا ہوں سو تم اپنے کو محروم نہ سمجھو بلکہ اس افسوس کے ہونے سے شکر کرو کہ عقلی گریہ تم کو حاصل ہے۔)

بہر حال میرے نزدیک حب طبعی سے حب عقلی راجح ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ حب عقلی والوں میں حب طبعی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلبہ حب عقلی کو ہوتا ہے باقی جن پر حب عقلی کا غلبہ ہوتا ہے بعض اوقات ان میں محبت طبعیہ بھی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن پر محبت طبعیہ کا غلبہ ہے مگر وہاں محبت طبعیہ پر حب عقلی غالب ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر جوش دبا رہتا ہے۔ لیکن گاہے کاملین پر بھی حب طبعی کا غلبہ ہو جاتا ہے اور یہی اس کی دلیل ہے کہ ان میں بھی طبعی محبت ہے مگر حب عقلی کے غلبہ نے اس کو دبا رکھا تھا۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حضورؐ پر بھی غلبہ حال ہوا ہے۔ واقعہ بدر کے متعلق آیا ہے کہ اس دن حضورؐ عریش میں مسلمانوں کی فتح کے لئے دعا فرما رہے تھے کہ اے اللہ! ان مسلمانوں کو کافروں پر غلبہ دے پھر فرمایا۔

اللهم ان تهلک هذه العصابة لم تعبدْ بعد اليوم (الصحيح لمسلم: ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، مسند الامام احمد ۱: ۳۲)

الٰہی! اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہوگئی تو آج کے بعد سے دنیا میں آپ کا نام کوئی نہ لے گا۔ بتلایئے یہ کیا تھا غلبہ حال ودلال نہ تھا تو اور کیا تھا۔ بہر حال کاملین تو حب عقلی و طبعی دونوں کے جامع ہوتے ہیں مگر ان میں غلبہ حب عقلی کو ہوتا ہے اور ناقصین میں حب طبعی ہوتا ہے اور یہ گو کمال مطلوب نہیں مگر محمود ضرور ہے۔

انسان اور عشق

جو دونوں سے کورا ہو وہ خطرہ میں ہے مولانا فرماتے ہیں۔

نافرشته لانشد اهر يمنی ست لانشد کے معنی ہیں فانی نشد۔ اور فانی سے مراد صاحب محبت ہے۔ کیونکہ فنا محبت ہی سے حاصل ہوتی ہے بدوں محبت کے طاعات و عبادت کی صورت تو متحقق ہوسکتی ہے مگر فنا نفس حاصل نہیں ہوسکتا اور بدوں فناء نفس کے طاعات کی حقیقت نہیں متحقق ہوتی۔ جس پر وصول موقوف ہے حافظ فرماتے ہیں۔

میاں عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

عاشق و معشوق میں کوئی پردہ نہیں تو خود ہی حجاب ہے حافظ درمیان سے علیحدہ ہو۔

انسان خود ہی حجاب ہو رہا ہے ورنہ حق تعالیٰ تو اتنے قریب ہیں کہ بس تمہیں حاجب

ہواور کوئی مسافت حاجب نہیں۔ اپنے اوپر نظر کرنا چھوڑ دو اپنے کو نیست و نابود سمجھو تکبر کو دماغ سے نکال دو حق تعالیٰ کے احکام میں منازعت نہ کرو۔ بس واصل ہو گئے۔

اسی لئے حضرت بایزید نے جب خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا اور عرض کیا دلنی علی اقرب الطرق الیک مجھے آپ اپنے نزدیک آنے کا قریب ترین راہ بتایئے تو جواب ارشاد ہوا یا بایزید دع نفسک وتعال یعنی اپنے آپ کو چھوڑ کر چلے آؤ۔

یعنی خودی وخود بینی کو چھوڑ کر۔ اور تجربہ ومشاہدہ ہے کہ خودی وخود بینی محبت ہی سے نکلتی ہے اس کے بغیر بہت کم نکلتی ہے اسی لئے عراقی طریق محبت کی تمنا کرتے ہیں۔

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

رہ قلندر سے طریق عشق مراد ہے اور رسم پارسائی سے طریق عبادت رسمی مطلب یہ ہے کہ طریق عبادت رسمی بہت دور دراز ہے اس میں وصول دیر سے ہوتا ہے کیونکہ خودی دیر سے نکلتی ہے فنا جلدی نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر وقت خطرہ ہے اور طریق عشق سے بہت جلد فنا حاصل ہو جاتی ہے۔ شیطان اسی لئے مردود ہوا کہ اس کو فناءِ نفس حاصل نہ تھی۔ کیونکہ محبت سے کورا تھا۔ اور ملائکہ میں محبت تھی اس لئے وہ فوراً سجدہ میں گر پڑے کیونکہ وہاں نفس نہ تھا اور ملائکہ سے زیادہ انسان میں محبت ہے اسی لئے یہ امانت کا حامل ہوا۔ جس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہم نے قرآن کی امانت کو زمینوں آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن۔

فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان

سوانہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔

ہم نے (اپنی) امانت کو آسمانوں اور زمین) اور پہاڑوں پر پیش کیا یعنی اور انسان پر بھی پیش کیا۔ جس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے حملها الانسان آ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ بدوں عرض کے وہ حامل امانت نہ ہو سکتا تھا اس لئے یہ ماننا لازم ہے کہ عرض میں انسان بھی دوسروں کے ساتھ تھا۔ مگر چونکہ آگے حمل میں اس کا ذکر آ رہا ہے اس لئے یہاں بیان کی ضرورت نہ تھی اور یہی جواب اس اشکال کا ہے کہ بعض لوگوں نے۔

واذقلنا للملآئکة اسجدو الأدم فسجدوآ الا ابلیس

جب اللہ نے تمام ملائکہ کو سجدہ آدم کے لئے کہا تو تمام نے فرمان بجالایا مگر شیطان نے انکار کیا۔

پر شبہ کیا کہ شیطان کے مردود ہونے کی وجہ کیا ہے اس کو تو سجدہ کا حکم ہوا ہی نہیں بلکہ **واذقلنا للملئکة اسجدوا** سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف ملائکہ کو ہوا تھا۔ نہ معلوم ان صاحبوں کو شیطان کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے شاید کبھی رات کو ہم بستر ہوئے ہوں گے۔

جواب اشکال کا یہ ہے کہ عدم ذکر ذکر عدم کو مستلزم نہیں اور یہاں اس کے ذکر کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ آگے الا ابلیس میں اس کا ذکر آ رہا ہے۔ یہ اس کا قرینہ ہے کہ وہ بھی مخاطب تھا بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کا ذکر آگے موجود ہو تو کلام سابق میں اکتفا باللاحق اس کا ذکر نہیں کیا کرتے جیسا کہ یہاں عرض امانت میں انسان کا ذکر اس لئے نہیں ہوا کہ آئندہ **حملها الانسان** (اسے انسان نے اٹھایا) میں اس کا ذکر موجود ہے یہ جواب اس اشکال کا بہت سہل ہے اس میں استثناء متصل و منفصل کی بحث کی ضرورت نہ رہے گی۔ بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ابلیس کا ذکر کلام سابق میں ایجزاً محذوف ہے اور تقدیر کلام اس طرح تھی **واذقلنا للملئکة والابلیس اسجدوا** (اور جب تم نے فرشتوں اور ابلیس سے کہا کہ سجدہ کرو) یہ جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور تمام مخلوقات پر پیش کی۔ امانت سے مراد احکام تکلیفیہ ہیں جن کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ اگر امتثال ہوا تو ثواب ملے گا اور نافرمانی پر عذاب ہوگا۔ عذاب کو سن کر سب ڈر گئے مگر انسان نے ہمت کی اور تحمل کے لئے آمادہ ہو گیا۔

محققین نے لکھا ہے کہ اور مخلوق میں عشق کا مادہ نہ تھا انسان میں عشق کا مادہ تھا یہ خطاب الٰہی کی لذات سے مست ہو گیا اور اس لذت کے لئے اس نے احتمال عذاب کی بھی پروانہ کی اور کہہ دیا کہ حضرت یہ امانت مجھے دی جائے میں اس کا تحمل کروں گا۔ بس وہی مثل ہوئی کہ چڑھ جا سولی پر اللہ بھلا کرے گا۔ اس نے سوچا کہ جس امانت کی ابتدا یہ ہے کہ کلام و خطاب سے نوازے گئے اگر اس کو لے لیا تو پھر تو روز کلام و سلام و پیام ہوا کرے گا بس ایک سلسلہ چلتا رہے گا کہ آج کوئی حکم آ رہا ہے کل کو دوسرا آ رہا ہے۔ کبھی عنایت ہے کبھی عتاب ہے تو پھر اس چھیڑ میں بھی بڑا مزہ ہے۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حمل امانت کا راز یہی بتلایا ہے کہ اس کا منشاء محبت کی دیوانگی تھی۔ فرماتے ہیں۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید ۔۔۔ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند
(آسمان جس امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکا اس کا قرعہ مجھ دیوانہ کے نام نکلا)

علاج النفس

بعض لوگوں نے اس راز کو قرآن سے بھی ثابت کرنا چاہا انہوں نے **انه کان ظلوما جهولا** (وہ ظالم ہے جاہل ہے) کو اسی پر محمول کیا ہے اور اس کی مدح کہا ہے کہ چنانچہ بعض صوفیا نے ظلوم کی تفسیر میں لکھا ہے اس کے معنی ظلوم لنفسہ ہیں مطلب یہ ہے کہ انسان میں فنائے نفس کی صفت تھی مگر میں اس تفسیر کو نہیں مانتا کیونکہ ظلم لنفسہ بھی تو شریعت میں محمود نہیں بلکہ مذموم ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے کفار کے باب میں فرمایا ہے **کانوا انفسهم یظلمون** وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو کیا وہ بھی فانی تھے؟

مگر آج کل ایک جماعت نکلی ہے جو نفس کی دشمن ہے کہتے ہیں اس کو خوب مارو۔ اس پر خوب ظلم کرو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کو کافر بھی کہتے ہیں حالانکہ سارے بدن میں اگر تلاش کرو تو مومن یہی نکلے گا۔ تو حضرت آپ نفس کو کافر کہہ کر خود اپنے ہی کو کافر کہتے ہیں پھر تمہارا کیا اعتبار پس نفس پر ظلم کرنا یہ کچھ تصوف نہیں ہے۔ حضورؐ کا تصوف تو یہ ہے۔

ان لنفسک علیک حقا و ان لعینک علیک حقا و ان لجسدک علیک حقا (مسند الامام احمد ۲: ۲۶۸)

تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا اور تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے۔

نفس کے بھی تمہارے ذمہ حقوق ہیں ان کو ادا کرنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ بس ظلم ہی پر کمر باندھ لو۔ بلکہ اس کے ساتھ بچہ کا سا معاملہ کرو کہ بچوں سے جب کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اول اس کو مٹھائی وغیرہ دے کر بہلاتے ہیں اگر اس سے نہ مانے تو دھمکی سے کام لیتے ہیں اگر اس سے بھی نہ مانے تو بس دو چپت دو چپت۔ صاحب قصیدہ بردہ فرماتے ہیں۔

النفس کالطفل ان تحملہ شب علی ۔۔۔ حب ارضا و ان تفطمہ ینفطم

بس اس کے حظوظ کو تو پورا نہ کرو بقدر حقوق ادا کرتے رہو۔ خوب کھلاؤ پلاؤ اور اچھی طرح کام لو۔

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

(جس مزدور کا دل خوش رکھا جائے وہ بہتر کام کرتا ہے)

ہاں جب کسی طرح باز نہ آئے تو اب سزا دو مگر خود سزا نہ دو بلکہ کسی کے حوالہ کر دو۔ وہ مناسب سزا تجویز کرے گا۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل ہی نہیں راہ میں خود بینی و خود رائی شرک ہے)

ورنہ جو لڑکا اپنے ہاتھ سے چپت مارے گا وہ تو آہستہ مارے گا اور محقق سزا کافی دے گا مگر حقوق تلف نہ کرے گا بہر حال نفس کو کافر کہنا گویا اپنے کو کافر کہنا ہے۔ شاید یہ لوگ تواضعاً اپنے نفس کو برا بھلا کہتے ہیں مگر ایسی بھی کیا تواضع ہے کہ مسلمان سے کافر بن گئے۔

بعض کی تواضع بھی الٹ ہوتی ہے جیسے ایک شخص کا نام نتھو تھا جب کوئی اس سے نام پوچھتا تو وہ تواضعاً کہا کرتا تھا کہ میرا نام ہے آخ تھوکنے کا گویا شیخ نتھو۔

جیسے ایک دو جنٹلمین ہمیں ریل میں ملے تھے۔ بڑے ہی شریر تھے انہوں نے ایک مصنف صاحب کا مذاق اڑا رکھا تھا۔ جب کھانا کھانے بیٹھے تو ایک نے کہا منصف صاحب آیئے آپ بھی کچھ گوہ موت کھا لیجئے تو دوسرا کہتا ہے توبہ کرو توبہ تم کھانے کو گوموت کہتے ہو۔ تو وہ جواب دیتا ہے کہ اپنے کھانے کو کھانا کہنا تکبر ہے۔ اس کو اس حیثیت سے کہ ہمارا ہے گوہ موت ہی کہنا چاہئے غرض سارے غیر منصف جمع تھے سب نے مل کر مصنف صاحب کا اچھا خاکہ اڑایا تو جیسے ان لوگوں کو تواضع تھی ایسی ہی ان صوفیوں کی تواضع ہے جو نفس کو کافر کہتے ہیں اور نفس پر ظلم کرنے کو اچھا سمجھتے ہیں مگر ہمارے نزدیک یہ سب غلو ہے۔ البتہ اگر یہ کسی مغلوب الحال سے منقول ہو تو وہ معذور ہوگا۔ مگر اس کی تقلید نہ کی جائے گی اسی طرح ان لوگوں نے جہول کی تفسیر کی ہے کہ یہ بھولا نادان ہے۔ اپنی مصالح سے بے خبر ہے اس لئے تحمل امانت پر آمادہ ہو گیا۔ مگر یہ تفسیر بھی غلط ہے کیونکہ آگے حق تعالیٰ نے ظلم و جہول کے آثار کی تفصیل فرمائی ہے۔

لیعذب اللہ المنافقین والمنافقات والمشرکین والمشرکات

تا کہ اللہ تعالیٰ منافق مرد و عورتوں کو مشرک مرد و عورتوں کو عذاب دے۔

اگر حق تعالیٰ نے ظلوما جہولا میں انسان کی مدح کی ہے اور ایسا ہونا ممدوح ہے تو آگے

تفصیل میں یہ منافقین وکفار پر عتاب ولعنت وعذاب کیوں مذکور ہے اس لئے یہ تفسیر بھی صحیح نہیں۔

پس قرآن سے تو یہ مسئلہ مستنبط نہیں ہو سکتا لیکن عارفین کے قول سے یہ بات ثابت ہے کہ منشاء تحمل امانت کا غلبہ محبت وعشق تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان میں یہ صفت سب سے زیادہ ہے۔ یہ ملائکہ سے بھی اس باب میں بڑھا ہوا ہے۔ مگر انفع یہی ہے کہ طبعی محبت عقلی سے مغلوب ہونا چاہئے لیکن اگر کبھی بلا اختیار عقلی مغلوب ہو اور طبعی غالب ہو تو گو ایسا شخص مقتدا تو نہ ہوگا مگر قابل ملامت بھی نہ ہوگا بلکہ معذور ہوگا۔ اسی جماعت مغلوبین معذورین میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اہل ظاہر کہلاتے ہیں جن کے نزدیک جمع بین اسوعین من التمر کا وہی حکم ہے جو جمع بین الاختین کا پس وہ بھی غلبہ محبت طبعی سے معذور ہیں۔

اسی طرح ایک غیر مقلد کی حکایت ہے کہ ان کی نواح میں سخت قحط ہوا لوگوں نے گھر بار بیچ بیچ کر کھالیا ان غیر مقلد صاحب کے یہاں ایک گائے تھی جس کے دودھ میں خداتعالیٰ نے برکت دے رکھی تھی۔ زمانہ قحط میں ان کا گھر بھر اس کے دودھ سے گزارا کرتا تھا۔ اس لئے زیادہ پریشانی نہ ہوئی جب قحط رفع ہوا تو کسی مہمان نے ان غیر مقلد صاحب سے پوچھا کہ تم نے کیوں کر گزر کیا۔ بیوی بول پڑی ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے ایک گائے دے رکھی تھی۔ اس کے دودھ سے سب نے گزر کیا غیر مقلد صاحب سنتے ہیں غصہ میں بھر گئے اور بیوی سے بولے کہ تو نے خدا کو چھوڑ کر گائے پر نظر کی اور یہ کہہ کر گائے کے گلے پر چھری پھیر دی۔

تو گو ہمارے نزدیک یہ بات تشدد اور غلو میں داخل ہے کیونکہ مسلمان کوئی بھی گائے کو رازق نہیں سمجھتا ہے بلکہ ایک ظاہری سامان ہے۔

اور رازق حقیقی خدا ہی کو سمجھتا ہے چنانچہ اس عورت نے بھی اس حقیقت کو اس طرح ظاہر کر دیا تھا کہ ہم کو تو خدائے تعالیٰ نے ایک گائے دے دی تھی۔ مگر پھر بھی ہم ان کے اس فعل کی قدر کرتے ہیں کہ اس وقت ان پر مذاق توحید غالب تھا۔ اس لئے اتنی بات بھی ناگوار ہوئی کہ گزارہ کا سبب گائے کو بتلایا گیا۔ اسی حالت میں وہ معذور تھے۔

گو وہ لوگ ہم کو برا کہیں گے مگر ہم تو جو بات قابل قدر ہوگی اس کی قدر ہی کریں گے کیونکہ ہمارے یہاں تو انصاف ہے اور ان کے یہاں ان صاف یعنی صفائی منفی اسی لئے ہم اہل ظاہر کی اس بات کی بھی قدر کرتے ہیں کہ جس حکم کی علت شارع نے ہمیں بتلائی وہ اس کی

علت تلاش نہیں کرتے بلکہ ظاہر پر رکھتے ہیں۔ مگر فقہاء محققین نے قیاس سے ان احکام کی علل بیان کی ہیں اور چونکہ قیاس مظہر ہے نہ کہ مثبت اس لئے احکام قیاسیہ بھی ویسے ہی ہیں جیسے احکام منصوصہ پس وہ کالمذکور فی النص ہیں مگر یہ سن لو کہ ہر شخص کو علل بیان کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ مجتہد کو حق ہے اور مجتہد کو بھی ہمیشہ حق نہیں بلکہ وہاں تعلیل کا حق ہے جہاں تعدیہ حکم کی ضرورت ہو اور جو امور تعبدی ہیں جن کا تعدیہ نہیں ہو سکتا وہاں قیاس کا مجتہد کو بھی حق نہیں۔ اسی لئے فقہاء نے صلوٰۃ وصوم زکوٰۃ وحج میں تعلیل نہیں کی کہ ان کی فرضیت کی بناء یہ ہے حتیٰ کہ اگر یہ بنا کسی دوسرے طریقہ سے حاصل ہو سکے تو دوسری صورت اختیار کرنا جائز ہو۔ ہرگز نہیں بلکہ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ امور تعبدیہ ہیں ان کی علت بیان کرنا جائز نہیں۔

ایک جدید فرقہ

مگر آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جس کو علل نکالنے کا بہت شوق ہے وہ تمام احکام کی علتیں نکالتے ہیں خواہ تعبدی ہوں یا غیر تعبدی انہوں نے ایک چیز ایجاد کی ہے جس کا نام فلاسفی ہے نہ معلوم یہ کون سالغت ہے۔ اس کا استعمال ان کے یہاں بہت سستا ہے بس ہر چیز کی فلاسفی نکالتے ہیں کہ نماز کی یہ فلاسفی ہے روزہ کی یہ فلاسفی ہے اور زکوٰۃ وحج کی یہ فلاسفی ہے۔

انہی میں سے ایک صاحب مجھ سے ملے کہنے لگے کہ پانچ وقت نماز فرض ہونے کی کیا فلاسفی ہے میں نے کہا کہ آپ کی ناک جو آگے لگی ہوئی ہے اس کی کیا فلاسفی ہے کہنے لگے کہ اچھی لگتی ہے اگر پیچھے ہوتی تو بدنما لگتی میں نے کہا اگر سب کی ناک پیچھے ہی ہوتی تو یہی اچھا لگا کرتی (پھر اگر محض اچھا لگنا بھی فلاسفی ہے تو یہی جواب ہمارا ہے کہ پانچ وقت کی نماز اللہ تعالیٰ کو اچھی لگتی ہے ان کو پسند ہے اس لئے فرض کر دی)۔

علی گڑھ میں ایک صاحب مجھ سے ملے جو وہاں کالج میں پروفیسر اور عربی وانگریزی کے فاضل شمار ہوتے تھے مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ جہاں زنا کی کثرت ہوتی ہے وہاں بیماری وبا وغیرہ پھیل جاتی ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کیا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا وجہ ربط درمیان جنایت وعقوبت کے سمجھ میں نہیں آئی کہنے لگے مدلول تو ظاہر ہے وجہ ربط سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا پھر ضرر کیا ہوا کہنے لگے اطمینان

میں نے کہا اطمینان کے نافع ہونے کی کیا دلیل ہے کہنے لگے اگر اطمینان نافع نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی درخواست نہ کرتے۔ **لیطمئن قلبی** (تاکہ میرے دل کو تسلی ہو) میں نے کہا اس کی کیا دلیل کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نافع ہو وہ آپ کے لئے بھی نافع ہو (اور اگر مان بھی لیا جاوے کہ ایسی طمانیت نافع ہے تو جس سے ابراہیم علیہ السلام نے طمانیت کا سوال کیا تھا۔ اسی سے آپ بھی کر لیجئے اب آگے ان کو اختیار ہے چاہے آپ کی تسلی کریں نہ کریں۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ علماء کے ذمہ بھی یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی تسلی اور اطمینان کیا کریں ان کے ذمہ تو محض تبلیغ احکام ہے اور بس) اس جواب سے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس جواب سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ علماء کو یہ مسائل معلوم نہیں۔ علماء کو بحمد اللہ اسرار شریعت بہت کچھ معلوم ہیں مگر ہم آپ کو نہیں بتلاتے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ تو مجلس عارفین میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہ ہو)

گو اس میں بظاہر ایک دعویٰ تھا مگر التکبر مع المتکبرین عبادۃ متکبر لوگوں کے ساتھ تکبر سے پیش آنا عبادت ہے۔

ایسے لوگوں کے ساتھ تواضع مناسب نہیں کیونکہ اس سے وہ علماء کو عاجز و لاجواب سمجھنے لگتے ہیں اس لئے میں نے کہہ دیا کہ ہم کو حکمت معلوم ہے جب وہ اٹھ کر چلے گئے اور خاص احباب کا مجمع رہ گیا۔ تب میں نے اس کی حکمت جو اپنے بزرگوں سے سنی تھی بیان کی۔ بعض کو بڑا افسوس ہوا کہ وہ صاحب اگر یہ تقریر سن لیتے تو ان کی تسلی ہو جاتی اور معلوم ہو جاتا کہ علماء کے پاس یہ علوم ہیں میں نے کہا ہرگز نہیں۔ کیا میں اپنی لیاقت جتلانے کو مریض کا مرض بڑھا دیتا ان کے مرض کا یہی علاج تھا کہ حکمت نہ بتلائی جائے کیونکہ یہ لوگ حکمتیں بکسر حاء ہی کو مقصود اور حکمت بضم حاء کو غیر مقصود سمجھتے ہیں۔

اس کے متعلق ایک مضمون یاد آیا جس کو میں نے ایک بار بیان کیا تھا کہ جو لوگ احکام کی حکمتیں بیان کرتے ہیں وہ دین کی جڑ کھوکھلی کرتے ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ کسی وقت یہ

حکم ومصالح کسی اور صورت میں زیادہ حاصل ہوں تو پھر حکمت کو بیکار سمجھا جائے گا۔

مثلاً نماز باجماعت کی حکمت آج کل یہ بیان کی جاتی ہے کہ شریعت مسلمانوں میں اتحاد واتفاق پیدا کرنا چاہتی ہے اس لئے پانچ وقت کی جماعت مقرر کی تا کہ ہر محلہ کے آدمی اپنی اپنی مسجدوں میں باہم مل کر ایک دوسرے کی حالت سے باخبر ہوں۔ باہم سلام وکلام کریں تبادلہ خیال ہو۔ نہ معلوم یہ تبادلہ خیالات کیا بلا ہے۔ پھر سارے شہر کے آدمیوں کو جمع کرنے کے لئے ہفتہ میں ایک بار جمعہ کی نماز مقرر کی گئی کیونکہ روزانہ شہر بھر کے آدمیوں کا اجتماع دشوار تھا پھر اطراف وجوانب کے دیہاتیوں کو جمع کرنے کے لئے سال بھر دو دفعہ عید کی نماز شروع ہوئی تا کہ دیہاتی شہریوں سے مل کر تہذیب سیکھیں اور ضروریات سے باخبر ہوں۔ پھر تمام دنیا کے آدمیوں کو ایک جگہ میں جمع کرنے کے لئے عمر بھر میں ایک دفعہ حج فرض ہوا تا کہ ایک دفعہ سب مسلمان تمام بلاد اسلام کے ایک جگہ میں جمع ہو کر تبادلہ خیالات کریں۔

اول تو اس مدعی سے کوئی پوچھے کہ (اگر نماز جمعہ کی حکمت یہ ہے کہ سارے شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوں تو چاہئے کہ جمعہ کی نماز ایک ہی مسجد میں ضروری ہو۔ تعدد جمعہ جائز نہ ہو حالانکہ حنیفہ کا مفتی بر قول جواز تعدد ہے نیز عیدین کی نماز میں جو حکمت بتلائی گئی ہے جب حاصل ہو سکتی ہے جب کہ دیہاتیوں پر بھی عیدین کی نماز واجب ہو حالانکہ دیہات والوں پر عید کی نماز کہاں واجب ہے اور حج کے متعلق جو حکمت بتلائی گئی ہے وہ مشاہدہ کے بالکل خلاف ہے وہاں تبادلہ خیالات سے اتفاق تو کیا ہوتا ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں میں سفر حج سے پہلے اتفاق تھا وہاں جا کر راستہ میں لڑتے ہیں کہ گھر پر کبھی نہ لڑے ہوں گے اسی لئے حق تعالی نے حج میں خصوصیت کے ساتھ جدال کو منع فرمایا ہے **ولا جدال فی الحج** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کو جدال میں کچھ دخل ضرور ہے جبھی تو خاص طور پر اس سے منع فرمایا (ورنہ **لافسوق** میں سب گناہوں کے ساتھ یہ بھی آ گیا تخصیص بعد تعمیم کی کوئی توجہ ہے)

اگر یہ حکمت تسلیم کر لی جائے تو اس بناء پر حکم کرنے میں یہ خرابی ہوگی کہ جو شخص ان اعمال کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ ان حکمتوں کو مقصود سمجھتا ہے تو اگر کبھی کسی عارض کے سبب نماز وحج وغیرہ سے یہ حکمتیں حاصل نہ ہوں یا کم حاصل ہوں اور کسی دوسری صورت سے بہ سہولت حاصل ہوں اور کامل طور پر حاصل ہوں تو یہ شخص نماز وحج کو چھوڑ کر اس دوسری

صورت کے اختیار کو ترجیح دے گا اور اس میں جو کچھ خرابی ہے ظاہر ہے کہ اس سے احکام اسلام ہی کا انہدام ہو جائے گا پس جو لوگ یہ حکمتیں بیان کر کے اپنے کو حامی اسلام اور خیر خواہ اسلام کہتے ہیں ان کی یہ خیر خواہی ایسی ہی ہے جیسے ریچھ کی دوستی۔

ایک شخص نے ریچھ کو تعلیم دے کر پنکھا جھلنا سکھایا جب آقا سو جاتا تو وہ اس کو پنکھا جھلا کرتا۔ لوگوں نے اس کو منع کیا کہ جانور کا کچھ اعتبار نہیں تم سوتے ہوئے اس سے خدمت نہ لیا کرو کہنے لگا واہ صاحب میرا ریچھ تعلیم یافتہ ہے کچھ خطرہ کی بات نہیں۔ ایک دن یہ قصہ ہوا کہ ریچھ نے پنکھا جھلنا شروع کیا اس شخص کی ناک پر ایک مکھی آ بیٹھی ریچھ نے اس کو اڑا دیا وہ پھر آ بیٹھی بعضی مکھی بہت لیچڑ ہوتی ہیں کتنا ہی اڑاؤ پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں جب ریچھ اڑاتے اڑاتے تنگ ہو گیا تو غصہ میں ایک بڑا سا پتھر رہا کہ اب کے آ وے گی تو پتھر سے ماروں گا وہ پھر آ بیٹھی تو ریچھ نے تاک کر پتھر مارا مکھی تو نہ معلوم مری یا نہیں مگر آقا کے دماغ کا بھرتہ ہو گیا۔

دیکھئے! اس بیچارے نے بھی اپنے نزدیک تو آقا کی خدمت ہی کی تھی مگر نادان دوست کی دوستی کا یہ نتیجہ ہوا کہ دشمن تو ہلاک نہ ہوا دوست ہی کا بھرتہ ہو گیا۔

اسی طرح ایک بادشاہ کا باز اڑ کر کسی بڑھیا کے گھر جا پڑا تھا۔ اس کو باز پر رحم آیا ہے کہ بے چارہ تھک کر گر پڑا ہے تو اس کو خوب کھلایا پلایا پھر دیکھا کہ اس کے ناخن بڑھے ہوئے ہیں کہنے لگی افسوس بے چارہ کی کسی نے خبر نہیں لی۔ ناخن اتنے لمبے ہو گئے۔ ان سے تکلیف ہوتی ہوگی اس نے محبت میں آ کر قینچی سے ناخن تراش دیئے۔ پھر دیکھا کہ اس کی چونچ بھی ٹیڑھی ہے کہنے لگی اس ٹیڑھی چونچ سے کھانے پینے میں تکلیف ہوتی ہوگی۔ قینچی سے اسے بھی کچھ تراش دیا پھر دیکھا کہ اس کے بازو ئیں بہت بڑی بڑی ہیں۔ کہنے لگی ہائے یہ اسی واسطے نہیں اڑ سکتا بازوؤں کا بوجھ بہت ہے قینچی سے کچھ کچھ بازو بھی کاٹ ڈالے اب وہ لنڈورا باز ہو گیا بڑھیا بے چاری نے تو اپنے نزدیک سب کام خیر خواہی سے کئے تھے مگر حقیقت میں یہ سب بدخواہی تھی۔

اسی طرح ہمارے بھائی اسلام کے ساتھ خیر خواہی کے گمان میں بدخواہی کر رہے ہیں۔ اپنے نزدیک تو وہ احکام کی حکمتیں بیان کر کے اسلام کی حقانیت ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ مذہب بالکل مطابق عقل کے ہے مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ ان حکمتوں پر احکام کی بنا کرنے سے اسلام کی جڑ کھوکھلی ہو رہی ہے کہ اس سے ایک وقت میں یہ احکام مٹ جائیں گے محض

حکمتیں رہ جائیں گی اس طرح سے کہ جب لوگ یہ سمجھیں گے کہ ان احکام سے اتفاق و اتحاد مقصود ہے اور پھر یہ دیکھیں گے کہ یہ حکمت کلب گھر میں جانے سے زیادہ حاصل ہوتی ہے جہاں ہر قسم کی آسائش و راحت بھی ہے۔ تو پھر یقیناً وہ کلب گھر میں جانے کو مسجد میں جانے پر ترجیح دیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ کسی وقت اسلام پر قائم رہنے سے اتفاق حاصل نہ ہو سکا اور تبدیل مذہب سے اس کا حصول متوقع ہوا تو جو لوگ ان حکمتوں پر احکام کی بنا سمجھے ہوئے ہیں۔ عجب نہیں کہ اس وقت وہ مذہب بھی بدل دیں اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہر شخص کو احکام کی حکمتیں نکالنے کا حق نہیں اور نہ ہر حکم کی علت بیان کرنا جائز ہے۔ البتہ محض مجتہد کو یہ حق ہے اور وہ بھی مطلقاً نہیں بلکہ تعدیہ حکم کے لئے اور وہ بھی سب علماء کے نزدیک نہیں۔ چنانچہ اوپر بیان ہوا ہے کہ اس میں بھی دو فرقے ہیں ایک اہل ظاہر جو سوائے علل منصوصہ کے اور کسی علت کا تلاش کرنا جائز نہیں سمجھتے اور فقہاء محققین جو تعدیہ حکم کے لئے صرف احکام غیر معتد بہا کی علل کا تلاش کرنا جائز سمجھتے ہیں باقی حکمتوں کا تجسس کرنا باجماع اہل حق غیر ضروری اور بعض جگہ مضر ہے۔ اس اجماع کے مخالف صرف نیچری ہیں جو ہر حکم کی حکمت کو ہی تلاش کرتے ہیں اس لئے میں نے اس مسئلہ پر تنبیہ کر دی۔

قاعدہ یہ ہے کہ جہاں شارع نے خود حکمت بتلا دی ہو خواہ صراحۃً یا دلالۃً یا الہاماً وہاں تو حکمت کا دعویٰ قطعاً یا ظناً یا احتمالاً جائز ہے اور جہاں شارع نے حکمت سے بالکل سکوت کیا ہو وہاں اس کے درپے ہونا جائز نہیں۔

حکمتوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے جواہرات کا شاہی خزانہ کہ اگر بادشاہ از خود اپنے خزانہ کی سیر کرا دے تو عنایت ہے اس وقت ضرور سیر کرنا چاہئے اور معلوم کرنا چاہئے کہ یہ یاقوت ہے یہ مرجان ہے یہ زمرد ہے۔

اس مثال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک بزرگ نے حکمتوں کے بارہ میں ایک کتاب لکھی ہے اس میں جواہرات ہی کے نام سے ان کو معنون کیا ہے چنانچہ کہیں یاقوت کا عنوان ہے کہیں زمرد کا کہیں الماس کا بلکہ اس میں بجائے الماس کے صرف ماس لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں الف لام اصلی نہیں بلکہ اصلی لفظ ماس ہے اس پر الف لام تعریف کا زیادہ کیا گیا ہے مگر استعمال میں وہ جزو کلمہ ہی بنا لیا گیا اور آج کل اغ

لام کا اتنا خرچ ہے کہ بہت سے اعلام میں الف لازم کو جزو علم بنایا جاتا ہے چنانچہ کتب و رسائل کے نام ہو گئے ہیں الہارون، المامون وغیرہما۔

اس کے متعلق ہمارے مولانا عبدالعلی صاحب کا لطیفہ ہے کہ الف لام کی چار قسمیں تو نحاۃ نے بیان کی ہیں۔ لام استغراق وعہد خارجی وعہد ذہنی ولام جنس مگر آج کل پانچویں قسم اور بھی ہے یعنی لام نیچریت پھر فرمایا کہ آج کل جو اعلام پر الف لام داخل کیا جاتا ہے یہ الف لام نیچریت کا ہے کیونکہ زیادہ عادت ان ہی کی ہے۔

غرض بادشاہ اگر خود اپنی خوشی سے خزانہ کی سیر کرادے تو یہ اس کی عنایت ہے مگر تمہارا درخواست کرنا جرم ہے چنانچہ اگر کوئی شخص از خود ایسی درخواست کرتا ہے تو گستاخ سمجھ کر دربار سے نکال دیا جاتا ہے یہی حال حکم کا ہے کہ خود ان کے درپے نہ ہونا چاہئے اور جن احکام کی حکمتیں معلوم ہو جائیں ان کو مبانی ومناشی احکام کا نہ سمجھے بلکہ خود ان کو احکام سے ناشی سمجھے ان شرائط کے ساتھ حکمتوں کے سمجھنے کا مضائقہ نہیں قرآن میں جہاں کہیں حکم کے بعد لام غایت آیا ہے وہ علت نہیں ہے حکمت ہے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس حکم پر یہ اثر مرتب ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ حکم کی بنا اس پر ہے مگر اب تو لوگوں نے حکمت کو علت بنا رکھا ہے۔

اس طرز سے حکمتیں بیان کی جاتی ہیں جس سے حکم کی بنا انہی پر معلوم ہوتی ہے یہ طریقہ غلط ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر بیان حکمت کا مضائقہ نہیں۔ اس صورت میں یہ مفسدہ نہ ہوگا کہ کلب گھر کو جو بعض جگہ تو کلب گھر بھی ہو جاتا ہے نماز باجماعت پر ترجیح دی جائے۔

حکمتوں کی تفصیل

اب سنئے چونکہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے احکام کی حکمتیں خود بیان فرمائی ہیں اس لئے ان کے بیان میں مضائقہ نہیں بلکہ ان کو سمجھنا ضروری اور مفید ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

یرید اللّٰہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر

(اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی فرمانا چاہتے ہیں نافرمانی نہیں چاہتے)

صوم کے احکام اداء وقضا بیان کر کے فرماتے ہیں کہ ہم تم پر آسانی کرنا چاہتے ہیں دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتے چنانچہ حکم قضا میں تو یہ آسانی ہے کہ معذور ومسافر کے ذمہ یہ

لازم نہیں کہ چاہے کیسا ہی عذر ہو تب بھی ادا ہی رکھو بلکہ یہ اجازت دی گئی کہ پھر جب چاہو رکھ لو۔ رہا یہ کہ حکم اداء میں کیا سہولت ہے ظاہر اً تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی اگر تعمیم ہوتی کہ جب چاہو رکھ لو کسی خاص زمانہ کی قید نہ ہوتی تو اس وقت سہولت ہوتی اور اگر اداء ہی واجب نہ ہوتا تو اور زیادہ سہولت تھی یعنی روزہ مشروع ہی نہ ہوتا چنانچہ کل ہی ایک سائل نے مجھ سے کہا تھا کہ بڑی آسانی تو یہ تھی کہ روزہ فرض ہی نہ ہوتا۔ میں نے کہا اس میں کیا آسانی تھی بلکہ یہ محرومی تھی۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ جائیداد ہی نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ تو کیا جائیداد نہ ہونا بھی کوئی لطف ہے (اس جواب کی تفصیل آگے آتی ہے)

تو سنئے ادا میں تو یہ سہولت ہے کہ ایک مہینہ معین کرنے سے سب مسلمان مل کر ساتھ ہی روزہ رکھتے ہیں اور جو کام سب مل کر کرتے ہیں وہ آسان ہو جاتا ہے تجربہ کر لیا جائے کہ تنہا روزہ رکھنا جاڑوں میں بھی گراں اور دشوار ہو جاتا ہے اور رمضان چاہے کیسے ہی گرمی کے ہوں ان میں روزہ آسان ہے کیونکہ ایک طرف ہے سب کا ایک حال ہوتا ہے اسی لئے اہل عرب کا مقولہ ہے۔ البلیۃ اذا عمت طابت مصیبت جو عام ہوتی ہے خوشگوار ہو جاتی ہے۔

اور فارسی مثل ہے مرگ انبوہ جشنے دارد اسی کو سعدی فرماتے۔

پائے در زنجیر پیش دوستاں بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

(دوستوں کے ساتھ جیل میں رہنے سے غیروں کے ساتھ باغ میں رہنے سے بہتر ہے)

دوستوں کے سامنے قید میں رہنا اس لئے تو اچھا ہے کہ وہ سب کے سب غم میں شریک ہو جاتے اور غم کو بانٹ لیتے ہیں اور بیگانوں کے ساتھ باغ کی سیر اس لئے بری ہے کہ وہ خوشی میں ساتھ نہیں دیتے غرض جس طرح خوشی بھی شراکت احباب ہی سے بھلی معلوم ہوتی اسی طرح رنج بھی شرکت احباب سے کم ہو جاتا ہے تو ادا کی تعیین میں یہ لطف ہے کہ دن بھر سب ایک حال میں رہتے ہیں اور افطار میں سب کے سب کیسے خوش ہوتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ روزہ ہی نہ ہوتا تو سب سے زیادہ آسانی تھی اس کا جواب یہ ہے کہ سہولت اسی وقت تک سہولت ہے جب تک اس کا ثمرہ صورت مشقت سے کم نہ ہو اور اگر مشقت مثمر ہو اور سہولت غیر مثمر تو اس صورت میں اس کو کوئی بھی سہولت نہیں کہتا توضیح اس کی یہ ہے کہ فرض کرو

ایک شخص کو ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ جس کے حصول کی دو صورتیں ہیں ایک یہ تجارت کرے دوسرے یہ کہ ملازمت یا زراعت کرے اور ان میں سے ہر صورت ایسی ہے کہ اس میں ہزار روپے مل جانے کی توقع ہے تو اس وقت مثلاً کہا جائے گا کہ زراعت و تجارت دشوار ہے اور ملازمت آسان ہے اب اگر کوئی کہنے لگے کہ سب سے آسان صورت تو یہ ہے کہ کچھ بھی نہ کرو۔ گھر بیٹھے رہو تو اس کو کوئی عاقل سہولت نہیں سمجھتا کیونکہ اس طرح ہزار روپیہ نہیں مل سکتا۔ اس کو تو ہر کس محرومی اور کم ہمتی سے تعبیر کرے گا محرومی ایسی ناگوار چیز ہے کہ اس پر انسان اس مشقت کو ترجیح دیتا ہے۔ جس میں گو تعب اور دشواری ہے مگر حصول ثمرہ کی توقع ہے۔

پس یہ بات محقق ہوگئی کہ یسر و عسر کے مقابلہ میں کسی صورت کو یسر جبھی کہا جاتا ہے۔ جب کہ مثمر ہونے میں عسر کے برابر ہو اور جو صورت مثمر ہی نہ ہو وہ یسر ہرگز نہیں بلکہ عسر سے بھی اشد اور ناگوار تر ہے۔

اب سمجھئے کہ روزہ بھی ایک بڑی دولت عظمیٰ ہے یہ ایسی نعمت ہے کہ اس سے بے انتہا ثواب ملتا ہے اور درجات میں ترقی ہوتی ہے تو اس میں بھی یسر کا مصداق وہی صورت ہو سکتی ہے جس میں ثواب تو عسر کے برابر ملے اور پھر سہولت ہو اور اگر روزہ ہی مشروع نہ ہوتا تو یہ ثواب بالکل نہ ملتا۔ تو اس میں کون سی آسانی تھی۔ دراصل آسانی کی حقیقت راحت ہے اور راحت حصول راحت ہی میں ہے نہ کہ محرومی میں پس عدم مشروعیت صوم کے مقابلہ میں تو روزہ کی مشروعیت صوم کے بعد چونکہ مثمر ہونے میں کئی صورتیں برابر ہیں تو ان میں سے جو صورت میں ادا سہل ہو وہ یسر ہوگی اور جس میں ادا دشوار ہو وہ عسر ہوگی۔

لطف و قہر

یہیں سے یہ سوال بھی حل ہوگیا کہ ہم پہلے عالم ارواح میں تھے اور اگر وہیں رہتے تو اچھا تھا کہ وہاں قرب ہی قرب تھا۔ بعد کا نام نہ تھا یہاں عالم ناسوت میں آ کر کیا فائدہ ہوا گھس گھس میں مبتلا ہوگئے بعد میں پڑے گئے اسی لیے بعض اہل حال اس حالت کو اشتیاق سے یاد کرتے ہیں چنانچہ عارف جامی فرماتے ہیں۔

حبذا روزے کہ پیش از روز و شب   فارغ از اندوہ و آزاد از طلب

متحد بودیم باشاہ وجود   حکم غیریت بکلی محو بود

الٰی آخر ہا اس عالم ناسوت سے پہلے کیا اچھا زمانہ تھا کہ ہم بغیر کسی غم کے اور بغیر ضرورت طلب کے شاہ وجود کے ساتھ متحد تھے اور غیریت کا حکم بالکلیہ محو تھا۔

مگر محققین نے فرمایا ہے کہ نہیں یہاں آنا ہی اچھا ہوا۔ اور ان علائق میں مبتلا ہونا بھی قرب ہے بلکہ اس قرب سے بڑھ کر ہے کیونکہ قرب کی اقسام ہیں بعض قرب بصورت بعد ہوتا ہے جیسے بعض لطف بصورت قہر ہوتا ہے چنانچہ بعضے امیر ہوتے ہیں مگر طاعات سے بے فکر ہوتے ہیں تو یہ لطف بصورت قہر ہے اور بعض دفعہ قہر بصورت لطف ہوتا ہے۔

جیسے ایک بچہ کو میاں جی کئی کئی دن تک کچھ نہیں کہتے حالانکہ وہ سبق یاد نہیں کرتا نہ آموختہ سناتا ہے مگر میاں جی کسی بات پر تنبیہ نہیں کرتے یہ بچہ اپنے دل میں خوش ہے کہ میاں جی مجھے بہت چاہتے ہیں کہ باوجود کوتاہیوں کے مجھے کچھ نہیں کہتے یہ قہر بصورت لطف ہے اور دوسرے بچے کو روز مارتے ہیں اس پر وہ پہلا بچہ ہنستا ہے کہ نالائق تجھے میاں جی نہیں چاہتے اسی لئے روز پیٹتے ہیں مگر۔

فسوف تری اذا انکشف الغبار   افرس تحت رجلک ام حمار

عنقریب دیکھ لے گا تو جب آنکھوں سے غبار اتر جائے گا کہ تیرے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

ایک دن جو میاں جی نے سب کا امتحان لیا کہ سبق سناؤ جو لڑکا روز پٹتا تھا وہ تو فر فر سناتا چلا گیا کہ میاں جی بھی خوش ہو گئے اور خوب شاباش دی اور بہت تعریف کی اور دوسرا لڑکا جو کبھی نہ پٹتا لفظ لفظ پر غوطے کھانے لگا اس پر سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگے اور آخر میں مکتب سے نکال دیا گیا اب وہ لڑکا اس سے پوچھتا ہے کہ بتلاؤ کل کس پر لطف تھا۔ اب وہ تسلیم کرے گا کہ اس پر قہر بصورت لطف تھا اور دوسرے پر لطف بصورت قہر تھا ہمارے حاجی صاحب نے اس نکتہ کو قبض کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ لطف بصورت قہر ہے مولانا فرماتے ہیں۔

چونکہ قبض آید تو دروے بسط بیں   تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں
چونکہ قبضے آیدت اے راہرو   آں صلاح تست آیس دل مشو

(جب قبض پیش آئے تو اس میں بسط کا ملاحظہ کرو خوش وخرم رہو پیشانی پر بل نہ ڈالو۔ جب تم کو قبض کی حالت پیش آئے تو وہ تمہاری اصلاح باطنی کیلئے ہے اس سے رنجیدہ مت ہو)

مولانا بھی اسی کو تعلیم دے رہے ہیں کہ قبض کو صلاح ولطف سمجھو اور اس میں بسط کو دیکھو۔ ایسے ہی بعض یسر بصورت عسر ہوتا ہے جیسا کہ روزہ میں بظاہر دشواری ہے مگر ثواب و ترقی پر نظر کر کے یہ سب مشقت عین یسر ہے۔ خصوصی جب اس کی صورت بھی آسان تجویز کی گئی۔ اسی طرح اس وقت جو ہم اس عالم میں آ کر علائق میں مبتلا ہو گئے یہ بھی قرب بصورت بعد ہے کیونکہ عالم ارواح میں ہم ناقص تھے۔ حق تعالی کو زیادہ قرب عطا فرمانا منظور تھا اس لئے یہاں بھیج دیا کیونکہ بہت سے اقسام قرب وہ ہیں جو بصورت صلوۃ اور صورت صوم پر موقوف تھے۔ بعض قرب وہ ہیں جو صورت حج پر موقوف ہیں یہ روح مجرد کو بدوں جسم کے کیونکر حاصل ہوتے وہ تو لنڈی لنڈی کھڑی رہتی۔ وہاں چہرہ ہی نہیں تو نماز میں وضع الجبہہ کیسے ہوتا وغیرہ وغیرہ تو روح ان اقسام قرب کی تحصیل سے بالکل عاجز تھی اگر عالم ارواح سے یہاں نہ آتی تو یہ قرب خاص کیسے حاصل ہوتا نماز روزہ کی دولت کیونکر ملتی اس لئے جن پر حب عقلی کا غلبہ ہے وہ تو اس پر نظر کر کے یہاں کی قید سے خوش ہو کر یوں کہتے ہیں۔

اسیرت نخواہد رہائی زبند شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی کا خواہش مند نہیں تیرا شکار جال سے خلاصی کا خواہش مند نہیں)

وہ تو چاہتے ہیں کہ دس برس کی جگہ بیس برس اور زندہ رہیں تا کہ بہت سے اعمال صالحات کا ذخیرہ ساتھ لے جائیں اور کسی باپ بیٹے کی فاتحہ کے محتاج نہ ہوں بلکہ اتنا زندہ رہیں کہ خود ہی اوروں کی فاتحہ دلایا کریں مگر جن پر حب طبعی کا غلبہ ہے وہ اس قید سے گھبرا کر پہلی حالت کا اشتیاق ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محبوب کا قرب صورۃ حاصل ہو جائے چاہے درجے بھی نہ ملیں ہم کو نہ درجات کی ضرورت ہے نہ کسی کے ایصال ثواب کی چنانچہ ایک مغلوب کا قول ہے۔

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقی ست

(اے نیاز ہم مخلوق سے ایصال ثواب کی تمنا نہیں رکھتے میرے لئے میرا عشق

میرے لئے خود ایصال ثواب کرے گا)

نیاز کو تو عقل کم ہوتی ہی ہے اس لئے یہ تو ایسی ہی کہیں گے حیرت ہے نیاز ہو کر ایسی بے نیازی اور جن پر حب عقلی کا غلبہ ہے وہ یوں کہتے ہیں۔

اے کہ بر ما مے روی دامن کشاں — از سر اخلاص الحمدے بخواں

(اے وہ شخص جو پاس سے دامن جھاڑ کر گزر گیا ذرا اخلاص سے ہمارے ایصال ثواب کیلئے ایک مرتبہ سورۃ الفاتحہ پڑھے جانا)

وہ تو ادنیٰ سے ادنیٰ عمل کے محتاج ہیں۔ اور اس کے لئے زندگی کی درازی کے طالب ہیں ہم نے دو قسم کے بزرگوں کو دیکھا ہے ان کو بھی جن پر حب طبعی کا غلبہ تھا اور زندگی نہ چاہتے تھے اور ان کو بھی جن پر حب عقلی کا غلبہ تھا اور وہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔

شاہ فضل الرحمٰن صاحب ایک دفعہ بیمار ہوئے پھر اچھے ہو گئے تو فرمایا کہ ہم ایک بار بیمار ہو گئے ہم کو مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے ایک رات حضرت سیدہ فاطمہ زہرہؓ کو خواب میں دیکھا انہوں نے ہم کو چھاتی سے لگالیا بس صبح ہی کو اچھے ہو گئے مولانا بڑے صاف تھے تصنع بالکل نہ تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تو حدیث میں آیا ہے کہ جب ملک الموت ان کے پاس قبض روح کے واسطے آئے تو آپ نے ان کے ایک طمانچہ مارا وہ بے چارے حق تعالیٰ کے پاس واپس گئے اور عرض کیا۔

انک ارسلتنی الی رجل لا یرید الموت

آپ نے مجھے ایسے شخص کے پاس بھیجا جو مرنا نہیں چاہتا۔

سو طمانچہ مارنے کی خواہ کچھ ہی توجیہ ہو لیکن ملک الموت کے قول سے موسیٰ علیہ السلام کی شان لا یرید اموت کی تو معلوم ہوئی جس پر کوئی نکیر نہیں کیا گیا معلوم ہوا کہ طول حیات کی خواہش بھی منافی کمال دلالت نہیں وہ دنیا کی عمر کو موجب زیدت سمجھ کر یہ چاہتے تھے کہ اور زندہ رہیں تا کہ قرب میں اور ترقی ہو۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا دنیا میں آنا گو بصورت عتاب تھا مگر حقیقت میں یہ

عنایت تھی کہ حق تعالیٰ نے یہاں بھیج کر ہمارے لئے ترقی کی راہیں کھول دیں۔ اگر جنت ہی میں رہتے تو وہ رہنا ایسا ہوتا جیسے گھر کی زمینداری ہوتی ہے جس میں ایک ہزار مثلاً بچت ہے بس وہی اوڑھنا بچھونا ہے اسے ہی کھالو پہن لو پھر کچھ نہیں اور یہاں آنا ایسا ہے جیسے کوئی زمیندار ملازمت پر چلا جائے کہ گھر کی زمینداری الگ رہی اور ماہواری تنخواہ الگ رہی۔ اب وہ بہت زمانہ کے بعد لاکھوں روپیہ لے کر گھر جائے گا۔ تو اسے معلوم ہوگا کہ گھر پر رہنے کا اب مزا ہے۔

اسلام نگر کے ایک صاحب ہیں حیدر آباد میں انسپکٹر ہیں گو انسپکٹری کا مضاف الیہ بہت برا ہے مگر ان کی تنخواہ بہت ہے دو ہزار روپے ماہوار۔ اب جس وقت وہ پنشن لے کر ہزاروں لاکھوں ساتھ لائیں گے تو ان کو اسلام نگر میں رہنے کا لطف ان لوگوں سے زیادہ آئے گا جو محض گھر کی زمینداری پر قناعت کئے ہوئے وہاں رہتے ہیں۔

اسی طرح آدم علیہ السلام کا دنیا میں آنا گویا ملازمت پر آنا ہے کہ یہاں خوب دولت جمع کر کے پھر بے فکری کے ساتھ اصلی وطن میں جائیں گے پس آدم علیہ السلام کا زمین میں اترنا بھی صورت قہر میں لطف تھا اور ان پر جو عتاب ہوا وہ بھی لطف تھا باقی عصیٰ آدم فرمانا یہ محبوبانہ انداز ہے محبوب اپنے عشاق کو جو چاہے کہہ لیتے ہے کبھی عاصی کبھی غاوی بلکہ کبھی عاشق بھی محبوب کو ظالم یا ستمگر کہہ دیتا ہے جس سے وہ برا نہیں مانتا مگر براہ مہربانی آپ ان سنے ہوئے الفاظ کی نسبت اپنی طرف بطور نقل بھی نہ کریں ورنہ آپ کے عصا لگے گا بعض لوگوں کو سنے ہوئے الفاظ کی نقل کا شوق ہوتا ہے مگر اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

چنانچہ ایک صاحب نے کسی مہذب آدمی کو سنا کہ جب وہ مجلس سے جانے لگے تو صاحب خانہ سے کہا کہ میں مرخص ہونا چاہتا ہوں آپ کو اس لفظ کے استعمال کا شوق ہوا۔ دیر تک سوچتے رہے کہ ہم بھی اٹھتے ہوئے یوں ہی کہیں گے اتفاق سے کچھ دیر کے بعد مرخص کی جگہ زبان پر مخنث چڑھ گیا اب جب آپ اٹھنے لگے تو فرماتے ہیں کہ میں بھی مخنث ہونا چاہتا ہوں صاحب خانہ نے کہا کہ اپنی چیز کا آپ کو اختیار ہے۔ جو چاہے کیجئے میں کیا عرض کروں۔ اب آپ ان کا منہ تکتے ہیں۔ مجھے یہ نیا خطاب کیوں دیا جا رہا ہے۔

اسی طرح ایک صاحب نے کسی کو سنا تھا کہ اس نے ایک شخص کے بیٹے کی تعزیت میں یوں کہا تھا خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آپ نے اس لفظ کو یاد کرلیا۔ اتفاق سے کسی کا باپ مر گیا تھا۔ آپ اس کی تعزیت کو گئے تو اس سے بھی فرماتے ہیں کہ خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے۔ تو حضرت سنے ہوئے الفاظ نقل کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے بہرحال حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے ساتھ لطف و یسر ہی کیا ہے گو صورۃً عسر تھا۔

مشروعیت احکام صیام

اسی طرح روزہ میں بھی یسر ہے ادا میں بھی اور قضا میں بھی احتمال ہے کہ **یرید اللہ بکم الیسر** کا تعلق کلام سابق کے ہر ہر جزو سے الگ الگ نہ ہو بلکہ مجموعہ سے ہو مطلب یہ ہوگا کہ مجموعہ احکام اداء و قضا میں یسر کی رعایت ہے گو کسی ایک جزو ہی کے لحاظ سے ہو۔ اس صورت میں ادا کے لئے یسر تلاش کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ مگر ظاہر پہلا ہی احتمال ہے کہ ہر جزو سے الگ الگ اس کا علاقہ ہے کیونکہ ادا میں بھی یسر کا ہونا مشاہدہ ہے اور یہ یسر تو دائمی ہے بعض اوقات یسر خاص بھی ہوتا ہے چنانچہ اس رمضان میں درمیان کے چند روزے کیسے دشوار معلوم ہوتے تھے جس سے اندیشہ تھا کہ اخیر کے روزے بہت سخت ہوں گے مگر فوراً ہی ایسی ٹھنڈی ہوئی ہے کہ اخیر کے روزے بہت ہی آسان ہوگئے۔ اور **یرید اللہ بکم الیسر** (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی فرمانا چاہتے ہیں) کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں اعانت کا وعدہ ہے کہ یہ حکم دے کر ہم تمہارے لئے آسانی اور سہولت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ تم کام شروع کرو ہم تائید و توفیق و تیسیر کریں گے۔

اب یہاں ایک سوال ہے وہ یہ ہے کہ **ولتکملوا العدة** (تاکہ تم گنتی پوری کرلو) کس کی علت غائیہ ہو جاتی ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتے ہیں تاکہ تم بسہولت اس شمار کو پورا کرلو۔ مگر واؤ کی وجہ سے اشکال پڑ گیا کہ یہ واؤ کیسا ہے اور عاطفہ ہے تو اس کا معطوف علیہ کیا ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے اور معطوف علیہ **کتب علیکم**

الصیام ہے اور **لتکملوا العدۃ** کا عامل مقدر ہے اور وہ معطوف ہے تقدیر عبارت یوں تھی۔

کتب علیکم الصیام انح و شرع لکم صیام رمضان لتکملوا العدۃ ولتکبروا اللہ علی ماھداکم

یعنی تم پر روزہ فرض کیا ہے اور رمضان کا روزہ تعیین کے ساتھ اس لئے مشروع ہوا تا کہ اس نعمت عظمیٰ پر خوش ہو کر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کرو کہ اس نے تم سے کام پورا کرا دیا **ولعلکم تشکرون** اور تا کہ ان احکام میں تمہاری جن مصالح و منافع کی رعایت کی گئی ہے ان کا مشاہدہ کر کے شکر کرو۔ حاصل اس تاویل کا یہ ہوا کہ کلام سابق میں احکام کی تفصیل تھی اور حکمتوں کا اجمال تھا اور اس کلام میں حکمتوں کی تفصیل ہے اور ذکر احکام کا اجمال ہے تو یہ ایک لطیف ایجاز ہے کہ صرف واؤ سے اجمالاً تمام احکام سابقہ پر اشارہ ہو گیا۔

ایک تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ **یرید اللہ بکم الیسر** کو بھی معرض عت میں مانا جائے اس صورت میں **والتکملوا** کا عطف معنیٰ **یرید اللہ** پر ہو جائے گا اور **لتکملوا** کو حکم قضا کی علت کہا جاوے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے دا کا حکم اس لئے مشروع کیا کہ ہم تم پر آسانی کرنا چاہتے ہیں اور قضا کا حکم اس لئے مشروع کیا تا کہ عذر کی حالت میں رمضان کا روزہ فوت ہو جائے تو دوسرے وقت میں تم شمار کو پورا کر سکو اور رمضان کی برکات حاصل کر سکو۔ اس صورت میں تفصیل حکم کے ساتھ تفصیل احکام بھی ہو گی کہ ہر حکمت ایک ایک حکم کی طرف الگ الگ مشیر ہے۔ آگے **والتکبروا اللہ ولعلکم تشکرون** کا تعلق سب کے ساتھ مجموعۃً ہو گا۔

ایک لطیف توجیہ اس مقام پر واؤ لانے کی شاہ عبدالقادر صاحب نے کسی اور آیت میں بیان فرمائی ہے وہ یہ کہ احکام دنیویہ جو معلل بالغایت ہوتے ہیں عموماً وہ احکام خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ وہ غایات مقصود ہوتی ہیں مگر احکام شرعیہ میں ایسا نہیں ہے وہ ہر حال میں خود بھی مقصود ہوتے ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے یہاں علت پر واؤ عطف داخل فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ یہاں معطوف علیہ مقصودیت بالذات ہے اور معطوف مقصودیت لغایات معنیٰ کلام کے یہ ہوں گے۔ **شرع لکم بہ الاحکام لمقصودیتھا بالذات**

ولغايات الاكمال والتكبير والشكر یعنی یہ احکام صرف ان علتوں ہی کی وجہ سے مقصود نہیں بلکہ یہ احکام خود بھی مقصود ہیں اور علل کی وجہ سے بھی مقصود ہیں حتی کہ اگر ان میں کوئی بھی حکمت نہ ہوتی جب بھی حق تعالیٰ کا حکم دینا بجا تھا اور اس میں لطیف اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ حق تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے بلکہ اغراض سے الگ ہو کر بھی مقصود ہیں۔ پس حقیقت میں وہ حکم نتائج ہیں نہ کہ مبانی۔

یہ الفاظ شاہ صاحب کے نہیں ہیں۔ انہوں نے بہت سہل لفظوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے میں نے اہل علم کی آسانی کے لئے اس کو اصطلاحی لفظوں سے تعبیر کر دیا۔

غرض یہاں مشروعیت احکام صیام کی متعدد حکمتیں مذکور ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ **یرید اللہ بکم الیسر** کو بحکم علت مان کر صرف صیام ہی کے ساتھ مخصوص نہ کہا جاوے بلکہ تمام احکام شرعیہ کی طرف راجع کیا جاوے جس میں صوم ہی کی کیا تخصیص ہے، ہم کو تو تمام احکام سے یہی مقصود ہے کہ تم پر آسانی کریں اور راحت دیں۔ اب بتلایئے حق تعالیٰ کے برابر کون شفیق حاکم ہو سکتا ہے کہ وہ محض ہماری راحت ہی کے لئے حکم دیتے ہیں ان کی کوئی منفعت نہیں۔

صاحبو! ماں باپ بھی اگر بیٹے کو کوئی حکم دیتے ہیں تو اس میں بھی ان کی کوئی نہ کوئی ذاتی غرض ضرور ہوتی ہے اور کچھ نہ ہو تو ان کی راحت سے اپنے کو راحت دینا مقصود ہوتا ہے پس سب کے سب طالب اغراض ہیں مگر حق تعالیٰ کے ان احکام میں کوئی اپنی غرض نہیں ہے بلکہ وہ تو محض ہماری آسانی اور راحت کے لئے احکام مقرر فرماتے ہیں اور تمام احکام شرعیہ میں آسانی عام ہونے کی دلیل دوسری آیت میں صریحاً مذکور ہے۔ **ماجعل علیکم فی الدین من حرج** اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں۔

تو مطلب یہ ہوگا کہ ایک یہی حکم کیا بلکہ جملہ احکام میں مقصود یسر ہی ہے کیونکہ یسر مفعول ہے یرید کا پس یسر مراد و مقصود ہوا اب اس میں دو احتمال ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ خود حکم ہی یسر ہو دوسرے یہ کہ حکم میں یسر ہو۔ اس کو حدیث الدین یسر (دین آسان ہے) نے صاف کر دیا کہ اس میں حضورؐ دین ہی کو یسر فرما رہے ہیں فی الدین یسر نہیں فرمایا کیونکہ فی الدین

یسر میں یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یسر دین سے کوئی الگ شے ہے جو اس میں داخل ہو گئی ہے چونکہ یہاں ایسا نہیں تھا بلکہ جس چیز کا نام یسر ہے وہ دین ہی ہے اس لئے الدین یسر فرمایا ہے۔

دین کی حقیقت

صاحبو! لوگوں کو دین کی حقیقت معلوم نہیں اس لئے وہ اس کو دشوار سمجھتے ہیں مگر بخدا دین کی حقیقت لذت و راحت ہے ذرا اس پر عمل کر کے دیکھو تو ہر کام میں لذت و راحت معلوم ہو گی اسی لئے حضور فرماتے ہیں۔ **جعلت قرة عینی فی الصلوة** (فتح الباری لابن حجر ۱۱: ۳۴۵، کنز العمال ۱۸۹۱۲) کہ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

صاحبو! نماز اور ذکر میں وہ لذت ہے کہ اس کی مستی میں ذاکر ساری پریشانیوں کو بھول جاتا ہے۔

ایک بزرگ چند سال ہوئے اکبر جہاز میں سوار تھے جب کہ وہ طوفان میں آ رہا تھا اس جہاز کے مسافر مجھ سے جس قدر ملے سب پریشان تھے اور اس مصیبت کی حالت کو بڑے ہیبت ناک لہجہ سے بیان کرتے تھے مگر ان بزرگ سے جو میں لکھنؤ میں ملا تو وہ بڑے خوش تھے ہنس ہنس کر واقعہ بیان کرتے تھے کہتے تھے کہ اس وقت بڑا مزا آ رہا تھا جہاز میں ہر طرف نور ہی نور تھا کیونکہ سب لوگ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ تھے کوئی ذکر کر رہا تھا کوئی توبہ استغفار کوئی گناہوں پر رو رہا تھا بس بڑا مزہ آ رہا تھا ان لوگوں سے کوئی دین کی لذت کو پوچھے کہ وہ انوار ذکر کی لذت میں جہاز کا طوفان میں آنا اور غرق ہونے کو تیار ہونا بھی بھول گئے۔

اہل اللہ کو نماز روزہ میں ایسی لذت آتی ہے جیسے عاشق کو محبوب کے پیر دبانے اور پنکھا جھلنے میں انصاف سے کہئے کہ اگر کوئی محبوب عاشق سے یہ کہہ دے کہ بس اب پنکھا نہ جھلو۔ آرام سے بیٹھو۔ تو کیا عاشق خوش ہو کر یہ کہے گا کہ اچھا ہوا اس نے میرے ہاتھ نہیں دکھائے ہرگز نہیں تو آپ ذرا احکام شرعیہ پر عمل کر کے دیکھیں ان شاء اللہ لذت و راحت ہی حاصل ہو گی۔

باقی کبھی نماز میں کچھ عارضی مشقت پیش آ جاتی ہے یہ یسر کے خلاف نہیں کیونکہ ایسے اتفاقات تو آسان سے آسان کام میں بھی پیش آ جاتے ہیں کیا کھانا کھانے میں کبھی لقمہ نہیں

انکلنا یا پانی پیتے ہوئے پھندا نہیں لگتا تو پھر ان کو بھی دشوار کہنا چاہئے صاحبو! جب یہ بات ہے پھر چاہئے تو یہ تھا کہ حق تعالیٰ مسجد میں آنے کی آپ سے فیس لیتے کیونکہ یہاں آ کر نماز پڑھ کر تم کو راحت حاصل ہوتی ہے۔ اس راحت پر فیس لگ سکتی ہے مگر وہ تو ایسے کریم ہیں کہ تم کو راحت پہنچا کر اس پر بھی خود ثواب دیتے ہیں کہ تم نے راحت حاصل کر لی اس کا انعام لو کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ وہ کس کس طرح ہم کو راحت دینا چاہتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

بشر المشائین فی الظلم الی المساجد بالنور التام القیمۃ

(السنن الکبری للبیھقی ۳: ۶۳، ۶۴)

کہ جو لوگ اندھیرے میں چل کر مسجد میں آتے ہیں ان کو قیامت میں نور کامل حاصل ہونے کی بشارت دے دیجئے۔

بتلایئے اگر کوئی محبوب اپنے عاشق کو اجازت دے دے کہ رات کو اندھیرے میں آ کر ہم سے مل لو تو فیس لینے کا محبوب کو حق ہے یا عاشق کو۔ ظاہر ہے کہ محبوب ہی کو حق ہے مگر یہاں حق تعالیٰ خود ثواب کی بشارت دے رہے ہیں۔ پھر یہاں یہ بھی اجازت ہے کہ لالٹین ساتھ لے لو حالانکہ جب عشق میں پردہ ہے تو چاہئے تھا کہ روشنی میں۔ آنے کی اجازت نہ ہوتی مگر نہیں یہاں اس کی بھی اجازت ہے گو بعض اس کے بھی قائل ہیں کہ اگر راستہ میں خطرہ نہ ہو تو روشنی ہرگز ساتھ نہ لائی جائے یہ بھی ایک مذاق ہے بعضے عشاق گھونسہ بازی میں خوش ہیں کہ محبوب ذرا دو چار دھول بھی لگا دیا کرے کیونکہ یہ خصوصیت کی علامت ہے اسی طرح یہ لوگ عشاق کے تحمل کو افضل سمجھتے ہیں تاکہ خصوصیت ظاہر ہو۔ اور دوسرے اظہار تمیز سے بچتے ہیں تاکہ عشق کا پردہ رہے۔ ہر ایک مذاق محمود ہے کیونکہ مقصود سب کا اچھا ہے۔

عباراتنا شتی و حسنک واحد　　　وکل الی ذاک الجمال یشیر

عنوانات مختلف ہیں اور حسن حقیقی قرآن ایک ہی ہے ہر عنوان اس ایک ہی حسن کی طرف مشیر ہے۔

بہر حال حق تعالیٰ عشاق کے سنانے کو اس مقام پر اپنے احکام کی حکمتیں بیان فرما رہے ہیں کہ دیکھو ہم نے تم پر کیا کیا احسانات کئے ہیں اور عشاق کی تخصیص اس لئے کہ ان اعمال میں لذت وغیرہ کا احساس انہی کو ہوتا ہے تو یہ آیت کی تفسیر کے متعلق کلام تھا۔

انعام الٰہی

اب ختم رمضان کے مناسب جو مضمون اس میں ہے اس کو خاص طور پر بیان کرتا ہوں۔ سو ختم رمضان کے مناسب اس میں دو جز ہیں ایک **ولتکملوا العدة**۔ اس میں حق تعالیٰ نے اکمال عدت کو بھی حکمت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی مطلوب ہے۔ یعنی جس طرح رمضان کا آنا نعمت ہے اس کا خیر و خوبی سے ختم ہو جانا نعمت ہے کیونکہ اس میں امتثال امر پر کامیابی ہے اور جب بندہ امتثال حکم میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس سے ایک خاص فرحت حاصل ہوتی اور غلبہ مسرت میں یوں کہتا ہے۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

نمردیم کے معنی یہ نہیں کہ رمضان میں نہ مرنے پر شکر کرتے ہیں کیونکہ اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ رمضان میں مرنا تو خوش قسمتی ہے۔ پھر اس کے نہ ہونے پر خوشی کیسی۔ گو جیسے رمضان میں مرنا بھی خوش قسمتی ہے نہ مرنا بھی خوش نصیبی ہے کیونکہ زندہ رہنے میں زیادہ عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ مثلاً جو لوگ مر گئے انہوں نے تو پندرہ ہی روزے رکھے ایسے کم ہمت تھے اور جو زندہ رہے انہوں نے پورے تیس رکھے مگر پھر بھی یہاں نمردیم سے موت حقیقی کی نفی مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ شکر للہ کہ ہم رمضان میں مریل نہ ہو گئے۔ روزہ سے عاجز نہ ہو گئے کہ اب تو روزہ نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ بعضے ایسے بھی ہیں جنہوں نے مریل ہو کر روزے نہیں رکھے بلکہ بعضے تو ترک عمل سے متجاوز ہو کر ترک اعتقاد کو لے کر روزہ نماز کو منحوس سمجھتے ہیں۔

جیسے ایک میواتی کا قصہ ہے کہ اس نے روزہ رکھا تھا۔ اتفاق سے اسی دن بھینس مر گئی۔ تو کم بخت نے منہ کو لوٹا لگا کر پانی پی لیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہا لے رکھوا لے روزہ تو نے میری بھینس مار دی میں نے تیرا روزہ توڑ دیا' کم بخت پیٹ بھر ہی کے جاہل تھا۔

اس طرح ایک دیہاتی بڈھے کی حکایت ہے کہ بڑھاپے میں اس کے لڑکوں نے اس کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا اور بات بات پر اس کو برا بھلا کہنے لگے۔ بیچارے نے مجبور ہو کر ایک طرف اپنا پلنگ ڈال لیا اور نماز روزے میں مشغول ہو گیا۔ اتفاق سے لڑکوں کے بیل مر گئے۔ کچھ کھیتی میں نقصان آ گیا۔ تو سب کی رائے اس پر متفق ہوئی کہ یہ سب

نحوست بڈھے کے نماز روزے کی ہے بالآخر سب اسی کے پاس گئے اور خوشامد کر کے اس کو اپنے ساتھ شامل کیا اور کہا تو نماز نہ پڑھا کر۔ ہم سب تیری خدمت کیا کریں گے۔ اس نے کہا بہت اچھا! میں نے تو اسی واسطے نماز شروع کی تھی کہ اکیلا پڑا ہوا کیا کروں گا۔ اگر تم میری خدمت کرو اور ساتھ شامل رکھو تو پھر نماز کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ دنوں تو لڑکوں نے اس کی خوب خدمت کی۔ پھر گھبرانے لگے۔ تو بڈھے نے کہا لائیو اوجھو کا کلہڑا (وضو کا لوٹا) میں نماج گھال لوں (نماز پڑھ لوں) لڑکوں نے پھر ہاتھ پیر جوڑے کہ نہ تو نماز مت پڑھ۔ ہم اب سے پوری خدمت کریں گے۔ اب بڈھے کا یہی معمول ہو گیا کہ جہاں لڑکے خدمت میں کمی کرتے اور وہ اوجھو کا کلہڑا مانگتا۔ پھر سب ٹھیک ہو جاتے۔ کچھ ٹھکانا ہے اس جہالت کا کہ کم بختوں نے نماز کو ایسا منحوس سمجھ رکھا تھا۔

ہمارے اسی قصبہ میں ایک زمیندار کا لڑکا ذرا نماز روزہ کا پابند تھا تو اس کا تایا کہا کرتا تھا کہ ارے تو نماز پڑھ پڑھ کر ہاتھ پھیل کر کیا مانگا کرتا ہے۔ تیرے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ اس کے نزدیک گویا نماز روزہ وہ کرے جس کے گھر میں کھانے کو نہ ہو۔ وہ تو خدا سے مانگے اور جس کے پاس ضرورت کے موافق سب کچھ ہو اسے خدا کی کچھ ضرورت نہیں استغفراللہ!

تو صاحبو! اگر ہم بھی ایسے ہی ہو جاتے تو کیا ہوتا۔ یہ سب خدا کی عنایت ہے کہ وہ ہم سے کام لے لیں اور کام لینا اس لئے کہتا ہوں کہ سب باگیں ان ہی کے قبضہ میں ہیں۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

بس اپنا کچھ کمال نہ سمجھو نہ کسی گنہگار کو حقیر جانو۔ اس لئے کہتے ہیں۔

شکر للہ کہ نمردیم ورسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

شاید دوسرے مصرع پر کسی کو شبہ ہو کہ اس میں تو اپنی تعریف ہونے لگی اپنا کمال ظاہر کر رہے ہیں۔ تو خوب سمجھ لو کہ یہ اپنی تعریف نہیں بلکہ خداتعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہے کیونکہ ہمارے اندر دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہاتھ پاؤں، دماغ، آنکھیں وغیرہ ہمارے اعضاء ہیں۔ اس حیثیت سے ان کی تعریف کرنا مذموم ہے دوسری حیثیت یہ ہے کہ سب سرکاری مشینیں ہیں جو ہم کو عطا ہوئی ہیں۔ اس حیثیت سے اپنی ہمت پر آفرین ہے۔ یہاں معقول

سے کام لینا چاہیے اس حیثیت سے اپنے اعضاء کے ساتھ محبت کرنا بھی مذموم نہیں بلکہ محمود ہے کیونکہ اس صورت میں یہ اپنے ساتھ محبت نہیں بلکہ حق تعالیٰ کے ساتھ محبت ہے کہ اس نے ہم کو ایسی ایسی مشینیں عطا کی ہیں۔ اسی حیثیت سے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
افتم بپائے خویش کہ بکویت رسیدہ است

مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے محبوب کے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پڑتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ تک لے گئے ہیں۔

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را
کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اپنے ہاتھوں کو ہزار بار بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے محبوب کا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے۔

اس حیثیت سے اپنے اعضاء کا علاج بھی کرنا محمود ہے۔ اگر سر میں درد ہو تو تیل لگانا چاہیے۔ ان کی حفاظت ضروری ہے جیسے انجن کی مشین کو تیل دینا اور صاف کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ہاتھ پیر میں درد ہو تو اس کا مالش کرو زخم ہو جائے تو مرہم پٹی کرو اور سب میں یہ نیت کرو کہ اس سے صحت ہوگی تو عبادت کامل طور پر ادا ہوگی اور اگر یہ کہا جائے کہ معذور کی نماز بھی تو کامل ہی ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو معذور کی عبادت کا ثواب تندرست کے برابر ہو مگر تجربہ اکثر یہ ہے کہ حالتِ صحت میں جیسا تعلق بشاشت کا قلب کو حق تعالیٰ سے ہوتا ہے مرض میں وہ تعلق نہیں ہوتا تو اس لحاظ سے ہی دوا کرنا چاہیے جسم کو کھلاؤ نہیں۔ صحت کی قدر کرنا چاہیے اپنی جان کو مارنا کوئی تصوف نہیں نہ اس سے کچھ قرب ہوتا ہے ہاں اگر سمن مفرط ہو تو اس کے کم کرنے کی اطباء ضرور تدبیر کرتے ہیں۔ مگر اس وقت بھی اپنی رائے سے تقلیل غذا نہ کرو بلکہ شیخ کا اتباع کرو ورنہ بجائے نفع کے ضرر کا اندیشہ ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ذاکر کو تقلیل غذا سے منع فرمایا تھا۔ انہوں نے اپنے کچھ حالات بیان کیے۔ تو مولانا نے فرمایا کہ دماغ میں یبس آگیا ہے جنون کا مقدمہ ہے۔ تم تقلیل غذا موقوف کر دو اور دماغ کا علاج کرو۔ مگر وہ تو ان کشفیات کو کمال سمجھے ہوئے تھے اس لیے مولانا کے قول پر اعتماد نہ کیا۔ بالآخر جنون ہو گیا اور سارے اذکار و اشغال موقوف ہو گئے۔ پھر یہ حالت تھی کہ بالکل ننگے بیٹھے رہا کرتے۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ اپنے اعضاء کو سرکاری مشین سمجھ کر کبھی تیل بھی دیا کرو۔ دودھ گھی بھی کھایا کرو۔ اس حیثیت سے ان سے محبت کرنا۔ حفاظت کرنا اور جب ان سے خداتعالیٰ کے احکام کی تعمیل ہو جائے تو ان پر ان کی تعریف کرنا سب محمود ہے۔ یہی مطلب ہے اس شعر کا۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست　　آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

پس رمضان کا ختم ہو جانا بھی نعمت ہے کہ ہم سے حکم کی تعمیل ہوگئی اگر رمضان ختم نہ ہوتا تو اس کامیابی کی مسرت کیونکر حاصل ہوتی اور کامیابی پر جو انعام کثیر ملتا ہے وہ کیسے ملتا ہے۔ البتہ جس نے رمضان کو ضائع کیا ہو اس کے لئے ختم رمضان موجب حسرت ہے۔

جیسے اب محکمہ بندوست بند ہو گیا ہے تو ملازمت تلاش کرنے والے رو رہے ہیں کہ ہائے تنخواہ ملنے کا دروازہ بند ہو گیا۔ مگر ایک وہ ملازم ہیں جو زمانہ بندوست میں سرکاری خدمت انجام دے چکے ہیں۔ وہ اس کے بندوبست ہونے سے خوش ہیں کیونکہ ان کو حسن کارگزاری پر اتنا انعام ملا ہے کہ گھر بھر گیا ہے پھر بعض کو اس محکمہ کے بند ہو جانے پر دوسرے محکمہ کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے وہ تو اور زیادہ خوش ہیں اور حق تعالیٰ کے یہاں تو ہمیشہ یہی صورت ہوتی ہے کہ ایک محکمہ بند ہو جائے تو یہاں جو ایک دفعہ ملازم ہو گیا اس کے لئے گویا استمراری پٹہ لکھ دیا گیا ہے کہ عمر بھر ملازمت سے برخاست نہیں ہو سکتا۔ البتہ تبدیل محکمہ ہوتی رہتی ہے کہ اب روزہ رکھو اب حج کرو اب قربانی کرو اب نماز پڑھو چنانچہ رمضان ختم ہوتے ہی کل سے اشہر حج شروع ہو جائیں گے۔

دوسرا جزو ختم رمضان کے مناسب اس آیت میں لتکبروا اللہ ہے ایک تفسیر پر۔ کیونکہ بعض نے اس سے عید کی نماز مراد لی ہے جو ختم رمضان ہی پر ہوتی ہے جس میں اور نمازوں سے چند تکبیریں زیادہ ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ہم نے رمضان کا روزہ اس حکمت سے فرض کیا ہے کہ اس کو ختم کر کے تم انعام کامیابی کے مستحق ہو اور اس کامیابی پر حق تعالیٰ کی حمد وثنا خاص طریق سے کہ وہ صلوٰۃ عید ہے ظاہر کرو اور بعض نے تکبیر واللہ سے مطلق حمد وثنا مراد لی ہے اس تفسیر پر اس جزو کو خاص ختم رمضان ہی سے مناسبت ہے۔

تفسیر رحمۃ للعالمین

اب میں آیت کی تفصیل کے لئے دو حدیثیں پڑھتا ہوں جن میں سے ایک کو تو **لتکملوا العدۃ** سے مناسب ہے یعنی ختم رمضان سے اور ایک کو **لتکبروا اللّٰہ** سے تفسیر اول پر یعنی عید کی نماز سے مناسب ہے۔

پہلی حدیث تو یہ ہے کہ جس کے راوی غالباً ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شخصوں پر بددعا کی ہے کہ ان کی ناک رگڑی جائے ذلیل وخوار ہو جائیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کیسی ہوگی۔ شاید اس پر کوئی طالب علم یہ کہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے نہیں ڈرتے کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں دوسرے آپ نے حق تعالیٰ سے یہ بھی عرض کیا ہے۔

انما انا بشر فایما مومن اذیته او شمته او جلته او لعنته فاجعلهما له صلوة وزكوة و قربته تقربه اليک (مسند الامام احمد بن حنبل ۴۸۸:۲)

اے اللہ! میں بشر ہی ہوں (اس لئے عوارض بشریہ مجھے بھی لاحق ہوتے ہیں) تو جس شخص کو میں ایذا دوں یا برا بھلا کہوں یا سزا دوں یا کسی پر لعنت (بددعا) کروں تو اس کو اس کے حق میں رحمت اور گناہوں سے) پاکیزہ اور قربت کا سبب بنا دیجئے کہ اس کے ذریعے سے آپؐ اس کو اپنا مقرب بنالیں۔ تو جب آپؐ نے اپنی بددعا کے متعلق خود یہ دعا کی ہے کہ وہ سبب رحمت وقرب بن جایا کرے تو پھر آپ کی بددعا سے کیا ڈر؟

اس کا جواب یہ ہے کہ **ما ارسلناک الا رحمة للعلمین** (اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دونوں جہانوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے) میں تو یہی امر محل سوال ہے کہ عالمین سے مراد کیا ہے اور عالمین کے لئے رحمت ہونے کا کیا مطلب ہے۔ مشہور یہ ہے کہ عالمین اپنے عموم پر ہے اور اس عموم میں کفار بھی داخل ہوں گے اور چونکہ آیت میں کوئی تحدید وتوقیت نہیں ہے تو لازم آئے گا کہ کفار کے لئے دنیا وآخرت دونوں میں سبب رحمت ہیں اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ کفار پر آخرت میں آپ کی رحمت کس طرح ظاہر ہوگی۔

بعض علماء نے جواب دیا ہے کہ اگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نہ ہوتا تو کفار

کو آخرت میں اب سے زیادہ عذاب ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس میں کچھ کمی تجویز کی گئی ہے۔ مگر میرے دل کو یہ جواب نہیں لگتا کیونکہ اس دعوے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو عذاب زیادہ تجویز کیا جاتا۔ دوسرے جہنم کا عذاب قلیل بھی ایسا شدید ہے کہ ہر شخص یوں سمجھے گا کہ میں سب سے زیادہ عذاب میں ہوں۔ تو اس قلت سے ان کو نفع کیا ہوا۔

میرے ذہن میں جو اس کا جواب آیا ہے وہ یہ ہے کہ عالمین سے مراد تو معنی عام ہی ہیں۔ مگر رحمت سے مراد خاص وہ رحمت ہے جس کا تعلق ارسال سے ہے یعنی رحمت فی الدنیا۔ کیونکہ ارسال دنیا ہی کے ساتھ خاص ہے آخرت سے اس کو کوئی علاقہ نہیں اور دنیا میں جو آپ کی رحمت مومنین و کفار سب کو عام ہے وہ رحمت ہدایت و ایضاح حق ہے۔ چنانچہ قرینہ مقام اسی پر دلالت کر رہا ہے اس لئے کہ پہلے تبلیغ ہی کا ذکر ہے۔

ان فی هذا لبلاغاً

اس میں کافی مضمون ہیں۔

لقوم عابدین

ایسے لوگوں کے لئے جو بندگی کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ پھر اس میں آپ کی تخصیص کیا ہے۔ ہدایت ایضاح حق میں تو تمام انبیاء آپ کے شریک ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تخصیص محض رحمت کے اعتبار سے نہیں بلکہ مجموعہ رحمۃ للعلمین کے اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عالمین سے مراد تمام مکلفین کے لئے ہادی بن کر آپ ہی مبعوث ہوئے ہیں اور عالمین سے مراد تمام مکلفین ہیں جن میں جن وانس، عرب عجم سب داخل ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ بعثت عامہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بخلاف اور انبیاء کے کہ ان کی دعوت خاص خاص اقوام کے لئے تھی۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ دیگر انبیاء کی دعوت خاص تھی تو نوح علیہ السلام کی تکذیب سے تمام عالم کے کفار کیوں غرق کئے گئے۔ بلکہ چاہئے تھا کہ عذاب صرف ان لوگوں پر آتا جن کی طرف سے خاص طور پر مبعوث ہوئے تھے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو دعوت عامہ مخصوص

ہے۔ اس سے مراد دعوت عامہ فی الفروع ہے۔ باقی اصول میں تو ہر نبی کی دعوت عام ہوتی ہے۔ کیونکہ اصول تمام انبیاء کے یکساں ہیں۔ اور نوح علیہ السلام کے زمانہ میں تمام عالم کے کفار اصول ہی میں ان کی تکذیب کرتے تھے یعنی توحید و اعتقاد رسالت ہی میں خلاف تھے۔ اس لئے سب پر عذاب نازل ہوا۔

بہر حال اس آیت کی تفسیر اگر وہی ہے جو میں سمجھا ہوں جب تو اس میں صرف عموم دعوت کا بیان ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ آپ کی بددعا بھی رحمت ہے جو اس سے بے فکری کی جائے اور اگر دوسری مشہور تفسیر ہے تو وہ منافی عذاب کے نہیں۔

رہی حدیث تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی یہ درخواست اس بددعا کے ساتھ مخصوص ہے جو غلبۂ غضب میں بلا عمد صادر ہو۔ اور یہ بددعا تو عمداً ہے کیونکہ اس میں تو آپ تبلیغ احکام کے ساتھ رغم انفہ فرما رہے ہیں۔ اگر یہ مضمون الخ ہر بددعا کے لئے عام ہوگا۔ تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا۔ اگر آپ کی بددعا مطلق قبول نہیں ہوتی تو لعنتهم کے بعد کل بنی مستجاب سے تاکید کیوں کی جا رہی ہے۔

بہر حال یہ شبہ تو رفع ہو گیا۔ اس لئے آپ کی بددعا سے بے فکری نہیں ہو سکتی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بددعا ایسے لفظوں سے کی ہے جن سے دعا بھی نکل سکتی ہے۔ کیونکہ آپ رغم انفہ فرما رہے ہیں اور رغم انف نماز میں بھی ہوتا ہے۔ تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے اللہ! ان کو نمازی بنا دیجئے۔ گو محاورہ میں یہ معنی مراد نہیں ہوتے مگر لفظ سے بنا بر لغت نکل سکتے ہیں اور کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا کیا ہے کہ ایک لفظ کو معنی عرفی سے صرف کر کے بنا بر لغت دوسرے معنی پر محمول کیا ہے تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی رئیس منافقین کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو روکا کہ آپ ایسے لوگوں کی نماز کیوں پڑھاتے ہیں جن کے لئے استغفار کرنے سے حق تعالیٰ نے آپ کو منع فرمایا ہے۔

استغفرلهم اولا تستغفرلهم ان تستغفرلهم سبعين مرة فلن يغفر لله لهم.

ان کے لئے ایمان کی دعا کریں یا نہ کریں اگر ستر مرتبہ بھی کریں تب بھی۔ ان کی بخشش نہیں ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر! حق تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے اور اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستر سے زیادہ کرنے سے ان کی مغفرت ہو جائے گی۔ تو میں اس سے زیادہ کرلوں گا۔

فلسفی مزاج مصنفین تو اگر حدیث کو سن لیتے تو موضوع ہی کہہ دیتے کیونکہ اس سے اشکال ہوتا ہے کہ کیا نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی محاورہ کی بھی خبر نہ تھی کہ اس قسم کی تردید سے تخییر مراد نہیں ہوتی بلکہ تسویہ فی عدم النفع مراد ہوتا ہے اور ذکر سبعین (ستر سے تجاوز کرنا) سے تحدید کا قصد نہیں ہوتا بلکہ تکثیر مراد ہوتی ہے مگر حدیث صحیح ہے۔ بخاری مسلم کی روایت ہے اس کو موضوع نہیں کہا جا سکتا۔ باقی علماء نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے ہیں مگر میں نے ان جوابوں کو یاد نہیں رکھا بلکہ اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ کا جواب مجھے بہت پسند آیا وہی یاد رکھا۔

ہمارے استاد علیہ الرحمۃ کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غایت رحمت سے محض الفاظ سے تمسک فرمایا۔ اس جواب کا حاصل وہی ہے کہ آپ نے معنی عرفی سے عدول کر کے معنی لغوی پر کلام کو محمول فرما لیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ معنی عرفی کی آپ نے نفی فرما دی بلکہ لفظی احتمال کے طور پر فرمایا کہ فی النفسہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے ایسے ہی ہم بھی کہتے ہیں کہ گویا عرفاً رغم انفہ بددعا ہی کے لئے ہے مگر لغۃً اس سے دعا بھی نکل سکتی ہے کہ اے اللہ! ان کو نمازی بنا دے تا کہ ان کے یہ عیوب سب مٹ جائیں۔ یہ ایسی تاویل ہے جیسے مثنوی کے اس شعر کی شرح میں۔

آتش ست ایں بانگ نای ونیست باد ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

شراح کا اختلاف ہوا ہے۔ بعض نے مصرع ثانی میں نیست باد کو بددعا پر محمول کیا ہے جس پر یہ آتش عشق نہ ہو خدا کرے وہ ملیا میٹ ہو جائے اور بعض نے اس کو دعا پر محمول کیا ہے کہ مولانا ان کے لئے مقام فنا کی دعا کر رہے ہیں کہ خدا ان کو بھی فنا عطا فرما دے۔ ایسے ہی رغم انفہ میں دعا اور بددعا دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

اہمیت ذکر رسول

اب سنئے وہ تین شخص کون ہیں۔ ایک تو وہ شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام

سنے اور صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا حق ہے۔ جب آپ کا نام مبارک لیا جائے یا سنا جائے تو صلی اللہ علیہ وسلم کہنا واجب ہے۔ اگر نہ کہے گا تو گناہ ہوگا ایسے ہی حق تعالیٰ کے نام پاک کے ساتھ جل جلالہٗ یا اور کوئی لفظ مشعر تعظیم کہنا واجب ہے ورنہ گناہ ہوگا۔ لیکن ایک مجلس میں اگر چند بار نام لیا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر صلی اللہ علیہ وسلم کہنا (اور حق تعالیٰ کے نام پر جل جلالہ یا تعالیٰ کہنا) ایک بار تو واجب ہے اور ہر بار کہنا مستحب ہے وہ اس کا مصداق ہوگا۔

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ لھو المسک ما کررتہ یتضوع

حضرت نعمان کا تذکرہ ہمارے سامنے دہرایئے کیونکہ ان کا تذکرہ کستوری ہے جتنا تو اسے دہرائے گا پھیلے گی۔

جتنی دفعہ درود پڑھا جائے گا قند مکرر کا لطف ہوگا اور گو ہر بار صلی اللہ علیہ وسلم کہنا شرعاً ضروری نہیں بلکہ مستحب ہے مگر محبت و عشق کا مقتضا یہ ہے کہ ہر بار درود پڑھا جائے کیونکہ عاشق کو اس کے بغیر چین نہیں آتا مجنوں کا واقعہ ہے

دید مجنوں را یکے صحرا نورد   در بیابان غمش بنشستہ فرد

ایک آدمی نے مجنوں کو جنگل طے کرتے ہوئے دیکھا کہ وہ اپنے غم کے بیابان میں تنہا بیٹھا ہوا ہے۔

ریگ کاغذا بود انگشتاں قلم   ے نمودے بہر کس نامہ رقم

ریت کاغذ تھی اور انگلیاں قلم تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کو خط لکھ رہا ہے۔

اس نے کہا اے عاشق مجنوں یہ کیا چیز ہے۔ یہ خط تو کس کے نام ہے۔

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم   خاطر خود را تسلی مے دہم

اس نے کہا لیلی کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔

اسی طرح عشاق کو حضور صلی اللہ عیہ وسلم کے ذکر کے بغیر چین نہیں ملتا جتنا بھی ہو تھوڑا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینا حدود کے ساتھ ہونا چاہئے ہر طرح اور ہر طریقہ سے اجازت نہیں۔ مثلاً محمد محمد کا درود کرنا جائز نہیں بلکہ ذکر رسول کا طریقہ یہ ہے کہ درود شریف پڑھا جائے یہاں تو محمد محمد کہنے کی بھی اجازت نہیں اور آج کل غضب یہ ہے کہ بعض

لوگ اپنے پیر کے نام سے وظیفہ پڑھتے ہیں اور وہ بھی حرف ندایا کے ساتھ چنانچہ یاوارث کہتے ہیں اور تاویل یہ کرتے ہیں کہ وارث خداتعالیٰ کا نام ہے۔ کیا خوب! بھلا آپ کو خدا کے ناموں میں سے ایک یہی نام ملا۔ آخر خداتعالیٰ کے بہت سے ناموں میں سے یہی نام کیوں چھانٹا گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس نام کو پیر کے نام سے مناسبت ہے یقیناً کی یہی وجہ ہے تو کیا یہ شرک نہیں کہ خدا کے ذکر میں پیر کا ذکر بھی شامل ہے۔

ایسے ہی آج کل ہمارے خاندان میں ایک بدعت نکلی ہے کہ خطوط وغیرہ کے شروع میں بامداداللہ یا ہوالرشید یا ہوالقاسم یا ہوالمعین یا بفضل الرحمن لکھتے ہیں۔

صاحبو! مجھے اس میں سے بوئے شرک آتی ہے خدا کے واسطے اس طرز کو چھوڑ دو یہ مقدمہ شرک ہے اور ایک دوسری بدعت جو اس سے کم درجہ کی ہے یہ نکلی ہے کہ اپنے نام کے ساتھ امدادی یا قاسمی و رشیدی لکھتے ہیں اور بعضے اس احقر کی طرف نسبت کر کے اپنے کو اشرفی لکھتے ہیں۔ چاہے واقع میں کوڑی بھی نہ ہوں مگر بنتے ہیں اشرفی۔ یہ بھی لغو حرکت ہے۔ اس میں خواہ مخواہ گروہ بندی اور تحزب ہے۔ کیونکہ ان سلاسل میں کوئی اختلاف نہیں ہے جس کے اظہار کی ضرورت ہو۔

پس اس کو حنفی و شافعی کی نسبت میں قیاس کرنا غلط ہے کیونکہ حنفیہ و شافعیہ میں خود فروعی اختلاف بہت ہے اور ائمہ اربعہ کے مقلدین کو باقی اسلامی فرقوں سے اصولی اختلاف ہے تو اس نسبت میں اس بات کا اظہار ہے کہ ہم اصولاً ائمہ اربعہ کے متبع ہیں اور فروعاً کسی خاص امام کے مقلد ہیں۔ لیکن امدادی و رشیدی و قاسمی میں جو نسبت ہے اس سے کون سے اختلاف پر متنبہ کرنا مقصود ہے کچھ بھی نہیں اس میں سوائے گروہ بندی کے اور کچھ مقصود نہیں یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہر طریقہ سے جائز نہیں اور حاجی صاحب کا جو شعر ہے۔

دے مجھے عشق محمد اور محمدیوں میں گن
ہو محمد ہی محمد ورد میرا رات دن

اس سے مراد یہ ہے کہ مجھے قاعدہ شرعیہ کے موافق ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر کی توفیق ہو۔ مگر چنانچہ شعر میں تنگی ہوتی ہے اس لئے شعر میں تفصیل نہ ہو سکی۔

کیونکہ وہاں بحر و وزن کی رعایت بھی ہوتی ہے اس لئے مولانا ایک مقام پر اس تنگی کی شکایت کرتے ہیں۔

معنی اندر شعر جز با خبط نیست
چوں گلا سنگ آں را ضبط نیست

اور بعض دفعہ ان رعایت سے گھبرا کر مولانا بعض تسامحات کا عذر بیان فرماتے ہیں۔

قافیہ اندیشم و دلدار من
گویدم مندیش جز دیدار من

(میں شعر کا قافیہ سوچتا ہوں اور میرا محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ میرے دیدار کے سوا کچھ نہ سوچ)

ہاں اگر کوئی ایسا شعر کہے جیسا ہمارے ایک دوست نے کہا تھا وہ البتہ ایسی تنگی سے خالی ہوگا۔ قصہ یہ ہوا کہ ایک بار وہ ایک نئی روشنی والے مولوی صاحب سے ملے اور دیوان قاآنی کا نسخہ ان کو پیش کیا مگر انہوں نے کتاب کو دیکھا بھی نہیت لاپرواہی سے اور تکبر کے لہجہ میں کہا کہ کیا یہ آپ کی تصنیف ہے (یہ نیچری اکثر متکبر ہوتے ہیں) تو ان صاحب کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے تمسخر سے کہہ دیا کہ جی ہاں! میری ہی تصنیف ہے۔ کہنے لگے کیا آپ شاعر ہیں۔ کہا جی ہاں! کہا کیا آپ فی البدیہ کوئی شعر کہہ سکتے ہیں۔ کہاں ہاں انہوں نے کہا کوئی شعر سنایئے تو آپ فرماتے ہیں۔

گر مصور تری تصویر اینچے
تو اس کام کے لئے سوا دو مہینے چاہئیں

کہا یہ کیا شعر ہے جس میں نہ وزن نہ بحر نہ قافیہ نہ ردیف۔ کہا جناب میں پہلے وزن و بحر کی رعایت کیا کرتا تھا۔ پھر نے آپ کا ایک مضمون دیکھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ پرانی رسوم کا اتباع لغو ہے مگر علماء لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں ہمیں چاہئے کہ ان رسوم کو ترک کر کے جس طریق میں راحت معلوم ہو اس کو اختیار کریں میں نے آپ کی اسی رائے پر عمل کیا اور سوچا کہ شعر میں وزن و بحر و قافیہ کی رعایت بھی پرانی رسم ہے اور اس سے کام میں تنگی بھی ہوتی ہے تو اس کو بھی ترک کر دینا چاہئے (آپ نے تو رسوم دینیہ کے ترک کا مشورہ دیا تھا جو رسوم شعر سے بدرجہا اہم ہیں جب ان کا ترک آپ کے نزدیک مذموم نہیں تو رسوم شعر کا ترک بدرجہ اولی مذموم نہ ہونا چاہئے) وہ صاحب کہتے تھے کہ اس جواب سے وہ مولوی صاحب بالکل لاجواب اور خاموش ہو گئے۔

تو اگر ایسا شعر ہو تو اس میں واقعی تنگی نہ ہوگی ورنہ وزن و بحر کی رعایت کے ساتھ شعر میں کیا کیا مضمون آ سکتا ہے۔ ضرور تنگی ہوتی ہے اس لئے حاجی صاحب کے شعر میں محمد ہی محمد سے

یہ مقصود نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اسی طریقہ سے کیا جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ کا ذکر ہونا چاہئے باقی رہا طریقہ تو اس کو علماء سے پوچھنا چاہئے۔ سو ہمارے اکابر نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کا طریقہ درود شریف ہے یا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا۔ صرف محمد محمد کہنا کوئی ذکر نہیں بلکہ بعض مشائخ نے کہا ہے کہ صرف اللہ اللہ کہنا بھی ذکر غیر ثابت ہے بلکہ خدا تعالیٰ کا ذکر احادیث سے لا الٰہ الا اللہ یا سبحان اللہ والحمد للہ وغیرہ کے ساتھ مقید معلوم ہوتا ہے اس کا ایک جواب ہمارے بعض اکابر نے دیا تھا کہ حدیث میں ہے۔

لاتقوم الساعة حتی یقال فی الارض الله (لم أجد الحدیث فی موسوعة أطراف الحدیث و لامافی معناه)

جب تک زمین پر اللہ اللہ کہنے والا کوئی باقی ہے اس وقت تک قیامت نہ آئے گی۔ تو اس سے اللہ کا ذکر ہونا ثابت ہے۔ مگر یہ جواب قواعد پہ منطبق نہیں کیونکہ یقال کا مقولہ جملہ ہوتا ہے سو لامحالہ یہاں ذکر بضمن جملہ ہی مراد ہے اور میں نے یہ جواب دیا تھا کہ اس میں حرف ندا مقدر ہے۔ اصل میں یا اللہ ہے اور تقدیر حرف ندا عرب میں رائج ہے جیسے **یوسف اعرض عن هذا** (یوسف اسے چھوڑو) یعنی یا یوسف۔ باقی ہر دفعہ نیت ندا کی ضرورت نہیں بلکہ شروع میں ایک بار نیت کر لینا کافی ہے۔ اگر ہر بار نیت کی ضرورت ہو تو کوئی فعل اختیاری بھی نہ ہو سکے گی۔ دیکھئے مسجد کی طرف کی نیت سے چلنا موجب ثواب ہے۔ تو کیا ہر قدم پر نیت مشی و ارادہ رفع قدم ضروری ہے۔ ہرگز نہیں ذرا ایسا کر کے تو دیکھو چلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔

اسی لئے شمس بازغہ والے نے بھی اس سے بحث کی ہے اور مثال دی ہے کہ اگر عود بجانے میں ہر نقرہ پر قصد کرے تو بلید ہو جائے گا۔ غرض افعال اختیاریہ کے لئے حدوث میں تو ارادہ کی ضرورت ہے مگر ان کے بقاء میں ارادہ کی ضرورت نہیں۔ اگر افعال اختیاریہ کا بقا بھی ارادہ پر موقوف ہو تو ان کا صدور دشوار ہو جائے گا۔ اسی طرح ذکر میں ایک دفعہ نیت ندا کافی ہے پھر جتنی دیر تک بھی کرتے رہو گے وہی نیت مستمر رہے گی۔ اور اگر کوئی شخص ہر دفعہ میں نیت کو ضروری کہے گا تو ہم کہیں گے پھر ذکر میں ہر ہر لفظ بلکہ ہر حرف پر ارادہ ضروری ہونا چاہئے کہ اب الف کہہ رہا ہوں اب لام اب ہا۔ اگر ایک لفظ بھی بلا ارادہ صادر ہوا تو چاہئے کہ ثواب نہ ملے مگر ان شاء اللہ اس طرح ذکر ہی نہ ہو سکے گا۔ جب ہر حرف پر ارادہ کی

ضرورت نہیں تو نیت نداہی کی کیوں ضرورت ہے۔

یہاں سے معلوم ہوگیا کہ بعض لوگ جو ذکر میں اللہ کی ہاء کا خیال کرتے ہیں کہ ہاء اچھی طرح ظاہر ہوئی یا نہیں یہ غلطی ہے۔ بس اس طرح ذکر ہو چکا۔ میاں ایک دفعہ صحیح طور پر مخارج سے نکال کر ذکر شروع کرو۔ اس کے بعد مخارج کی فکر میں نہ پڑو۔ تا کہ طبیعت مشوش نہ ہو کوئی نماز تو نہیں ہے جو مخارج کے ادا نہ ہونے سے فاسد ہو جائے گی۔ شاید کوئی کہے کہ ذکر تو ناتمام رہے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تم بھی ناتمام ہی ہو۔ تم ہی کون سے ذاکر کامل ہو۔ تو جیسا ذاکر ہے ویسا ہی ذکر بھی ناتمام سہی۔

کانپور میں مجھ سے ایک بڈھے نے پوچھا تھا کہ وتروں کے بعد سبحان الملک القدوس کہنا کیسا ہے میں نے کہا ہاں مسنون ہے حدیث سے ثابت ہے۔ کہنے لگا وہ حدیث تو ضیعف ہے۔ میں نے ظرافت سے کہا تم بھی تو ضعیف ہو۔ تم ہی کہاں کے قوی ہو جو تمہیں حدیث قوی کی ضرورت ہے۔ اس وقت مجھے اس حدیث کی قوت وضعف کی تحقیق نہ تھی۔ ہاں اتنا معلوم تھا کہ موضوع نہیں ہے اور فضائل اعمال میں احادیث ضعیفہ پر بھی عمل جائز ہے۔ اس لئے میں نے بڈھے میاں کو بوجہ اس کے کہ وہ علمی مباحث کو سمجھ نہیں سکتا تھا اس وقت یہی جواب دے دیا کہ تم بھی تو ضعیف ہی ہو۔

اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ مخرج ہاء ادا نہ ہوا تو ذکر ناتمام ہوگا۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ تم بھی ناتمام ہمارا ذکر تو مخارج ادا ہونے پر بھی ناقص ہی رہے گا بس۔

ایں قبول ذکر تو از رحمت است
چوں نماز مستحاضہ رخصت است

(اس ذکر کا قبول فرمانا محض آپ کی رحمت کے سبب ہے جیسے استحاضہ والی عورت کی نماز بوجہ عذر کے ہو جاتی ہے)

ذکر کا کمال اداء مخارج پر نہیں ہے بلکہ اس کا کمال تو قلب پر ہے کہ دل سے کس طرح نکلتا ہے خلوص سے یا عدم خلوص سے مولانا فرماتے ہیں۔

ناظر قلبیم اگر خاشع بود
گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

(خدا تعالیٰ قلب کو دیکھتے ہیں اگرچہ غلطی سے کسی وقت نامناسب لفظ ادا ہو جاتے) تو ان قیود میں نہ پڑنا چاہیے کہ الف بھی نکلا یا نہیں ہاء بھی ادا ہوئی کہ نہیں اس سے

بجز تشویش کے کچھ فائدہ نہیں اور یہ جواب وہمی مزاجوں کے لئے ہے ورنہ اصلی جواب یہ ہے جب ہاء معنوی ہے تو ضرورت کثرت سے تلفظ معاف ہے جیسے ضرورت شعر میں لفظ اللہ کا الف ساقط ہو جانا جائز ہے۔ کمال قال۔

الا لا بارک اللہ فی سہیل. کمال فی البیضاوی فی تحقیقی اسم اللہ

اور ضرورت کثرت ذکر ضرورت شعر سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے۔ نیز روزمرہ کے محاورات قسم وغیرہ میں ہاء کو کوئی بھی ادا نہیں کرتا۔ اور نہ اس کو کوئی مفتی عاصی کہتا ہے اور نہ یمین کو غیر منعقد کہتا ہے۔ اور بیضاوی میں مقام مذکور میں جو حذف الف کے ساتھ صریح یمین کو غیر منعقد کہا ہے محشی نے اس کی تفسیر کی ہے ای الیمین بالنیت اور یہاں ذاکر نیت یقینی ہے اس لئے وہ ذاکر لکھا جاوے گا۔

اسی طرح نفی اثبات میں جو یہ قید ہے کہ دس مرتبہ کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و علی آلہ واصحابہ وسلم کہا کرے یہ بھی مقصود نہیں۔ بس جب یاد آئے کہہ لیا کرے خواہ سو دفعہ کے بعد ہی سہی۔ بعض لوگ اس قید کی بھی پابندی کرتے ہیں تسبیح میں دس دس دانوں کے بعد ایک موٹا سا دانہ ڈالتے ہیں تا کہ فوراً یاد آ جائے اس طرح یہ شخص اسی دھندے میں رہتا ہے حق تعالیٰ کی طرف توجہ کامل نہیں ہوتی ایسے ہی بعض لوگ رگ کیماس کے دبانے کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔ یہ تمام قیود غیر مقصودہ ہیں۔

میں نے حضرت حاجی صاحب سے ضیاء القلوب سبقاً پڑھی ہے اس سے بہت نفع ہوا کہ مجھے طریق کی حقیقت معلوم ہو گئی جب میں ان قیود پر گزرا اس وقت معلوم ہوا کہ دسویں بار پورا کلمہ کہنا مقصود نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی کہہ لے یہ سب مضمون تنگی شعر میں چلا تھا جس میں یہ کہا گیا ہے۔

ہو محمد ہی محمد ورد میرا رات دن

اصل مضمون یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک سن کر درود شریف پڑھنا ضروری ہے۔ غرض ایک تو آپؐ نے اس شخص کو بددعا دی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر درود نہ پڑھے۔ اور اس سے خود غرضی کا شبہ نہ کیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر درود نہ پڑھنے سے چونکہ حق تعالیٰ کا غصہ اس شخص پر ہوتا ہے۔ اس لئے آپؐ نے امت کو خدا تعالیٰ کے غضب سے بچانا چاہا ہے۔

خدمت والدین کی اہمیت

دوسرا شخص جس پر بددعا فرمائی ہے۔ وہ ہے۔ جس نے اپنے باپ یا ماں کو یا دونوں کو بڑھاپے میں پایا اوران کی خدمت کر کے جنت نہ پالی۔ بڑھاپے کی قید اس لئے لگائی کہ جوانی میں تو تمہاری خدمت کے محتاج نہ ہوں گے بلکہ خود تمہیں ان کے محتاج ہو گے۔ کیونکہ ماں باپ کی جوانی میں اولاد کا بچپن ہوتا ہے۔ ہاں جب اولاد جوان ہوتی ہے تو اس وقت والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اب اولاد کو ان کی خدمت کرنا چاہئے۔ حق تعالیٰ نے والدین کا بڑا حق رکھا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

امایبلغن عندک الکبر احدھما او کلاھما فلاتقل لھما اف ولاتنھرھما و قل لھما قولاً کریماً

کہ والدین میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو۔ اور اسی میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ مگر صورت سے ناگواری خاہر کی جائے کیونکہ اف سے ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ایذا نہ دو۔ اور جب صورت سے ناگواری ظاہر کی جاتی ہے تو اس سے بھی مخاطب کو ایذا ہوتی ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ ان کو (کسی بات پر) دھمکاؤ بھی نہیں بلکہ تہذیب سے گفتگو کرو۔ یہاں تک تو خدمت تعظیم وادب کی تعلیم تھی۔

اس کے علاوہ حق تعالیٰ نے والدین کا ایسا حق رکھا ہے جس کی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو خبر نہیں ہوتی وہ کیا ہے؟ دعا ! چنانچہ ارشاد ہے۔

وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیراً

دعا بھی ایسی تعلیم فرمائی ہے جس میں اولاد کے زمانہ احتیاج کو یاد دلایا ہے کہ اس طرح دعا کرو کہ اے پروردگار میرے والدین پر رحم کیجئے۔ جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا اور شفقت ورحمت سے) پرورش کیا ہے۔ اس میں بتلا دیا کہ والدین کے زمانہ احتیاج میں تم اپنے زمانہ احتیاج کو یاد کرو کہ کبھی تم بھی نہایت کمزور ضعیف تھے نہ اپنے ہاتھ سے کھا سکتے تھے نہ پی سکتے تھے۔ نہ چلنے پھرنے کی طاقت تھی۔ پھر بھی والدین نے اس وقت کس محبت وشفقت سے تمہارے نازنخرے اٹھائے اور کس شفقت سے پالا کہ آج تم اس قابل ہوئے کہ دوسروں کو خدمت کرو۔ اب تم ان کی ضعیفی میں بات بات پر کیوں جھلاتے ہو پھر الفضل للمتقدم تمہارے

اندر جو آج خدمت کی صلاحیت آ گئی ہے۔ اس میں تو والدین کو دخل ہے اور ان کی خادمیت میں تم کو کوئی دخل نہ تھا۔ مگر بایں ہمہ وہ تو تمہاری خدمت سے ایک دن بھی نہ گھبرائے اور تم گھبرا گئے۔

اس پر مجھے ایک بنئے کی حکایت یاد آئی۔ وہ حکایت یہ ہے کہ ایک بنیا اپنے بچے کو گود میں لئے ہوئے بیٹھا تھا کہ فصیل پر ایک کوا آ کر بیٹھا۔ لڑکے نے پوچھا ابا یہ کیا ہے۔ کہا بیٹا کوا۔ لڑکے نے پھر تھوڑی دیر میں یہی سوال کیا ابا یہ کیا ہے کہا بیٹا کوا۔ تھوڑی دیر میں پھر وہی سوال کیا اور بنیا برابر جواب دیتا رہا۔ گنتی میں بھی لکھتا رہا۔ لڑکے نے سو دفعہ پوچھا اور اس نے سو ہی دفعہ جواب دیا اور روزنامچہ میں لکھ لیا۔ بات گئی گزری ہوئی ایک زمانہ میں وہ وقت آیا کہ لڑکا جوان ہو کر دکان کا مالک ہوا اور بنیا بوڑھا ہو گیا۔

اب بنئے نے ایک دن لڑکے سے یہی سوال کیا کہ بیٹا فصیل پر کیا بیٹھا ہے۔ اس نے پہلی بار تو نرمی سے کہہ دیا کہ ابا کوا ہے۔ تھوڑی دیر میں پھر سوال کیا اس دفعہ ذرا اس نے تیزی سے کہا کہ کوا ہے۔ تیسری دفعہ پھر پوچھا تو غصہ میں جواب دیا کوا ہے۔ چوتھی بار اس نے پھر پوچھا تو بیٹا کہتا ہے کہ تمہاری تو عقل جاتی رہی بس ایک بات کی رٹ ہی لگا رکھی ہے۔ بنئے نے کہا ارے منشی جی ذرا میرے روزنامچہ کی بھی لانا کیونکہ وہ بھی اب تک قائم تھی (پانی میں) بہی نہ تھی۔ اس نے کھول کر دکھلایا کہ صاحبزادے تم جب بچے سے تھے تو تم نے سو دفعہ یہی سوال کیا تھا اور میں نے ہر دفعہ محبت سے جواب دیا تھا کہ بیٹا کوا ہے مجھے سو بر میں تم پر غصہ نہیں آیا اور تم تین ہی دفعہ میں جھلانے لگے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ بچوں کی باتیں پیاری معلوم ہوتی ہیں اس لئے ان سے ناگواری نہیں ہوتی اور بوڑھوں کی باتیں پیاری نہیں لگتیں۔ اس لئے گراں گزرتی ہیں تو میں کہتا ہوں کہ یہ سچ ہے بے شک بچوں کی باتیں ان کی ناسمجھی اور بھولے پن کی وجہ سے طبعاً اچھی لگتی ہیں تو بوڑھوں کی باتیں ناسمجھی کی وجہ سے عقلاً گراں نہ ہونا چاہئیں کیونکہ عقل دونوں میں مشترک ہے۔ بس اگر وہاں محبت کی وجہ سے طبعاً ناگواری نہیں ہوتی تو یہاں ادب و تعظیم کی وجہ سے عقلاً ناگواری نہ ہونا چاہئے۔ شریعت یہ نہیں کہتی کہ طبعی ناگواری بھی نہ ہو بلکہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ اگر بوڑھے ماں باپ کی باتوں سے طبعاً ناگواری ہو تو اس کو ظاہر نہ کرنا چاہئے عقل سے کام لے کر ان کو معذور سمجھنا چاہئے اس طرح سے عقلی ناگواری نہ ہوگی۔ چنانچہ حق

تعالیٰ کی کیسی عنایت ہے چونکہ وہ جانتے ہیں کہ انسان میں طبعاً بوڑھے آدمی کی بے ڈھنگی بات سے تغیر آہی جاتا ہے۔ اس لئے آگے فرماتے ہیں۔

ربکم اعلم بما فی نفوسکم ان تکونوا صالحین فانه کان للاوابین غفوراً

یعنی حق تعالیٰ تمہارے دلوں کے حال کو خوب جانتے (کہ تم کو بعض دفعہ طبعاً ناگواری ضروری ہوگی اس لئے اس کے متعلق قانون بتلاتے ہیں کہ) اگر تم صالح ہو گے (یعنی اس طبعی اقتضاء پر عمل نہ کرو گے) تو حق تعالیٰ معذرت کرنے والوں کو بخش دیں گے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ للاوابین میں للتوابین سے ایک فائدہ مہمہ زائدہ ہے وہ یہ کہ توابین میں مصروف معذرت پر دلالت ہے اور اوابین میں خاص تعلق پر دلالت ہے یعنی جو حالت محبت وخدمت کی پہلے تھی وہی اختیار کر لی۔ مطلب یہ کہ فوراً ہی معذرت کر لی جائے تو مواخذہ نہ ہوگا۔

نیز ربکم اعلم بمافی نفوسکم میں بڑی رحمت کا اظہار کیا گیا ہے کہ خدائے تعالیٰ تو دلوں کو دیکھتے ہیں اگر تمہارے دل میں اختیاراً وعقلاً ادب وتعظیم کی صفت موجود ہو اور ظاہر میں کسی وقت غلطی سے سختی ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہ ہوگا۔

ناظر قلبیم گر خاشع بود گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

خدا تعالیٰ تو دل کو دیکھتے ہیں اگر چہ کسی وقت غلطی سے نامناسب لفظ ادا ہو جاوے۔

ما بروں را ننگریم وقال را ما دروں را بنگریم و حال را

ہم ظاہری حالت اور قال کو نہیں دیکھتے ہم باطن کو اور حال دیکھتے ہیں۔

اہتمام مغفرت کی ضرورت

تیسرا شخص جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا فرمائی ہے وہ ہے جس نے رمضان کا بابرکت زمانہ پایا اور گناہوں سے اپنی مغفرت نہ کرائی یہی جزو مجھے زیادہ مقصود ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں پر وعید فرمائی ہے جو رمضان میں بھی اپنی مغفرت کا سامان نہ کریں۔ صاحبو! اب رمضان ختم ہونے کو آیا ہے (کیونکہ آج تیس تاریخ ہے) اور نہ معلوم اب

تک ہم نے اس کو کس حالت میں گزارا ہے اب تھوڑا سا وقت باقی ہے اس کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ اس میں بھی اگر ہم اپنی اصلاح کرلیں تو سرخرو چنگیز ہو سکتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی شان یہ ہے۔

چو باز آمدی ماجرا در نوشت　　دگر خشم گیرد بکردار زشت

کہ بندہ گناہ کر کے جس وقت بھی رجوع کرنا چاہئے وہ اسی وقت سب قصہ ختم کر دیتے ہیں اور توبہ قبول کر لیتے ہیں۔ پس ہم کو سب گناہوں سے اسی وقت دل سے توبہ کرنی چاہئے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ گناہوں پر ندامت و معذرت ظاہر کریں اور جو حقوق واجب الادا ہیں فی الحال ان کے ادا کا عزم کرلیں اور فی المال ان کے ادا کا اہتمام کریں اور آئندہ کے لئے گناہوں سے بچنے کا ارادہ کریں اب میں دوسری حدیث پڑھتا ہوں جس کو ایک تفسیر پر لتکبروا اللہ علی ماھداکم سے مناسبت ہے اس کے راوی غالباً حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں اور مخرج بیہقی ہیں۔ اس وقت حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں۔

یا ملائکتی ما اجومن و فی عمله قالوا ربنا جزآء (لم أجد الحديث فی موسوعة أطراف الحديث ولامافی معناه)

ان یوفی اجره فیقول الرب تعالی ان عبادی ومائی قدوفوا فریضتهم وخرجوا یعجون بالتکبیر والثناء علی اشهد واقد غفرت لهم فیرجعون مغفوراً الهم و یبدل الله سینا تهم حسنات (او کما قال)

یعنی اے فرشتو! بتلاؤ اس مزدور کی مزدوری کیا ہونا چاہئے جس نے اپنا کام پورا کیا۔ وہ عرض کرتے ہیں خداوندا اس کو پوری مزدوری ملنا چاہئے اس پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں اور بندیوں نے اپنے فرض روزے پورے کر لئے اور اب وہ تکبیر و ثناء پکارتے ہوئے نکلے ہیں گواہ رہو میں نے ان کو بخش دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں پھر سب عیدگاہ کے نمازی بخشے بخشائے لوٹتے ہیں اور حق تعالیٰ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ وقت کل کو آنے والا ہے۔ اب تو ہمارے سامنے دو وقت ہیں۔ ایک تو یہ رمضان کا حصہ ہے جو بہت کم رہ گیا ہے اس میں سامان مغفرت نہ کرنے پر تو وعید ہے۔ اس لئے ہم کو اس کا حق ادا کرنا چاہئے اور اس میں توبہ و استغفار و عزم کر کے مغفرت طاعات کا مستحق ہو جانا چاہئے اور دوسرا وقت کل آنے والا ہے اس میں بھی دعا مغفرت کرنا

اور مذلت وخضوع کی ایسی حالت بنانا چاہئے جس سے اجر کامل کے مستحق ہو جائیں۔

چند اشکالات کے جواب

اب میں اس حدیث کے متعلق چند ضروری باتیں عرض کر کے بیان ختم کرنا چاہتا ہوں اس حدیث میں ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں ان عبادی و امائی قدوفوا فریضتھم و خرجوا وارد ہوا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ خرجوا کا مرجع عبادی و امائی دونوں ہیں تو اس سے عورتوں کا بھی عیدگاہ کی طرف نکلنا ثابت ہوا۔

جواب یہ ہے کہ ہاں اصل تو یہی ہے کہ عورتیں بھی عیدگاہ میں جائیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں عیدگاہ میں جاتی تھیں مگر اب فتنہ کی وجہ سے ان کو روک دیا گیا کیونکہ اتنے بڑے مجمع میں ان کا نکلنا فتنہ سے خالی نہیں۔ مگر عید کا جو ثواب حدیث میں مذکور ہے وہ عورت کو بھی ملے گا کیونکہ شرعی قاعدہ ہے کہ جو عمل کسی عذر کی وجہ سے نہ ہو سکے اس کا اجر ساقط نہیں ہوتا۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ یہاں لفظ خرجوا وارد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عید کی نماز شہر سے باہر ہونا چاہئے شہر کے اندر نہ ہونا چاہئے تو اب جو لوگ شہر کے اندر عید کی نماز پڑھتے ہیں کیا ان کے لئے یہ فضیلت نہ ہوگی۔ اس کا بھی یہی جواب ہے کہ اگر شہر میں عید کی نماز بلا عذر پڑھی جاتی ہے تو یہ خلاف سنت ہے اور اگر بعذر ہے تو ان کو بھی وہی ثواب ملے گا جو شہر سے باہر پڑھنے کو ملتا ہے اور ان کا عدم خروج اگر کسی کے بے راہی سے ہے تو اس کا وبال ان لوگوں پر ہوگا۔ جن کی وجہ سے یہ لوگ خروج سے معذور ہیں اور اگر حدیث میں خروج من البیت مراد ہو تو یہ تو ہر حال میں متحقق ہوگا۔

تیسرے اس حدیث میں خرجوا یعجون الی بالدعاء سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذکر بالجہر بلا کراہت مشروع ہے مگر اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ ایک تو ذکر کا جہر ہے اور ایک ذکر کی اذان ہے تو جہر بالذکر کا ثبوت تو احادیث میں ہے مگر ذکر کی اذان کا کہیں ثبوت نہیں۔

یہ لطیفہ نواب صدیق حسن خان صاحب کے صاحبزادے نور الحسن خان نے فرمایا تھا۔ ایک بار وہ کسی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے جب امام نے ولا الضالین کہا تو

غیر مقلدین نے بڑے زور سے آمین کہی۔ نواب صاحب کے بیٹے بھی موجود تھے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو ان چلانے والوں کو بلایا وہ اپنے دل میں خوش ہوئے ہوں گے کہ نواب زادہ بھی ہم ہی جیسے ہوں گے۔ ان کو ہمارا جہر پسند ہوا ہوگا۔ ضرور کچھ انعام دیں گے جب یہ قریب پہنچے تو ایک چپت رسید کیا اور کہا کہ آمین بالجہر تو حدیث میں آئی ہے مگر آمین کی اذان کون سی حدیث میں آئی ہے۔

واقعی بعضے لوگ اتنے زور سے آمین کہتے ہیں کہ جیسے لڑ رہے ہوں۔

ہمارے سب سے چھوٹے بھائی جن کو ہم نے عربی پڑھائی تھی وہ ایک دفعہ قنوج میرے ساتھ گئے وہاں جمعہ کی نماز میں کچھ غیر مقلد بھی شریک تھے جنہوں نے آواز ملا کر زور سے آمین کہی کہ سننے والوں کو توحش ہوتا تھا نماز کے بعد میرے بھائی کہنے لگے کہ آمین تو دعا ہے اور دعا خاص لب ولہجہ عاجزی و نیازمندی کا ہوتا ہے جس کا ان لوگوں میں پتہ بھی نہیں۔ ان کے لہجہ میں تو دعا کی شان نہیں معلوم ہوتی۔ یہ بات مجھے بہت پسند آئی واقعی اس میں جہر شدید کے ممنوع ہونے کو یہی بات کافی ہے کہ اس میں دعا کا لہجہ نہیں ہوتا۔

ایک انگریز نے بھی اس بات کو سمجھا۔ کسی جگہ مقلدوں اور غیر مقلدوں کا جھگڑا تھا انگریز موقعہ پر تحقیقات کو خود آیا اور یہ فیصلہ لکھا کہ آمین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک بالجہر یہ تو سنت ہے احادیث سے ثابت ہے۔ ایک بالسر یہ بھی سنت ہے احادیث سے ثابت ہے۔ ایک بالشر جس سے مشتعل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ قابل روکنے کے ہے اور ان لوگوں کی آمین تیسری قسم کی ہے۔ لہذا قابل روکنے کے ہے۔

مسلمانوں کے لئے کتنے افسوس کی جگہ ہے کہ ہمارے دینی معاملات کا فیصلہ کفار کرتے ہیں۔ خود آپس میں ہم سے تصفیہ نہیں ہو سکتا اور پھر تماشہ یہ ہے کہ وہ ہمارے واقعات کی حقیقت کو ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں اسی طرح ذکر جہر میں بھی ایک تو جہر کا درجہ ہے اور ایک اس کی اذان کا درجہ ہے تو اس اذان کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔

شاہجہان پور میں ایک ڈپٹی صاحب ذاکر تھے اور ایک بزرگ سے بیعت تھے۔ وہ ایسا جہر کرتے تھے کہ سارے محلے والے تنگ تھے وہ بندہ خدا رات کو دو بجے سے جو ذکر کی اذان دیتے تو صبح تک محلے والوں کو سونا دشوار ہو جاتا۔ پھر وہ مجھ سے رجوع ہوئے تو میں

نے اس جہر سے روک دیا۔ پھر تو لوگ مجھے دعا دیتے تھے۔

پھر اہل جہر میں بھی بعض لوگ تو ریلی آواز سے جہر کرتے ہیں اس سے تشویش نہیں ہوتی اور بعضوں کی آواز بہت سخت ہوتی ہے اس سے دماغ پر چوٹ سی لگتی ہے۔ بہر حال نفس جہر ممنوع نہیں احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں بھی ہے اور ایک دوسری حدیث میں جو اربعوا علی انفسکم آیا ہے اس سے نفس جہر کی ممانعت مناسب نہیں ہوتی بلکہ اربعوا خود بتلا رہا ہے کہ صحابہ اس وقت مشقت وتعب کے ساتھ ذکر کر رہے تھے اس کو روکا گیا ہے کیونکہ اربعوا کے معنی ہیں ارفقوا یعنی نرمی کرو تو جہر نرمی سے ہو تو وہ ممنوع نہیں اگر کسی کو شبہ ہو کہ مشقت تو عبادت میں مطلوب ہے پھر اس مشقت سے کیوں منع فرمایا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مشقت ایک تو مقاصد میں ہوتی ہے ایک طریق میں تو مقاصد میں تو مشقت باعث اجر ہے اور طریق میں مشقت برداشت کرنا موجب اجر نہیں۔ دوسرے جب کہ اس کا طریق بھی ہو مثلاً ذکر مقصود ہے تو نفس ذکر میں جو مشقت ہو جیسے دو ہزار کی جگہ چار ہزار دفعہ ذکر کیا جائے یہ مشقت ثواب کو موجب ہے اور ایک مشقت یہ ہے کہ خاص آواز اور خاص ہیئت سے ذکر کیا جائے۔ سو یہ محض طریق ہے اس میں مشقت موجب ثواب نہیں۔

میرے ایک دوست اس میں اطلاق کے مدعی تھے۔ وہ مشقت کو مطلقاً موجب اجر سمجھتے تھے خواہ مقاصد میں ہو یا طریق میں۔ تو میں نے کہا بہت اچھا پھر آپ وضو کے لئے یہاں سے پانی نہ لیا کریں بلکہ جلال آباد سے جا کر لیا کریں کیونکہ اس میں مشقت زیادہ ہے۔ بس اس پر آنکھیں کھل گئیں اور سمجھ گئے۔

تو ممکن ہے کہ صحابہ نے جہر مفرط کیا ہو جس سے مشقت ہو رہی ہو یا جہر تو معتدل ہو مگر وہ مشقت۔ جہر کو موجب اجر سمجھ رہے ہوں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا جس سے معلوم ہو گیا کہ جہر من حیث ہو جہر عبادت نہیں اور اگر مقصود تو ذکر کو سمجھیں تو جہر کو کسی مصلحت سے اختیار کریں۔ جیسے دفعہ خواطر وحصول جمعیت وغیرہ کیونکہ تجربہ ہے کہ ذکر جہر میں وساوس کم آتے ہیں اور سکون قلب بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے تو یہ صورت ممنوع نہیں بشرطیکہ اور کوئی عارض مانع نہ ہو۔

بہر حال فیصلہ یہ ہوا کہ جہر مفرط مطلقاً ناجائز ہے جس سے خود کو مشقت ہو یا دوسروں

کو اور جہر معتدل میں تفصیل ہے۔ اگر خود جہر کو بطور ثواب اختیار کرے تو یہ بھی ناجائز اور بدعت ہے اور اگر مقصود نفس ذکر ہو اور جہر اعتدال سے ہو اور اختیار للمصلحت تو وہ بدعت نہیں بلکہ ایسا جہر شریعت سے ماذون فیہ بلکہ احادیث میں وارد ہے۔ چنانچہ یعجون الی بالدعاء سے اسی حدیث میں جہر کا ثبوت ہو رہا ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ عید کے روز سب کی مغفرت ہو جاتی ہے **فیرجعون مغفوراً لهم و یبدل الله سیئاتهم حسنات** اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ مغفرت تبدیل سیئات سب حاضرین عید کے لئے عام ہو کہ سب کو دونوں باتیں حاصل ہوتی ہوں۔ سب کی مغفرت بھی ہو اور گناہ بھی سب کے نیکیوں سے بدلتے ہوں اور ایک احتمال یہ ہے کہ یہاں دو صیغے اس لئے اختیار کئے گئے کہ مجمع میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ خواص مقربین اور مجرمین تو خواص کے لئے تبدیلی سیئات بالحسنات ہوتی ہے اور مجرمین کے لئے مغفرت ہے۔

خلاصہ بیان

خلاصہ بیان یہ ہوا کہ اس وقت میں نے دو حدیثیں پڑھیں ہیں ایک میں ان لوگوں پر وعید ہے جو رمضان میں اپنی مغفرت اور بخشوانے کا اہتمام نہ کریں دوسری ان لوگوں کے لئے بشارت اور عید ہے جو روزے پورے کر کے عید گاہ میں خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تعظیم کا حق ادا کریں گے۔ تو ایک میں عید کا ذکر ہے اور ایک میں وعید کا اس لئے میں اس وعظ کا نام بھی العید والوعید رکھتا ہوں۔ پس جو لوگ رمضان کی حرمت میں کمی کر چکے ہیں وہ اس تھوڑے سے باقی ماندہ وقت میں اس کی تلافی کر لیں کہ اصل میں کل کو اسی کی عید ہے جس نے رمضان میں خدا تعالیٰ کو راضی کر لیا۔ مجرم کی کیا عید ہے پھر کل کو دعا و خلوص کے ساتھ نماز عید اس طرح پڑھیں جس سے مغفرت و اجر کامل کے اہل بن جائیں۔ پھر ان شاء اللہ بخشے بخشائے گھر کو لوٹیں گے۔

مگر اس کے لئے کچھ شرائط ہیں جن میں سے ایک تو اخلاص فی العمل

والدعا ہے دوسرے عزم طاعت ہے کہ آئندہ کے لئے طاعت خداوندی کا پختہ ارادہ ہو۔ حتی الامکان کوئی نافرمانی نہ کریں گے اور طاعات ہمیشہ بجالائیں گے اور عزم طاعت کی علامت صدور طاعت ہے کہ اس سے طاعات صادر ہونے لگیں پس اگر کسی سے عید کی نماز کے بعد طاعات کا صدور نہ ہوا۔ تو یہ سمجھا جاوے گا کہ اس نے طاعات کا عزم ہی نہ کیا اور بدوں عزم طاعات کے توبہ کاملہ مستحق نہیں ہوتی۔ تو مغفرت کا بھی اس کے لئے وعدہ نہیں۔ یہ وعدہ انہیں کے لئے ہے جو طاعت کا عزم کرلیں۔ جس کے بعد صدور طاعات عادۃً لازم ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ مبادا بعض لوگ عید کی نماز پڑھ کر سال بھر کو اعمال سے فارغ اور بے فکر ہوجائیں کہ اب تو بخشے گئے۔ اگلے سال پھر عید کی نماز پڑھ لیں گے۔ درمیان جو گناہ اس سے معاف ہوجائیں گے تو یاد رکھو جو شخص ابھی سے یہ نیت کئے ہوئے ہے اس کو توبہ حاصل نہ ہوگی نہ اس کے لئے وعدۂ مغفرت ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمارے روزے قبول فرمائیں اور ان میں جو کچھ کوتاہی ہوئی تو اس کو معاف فرمادیں اور اس بقیہ وقت رمضان میں ہم کو مغفرت کا مستحق بنادیں اور کل کو اجر کامل عطا فرمائیں۔ آمین صلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین .

تم بحمد اللہ